07 — سرگزشت
قلم کا مبلغ
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

08 — گفت و شنید
شہر خیال
مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

16 — شخصیت
بے اماں
زویا اعجاز
وہ بے اماں، اسیر بھی تھا اور آزاد بھی

44 — دہشت گردی
حلف
زرین قمر
دہشت گردوں سے مقابلہ کرتے بہادروں کی روداد

67 — تعصب
ناسور
ابوالفرح ھمایوں
یورپین معاشرے میں پھیلے تعصب پر ایک نظر

75 — حیرت انگیز
پریگننٹ مین
کوثر اسلام
مرد ہو کر بھی اس نے تین بچوں کو جنم دیا

79 — فلم نگری
باپ بیٹے
انور فرھاد
فلمی دنیا کے تین اہم ہدایت کاروں کا تذکرہ

108 — جرم و سزا
گلے کی ہڈی
عباس ثاقب
بیوی کے قاتل سے انتقام کا قصہ

113 — سفر کہانی
سفر پہلا پہلا
ندیم اقبال
الفاظ کی جادو بیانی کا شہکار ایک الگ انداز کی سفر کہانی

137 — واقعات
حقائق گم گشتہ
فرزانہ نگہت
ماہرین آثار قدیمہ نے ایک اہم تحریر دریافت کرلی

140 — معاشرت
روسیاہ
عاطر شاھین
ایک شوریدہ سر نوجوان کی جنوں خیزی

UUNOVELS.COM

پہلی سچ بیانی — 170

فراری

زین مہدی

وہ دونوں بھی جیل
سے فرار ہوئے تھے

دوسری سچ بیانی — 201

خالی ہاتھ

کامران چودھری

وہ سب کچھ پاکر
بھی خالی ہاتھ رہی

تیسری سچ بیانی — 211

شکست

خلیل جبار

شوہروں کو بے وقوف بنانے
والی ماں بیٹیوں کی روداد

چوتھی سچ بیانی — 221

پناہ گاہ

فوزیہ احسان

وہ خود ہی اپنی پناہ گاہ
کو مسمار کر رہی تھی

پانچویں سچ بیانی — 231

پھسلتے قدم

ناظم بخاری

اگر قدم پھسل جائے
تو کیا ہوتا ہے؟

چھٹی سچ بیانی — 241

بے جوڑ

آصف مالک

کچھ رشتے بے جوڑ ہو کر
بھی دیرپا ہوتے ہیں

ساتویں سچ بیانی — 253

نیا ابراہہ

اسد عباس

ایک جعلساز کی
انوکھی جعلسازی کا قصہ

آٹھویں سچ بیانی — 259

آخری کال

نفیسہ سعید

اس آخری کال
نے زندگی کا رخ بدل دیا

نویں سچ بیانی — 267

نئے راستے

اریشہ غزل

ایسے واقعات سبق حاصل
کرنے کے لیے کافی ہیں

دسویں سچ بیانی — 272

ع ش ق

علی عمران ممتاز

عشق کی حشر سامانی
کا دلچسپ واقعہ

سوغات — **

پارچے

قارئین / ادارہ

دنیا بھر سے مختلف موضوعات
پر معلوماتی انکشافاتی پارچے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

چین کے صوبہ ہبائی کے شہر وھان جسے ہنگز اور ہان ندی تقسیم کرتی ہے، جسے جھیل اور باغیچوں کا شہر کہا جاتا ہے، جو تعلیمی، معاشیاتی، تجارتی اعتبار سے اہم مقام رکھتا ہے، جو آپٹکل، الیکٹرونک، آٹو موبائل، کپڑے، کھلونے اور فولادی صنعت کے لیے عالمی طور پر اہم مقام رکھتا ہے۔ سائنس وٹیکنالوجی کے لیے اہمیت کی حامل وھان یونیورسٹی اور ہوزونگ یونیورسٹی اسی شہر میں ہے۔ یہاں 6000 سے زائد 80 ممالک کے انوسٹر کام کر رہے ہیں۔ گویا ترقی کی دوڑ میں یہ شہر بہت آگے ہے مگر چند ہفتے پہلے وہاں ایک وبا پھیلی جسے ''کرونا وائرس اٹیک'' کا نام دیا گیا۔ یہ وبا بالکل اسی طرح پھیلی جیسے 2011ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی فلم contagion میں دکھایا گیا تھا۔ شہر ویران ہو گیا۔ اب تک کی اطلاعات کے مطابق 910 افراد کے مرنے کی اطلاعات ہیں جب کہ 3281 افراد اس وائرس سے متاثر ہو کر اسپتالوں میں زیر علاج ہیں۔ اس وبا کا سب سے برا اثر وہاں کی صنعت پر پڑا ہے کہ کارخانے بند، لوگ گھروں میں محبوس ہو گئے ہیں لیکن بغور دیکھیں تو صنعت بالکل تباہ ہو گئی ہے۔ چینی اشیاء درآمد کرنے والے ممالک خوفزدہ رہیں گے۔ لوگ چین کی اشیاء خریدنے سے اجتناب کریں گے کہ کہیں ان میں وائرس نہ آ گیا ہو۔ چین ہمارا سب سے قریبی دوست ہے، ہمارے اچھے برے وقت کا ساتھی ہے۔ سی پیک منصوبے کے ذریعے ہماری قسمت بدلنے کا داعی ہے اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم سب مل کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کڑے وقت میں چین کو سرخرو کرے اور وہاں کے عوام کی حفاظت کرے۔

بے اماں

زویا اعجاز

دشوار گزار وادی کے ایک چھوٹے سے گائوں کے ایک ننھے سے بچے کو ڈھونڈ کر لایا گیا تھا اور اس کی پوجا کی جارہی تھی۔ اسے دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ پھر جب وہ جوان ہوا تو اسے وہ عزت وتوقیر دی گئی جس کا تصور بھی محال ہے۔ لوگ اسے سجدے کرتے، اس سے منتیں مرادیں مانگتے۔ اُسے بیسویں صدی کا اوتار مانتے۔ اس کی ہدایت کو عقیدت کا جُز مانتے۔ اس کی ہدایت پر چلنے والے اس کے پیروکار دس بیس نہیں کئی لاکھ تھے جو اس کے ایک اشارے پر جان دے سکتے تھے مگر حکومتِ وقت اس کے خلاف تھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے ہی وطن میں بے اماں ٹھہرا۔ آزاد رہ کر بھی اسیر کہلایا۔ اس کے ماننے والے اسے فرار کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہے تھے کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ وہ قتل نہ ہو جائے۔ بالآخر عوامی مطالبے پر اس نے سرحد عبور کرلی۔ پڑوسی ملک میں پناہ لے لی۔ عالمی طور پر اسے عدم تشدد کا سفیر کہا گیا!..... اس کی کاوشوں پر اسے نوبل انعام سے بھی نوازا گیا۔

دورِ حاضر کی ایک اہم شخصیت کا زندگی نامہ

وہ تینوں طویل عرصہ سے ایک سفر طے کر رہے تھے۔

گھوڑوں پر سوار، ناہموار، بے آب وگیاہ، دھول اڑاتے پتھریلے رستوں پر مسافت مکمل کرتے تھکن ان کے چہروں پر کہیں نہ کہیں اپنا رنگ دکھانے لگی تھی لیکن منزل کا اب بھی کہیں نام ونشان نہ تھا۔ ہر صبح ایک نئی اُمید کے ساتھ سفر کا آغاز کیا جاتا اور سورج ڈھلتے ہی دلوں میں اُمید کی شمع روشن کیے آرام کی غرض سے ستانے لگتے۔ ان کی متلاشی و پیاسی نظریں شمال کی جانب دیکھتی نہ تھکا کرتیں۔

''ان بستیوں میں بھٹکتے ہوئے آج ہمیں بھلا کتنے ماہ ہوگئے ہیں؟'' ایک مسافر نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

''مہینوں کا شمار ہی نہیں رہا۔ اب تو بات سالوں تک آپہنچی ہے میرے عزیز۔'' ہلکے بھورے رنگ کے کھلے لبادے میں ملبوس اس شخص نے جواب دیا۔ وہ اس سہ رکنی قافلے کا سربراہ تھا۔

''کیا ہماری یہ تلاش کبھی ختم بھی ہوگی؟'' تیسرا ساتھی گہری سانس لے کر بولا۔

''یہ کیسی بات کی؟ تمہیں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے کہ ہم اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ مسافت جتنی بھی طویل ہو منزل اسی قدر حسین اور دلکش ہوا کرتی ہے۔'' اس کی بات نے دیگر دو افراد کی آنکھوں میں چمک پیدا کردی۔ وہ آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ سربراہ کی نظریں اب بھی شمال کی جانب ہی مرکوز تھیں۔ اس کے ذہن میں سوچوں کا ایک پُرپیچ سلسلہ رواں تھا۔

''تبت...... میرا تبت...... ہم سب کی ماتر بھومی...... میں تجھے کبھی مایوس نہیں کروں گا۔ میں تیرا اصل وارث ضرور تلاش کروں گا۔ بہت جلد تلاش کرلوں گا۔'' اس نے بڑی محبت سے پتھریلی زمین پر ہاتھ پھیرا۔ اسے اپنی سرزمین سے عشق تھا۔ اس کی یہ ماتر بھومی بھی تو بہت منفرد تھی۔ کوہ ہمالیہ کے سطح مرتفع تبت میں واقع یہ علاقہ دنیا کے چند بلند ترین مقامات میں سے ایک تھا۔ رقبے کے اعتبار سے مغربی یورپ جتنے وسیع اس خطہ کی سرحدیں ہندوستان، نیپال، سکم، بھوٹان اور میانمار سے منسلک تھیں۔ تبت کے علاقہ 'لہاسا' سے تعلق رکھنے والے وہ تینوں افراد 'تلکو' تھے جو اپنے دلوں میں محبت اور یقین کی جوت جگائے شمالی سطح مرتفع چانگ تاک، کن لن اور تنگولو پہاڑوں میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ وہ تبت میں بدھ مت کے سب سے بڑے روحانی پیشوا دلائی لامہ کے معتمد

خاص شمار ہوتے تھے۔ ان کے منصب کی مناسبت سے ذمے داری بھی اسی قدر بھاری تھی۔ انہیں اپنے نئے دلائی لامہ کی تلاش تھی۔ ان کی زندگی میں سرکاری' روحانی اور سیاسی اختیارات کی علامت اس ''منصب دار'' کی بہت اہمیت تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں البتہ یہ فرائض لاما سر انجام دیتے۔ دلائی لامہ شادی اور عمل تولید کا مجاز نہیں ہوتا تھا۔ مخصوص مذہبی عقیدے کے مطابق ان کا ماننا تھا کہ دلائی لامہ اپنی طبعی جسمانی عمر پوری کر لینے کے بعد کسی نئے بدن کی صورت میں دوبارہ پیدا ہو جاتا ہے۔ روایات اور ضابطوں کے مطابق انتقال سے قبل دلائی لامہ اپنے جانشین کی جائے پیدائش' والدین کا نام اور چند جسمانی نشانیاں کسی خط میں بیان کر دیا کرتا۔ اس کے معتمد خاص تلکو مطلوبہ مقام اور گھر کے سامنے ہی ڈیرا ڈال لیا کرتے۔ نوزائیدہ کی پیدائش ہوتے ہی مطلوبہ نشانیوں کی جانچ کے بعد اسے اپنی تحویل میں لے لیا جاتا۔ صدیوں سے جاری یہ معمول بہت ہموار اور منظم انداز سے رواں تھا لیکن اس بار ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ تیرہویں دلائی لامہ کو وفات سے قبل اپنے معتقدین کو کچھ بھی بتانے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ اپنے روحانی پیشوا کا وقت نزع یاد آتے ہی پتھریلی سطح پر گردش کرتا ہاتھ ساکت ہو گیا اس کا دل افسردگی سے لبریز ہو گیا۔ بوقت مرگ دلائی لامہ نے اپنا چہرہ شمال کی جانب موڑ رکھا تھا۔ سب معتقدین کے لیے یہ ایک واضح نشانی تھی کہ اس بار ان کا گوہر مقصود شمالی تبت میں ملے گا۔

''کیا سوچ رہے ہیں سیر الامہ؟'' اس کے ساتھی کی آواز نے خیالات میں خلل پیدا کیا۔

''دلائی لامہ کے علاوہ اور سوچ بھی کیا سکتا ہوں؟'' وہ تاروں بھرے شفاف آسمان کی وسعتوں میں نظریں جمائے کہنے لگا۔

''تبت کے لیے اگلے جانشین کا جلد از جلد ملنا بہت ضروری ہے۔ جانے کیوں مجھے دلائی لامہ کی وصیت آج کل بہت یاد آنے لگی ہے۔''

''یاد تو وہ آتا ہے میرے عزیز جو فراموش ہو گیا ہو۔ مجھے تو وہ کبھی بھولے ہی نہیں۔'' سیر الامہ نے بے چینی سے کروٹ لی۔ اس کی سماعت میں تیرہویں دلائی لامہ کی وہ وصیت گونجنے لگی تھی۔

''ہماری یہ مقدس سرزمین مذہب اور سیاست کا بڑا متوازن امتزاج رہی ہے۔ ہماری ثقافت اور تاریخ مثالی ہے لیکن اب وقت کے امبر پر طوفان کروٹیں لیتا محسوس ہو رہا ہے۔ مجھے داخلی اور خارجی سطح پر دھوکا اور تشدد عوامل برپا ہوتے نظر آنے لگے ہیں۔ اگر ہم نے اپنے خطہ کی حفاظت نہ کی تو وہ وقت بہت نزدیک ہے جب ہماری روحانی شخصیات دلائی لامہ اور پنچن لامہ اپنی حیثیت اور شناخت کھو بیٹھیں گی' ان کی رہائش گاہیں چھین لی جائیں گی اور بھکشوؤں پر عتاب نازل ہوگا۔ ہمارا صدیوں سے جاری یہ سیاسی سفر کہیں اپنی موت آپ ہی نہ مر جائے۔ تباہی و بربادی کی یہ لہر بہت خرابیاں لائے گی۔ عوام و خواص کی زمینیں' جائیدادیں چھین کر انہیں غلام بنا لیا جائے گا۔ ہر ذی نفس کو لامتناہی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ وقت آنے ہی والا ہے جب ہر سو خوف اور دہشت کا راج ہوگا۔''

ان الفاظ کی بازگشت نے سیر الامہ پر جھرجھری سی طاری کر دی۔ اسے علم تھا کہ دوسرا ساتھی بھی انہی جذبات کے زیر اثر ہوگا۔

''وہ وقت ہم پر کیوں آئے گا سیر الامہ؟ ہم تو ایک امن پسند قوم ہیں۔ ہزاروں برس سے اپنی روایات کو سینے سے لگائے پُرسکون زندگی بسر کرتے آئے ہیں۔ ہم کسی عتاب کا نشانہ کیوں بنیں گے؟''

''یہ سوال میرے ذہن میں بھی کئی بار آیا ہے اور اس کے ساتھ ایک خلش بھی بیدار ہو جاتی ہے کہ کاش دلائی لامہ ہمیں ان خطرات اور اپنے جانشین کے متعلق مزید معلومات بھی فراہم کر جاتے لیکن اب قسمت نے یہ ذمے داری اور سعادت ہمیں سونپی ہے تو ہم اسے نبھائیں گے۔ میرا دل کہتا ہے کہ ہم اپنی منزل بہت جلد پا لیں گے۔'' سیر الامہ نے اسے دلاسہ دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اپنے تھکے ماندے جسموں کی طلب پر نیند کی وادی میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس رات سیر الامہ کے ذہن پر دلائی لامہ کی پیشگوئی اور اپنے اس سفر کی کامیابی کی سوچیں ہی قابض تھیں۔ اب یہ اتفاق تھا یا انسانی ذہن کے اس پیچیدہ ترین رازوں کی کارستانی۔ سیر الامہ نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ نیلے رنگ کا چوبی بدحال دروازہ' گلی کوچوں میں کھلتا ایک شریر تنہا بچہ اور شمالی جانب کاشت کار طبقہ پر مشتمل چھوٹی سی بستی' بہت حقیقی اور اپنی منزل کے قریب تر محسوس ہو رہی تھی۔ نیند سے بیداری کے بعد سیر الامہ کا دل ایک نئی تال پر دھڑکنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ منزل اب زیادہ دور نہیں۔

''تیار ہو جاؤ ساتھیو۔ قدرت ہم پر مہربان ہو گئی ہے۔ ہماری تلاش ختم ہونے ہی والی ہے۔ مجھے دکھائی دینے والا وہ

UUNOVELS.COM

خواب ایک الوہی رہنمائی ہے۔'' اس کے الفاظ نے دونوں ساتھیوں کو بھی نئے ولولے سے لبریز کردیا۔ وہ اس سفر کے لیے خود کو مزید توانا محسوس کرنے لگے۔

☆......☆

تبت کے شمال مشرقی صوبے ہمڈو کی بستی یختسر میں معمولات زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔

معاشی پسماندگی کے شکار افراد کی یہ بستی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھی۔ اس پہاڑی سے وادی کا نظارہ بہ آسانی کیا جاسکتا تھا۔ اسی وادی میں موگور خاندان سے تعلق رکھنے والا ایک کاشت کار گھرانے کے افراد ناشتے کے لیے فرشی دسترخوان پر بیٹھے تھے۔

''یہاں مجھے بیٹھنا ہے۔'' اس خاندان کے انتہائی کم عمر بچے لہاموں نے کہا۔ وہ معصوم صورت، شریر آنکھوں اور بے چین فطرت کا مالک تھا۔ نچلا بیٹھنا تو اسے آتا ہی نہیں تھا۔

''یہاں میری جگہ ہے بیٹا۔ تم بیٹھ کر کیا کرو گے؟'' اس کے والد چوکیونگ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی اپنے گھوڑے کی مالش کے بعد چارا کھلا کے آیا تھا۔ اس نے بھاری جرکم اور ڈھیلا ڈھالا مقامی لبادہ چُبا پہن رکھا تھا۔ بھیڑ کی اون سے بنا یہ لبادہ مقامی افراد میں بہت مقبول تھا۔ کمر پر ایک چوڑی پٹی سے سامنے والا حصہ باندھ دیا جاتا تھا۔

''نہیں، یہ آپ کی نہیں میری جگہ ہے۔ مجھے یہاں بیٹھنا ہے۔'' وہ بضد رہا۔

''لہاموں، بڑوں سے ایسے ضد، بحث نہیں کرتے بیٹا۔'' اس کی والدہ ڈیکائی سیرنگ نے فوراً نرمی سے ٹوکا۔

''اچھا! میں ضد نہیں کروں گا۔ پھر مجھے وہ کہانی سنا دیں۔'' لہاموں نے فوراً اگلی فرمائش جڑ دی۔

''اوہ نہیں۔ اب پھر سے وہ سب شروع نہیں کرنا۔ ہمارے کان پک گئے ہیں یہ کہانی سن سن کر لیکن یہ اکتاتا ہی نہیں۔'' اس کے چاروں بہن بھائیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ چوکیونگ اور ڈیکائی سیرنگ خوشدلی سے ہنس دیئے۔ لہاموں خفا نظروں سے سب کو دیکھنے لگا۔

''اب ناراض مت ہو۔ میں سنا دیتی ہوں تمہیں وہ کہانی۔'' لہاموں کی اٹھارہ سالہ بہن سیرنگ ڈولما نے کہا اور متوازن لہجہ میں گویا ہوئی۔ ''تمہاری پیدائش سے قبل ہمارے خاندان پر شدید غربت نے سایہ کر رکھا تھا۔ ہماری فصلیں برباد ہو جاتیں، مویشی کسی نہ کسی بیماری کا نشانہ بن کر زندگی کی

بازی ہار جاتے۔ یہ نقصان انسانی زندگیوں کی صورت میں بھی برداشت کرنا پڑا۔ ہمارے کئی بہن بھائی بھی موت نے چھین لیے۔ پھر قدرت نے تمہیں ہمارے پاس بھیجا۔ تم پیدائش سے ہی ایک غیر معمولی بچے تھے۔ عام بچوں کے برعکس تم روئے نہ چیخے۔ یہ ایک انوکھا امر تھا۔ رفتہ رفتہ علم ہوا کہ تم ہماری زندگی میں تبدیلی کی ایک خوشگوار لہر بن کر آئے ہو۔ ہماری فصلیں پیداوار دینے لگیں، جانوروں نے بچے جننے شروع کر دیئے اور دھیرے دھیرے ہم غربت کے دائرے سے نکل کر درمیانے درجے کے خوشحال کاشتکار بن گئے۔ انہی تبدیلیوں کی وجہ سے

عنقا

کتاب ربیع الابرار میں حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے ایک جانور پیدا کیا جس کا نام عنقا تھا۔ اس کے ہر دو جانب چار چار بازو تھے اور اس کا چہرہ انسان کے چہرے سے مشابہ تھا اور اس کو اللہ تعالیٰ نے ہر شے سے حصہ عطا کیا تھا یعنی اس جانور میں ہر جان دار کی مشابہت تھی۔ خاص طور سے پرندوں میں جو خصوصیات ہیں، وہ اس میں موجود تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا کہ میں نے دو پرندے عجیب و غریب پیدا کیے ہیں اور بیت المقدس کے ارد گرد جو جانور ہیں ان کو اس کا رزق قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس جوڑے سے عنقا کی نسل بڑھی۔ حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد یہ جانور نجد و حجاز کی جانب منتقل ہو گئے اور وہاں کے جنگلی جانوروں کو کھاتے رہے اور پھر جب اس جانور نے انسانوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا تو لوگ حضرت خالد بن السنان علیہ السلام (جو کہ زمانہ فترۃ میں نبی ہوئے ہیں) کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عنقا کی شکایت کی چنانچہ آپ نے اس کے لیے بددعا فرمائی جس کی وجہ سے اس جانور کی نسل منقطع ہو گئی اور دنیا میں اس کا وجود نہ رہا۔ اردو زبان میں لفظ ''عنقا'' نایاب ہی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس لفظ کی اصل وہی عنقا جانور ہے جس کی نسل اب ختم ہو چکی ہے۔

مرسلہ: اسرار عباسی۔ مری

UUNOVELS.COM

تمہارا نام لہاموو رکھا گیا۔ لہاموو کا مطلب جانتے ہو ناں؟ مددگار۔ محافظ۔" سپرنگ دولما نے کئی بار کی دہرائی گئی باتوں کا اعادہ کروایا۔ دیگر بہن بھائی بھی مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ چاکیونگ نے انہیں مناجات پڑھنے کا حکم دیا اور خود بھی آنکھیں بند کر کے زیر لب دعاؤں میں مشغول ہو گیا۔ ناشتے کے بعد وہ گھر سے باہر کھیلنے چل دیا۔ مختلف پتھر اکٹھے کرنا، کیڑے مکوڑوں پر غور کرنا اور ساتھیوں کے ہمراہ شرارتوں میں مگن رہنا اسے کافی مرغوب ہوتا تھا۔ سارا دن انہی سرگرمیوں میں بیت گیا۔ شام سے کچھ دیر پہلے ڈیکائی اسے گھر لے گئی۔

"مجھے لہاسا جانا ہے۔" لہاموو کی اچانک فرمائش نے ان سبھی کو حیران کر دیا۔

"اب یہ کیا نئی ضد ہے بھئی؟" اس کے بڑے بھائی تھپن چھگے نور نے کہا۔

"میں لہاسا جاؤں گا۔" لہاموو نے اپنی شرارتی آنکھیں گھماتے ہوئے ایک بار پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔

"ٹھیک ہے۔ وقت آنے پر ہم لہاسا بھی چلیں گے۔" چاکیونگ نے اسے محبت سے ٹالا۔ ڈیکائی نے رات کا کھانا لگانا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے انہیں چونکا دیا۔ چوکیونگ نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور اپنے ساتھ تین مہمانوں کو اندر لے آیا۔

"یہ مہمان مسافر ہیں۔ لہاسا سے آئے ہیں۔ آج رات ہمارے پاس ہی ٹھہریں گے۔" چوکیونگ نے انہیں مطلع کیا۔

"خوش آمدید معززین۔ تشریف لائیے۔ میں چائے کا بندوبست کرتی ہوں۔" ڈیکائی نے مخصوص انداز میں جھک کر انہیں تعظیم دیتے ہوئے کہا۔ لہاموو بھی پُرشوق نظروں سے ان کے لبادے، منفرد بھوری ٹوپیاں اور باوقار چہرے دیکھنے لگا۔ ان تینوں کو بھی اس بچے سے بے حد انسیت محسوس ہو رہی تھی۔ چائے پینے کے دوران لہاموو ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کی نگاہوں کا مرکز وہ خوب صورت مالا تھی جو سامنے بیٹھے اس شخص کے گلے میں حمائل تھی۔

"یہ میری ہے...... مجھے لینی ہے۔" لہاموو نے اچانک کہا۔

"یہ آپ کی ہے تو آپ ہی لے لو لیکن پہلے میرے ایک سوال کا جواب دینا ہوگا۔ بتاؤ بھلا۔ میں کون ہوں؟" اس کے سوال نے لہاموو کو تذبذب میں مبتلا کر دیا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے کھڑا اس کی نظروں میں جھانکتا رہا پھر کسی نامعلوم قوت کے زیر اثر کہنے لگا۔

"سیرالامہ! آپ سیرالامہ ہو۔" لہاموو کے اس جواب سے ان تینوں کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ چہروں پر یکدم ہی چمک پیدا ہو گئی تھی۔

"لہاموو بیٹا۔ مہمانوں کو اس طرح تنگ نہیں کرتے۔" ڈیکائی نے اسے نرمی سے سمجھایا۔ "چلو میرے ساتھ۔ سونے کا وقت ہو گیا ہے۔"

وہ مہمانوں سے معذرت کرتے ہوئے بیٹے کو اندرونی جانب لے گئی۔ سیرالامہ اپنے ساتھی لاماؤں کی طرف اُمید بھری چمکتی نظروں سے دیکھنے لگا۔ بچے کی شناخت کی پہلی نشانی پوری ہو گئی تھی۔

ڈیکائی سپرنگ نے بچے کے کپڑے تبدیل کر کے اسے سلا دیا۔ مہمانوں نے کھانا کھانے کے بعد اپنی آمد کا مقصد چوکیونگ کو بتا دیا۔

"کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟ ہمارا لہاموو دلائی لامہ کا نیا روپ ہے؟ مجھے تو یہ سب ایک خواب جیسا لگ رہا ہے۔" وہ بے یقین تھا۔

"یہ سب خواب ہی تو نہیں ہے۔ ہم بڑی کٹھن مسافت اور طویل ریاضت کے بعد یہاں پہنچے ہیں۔ تبت کے اگلے روحانی اور سیاسی پیشوا کی تلاش میں ہم نے کہاں کہاں خاک نہیں چھانی۔" سیرالامہ نے کہا۔

"کہیں آپ کو پہچاننے میں کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی؟" ڈیکائی نے اپنی خوشی اور جوش پر قابو پاتے ہوئے کسی خدشے کے تحت سوال کیا۔

"نہیں۔ سب نشانیاں وہی ہیں۔ بس ایک آخری امتحان باقی ہے۔ صبح وہ بھی لے لیا جائے گا۔" سیرالامہ کے اس جواب پر اہل خانہ کے چہرے خوشی اور خدشات کے متفرق جذبات کا عکس پیش کرنے لگے۔ اگلی صبح کے انتظار میں نیند بھی آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ لہاموو بیدار ہوتے ہی حسب سابق اچھلتا کودتا ہوا بستر سے اتر کر آیا تو بیرونی کمرے میں ایک میز پر مختلف اقسام کی اشیاء دھری دیکھ کر معصوم سے جوش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے میز کے عقب میں ہاتھ باندھے کھڑے اہل خانہ اور تینوں مہمان نظرانداز کر دیئے۔ اس کی نظریں ایک سو آٹھ دانوں پر مشتمل انجیر کی لکڑی سے بنی ایک مخصوص مالا پر تھی۔ لہاموو چند لمحوں کے لیے اس مالا کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا

UUNOVELS.COM

اور پھر بے اختیاری کے عالم میں اسے تھامتے ہوئے بولا۔ ’’یہ میری ہے۔‘‘

سیرالامہ کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس کے بعد لہامو نے تین مختلف النوع گھنٹیوں میں سے ایک مخصوص انداز کی گھنٹی تھام لی۔ ’’یہ بھی میری ہے۔‘‘

گھنٹی کے بعد اس کی توجہ دو چھڑیوں کی جانب ہوگئی۔ دونوں کا مختلف زاویوں سے اچھی طرح معائنہ کرلینے کے بعد اس نے ایک چھڑی منتخب کی اور وہی سہ حرفی فقرہ ایک بار پھر دہرا دیا۔ ان تینوں اشیاء کے بعد اس نے مختلف پیالوں کا معائنہ کیا اور اسی قوت کے زیر اثر ایک مخصوص پیالہ الگ کرلیا۔

’’یہ بھی میرا ہے۔‘‘ میز کے عقب میں کھڑے لاماؤں پر ہر انتخاب کے ساتھ شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ ان کی پُرشوق نظریں لہامو کو چمڑے کے ڈرم نما آلہ کی جانب متوجہ ہوتے دیکھنے لگیں۔ اس ڈرم کے دونوں جانب مختصر رسی کے اختتام پر موتی بندھے تھے۔ لاماؤں کے دل سے دعائیہ کلمات برآمد ہو رہے تھے کہ لہامو ان میں سے Damaru کا انتخاب ہی کرے۔ لہامو نے بھی انہیں مایوس نہیں کیا اور ان کی سماعت میں رس گھولتے ہوئے کہا۔ ’’یہ بھی میرا ہے۔‘‘ لاماؤں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمکنے لگے۔ اس نے ہر اس شے پر ہاتھ رکھا تھا جو تیرہویں دلائی لامہ کے زیر استعمال رہی تھی۔ وہ مسرت، جوش اور بے پناہ مذہبی عقیدت سے ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے جھک گئے۔

’’کندن! آپ ہمارے دلائی لامہ ہیں۔ اوپر والے نے ہماری سن لی۔ ہماری تلاش کامیاب ہوگئی۔‘‘ سیرالامہ کی آواز کپکپا رہی تھی۔

لہامو حیرت اور ناسمجھی سے انہیں دیکھتا رہا۔ اسے ان کے ناقابل فہم اعمال سمجھنے سے زیادہ دلچسپی ان سبھی اشیاء میں تھی جسے تھامنے اور استعمال کرنے میں کسی نے بھی اسے نہ روکا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کی زندگی کا دھارا تبدیل ہونے والا ہے۔ تینوں لاماؤں نے چوکیونگ اور اہل خانہ سے تکریم و عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے واپسی کی اجازت لی۔ لہامو تھونڈپ کو ایک مخصوص ڈولی نما سواری میں بٹھا دیا گیا۔ اس کا سنہری لبادہ اور ٹوپی ہر ایک کی نظروں میں عقیدت و احترام پیدا کرنے لگی۔ اس قافلے میں سواری سے آگے دو افراد شہنائی بجا رہے تھے۔ سنہری دھات پر مشتمل گول پلیٹوں کی موسیقی ماحول کو عجیب حدت آمیز لطف فراہم کر رہی تھی۔ لہامو کے لیے یہ سب بہت انوکھا اور سنسنی خیز تھا۔ اسے

سوانحی خاکہ

پیدائشی نام: لہامو تھونڈپ

تاریخ پیدائش: 6 جولائی۔ 1935

موجودہ رہائش: دھرم شالہ

مادر علمی: جامعہ ملبورن، برٹش کولمبیا یونیورسٹی۔

پیشہ: بھکشو لاما، سیاستدان۔

پیشہ وارانہ زبان: تبتی، انگریزی۔

☆☆☆

دلائی لامہ نے روحانی موضوعات پر بہت سی کتابیں بھی تصنیف کر رکھی ہیں اور ہر کتاب 'بیسٹ سیلر' ثابت ہوئی۔

☆ مسرت کا فن ☆ نئی ہزاری کی اخلاقیات

☆ طریق سادہ ☆ بامعنی زندگی

☆ جلاوطنی میں آزادی (آپ بیتی) ☆ کھلا دل

☆ مہامدرا کی گیلوک روایت ☆ معافی کی حکمت

☆ ہمدردی ☆ میرا تبت

والدین نے بڑی محبت اور جوش و جذبہ سے ان تین مہمانوں کے ساتھ روانہ کیا تھا جو اس وقت قافلے کی رہنمائی کر رہے تھے۔ اس ڈولی نما سواری کی حرکت پر جھولتے وہ سرور کے عالم میں اردگرد کے مناظر کو دیکھنے لگا۔ اس نے پوتالہ محل کا نام بارہا سنا تھا۔ اپنی اس نئی منزل کے متعلق اسے رتی بھر علم تھا نہ ہی یہ اندازہ تھا کہ بدھ مت کی تاریخ میں اس کا نام امر ہونے والا ہے۔

☆......☆

لہامو تھونڈپ کی نئی منزل لہاسا تھی۔

دریائے لہاسا (کی چو) کے کنارے واقع لہاسا کوہ ہمالیہ میں سطح سمندر سے 3683 میٹر کی بلندی پر واقع تھا۔ صدیوں تک بیرونی دنیا سے کٹے رہنے کے باعث چند ایک سیاحوں، مشنریوں اور مہم جو دریافت کنندگان کے سوا شاذ ہی کوئی فرد یہاں آیا تھا۔ لہاسا کے لغوی معنی دیوتاؤں کی نگری کے ہیں۔ قدیم تبتی مخطوطوں میں اس کا قدیم نام 'راسا' (معنی: بکریوں کا باڑہ) درج تھا۔ ابتدائی طور پر شہنشاہ سونگتسن گامپو نے اس مقام پر ایک چھوٹا معبد تعمیر کروایا تھا۔ 1652 میں پانچویں دلائی لامہ نے مانچو شہنشاہ شن زی سے ملاقات کے بعد لہاسا میں پوتالہ محل تعمیر کروا دیا۔

UUNOVELS.COM

پوٹالہ محل مارپوری پر تعمیر کیا گیا تھا۔ مارپوری کو مقامی زبان میں سرخ پہاڑ بھی کہا جاتا ہے۔ تبتی فن تعمیر کا شاہکار یہ مقام تبتیوں کے لیے مذہبی لحاظ سے ناگزیر اہمیت کا حامل تھا۔ لفظ پوٹالہ کا ماخذ سنسکرت زبان ہے۔ سنسکرت حروف پولا تا کا سے بنے اس لفظ کا مطلب بودھی استواؤ کی رہائش گاہ ہے۔ (تبتی بدھ مت ماننے والوں کا عقیدہ ہے کہ دلائی لاما اولوک تیسور کا انسانی روپ ہوتا ہے)

پوٹالہ محل کی اونچائی 117 میٹر اور چوڑائی 360 میٹر' 30 سیڑھیاں اور ایک ہزار کمرے تھے۔ مختلف نمایاں مقامات پر گوتم بدھ کا مجسمہ اور سابقہ تیرہ دلائی لاماؤں کی تصویریں نصب کی گئی تھیں۔ اس محل کے دو حصے تھے۔ اندرونی حصہ سرخ محل کہلاتا۔ اس میں لاماؤں کی اجتماع گاہ' معبد' ایک سو کے قریب خانقاہیں' بدھ مت کی تعلیمات کے مخطوطوں اور کتابوں پر مشتمل کتب خانے بھی موجود تھے۔ لہامو کے لیے دنیا ابھی تک صرف ہیمڈ بستی کے پہاڑوں' گلی کوچوں' جانوروں اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ اور تنہا کھیل کود تک محدود تھی لیکن یہاں تو زندگی کا مطلب ہی تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ حیران نظروں سے سب کچھ دیکھتا رہتا۔ یہاں ہم عمر ساتھیوں کی بجائے لاما اور بھکشو تھے جو مخصوص انداز میں آسن بنا کر آنکھیں بند کیے عبادات میں مشغول رہتے۔ نئے نام کندن سے آشنا ہونا بھی آسان بہرحال نہیں تھا۔ نئے دلائی لامہ کی حیثیت سے شناخت کیے جانے کے بعد ہی اس کا سابقہ نام ختم ہو گیا تھا۔ اسے "چیتن جیتسل نگاوانگ لوبسینگ یشے تینزین گیاتسو" نامی نئی شناخت میسر آ گئی تھی۔ اس تبتی نام کا مطلب مقدس دیوتا' عالی مرتبت' مہربان و کریم' مذہب کا محافظ اور دانش و حکمت کا سمندر شمار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ یشے نوربو (مرادیں پوری کرنے والا موتی) اور کندن (موجودگی) بھی کہا جاتا۔

تینزین گیاتسو اس مذہبی ماحول اور سرگرمیوں کو حیرت و تجسس سے دیکھا کرتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ عبادت کے لیے بیٹھے افراد میں سے ہی کسی کے زانو پر سر رکھے سو جاتا۔ ایسی صورت حال میں کوئی نہ کوئی شخص اسے گود میں اٹھا کر بستر پر چھوڑ آتا۔ تینزین گیاتسو کو بڑی محبت اور توجہ سے ادب و آداب اور بدھ متی ماحول سے آشنا کروایا جانے لگا۔ چھ سال کی عمر میں تعلیم و تربیت کا آغاز ہو گیا۔ اسے یہ نئی ذمہ داریاں افسردہ کر رہی تھیں۔ ہیمڈ' والدین' گھر اور بہن بھائیوں کی یاد بھی ستایا کرتی۔ اساتذہ سے اس کی یہ کیفیت بھلا کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ انہوں نے باقاعدہ حکمت عملی' محبت اور شفقت سے اس کی نفسیات کو قابو میں لیتے ہوئے بدھ مت سے وابستہ تاریخی حقائق اور دیومالائی کہانیاں گوش گزار کرنی شروع کیں۔ اسے نہایت سہل انداز میں تبتی ثقافت اور تہذیب سے روشناس کرایا جانے لگا۔ اسے بتایا گیا کہ تبت دو قدیم تہذیبوں چین اور ہندوستان کے درمیان واقع ایک بے مثال خطہ ہے لیکن دور افتادہ سطح مرتفع پر واقع ہونے کے باعث یہ دونوں ہی تہذیبوں سے منقطع اور الگ تھلگ ہے۔ تبت درحقیقت دنیا کی چھت ہے مگر یہ بات واضح نہیں تھی کہ تبتی قوم اصلاً وسطی ایشیا سے تعلق رکھتے تھے یا مشرقی ایشیا سے۔ البتہ یہ حقیقت بالکل شفاف تھی کہ تبتیوں' چینیوں اور برمیوں کا لسانی ورثہ مشترک تھا۔ یہ تینوں زبانیں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ تبت کی قدیم تہذیب زانگ زنگ کہلاتی تھی۔

تینزین گیاتسو ان حقائق سے زیادہ اپنی تہذیب سے وابستہ دیومالائی قصے سن کر مسحور ہوا۔ اسے بتایا گیا کہ تبت کے پہلے بادشاہ گنیا کر بیتسان پو کا نزول آسمان سے ہوا تھا (اس بارے میں متضاد آراء موجود ہیں۔ گنیا کر بیتسان پو کے خدوخال منفرد تھے۔ وہ ہندوستان سے تبت آیا تھا۔ انہی خدوخال کی وجہ سے مقامی باشندوں نے اسے دیوتا کا درجہ دیا تھا) وہ ایک رسی کے ذریعے آسمان سے اپنا تعلق برقرار رکھے ہوئے تھا۔ دنیا میں مخصوص وقت گزار لینے کے بعد اس نے آسمان پر واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دیومالائی حیثیت کے ہی حامل بادشاہ ڈریگم برتسان پو نے اپنے ایک بیٹے کو اس کے ساتھ جنگ کے لیے بھیجا۔ اسی لڑائی کے دوران آسمانی رسی کٹنے سے گنیا مارا گیا۔ تینزین گیاتسو کے لیے ان سب مناظر کو پردہ تصور پر لہراتے دیکھنا بہت انوکھا تجربہ تھا۔

اس کے بعد اسے ایک اور حقیقت سے آگاہ کیا گیا کہ تبتی قوم ایک چڑیل اور بندر کے ملاپ سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کے عقیدے کے مطابق تبتی زبان میں سپیان رس گزیگر کہلائے جانے والے دیوتا اولوک تیسور نے بندر جب کہ گرول کہلائی جانے والی دیوی تارا نے چڑیل کا روپ دھارا تھا۔ تبتیوں کا مذہب بون تھا۔ دھیرے دھیرے بدھ مت کی تعلیمات کسانوں اور قبائلیوں سے لے کر جنگجوؤں تک کی زندگیوں میں سرایت کرتی گئیں۔ اس کے بعد اسے دلائی لامہ کے منصب کی حیثیت باور کروائی گئی۔ تبتی زبان میں اس کا تلفظ تلائی بلاما تھا۔ لفظ دلائی کا مطلب سمندر اور لاما کا مفہوم

UUNOVELS.COM

گرو یا استاد تھا۔ تبتی بدھ مت کے پیروکاروں کے مطابق اس خطاب کا حامل انسان دانش، علم، حکمت اور دانائی کا سمندر ہوا کرتا ہے۔ یہ خطاب سب سے پہلے منگول شہنشاہ التائی خان نے تیسرے دلائی لامہ کو دیا تھا۔ اس کے بعد یہ خطاب بھی پیش روؤں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ تینزن گیاتسو کو اپنی ذات کے لیے گیاوار پنوچے (بیش قیمت فاتح) اور لیش نوربو (دانش کا موتی) جیسے خطابات نے رفتہ رفتہ تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ اسے فطری طور پر ایک سنجیدہ ذمہ داری اور لگن کا احساس ہونے لگا۔ اگلے چند سال میں ابتدائی افسردگی، گھر اور آبائی شہر کی یاد ماند پڑ گئی۔ پوٹالہ محل کی رہائش، تعلیم گیان اور اپنی ذات سے وابستہ اہمیت کا احساس غیر محسوس طریقہ سے حاوی ہونے لگا۔

تعلیم و تربیت کا یہ سلسلہ دھیرے دھیرے دراز ہو رہا تھا۔ مذہبی علوم کے بعد یہ دائرہ علم فلکیات اور عالمی نقشہ کی پڑھائی تک پھیل گیا۔ تبت کی سرحدوں سے پرے جھانکنے اور معلومات ذہن نشین کرنے کا عمل اس کی دلچسپی سوا کرنے لگا۔ اسی دوران اسے علم ہوا کہ ساتویں صدی سے گیارہویں صدی تک تبت پر ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والے بادشاہ حکمران رہے تھے۔ اس سلطنت کی سرحدیں کچھ زمانوں تک جنوب میں بنگال اور شمال میں منگولیا تک وسیع رہیں۔ تبت بنیادی طور پر امن پسند اور صلح جو خطہ تھا تاہم انہیں آغاز ہی سے چین سے خطرہ تھا۔ دوسری جانب چین بھی تبت کی جغرافیائی حدود چین کے لیے ہمیشہ ہی سے خطرہ رہیں۔ کوہ ہمالیہ ہندوستان کو سطح مرتفع تبت سے الگ کرتا تھا جس کی بدولت اہل تبت کو ہندوستان سے کبھی کوئی خطرہ نہیں رہا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہندوستان کے لیے فطری طور پر اپنے دلوں میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ بادشاہ گنیا کی ہندوستان آمد کے باعث بھی ان کی انسیت اور اعتماد اس خطہ کے لیے نسبتاً زیادہ تھا۔ اس وقت بھی تینزن گیاتسو کے دل میں چین کے لیے جاری رہنے والی کشمکش کے متعلق کئی سوال پیدا ہوئے۔ ان حقائق سے شناسائی حاصل کرنے کا وقت تو نہیں آیا تھا البتہ اس کے امتحانات کا موسم ضرور طلوع ہو گیا تھا۔

☆......☆

امتحانات میں نمایاں کامیابی کے بعد اس نے اپنے اساتذہ اور اعلیٰ منتظمین کے دلوں میں اُمید کی مزید کئی شمعیں روشن کر دیں۔ کچھ سال مزید آگے سرکے تو اس کا ذہنی افق وسیع تر ہونے لگا۔ اب وہ ہر ایک حالیہ معاملہ اور ماضی کے حقائق پر غور و فکر کرنے لگا تھا۔ چین کے ساتھ کشیدہ تعلقات ذہن کے کواڑوں پر متواتر دستک دیا کرتے تھے۔ اس روز بھی وہ اپنے ایک معاون خاص کے ساتھ محل کی چھت پر منڈیر سے ہاتھ ٹکائے کھڑا تھا۔ اس کے سامنے تا حد نگاہ تبت کی پتھریلی دھول اڑاتی راہگزریں تھیں۔ بظاہر اس کی نظریں انہی رستوں اور زمینی نقوش میں الجھی دکھائی دے رہی تھیں لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ اس کی ذہنی پرواز ان تبتی سرحدوں سے دوسری جانب چین کی طرف بھٹک رہی تھی۔ اسے زیر تربیت دلائی لامہ کی حیثیت سے محل میں رہتے ہوئے دس سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ اس نے تربیت کے مرحلے زبانی یا عملی امتحان میں اپنے اساتذہ کو مایوس نہیں کیا تھا۔ تعلیم و تربیت کا یہ سلسلہ نہایت کامیاب اور ہموار انداز سے جاری تھا۔ ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے اس کے ذہن میں چین سے دیرینہ چپقلش اور بد اعتمادی کے متعلق سوالات جوں کے توں برقرار تھے۔

”کیا سوچ رہے ہیں کندن؟“ معاون خاص نے بڑی محبت و عقیدت سے اسے مخاطب کیا۔

”پڑوسیوں کے متعلق سوچ رہا ہوں فالا۔“ تینزن گیاتسو نے جواب دیا۔ فالا پینتالیس برس سے متجاوز قدرے گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے ہمہ وقت ایک عزم، وطن پرستی اور مذہب کی حفاظت کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ جھلکتا رہتا۔ گیاتسو اس کے رویے اور منصب کے باعث فالا کا بہت قدردان تھا اور اس کی رائے کا بے حد احترام بھی کرتا۔

”چین ہمارے لیے آغاز ہی سے ایک خطرہ رہا ہے، کندن اور آثار بتاتے ہیں کہ مستقبل میں بھی یہ کشمکش جاری رہے گی۔“

”لیکن ایسا کیوں ہے فالا؟ میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ مجھے اس بارے میں مکمل معلومات حاصل ہوں۔“

”آپ درست کہہ رہے ہیں کندن۔ آپ کو تو سب معلوم ہونا چاہیے۔ تاریخ کا یہ سفر اور اس کے مختلف پڑاؤ جس قدر میرے علم میں ہیں آپ کو ایمانداری اور سہل انداز سے بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ وہ خیالات مجتمع کرنے کے لیے خاموش ہوا اور قدرے توقف سے کہنے لگا۔ ”تاریخ کا یہ سفر بہت قدیم ہے کندن۔ کئی حقائق وقت کی گرد میں دب کر اپنے اصل نقوش کھو چکے ہیں۔ کئی باتیں وطن پرستی کی دھند میں تبدیل ہوئی ہیں۔ یہ صدیوں کی مسافت ہے۔ کچھ میرے علم میں ہے اور کچھ سے میں بھی ناواقف ہوں۔ 634 میں ایک

UUNOVELS.COM

تبتی سفارت چین گئی تھی۔ تبتی بادشاہ نے اپنے لیے کسی چینی شہزادی کا رشتہ طلب کیا تھا۔ درخواست رد ہونے پر اس نے اگلے برس چین پر حملہ کر کے تبتی سرحد کے قریب بسنے والی 'اژا' قوم کو شکست دے دی۔ اس خطہ کی اہمیت یہ تھی کہ تبت کے شمال مشرقی سرے پر جھیل کوکونور کے کنارے آباد ہونے کے باعث چین جانے والی اہم تجارتی راستوں کی نگہبان تھی۔ اس فتح کے بعد چینی شہنشاہ کے پاس انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ اس نے شہزادی کو سونگتسن گامپو کی زوجیت میں دینے کا فیصلہ کرلیا۔ 640 میں چینی شہزادی وین چینگ کو سونگتسن گامپو سے شادی کے لیے شاہی لاؤ لشکر کے ساتھ روانہ کردیا گیا۔ وہ ایک سال کے سفر کے بعد اپنی منزل پر پہنچی۔ اس کے بعد سونگتسن کے پورے دور حکمرانی میں چین اور تبت میں مکمل امن قائم رہا۔ سونگتسن گامپو کی وفات 650 میں ہوئی۔ اس کا تخت نشین شیر خوار پوتا کریسونگ سلون بنا تاہم حقیقی اقتدار وزیر مگار سرونگ رتسان کے پاس رہا۔ مگار نے اژا پر حملہ کر کے اس خطہ پر مکمل قبضہ کیا اور اسے تبتی سلطنت کا حصہ بنادیا۔ وزیر مگار زیادہ عرصہ حیات نہ رہ سکا۔ اس کی وفات 667 میں ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب تبتیوں نے کوتانوں کو شکست دی تھی۔ اسی دور میں بادشاہ کریسونگ نے کریمالود نامی عورت سے شادی کرلی۔ کریمالود تبتی تاریخ میں بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ 677 میں شہزادہ کریدس رونگ رتسان کی پیدائش ہوئی اور اسی سال بادشاہ کی وفات کے بعد ژانگ ژنگ نے بغاوت کردی۔ کریدس رونگ رتسان کے پس پردہ کریمالود اور مگار خاندان کی مشترکہ حکومت تھی۔ وزیر البتہ بشرط حیات تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ 692 میں چین تبت کے علاقے تاریم پر قابض ہوگیا۔ چار سال بعد وزیر مگار کریبرنگ نے شکست کا بدلہ چکا کر چین سے امن کا معاہدہ کرلیا۔ شہزادہ کریدس سرونگ رتسان کو مگار خاندان کی یہ من مانیاں اور اثر و رسوخ کھلنے لگا۔ اس نے مگاریوں کے دو سو افراد کو شکار کے بہانے اکٹھا کر کے قتل کروادیا۔ وزیر مگار کریبرنگ نے اس سانحے کے دباؤ سے خودکشی کرلی اور ردعمل کے طور پر سرحد کے سبھی وفادار فوجی چینیوں سے مل گئے۔ بادشاہ کریدس اپنی وفات (704) تک وسطی تبت سے دور شمال مشرق میں عسکری مہمات میں مصروف رہا۔ اس کی غیر موجودگی میں نظام حکومت کریمالود ہی چلاتی تھی۔ 702 میں ایک بار پھر تبت اور چین میں معاہدہ امن قائم ہوا۔ 710 سے اگلی دہائی بہت اہم رہی۔ اس دوران عرب اور ترک اس خطہ میں وارد ہوئے تھے۔ اہل تبت نے عربوں اور مشرقی ترکوں سے اتحاد کو ترجیح دی۔ تبت اور چین کی عسکری کشمکش بھی 720 کی دہائی کے اواخر تک وقتاً فوقتاً جاری رہی۔ ابتدا میں تبتی ترکوں کی مدد سے چین پر حاوی رہے لیکن بعدازاں شکست کا آسیب ان پر حاوی ہوگیا۔ 730 میں جنوبی چین میں ایک بہت بڑی بغاوت ہوئی۔ تبتیوں نے چینیوں کو ایک بار پھر شکست دے دی۔ اس واقعہ کے بعد دونوں اقوام میں دوبارہ امن کی فضا قائم ہوگئی۔

یہ معاہدہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ چند سال بعد ہی 734 میں تبت نے اپنی ایک شہزادی دردمالون کی شادی قاغان ترک سے کردی۔ چینیوں کی صفوں میں اس امن کی فضا نے کھلبلی تو مچائی ہی تھی۔ وہ ترک اور تبت کی اس رشتہ داری سے ہونے والے الحاق پر نچلے نہ بیٹھ سکے۔ انہوں نے ترکوں پر حملہ کرنے کے لیے عربوں سے اتحاد کرلیا۔ قسمت کی یاوری سے وہ ترکوں پر فتح یاب بھی رہے۔ ان کے ساتھ امن کا معاہدہ کرنے کے بعد چین نے تبت پر دھاوا بول دیا۔ مغرب میں مستحکم ہونے کے باوجود مشرقی محاذ پر تبت کو شکست کھانا پڑی۔ انہی دنوں ترک سلطنت کو داخلی مسائل کا بھی سامنا تھا۔ یہ سلطنت بہت جلد منہدم ہوگئی۔ 750 تک چینیوں نے وسطی ایشیا کے تقریباً سبھی علاقے تبت سے آزاد کروالیے۔ اگلے سال چینی عرب اتحاد کا خاتمہ ہوتے ہی دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ چینی عربوں سے تو یہ جنگ ہار گئے لیکن تبتیوں سے انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ سکون سے بیت گیا۔ 758 تک چین اندرونی شورشوں کی وجہ سے کافی کمزور ہوچکا تھا۔ اگلے چھ برس میں تبت نے نہ صرف اپنے تمام علاقے واپس حاصل کرلیے بلکہ چین کے اس وقت کے دارالحکومت چانگ آن پر بھی پندرہ روز تک قابض رہے۔ اس دوران تبتیوں نے ایک بادشاہ کی نامزدگی بھی کردی۔ حملوں، دفاع، جنگوں، خونریزی اور امن کے معاہدوں کا یہ کھیل تیرہویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔ منگول حملوں کی داستان بھی ایک الگ ہی باب ہے۔ مختصراً اس کے سوا اور کیا کہوں کہ چین اور تبت نے کبھی ایک دوسرے کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ ان دونوں کو ہی غلبہ اور طاقت درکار ہے۔'' فالا اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

''آپ کی معلومات قابل رشک ہیں فالا۔ اب مجھے چین اور تبت کی یہ ٹسل سمجھ آنے لگی ہے۔'' تینزین گیاتسو نے فالا کے لحاتی توقف پر اپنا تجزیہ بیان کیا۔

''یہ قومی اور بین الاقوامی سیاست بہت جلد آپ کی عملی زندگی کا حصہ بن جائے گی کندن۔ آپ کے علم میں یہ سب کچھ

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

لانا تبت کی سلامتی کے لیے بے حد ضروری ہے۔'' اس نے تعظیمی انداز میں جواب دیا۔

''مجھے اس خطہ میں یورپی سیاحوں کے بارے میں بھی جاننا ہے فالا۔ یورپ اور انگریزوں کا ہمارے ہمسایہ ممالک پر بہت اثر ورسوخ ہے۔ مجھے ان کے بارے میں بھی تو کچھ بتایئے۔'' گیاتسو نے اپنے مزید تشنہ سوالوں کا جواب طلب کیا۔

''اہل یورپ کے بارے میں میری ذاتی رائے اچھی نہیں ہے کندن۔ میں ایماندارانہ تجزیہ کروں تو ان میں مقتدر لوگوں کو بھیڑیے سے زیادہ سفاک لومڑی سے زیادہ مکار اور بے حد و بے حساب مطلب پرست پایا ہے۔ ان کی تبت میں اوّلین آمد عزت مآب پانچویں دلائی لامہ کے دور میں ہوئی تھی۔ نووارد دین دو جیسوٹ مشنری جوہانس گربر اور البرٹ ڈی اوردل تھے۔ وہ 1661 میں لہاسا آئے تھے۔ انہوں نے دلائی لامہ کو ایک ایسا شیطان صفت دیوتا قرار دیا جو اپنی اطاعت نہ کرنے والوں کو قتل کروا دیتا ہے۔'' فالا کے چہرے پر یہ سب دہراتے ہوئے ضبط کی سرخی چھا گئی۔

''کیا یہ مشنری اپنی آمد کے اصل مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے؟''

''نہیں کندن۔ دونوں مشنری کسی ایک تبتی کو بھی عیسائیت کی طرف مائل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ان کے بعد بھی ایسے بہت سے افراد آنکھوں میں یہی خواب سجائے تبت آتے رہے لیکن کامیابی کسی کا بھی مقدر نہ بنی اور بالآخر 1745 میں ان سب کو تبت بدر کر دیا گیا۔ چھٹے دلائی لامہ کو دنیاوی معاملات سے عدم دلچسپی کی وجہ سے اپنا منصب چھوڑنا پڑا۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز تک چین نے لہاسا میں 'امبان' کہلانے والے منتظمین کے ذریعہ اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔ تبتیوں نے مزاحمت کی روایت نبھاتے ہوئے 1750 میں امبانوں کا قتل عام کر کے چین کے خلاف بغاوت تو کی لیکن یہ بغاوت فرو کر دی گئی۔ وہ وقت بہت کٹھن تھا۔ اہل تبت نفسیاتی طور پر چین سے مغلوب ہو کر خود کو ان کے رعایا تسلیم کرنے لگے لیکن اس موقع پر چین نے تبت پر براہِ راست حکومت کو ترجیح نہ دی۔ تبتی حکومت دلائی لامہ کی مرکزی حیثیت کے ساتھ قائم رہی اور اہل تبت کی اپنے روزمرہ معاملات میں آزاد حیثیت برقرار رہی، پھر آیا 1788 کا وہ دور جب گورکھا بادشاہ پرتھوی نارائن نے نیپال کی سرحدوں کو توسیع دینے کی غرض سے تبت پر حملہ کر دیا۔ تبتی گورکھوں کے مقابلے میں کمزور تھے اس لیے چنگ فوج کو مدد کے لیے بلانا پڑا۔ اس متحدہ فوج نے گورکھوں پر فتح پا کر نیپال پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد نیپال چنگ سلطنت کی باجگذار کی حیثیت اختیار کر گیا۔ یہ حملہ انگریزوں کی انا اور اقتدار پرستی پر گہری ضرب ثابت ہوا۔ وہ نیپال کو اپنی جاگیر تصور کرتے تھے چنانچہ انہوں نے بھرپور جوابی حملہ کر کے تبتیوں کو نیپال سے پسپا کر دیا۔ تبت نے جواب میں اپنی سرحدوں پر سخت پہرا لگا کر کسی بھی غیر ملکی کے ملک میں داخل ہونے پر پابندی لگا دی۔ اسی دور سے اسے رہبانی سلطنت کہا جاتا ہے۔ پوری انیسویں صدی میں صرف چند ایک غیر ملکیوں نے ہی لہاسا کی سیاحت کی ہو گی۔''

''ایک بات کہوں فالا۔ میں نے انگریزوں کا کردار ہمیشہ مشکوک ہی پایا ہے۔ یہ کسی بھی خطہ سے اتنی جلدی دست بردار تو ہوتے نہیں۔ تبت کا یہ جوابی قدم انہوں نے بھلا کیسے برداشت کر لیا؟ آخر کوئی تو درمیانی راہ نکالی ہی ہو گی۔'' گیاتسو نے پوچھا۔

''آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے کندن۔ میں گفتگو کا رخ اسی طرف موڑ رہا تھا۔'' فالا کو اس کی باریک بینی سے خوشی ہوئی۔ ''یہ بات ہے اس وقت کی جب انیسویں صدی کے دوران چنگ خاندان کے زیر حکمرانی چین کمزور ہو چکا تھا۔ ہندوستان پر قابض انگریزوں کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ انہوں نے یورپیوں کی بجائے اہلِ برصغیر کو تبت بھیجنا شروع کر دیا۔ اہل تبت کے دلوں میں اہلِ برصغیر کے لیے ہمیشہ ہی نرم گوشہ رہا ہے۔ وہ ان پر شک نہیں کر سکتے تھے۔ انگریزوں کے بھیجے گئے یہ مخبر تاجروں اور سیاحوں کے روپ میں یہاں آنے جانے لگے۔ وہ گریٹ گیم کا زمانہ تھا۔ انگریز اس بات سے خائف تھے کہ تبت کہیں روس کے قبضے میں نہ چلا جائے۔ اس عرصہ میں روس تبت کے شمال اور مغرب میں ترکستان کے خطے میں اپنے پاؤں پھیلا رہا تھا۔ بہرحال چین اور تبت نے انگریزوں کے ساتھ معاہدوں کے مطالبات رد کر دیے۔ 1904ء میں انگریزوں نے لیفٹیننٹ کرنل فرانسس ینگ ہزبینڈ کی کمان میں فوج بھیج دی۔ تبت کا ناکافی اسلحہ اور انگریزوں کی نسبت غیر پیشہ وارانہ فوج اس یلغار کا سامنا کر سکی اور انگریز لہاسا پر اپنے پنجے گاڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمیں سب سے زیادہ فکر اپنے دلائی لامہ کی حفاظت کی تھی۔ تیرہویں دلائی لامہ تبت کے اتحاد اور جذباتی تحریک کی آخری امید تھے۔ انہیں انگریزوں کے شر سے بچانے کے لیے منگولیا روپوش

UUNOVELS.COM

کروانا پڑا۔ لہاسا انتظامیہ نہایت بے بس ہو چکی تھی۔ وہ انگریزوں کے اس مطالبہ پر بالکل مزاحمت نہ کر سکے کہ تبت کی سرحدیں برٹش انڈیا پر کھلی رہیں گی۔ اس کے نتیجہ میں ہندوستانی اور انگریز تاجر آزادانہ طور پر تبت آنے جانے لگے۔ ہندوستان کے ساتھ تجارت پر کسٹم ڈیوٹی ختم کر دی گئی اور انگریزوں کی منظوری کے بغیر کسی بھی غیر ملکی طاقت کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے کی اجازت ہی نہ تھی۔ 1906ء میں چین کے ساتھ کیے جانے والے ایک معاہدے میں بھی انہی شرائط کو منوایا گیا۔ اگلے برس برطانیہ، چین اور روس میں ایک معاہدہ استوار ہوا جس میں چین کو تبت کا حکمران تسلیم کر لیا گیا۔ 1910ء میں چین نے تبت پر پہلی بار اپنا براہِ راست اقتدار قائم کرنے کے لیے ایک عسکری مہم بھیج دی۔ دلائی لاما کو بچاؤ کے لیے روپوش ہو کر ہندوستان جانا پڑا۔ یہ مہم اس وقت اپنی موت خود مری جب 1911ء میں چین سے صدیوں پرانے شاہی نظام کو ختم کر کے ایک زبردست انقلاب کے نتیجہ میں اسے عوامی جمہوریہ چین نامزد کر دیا گیا۔ چینی فوج تبت سے واپس بلائی گئی تو دلائی لامہ بھی لہاسا لوٹ آئے۔ 1913ء میں تبت اور منگولیا نے چین سے آزادی کا اعلان کر کے ایک دوسرے کو آزاد ممالک کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ اب تبت ایک خود مختار ملک تھا۔ 1914ء میں شملہ کنونشن ہوا جس میں چینی، تبتی اور برطانوی نمائندوں نے ایک نیا معاہدہ مرتب کیا۔ تبتیوں اور انگریزوں نے ایک خفیہ معاہدہ بھی کر لیا جس کے مطابق تبت کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا گیا مگر چینی نمائندے نے معاہدے پر دستخط سے انکار کر دیا۔ اس انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہندوستان اور تبت میں میک ماہن لائن نامی سرحد قائم کر دی گئی۔ یہی میک ماہن لائن چین اور ہندوستان میں بھی لائن آف کنٹرول ہے۔'' فالا نے تاریخ کی ایک طویل مسافت کا اختتام کیا۔

''تو ثابت یہ ہوا کہ چین نے آج تک تبت کی خود مختار حیثیت تسلیم نہیں کی اور مستقبل میں بھی ہماری سلامتی اور بقاء کے لیے خطرہ بنا رہے گا۔'' گیاتسو نے بوجھل سانس لی۔

''آپ نے درست کہا کندن۔ اس وقت تو یہ خطرہ اور بھی زیادہ ہے۔ آپ کی تعلیم مکمل ہونے تک تبت کے سربراہ کی گدی خالی ہے۔ قوم اپنے سربراہ سے محروم ہو تو ان میں دفاع اور مزاحمت کا جذبہ گرمجوشی کی مخصوص انتہا تک نہیں پہنچ پاتا۔ تبتی عوام دلائی لامہ سے بے حد عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ وہ آپ کے لیے اور آپ کے کہنے پر کسی بھی مقصد کے لیے اپنی جان تک لڑا دیں گے۔'' فالا نے ایک اور حقیقت بیان کی۔

''میری تو خواہش ہے کہ ایسی کوئی نوبت ہی نہ آئے۔ ہم امن و آشتی سے اپنی سرزمین میں اور چین اپنی زمینی حدود میں اپنے عقائد و نظریات کے مطابق زندگیاں بسر کرتے رہیں۔'' فالا کندن کی اس بات پر اثباتی جنبش کے سوا کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

☆......☆

بین الاقوامی سیاست اور حالات سے اس واقفیت کے بعد تینزن گیاتسو کی سنجیدگی اور احساس ذمہ داری میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ تندہی سے اپنی تعلیم مکمل کرنے میں جت گیا۔ ذہانت، لگن اور خلوص نیت اس کے لیے زادِراہ تھے۔ ان کٹھن، محنت طلب اور پُرمشقت معمولات زندگی میں خوشگواریت اور اعصابی فرحت کی لہریں اس وقت پیدا ہوتی تھیں جب ایمڈو سے ڈیکائی اسپرنگ اس سے ملاقات کے لیے آیا کرتی۔ چوکیونگ کے حالیہ انتقال نے ان کی زندگی میں ناقابل عبور خلاء پیدا کر دیا تھا۔ ڈیکائی کے ساتھ اس کا چار پانچ سالہ بیٹا بھی ہوا کرتا۔ تینزن گیاتسو کے لیے والدہ اور بھائی سے یہ ملاقات بہت اہم ہوا کرتی تھی۔ وہ چھوٹے بھائی کو گود میں لیے تختی پر لکڑی کے قلم سے حروف آشنا کرتا، اپنے ساتھ بھینچ کر پیار کرتے ہوئے اس کی ذات میں باپ کی خوشبو محسوس کرتا، ڈیکائی اسپرنگ کے ساتھ بیٹھا گھریلو امور اور دیگر بہن بھائیوں کا احوال دریافت کر کے ان کے وقت رخصت نم آنکھوں سے انہیں الوداع کہہ دیتا۔

اس کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ نہایت ہموار انداز میں جاری تھا۔ ذاتی اور قومی زندگی کے اس سکون سے قطع نظر ان کے پڑوسی ملک میں ایک ایسی ہلچل برپا تھی جس نے ان کی زندگی میں بھی بھونچال برپا کر دینا تھا۔ ماؤزے تنگ کی قیادت میں یکم اکتوبر 1949ء کو چین عوامی جمہوریہ چین کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ وہاں عوامی حکومت قائم ہو گئی۔ ماؤزے تنگ اشتراکیت پسند تھے۔ انہوں نے ملک بھر میں اشتراکی نظام نافذ کر دیا۔ یہ مخصوص طرزِ فکر اور اندازِ حکومت ان خطوں کے لیے حقیقتاً ایک خطرہ تھا جہاں شاہانہ طرزِ حکومت رائج تھا۔ اس کے باعث لاماؤں کا سماجی اور سیاسی اختیار بھی براہ راست زد میں تھا۔ لاماؤں کی ملکیتی اراضی پر سینکڑوں اراکین ملازم تھے۔ لامہ ان سے غلامانہ سلوک کیا کرتے۔ فرار کی کوشش کی صورت میں انہیں شدید اذیت و تشدد کا نشانہ بنایا

جاتا۔ چین کی عوامی حکومت کی نظریں تبتی سرزمین پر قائم مثل شہنشاہی دلائی لاماؤں کی حکومت پر گڑی تھیں۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی اس بالواسطہ صورت کو بھی پسند نہیں کر رہے تھے کیونکہ بارہ لاکھ تبتی افراد میں سے سات لاکھ زرعی غلام تھے۔ دلائی لامہ ان کو محکوم بنا کر بیگار لے رہی تھی۔ ان باتوں کو مدِنظر رکھ کر تقریباً چالیس ہزار اشتراکی چینی فوج نے مشرقی تبت پر دھاوا بول دیا۔ فالا فوری طور پر جب یہ خبر لیے تینزین گیاتسو کے پاس گیا تو وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ملاقات میں ہی مصروف تھا۔

''کیا بات ہے فالا؟ آپ اس قدر تناؤ زدہ کیوں دکھائی دے رہے ہیں؟'' اس نے ٹھٹک کر دریافت کیا۔

''وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ چینی فوج نے ہماری مشرقی سرحدوں پر حملہ کر دیا ہے۔''

''کیا ہماری فوج نے ان کی راہ بالکل نہیں روکی فالا؟ تبتی سرحدوں میں داخلہ ان کے لیے اس قدر آسان ثابت ہوگا کیا؟'' اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

''ہمارے کھمپا جنگ جوان کے سامنے دیوار بنے ہوئے ہیں۔ وہ مزاحمت کا پورا پورا حق ادا کریں گے لیکن وہ اکیلے یہ یلغار روکنے کے اہل بھی نہیں ہیں۔''

''آپ نے مدد کے لیے پڑوسی ممالک سے رجوع کیا کہ نہیں؟''

''میں نے اپنے خدشات کے تحت یہ کام پہلے ہی کر دیا تھا۔ برطانیہ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ وہ برصغیر سے واپس جا چکے ہیں۔ ان کے ماضی کی سرگرمیاں دیکھتے ہوئے کوئی بھی ملک ان کی افواج کو اپنی سرزمین میں دوبارہ رسائی دے کر اپنے لیے خطرہ مول نہیں لے گا۔ امریکا نے فی الحال کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ بھارت ابھی تو زائیدہ ملک ہے۔ وہ اپنے داخلی مسائل اور استحکام کی سرگرمیوں میں الجھا ہے۔ اس کی جانب سے بھی کوئی عسکری تعاون ملنا دشوار ہے۔'' فالا کے جواب پر اس کے چہرے پر دکھ کے سائے لہرانے لگے۔

''اس مشکل میں بھی ہمارے لیے ایک اچھا پہلو موجود ہے۔ کم از کم ہمیں یہ علم تو ہوا کہ ہمیں اپنی بقاء کے وسائل خود ہی تلاش کر کے دفاع کی جنگ تنہا لڑنی ہوگی۔''

''میں جانتا ہوں کندن کہ یہ وقت بہت دشوار ہے۔ اس لمحہ ہمیں غیر معمولی فیصلے کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے ذہن میں کچھ اہم نکات موجود ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ آپ منظر عام پر آ کر اپنے اقتدار اور حیثیت کا اعلان کر دیں۔'' فالا

کی اس تجویز پر وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔ فالا کا یہ فیصلہ حقیقتاً نہایت غیر معمولی تھا۔

''ایسا کیسے ممکن ہے؟ تبت کی تاریخ میں ایسا پہلے کبھی ہوا ہے کیا؟'' وہ حیرت زدہ تھا۔ ''ہر دلائی لامہ کو تعلیم و تربیت کے لیے اٹھارہ سال کا وقت ملتا ہے۔ میں تو ابھی صرف پندرہ سال کا ہوں۔ اتنی جلدی سب کچھ کیسے سنبھال سکتا ہوں؟ مجھے ذہنی استعداد اور قابلیت کی تین سالہ مسافت ابھی مزید طے

تینزین گیاتسو کی جدوجہد کو عالمی سطح پر بے پناہ پذیرائی ملی ہے۔ دسمبر 1989 میں امن کے نوبل انعام کے بعد مئی 2005 میں برطانیہ کی بدھسٹ سوسائٹی کی جانب سے 'کرسمس ہمفرے ایوارڈ' بھی دیا۔ تقریباً ایک سو اعزازات میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

☆ اعزازی آنریری ڈگری (سائمن فریزر یونیورسٹی) ☆ لائف اچیومنٹ ایوارڈ (حدسہ ویمنز ائیونسٹ آرگنائزیشن) ☆ آنریری ڈاکٹر آف لا (یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا) ☆ آنریری ڈگری (برینڈیز یونیورسٹی) ☆ جائیم برونیٹ ایوارڈ برائے انسانی حقوق ☆ آنریری ڈگری (ایموری یونیورسٹی) ☆ بلٹن ہیومینیٹیرین ایوارڈ ☆ ڈاکٹریٹ آف فلاسفی کی آنریری ڈگری (بائت سین ڈگری) ☆ انٹرنیشنل لیگ فار ہیومن رائٹس ایوارڈ ☆ پیس اینڈ یونٹی ایوارڈز (نیشنل پیس کانفرنس) ☆ ایڈوانسنگ ہیومن لبرٹی ایوارڈ (فریڈم ہاؤس) ☆ ڈاکٹریٹ آف ڈیوینٹی ایوارڈ (سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ہائی تبتن سٹڈیز) ☆ لاس اینجلس کی چابی پیش کی گئی (میئر ٹام بریڈلے) ☆ سان فرانسسکو کی چابی پیش کی گئی (میئر فین اسٹائن)

☆☆☆

دلائی لامہ نے عالمی سطح پر امن اور اخلاقیات کے فروغ کا کام انجام دینے والی 'دلائی لامہ فاؤنڈیشن' بھی قائم کر رکھی ہے۔ وہ ہم جنس پرستی اور ضبط تولید کے خلاف ہے۔ ماضی میں وہ چند متنازعہ سرگرمیوں میں بھی مبتلا رہا ہے۔ عالمی ذرائع ابلاغ میں بھی اس کی جانب سے ہندوستان کے ایٹمی دھماکوں کی حمایت' ٹوکیو سب وے میں زہریلی گیس پھیلانے والے گروپ سپریم لیڈر شوکو اساہارا سے بھاری امداد وصول کرنے اور بعد ازاں جسم فروشی کو جائز قرار دینے پر کڑی تنقید ہوئی۔

UUNOVELS.COM

کرنی ہے۔ میں ایسے کیسے بھلا؟" وہ اپنی پیشانی مسلنے لگا۔

فالا کے لیے اس کے اعتراضات غیر متوقع نہیں تھے۔ وہ اس کی ذہنی کیفیت بھی بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اسے علم تھا کہ گیاتسو محض وقتی گھبراہٹ کا شکار ہے۔ اسے اعتماد فراہم کرنے کی ضرورت تھی۔

"آپ سے کس نے کہا کہ اس عہدہ کے لیے ابھی آپ غیر موزوں ہیں۔ آپ بالکل تیار ہیں کندن۔ تبت کو آپ کی ضرورت ہے۔ ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے۔ ہمیں چین کو ایک پیغام دینا ہے کہ ہماری قوم سیاسی اور روحانی طور پر یتیم نہیں ہے۔ ہمارا بھی ایک رہنما ہے۔ وہی ہمارا پیشوا ہے اور ہم اس کی قیادت میں متحد ہیں۔ ہم کسی حملہ آور کا تسلط اور جبر قبول نہیں کریں گے۔ اس وقت صرف آپ ہی تبتی قوم کو متحد کر سکتے ہیں۔" فالا نے نرمی سے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سیرا لامہ نے مجھے پہچاننے میں غلطی کر دی ہو۔ میں آپ کا مطلوبہ شخص نہ ہوں۔" تینزین گیاتسو کی نوک زبان پر بالآخر وہ فقرہ مچل ہی گیا جو گزشتہ گیارہ سال سے اس کے اندر سوالات کا جوار بھاٹا اٹھائے رکھتا تھا۔

اس بار حیرت زدہ ہونے کی باری فالا کی تھی۔ وہ بھی اسی بے یقینی سے کندن کو دیکھنے لگا جس کا شکار کچھ لمحات قبل خود کندن ہوا تھا۔ فالا نے گہری سانس لے کر اپنے اعصاب پرسکون کیے اور مضبوط لہجہ میں بولا۔ "سیرا لامہ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی کندن۔ ایسا کبھی سوچیے گا بھی مت۔ تیرہویں دلائی لامہ نے آپ کے متعلق بڑی واضح نشانیاں بتائی تھیں۔ اس وقت آپ صرف الجھن کا شکار ہیں۔ اپنی روح کی طاقت کو پہچانیے۔ آپ دلائی لامہ ہیں۔ صدیوں سے ہماری پیشوائی کے فرائض سرانجام دے کر یہاں تک آئے ہیں۔ اب ایک بار پھر صرف آپ ہی کی ذات ہمیں بقاء دے سکتی ہے۔" فالا کی اپنی مخصوص جوش و جذبہ سے لبریز یہ گفتگو اس کے خدشات زائل کرنے لگی۔ فالا نے بھی بھانپ لیا کہ لوہا گرم ہو چکا ہے لہٰذا اس نے آخری ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ "تبت کو صرف آپ ہی بچا سکتے ہیں کندن۔ اگر آپ نے ذرا سی بھی کمزوری دکھائی تو ہماری قوم غلامی کے اندھیروں میں اپنی شناخت کھو بیٹھے گی۔"

"ٹھیک ہے فالا۔ میں کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہوں۔ آپ بھی تیاری کر لیجیے۔" اس نے رضامندی ظاہر کی۔ فالا کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ پہلے سے زیادہ پراعتماد دکھائی دینے لگا۔ اس نے تبت کی بااثر شخصیات کے ساتھ مل کر تمام انتظامات مکمل کیے اور 17 نومبر 1950ء کو رسم تاج پوشی ادا کر دی گئی۔

☆......☆

تینزین گیاتسو کے دلائی لامہ کا منصب سنبھالتے ہی تبت بھر میں ایک نیا جوش و ولولہ عود آیا تھا۔ انہیں یقین ہو چلا تھا کہ اب انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ اپنے پیشوا کے زیر سایہ بالکل پرسکون اور مطمئن رہیں گے لیکن یہ ان کی خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ چینی افواج ترقی یافتہ تھیں پھر اس فوج میں تبتی بھی تھے انہوں نے ناقابل یقین رفتار سے تبت میں اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ اشتراکیت پسندوں نے مختلف بستیوں کی درسگاہوں میں حکومت کی جانب سے خصوصی شائع کردہ کتابچے تقسیم کرنے کے علاوہ انہیں ماؤزے تنگ سے متعارف کروانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ طلبہ اور اساتذہ کو اشتراکیت پسندی سے متاثر کرنے کی بھرپور کوشش کرتے لگے تھے۔

"اشتراکیت میں آپ کے سبھی مسائل کا حل موجود ہے۔ یہ معیشت کو ہموار رکھتی ہے۔ روزگار کے یکساں مواقع فراہم کرتی ہے۔ اقربا پروری اور استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا۔ آپ کسی کے غلام نہیں رہیں گے بلکہ ہر ایک کو مساوی حقوق ملیں گے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی وحشت اور ناانصافیوں سے نجات مل جائے گی۔ تعلیم سب کا حق ہو گی۔ تعلیم ملے گی تو روزگار بھی آپ کے در پر ہو گا۔ سماجی روابط میں مضبوطی آئے گی۔ اشتراکیت آپ کی زندگیاں تبدیل کر دے گی۔ اٹھو اور اپنے سرمایہ دارانہ شاہی نظام سے نجات حاصل کر لو۔ اسی میں آپ کی آئندہ نسلوں کی بھلائی اور بقاء پوشیدہ ہے۔"

تینزین گیاتسو تک یہ ساری خبریں پہنچ رہی تھیں۔ وقت کچھ مزید آگے سرکا تو ایک روز اس کا سب سے بڑا بھائی تھبٹن جگمے نورزا اچانک ملاقات کے لیے آ گیا۔ اس کے چہرے پر ایک طویل مسافت، بے بسی اور اذیت بھرے شب و روز کی کٹھنائیاں ثبت تھیں۔

"حالات ہر گزرتے دن کے ساتھ بدتری کی جانب بڑھ رہے ہیں کندن۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "کھمپا اور دوسرے علاقوں میں تو اور بھی برا حال ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ حالات ایک بار پھر پہلے جیسے پرسکون اور پرامن ہو جائیں گے۔" تینزین نے بھائی کو امید کا جگنو تھمایا۔

"میں ان لوگوں کے درمیان رہ کر آیا ہوں کندن۔ وہ

UUNOVELS.COM

ہر قیمت پر تبت کو کمیونسٹ خطہ بنانا چاہتے ہیں۔ ڈیڑھ سال تک مجھے مذہبی تعلیمات اور رسومات پر عمل نہیں کرنے دیا گیا۔ ان کے لیے مذہب بالکل بے معنی چیز ہے۔ وہ ایک مخصوص فلسفہ کے تحت جی رہے ہیں اور یہی طرزِ فکر تبت پر بھی لاگو کرنا چاہتے ہیں۔"

"مذہب کو زندگی سے کیسے الگ کیا جا سکتا ہے؟ یہی تو ہمیں زندگی اور روح کی اصل سرشاری سے آگاہ کرتا ہے۔" وہ حیران تھا۔

"یہ بات ہمیں ناممکن لگتی ہے کندن مگر ان کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ ان کے عزائم بہت خطرناک ہیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ان کا اعتماد جیتنے کا فیصلہ کیا اور خود کو مکمل طور پر ان کے زیرِ اثر ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے یہاں بھی نہ بھیجتے۔ انہوں نے مجھے یہاں آپ کو قائل کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ آپ بھی ان کی اطاعت اور اشتراکیت قبول کر لیں۔"

"میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ آج، کل، نہ ہی مستقبل میں کبھی ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔" اس نے دوٹوک انداز میں واضح کیا۔

"میں جانتا ہوں کندن۔ میں بالکل جانتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا لیکن اگر میں ان سے ایسا نہ کہتا تو یہاں آ کر آپ کو اصل خطرات سے کیسے باخبر کرتا؟ آپ کی جان خطرے میں ہے۔ دشمن بھی اس بات سے واقف ہے کہ آپ ان کے مطالبات تسلیم نہیں کریں گے۔ اس صورت میں وہ آپ کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ آپ یہاں سے چلے جائیے کندن۔ کچھ عرصہ کے لیے منظرِ عام سے غائب ہو جائیے۔" تھپن اپنی بات کے اختتام پر چہرہ ہاتھوں پر گرائے بے بسی سے رو دیا۔

تینزین گیاتسو کے وجود میں یکدم لہا موعود آیا۔ بھائی کی حالت دیکھ کر اس کا دل کٹنے لگا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ مشکل وقت جلد ختم ہو جائے گا۔"

وہ اپنی نشست سے اٹھا اور تھپن کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر عوام کی حالت اور اذیت کے تصور سے ہی سخت کبیدگی اور آزردگی جھلک رہی تھی لیکن مسئلہ صرف یہیں تک تو محدود نہ تھا۔ حالات گمبھیر تر ہوتے نظر آ رہے تھے۔ حقیقت پسندی سے دیکھا جاتا تو چین سے باقاعدہ جنگ کرنے کی سکت ہی کہاں تھی؟ ان کے پاس چین کی طرف دوستی اور سمجھوتے کا ہاتھ بڑھائے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ گیاتسو نے تھپن کی آمد اور فراہم کردہ معلومات تبتی امور کی خصوصی کونسل 'کشگ' کے گوش گزار دیں۔ کشگ نے خوب سوچ بچار کے بعد کندن کو لہاسا سے باہر بھیجنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ گیاتسو نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اس نے روانگی سے قبل دو معمر اور اہل ترین مشیروں کو وزرائے اعظم کے عہدے پر فائز کر کے اپنی موجودگی اور غیر موجودگی دونوں صورتوں میں اہم فیصلے کرنے کا کلی اختیار بھی سونپ دیا۔ اس کے علاوہ ایک خصوصی وفد چین بھیجنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ یہ وفد چینی حکومت کے سامنے مذاکرات اور سمجھوتے کی راہ نکالنے پر یہ شرط سامنے رکھتا کہ ان کی فوج لہاسا تک نہیں آئے گی۔ اس وفد کی روانگی سے قبل ہی گیاتسو کو بھارتی سرحد کے پاس ایک علاقے یاتنگ Yatung روانہ ہو جانا تھا۔ تبتی عوام اور کشگ اراکین کے لیے دلائی لامہ کی سلامتی ناگزیر تھی۔ گیاتسو اپنے دل میں اُمید اور بہتری کے جذبات لیے یاتنگ منتقل ہو گیا۔ فالا اس کے ہمراہ تھا۔ کچھ روز ہی گزرے تھے کہ اس کی اُمید اور توقعات کا شیش محل ریڈیو پر نشر ہونے والی ایک خبر نے بڑی بے دردی سے چکنا چور کر دیا۔ تبتی وفد کے ایک رکن کے ادا کردہ وہ الفاظ اس کی روح چھلنی کر گئے تھے۔

"آج ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے چین کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کر دیئے ہیں۔ سترہ نکاتی اس معاہدہ میں ہم نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ تبت چین کا حصہ ہے۔ چین کی سربراہی اور ماتحتی میں ہم مکمل محفوظ، مطمئن اور خوش حال رہیں گے۔"

ریڈیو سے دلائی لامہ اور پنچن لامہ کے اختیارات محدود کر دینے کی بابت بھی اعلان ہو رہا تھا لیکن اس کی سماعت گویا مفلوج ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں آتشیں سیال جمع ہوتا محسوس ہونے لگا۔ فالا نے عقب سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

"یہ سب کیا ہو گیا فالا؟ یہ کیسے ہو گیا؟" گیاتسو سخت بے یقین تھا۔ فالا نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے معاملہ کی چھان بین کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"ہمارے وفد کے ساتھ سفارتی آداب کے خلاف سلوک کیا گیا ہے کندن۔ چین کے وفد نے پیکنگ پہنچنے سے قبل ہی معاہدہ تیار کر رکھا تھا۔ کچھ دن رسمی بات چیت کے بعد دباؤ بڑھا کر دستخط کروائے گئے ہیں۔ انہیں موقع ہی نہیں ملا کہ آپ سے یا لہاسا میں کسی انتظامی عہدیدار سے رابطہ کر پاتے۔"

"ہماری امن کی ہر کوشش ناکام ہو رہی ہے فالا۔ ہمیں دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگایا جا رہا ہے۔"

"یہ سب تو صدیوں سے ہوتا آیا ہے کندن۔ کبھی وہ حاوی رہے تو کبھی ہمارا پلہ بھاری رہا۔ اس لمحہ وقت ان کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی کوششیں کامیاب ہو رہی ہیں۔" فالا نے تجزیہ کیا۔

"سترہ نکاتی معاہدہ کے بارے میں کچھ علم ہوا کہ اس میں کیا نکات شامل ہیں؟" کیا تسو کو ایک نئی تشویش نے گھیرا۔

"جی ہاں! میں نے اس بارے میں بھی معلومات حاصل کر لی ہیں۔" فالا نے اسے سترہ نکات کے متعلق بتانا شروع کیا۔

1۔ تبت کے عوام متحد ہو کر تبت سے سامراجی جارحانہ قوتوں کو نکالیں گے۔ تبتی لوگ عوامی جمہوریہ چین کے کنبے کی طرف لوٹ آئیں گے۔

2۔ تبت کی مقامی حکومت عوامی لبریشن آرمی کو تبت میں داخل ہونے اور قومی دفاع کو مستحکم کرنے میں فعال طور پر مدد کرے گی۔

3۔ چینی عوامی سیاسی مشاورت کانفرنس کے مشترکہ پروگرام میں رکھی گئی قومیتوں کے بارے میں پالیسی کے مطابق تبت کے عوام کو عوامی جمہوریہ چین کی مرکزی عوامی حکومت کی متفقہ قیادت میں قومی علاقائی خودمختاری استعمال کرنے کا حق ہے۔

4۔ مرکزی حکام تبت میں موجودہ سیاسی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں کریں گے۔ مرکزی حکام دلائی لامہ کی قائم کردہ حیثیت، افعال اور اختیارات میں بھی رد و بدل نہیں کریں گے۔ مختلف عہدوں کے عہدیدار ہمیشہ کی طرح اپنے عہدے پر قائز ہوں گے۔

5۔ پنچن نگوار تھنی کی قائم کردہ حیثیت، افعال اور اختیارات کو برقرار رکھا جائے گا۔

6۔ دلائی لامہ اور پنچن نگوار تھنی کی قائم کردہ حیثیت، افعال اور اختیارات سے مراد تیرہویں دلائی لامہ اور نویں پنچن نور گور تیمنی جی وہ حیثیت، افعال اور اختیارات ہیں جب ان کے ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ اور خوشگوار تعلقات تھے۔

7۔ چینی عوامی سیاسی مشاورتی کانفرنس کے پروگرام میں رکھی گئی مذہبی عقیدے کی آزادی کی پالیسی پر عمل ہوگا۔ تبتی عوام کے مذہبی عقائد، رسم و رواج اور عادات کا احترام کیا جائے گا اور لامہ خانقاہوں کا تحفظ کیا جائے گا۔

8۔ عوامی لبریشن آرمی میں قدم قدم پر تبتی فوجیوں کی تنظیم نو کی جائے گی اور وہ عوامی جمہوریہ چین کی دفاعی فورس کا حصہ بنیں گے۔

9۔ تبت کی قومیت کی بولی، تحریری زبان اور اسکول کی تعلیم کو تبت کے اصل حالات کے مطابق قدم بہ قدم تیار کیا جائے گا۔

10۔ تبتی زراعت، مویشیوں کی پرورش، صنعت اور تجارت کو ایک ایک قدم کے ساتھ ترقی دی جائے گی اور تبت کے حقیقی حالات کے مطابق زینہ بہ زینہ لوگوں کی روزی بہتر ہوگی۔

11۔ تبت میں مختلف اصلاحات سے متعلق معاملات میں مرکزی حکام کی طرف سے کوئی مجبوری نہیں ہوگی۔ تبت کی مقامی حکومت اپنے طور پر اصلاحات کرے گی اور جب عوام اصلاحات کے مطالبے کریں گے تو تبت کے سرکردہ اہلکاروں سے مشاورت کے ذریعہ ہی ان کا تصفیہ کیا جائے گا۔

12۔ اب تک سابق سامراجی حامیوں اور تخریب کاری کے مزاحمین کی پکڑ دھکڑ جاری رہے گی۔

13۔ تبت میں داخل ہونے والی عوامی لبریشن آرمی پر مذکورہ بالا تمام پالیسیوں کی پابندی ہوگی۔ وہ تمام تر خرید و فروخت میں اس حد تک منصفانہ ہوں گے کہ لوگوں سے جبری طور پر کوئی سوئی یا دھاگا بھی نہ لیں گے۔

14۔ مرکزی عوامی حکومت کے پاس تبت کے علاقے کے تمام خارجی امور کا مرکزی اختیار ہوگا۔ ہمسایہ ممالک کے ساتھ پر امن بقائے باہمی اور مساوات، باہمی مفاد اور علاقائی خودمختاری کے لیے باہمی احترام کی بنیاد پر ہی ان کے ساتھ منصفانہ تجارتی تعلقات کا قیام اور ترقی ہوگی۔

15۔ اس معاہدے پر مکمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے مرکزی عوامی حکومت تبت میں ایک فوجی و انتظامی کمیٹی اور ایک ملٹری ایریا ہیڈ کوارٹر قائم کرے گی۔ مرکزی عوامی حکومت کے ذریعہ وہاں بھیجے گئے اہلکاروں کے علاوہ زیادہ تر مقامی تبتی اہلکاروں کو شامل کیا جائے گا۔ فوجی اور انتظامی کمیٹی میں حصہ لینے والے مقامی اہلکاروں میں تبت کی مقامی حکومت، مختلف اضلاع اور مختلف درس گاہوں کے محب وطن عناصر شامل ہو سکتے ہیں۔ نام کی فہرست مرکزی عوامی حکومت اور مختلف متعلقہ حلقوں سے متعلق نمائندوں کے درمیان مشاورت کے بعد رکھ کر مرکزی عوامی حکومت کو پیش کی جائے گی۔

URDUNOVELS.COM

16۔ فوجی اور انتظامی کمیٹی' ملٹری ایریا ہیڈ کوارٹر اور تبت میں داخل ہونے والی عوامی لبریشن آرمی کو درکار فنڈز مرکزی عوامی حکومت ہی فراہم کرے گی۔ تبت کی مقامی حکومت کو چاہیے کہ وہ عوامی لبریشن آرمی کو کھانا' چارہ اور روزمرہ کی دیگر ضروریات کی خرید و فروخت میں مدد کرے۔

17۔ یہ معاہدہ دستخط اور مہروں کے چسپاں ہونے کے فوراً بعد نافذ ہو جائے گا۔"

معاہدے کے یہ نکات سن کر گیاتسو کے پاس خاموشی اور سوچ بچار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

☆......☆

یاتنگ میں تنزین گیاتسو کے شب و روز بہت اضطراب میں بیت رہے تھے۔ سترہ نکاتی معاہدہ کسی تلوار کی مانند سر پر لٹکتا محسوس ہوتا۔ اس کا بیشتر وقت عبادت اور پھر عوام کے مستقبل کی بابت سوچ بچار میں ہی گزرتا، اضطراب جب حد سے سوا ہوتا تو وہ رہائش گاہ کی چھت پر آکر نشیب میں پھیلی وادی اور مناظر دیکھا رہتا۔ اس روز بھی وہ چھت کی منڈیر سے ہاتھ ٹکائے اسی مشغلے میں منہمک تھا۔ بے چینی کے ساتھ بے بسی کی کیفیات نے مزاج بوجھل کر رکھا تھا۔ اسے چینی افسران کی آمد کی اطلاع ملی تھی۔ وہ اس سے خصوصی طور پر ملنا چاہتے تھے۔ کچھ ہی اثناء میں فالا بھی اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ ان سوچوں کا تسلسل بائیں جانب ایک سفید متحرک نکتہ نظر آنے سے ٹوٹا۔ چینیوں کی گاڑی نزدیک تر آ رہی تھی۔

"میں نے کبھی سرکاری طور پر کسی چینی افسر سے ملاقات نہیں کی۔" وہ جز بز ہو کر بولا۔

"تو آج کر لیجیے گا کندن۔ وہ خاص طور پر آپ سے ملنے کے لیے لہاسا جانے کی بجائے رستے سے گھوم کر یہاں آ رہے ہیں۔" فالا نے نرمی سے بتایا۔

"میرے پاس ان سے گفتگو کرنے کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں۔ ہمارے درمیان بات چیت کے لیے بچا ہی کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ انہیں چائے پلا کر رخصت کر دینا ہی بہتر ہو گا۔" گیاتسو حتی الامکان اس ملاقات سے گریز ہی کر رہا تھا لیکن فالا نے متانت اور بردباری سے اسے قائل کر کے ہی دم لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دو چینی افسران اس کے سامنے موجود تھے۔

"تاشی ڈیلیک دلائی لامہ۔" ان میں ایک افسر نے تبتی زبان میں اس کا حال دریافت کیا تو اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "میرا نام جنرل چیانگ چو ہے۔" اس نے خوش خلقی سے اپنا تعارف کروایا۔

گیاتسو کے خفیف اشارے پر ان کی خاطر مدارت کا آغاز کرتے ہوئے چائے پیش کر دی گئی۔ گیاتسو ان کی خوش اخلاقی' دوستانہ رویہ اور عاجزی کے باوجود ماحول میں چھایا تناؤ بخوبی محسوس کر رہا تھا۔

"دلائی لامہ! ہم یہاں محترم ماؤزے تنگ کی جانب سے آپ کو اپنی سرزمین میں مدعو کرنے آئے ہیں۔ وہ آپ سے خصوصی ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔" جنرل نے اسے ایک سرکاری خط تھماتے ہوئے کہا۔

"میں اس دعوت کے لیے ان کا مشکور ہوں۔" گیاتسو بس اتنا ہی کہہ سکا۔ چین کے بااثر ترین شخص کا وہ دعوت نامہ ہاتھ میں لیتے ہوئے گیاتسو کے ذہن پر ہزاروں سوچیں

تبتی فن تعمیر کافی منفرد خصوصیات کا حامل رہا ہے۔ گمپا اور خانقاہیں ایسے مقامات پر تعمیر کی جاتی ہیں جہاں دھوپ زیادہ پڑتی ہو۔ پتھروں' سیمنٹ' لکڑی اور گارے سے بنی ان عمارتوں کا رخ جنوبی سمت ہوتا ہے۔ تبت میں حرارت اور قدرتی روشنی کی کمی کے باعث عمارتوں کی چھتیں سخت اور ہموار بنائی گئی ہوتی ہیں تاکہ حرارت محفوظ رہ سکے۔ عمارات روشن رکھنے کے لیے کھڑکیاں سورج کے رخ پر بنائی جاتی ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں مسلسل زلزلوں سے تحفظ کے لیے دیواروں کو دس ڈگری کے زاویے سے اندرونی جانب ٹیڑھا رکھا جاتا ہے۔

☆☆☆

تبت میں مسلمانوں کو 'کاچے' کہا جاتا ہے۔ مسلم آبادی قلیل تعداد میں ہے۔ لہاسا اور شگاتسے میں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ ان کے ذاتی نام تبتی اور خاندانی نام فارسی یا اردو میں ہوتے ہیں۔ اکثریت تبتی زبان بولتی ہے۔ اردو سے بھی خاصی واقفیت رکھتے ہیں البتہ ان کی مذہبی زبان عربی ہی ہے۔

☆☆☆

تبتیوں کے گھروں میں چھوٹا سا معبد ہوتا ہے جسے 'گاؤ' کہتے ہیں۔ اس معبد میں کسی دیوی یا دیوتا کا چھوٹا سا مجسمہ رکھا ہوتا ہے۔ گاؤ کو خاصہ بابرکت تسلیم کیا جاتا ہے۔ خیموں' خانقاہوں اور گھروں میں رکھنے کے علاوہ بعض افراد اسے گلے میں لٹکا لیتے ہیں اور چند ایک آڑی پٹی کے ذریعے سینے پر باندھ لیا کرتے ہیں۔

UUNOVELS.COM

یلغار کر رہی تھیں۔ چینی فوجی لہاسا کے گلی کوچوں میں مارچ کرنے لگے تھے۔ گیاتسو بھی روپوشی ترک کر کے Norbulingka محل منتقل ہو گیا۔ دونوں وزرائے اعظم نے روایتی شہنائیوں اور مذہبی رسومات کی ادائیگی میں اس کا استقبال کیا۔ وہ بھی لہاسا کی موجودہ صورتِ حال سے بہت تشویش زدہ تھے۔ گلی کوچوں میں کوئی دیوار ایسی نہ تھی جہاں ماؤزے تنگ کی تصویر اور نعرے آویزاں نہ کیے گئے ہوں۔ ہر جگہ چینی فوجی اور چین کے جھنڈے لہراتے نظر آتے تھے۔ مقامی افراد کے غم و غصہ میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ ردِعمل کے طور پر نفرت سے پتھر برسانے لگتے۔ مرد و خواتین چینی حکومت اور اشتراک پسندی کے خلاف نعرے لگاتے‘ تبتی روایات کے انقلابی نغمے گاتے۔ چینی افواج اور اعلیٰ عہدیداران کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ رفتہ رفتہ یہ ہنگامے اس قدر بڑھے کہ چینی فوجیوں نے مقامی افراد پر اسلحہ کھول دیا۔ تبتی افراد کے دلوں میں نفرت اور غصہ مزید بڑھ گیا۔ تینزین گیاتسو کے لیے اپنے عوام کی یہ حالت اور اذیت قابلِ قبول نہیں تھی۔ اس نے چینی جنرل کو ملاقات کے لیے پوتالا محل میں طلب کر لیا۔

”ہمارے عوام کی جان و مال اس قدر سستے نہیں ہیں جنرل کہ آپ انہیں یوں بے مول کرتے پھریں۔“ وزیراعظم نے بات کا آغاز کیا۔

”غلطی آپ کے لوگوں کی ہی ہے۔ وہ ہمیں دیکھ کر پتھر برساتے ہیں‘ غلیظ زبان استعمال کرتے ہیں اس لیے ایک دو کو مارنا پڑتا ہے کہ کسی کو مزید ایسی گستاخی کی جرأت نہ ہو سکے۔“

”تو کیا آپ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ آپ کو دیکھ کر پھولوں کے ہار پہنائیں گے۔“ دوسرے وزیراعظم نے قدرے نرمی سے کہا۔

”ایسا کر لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ ہم ان کے دشمن تو نہیں ہیں۔“ جنرل نے اطمینان سے جواب دیا۔

”آپ کا طریقہ کار بہت غلط ہے جنرل صاحب۔ میرے لیے اپنے عوام سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے ہر قیمت پر ان کی سلامتی اور تحفظ درکار ہے۔“ گیاتسو نے بھی سنجیدگی سے کہا۔

”ہم نے کچھ بھی غلط نہیں کیا دلائی لامہ۔“ اس کی ہٹ دھرمی میں کوئی فرق نہ پڑا۔

”چھ ماہ پہلے تم لوگوں کے تین ہزار فوجی ہماری سرزمین میں آئے اور آتے ہی دو ہزار ٹن اناج مانگ لیا۔ تین ماہ پہلے پھر اتنی ہی فوج مزید چلی آئی۔ ان کے لیے بھی ہزاروں ٹن اناج مانگ لیا گیا۔ میں پوچھتا ہوں کہ پرائی سرزمین پر ڈیرے ڈالنے کا اتنا ہی شوق تھا تو اپنے ساتھ سب وسائل بھی لے کر آتے۔“ پھر اس نے فکرمند لہجے میں کہا۔ ”ہم نے اپنی قابلِ کاشت اراضی کا سب اناج تمہیں دے دیا تو لہاسا میں قحط پڑ جائے گا جنرل۔“ وزیراعظم دوئم نے نرمی کا دامن تھام رکھا ہے۔

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ یہ دہرا کھیل کیوں کھیلا جا رہا ہے؟ ہماری زمینیں ہتھیا کر سڑک بنا ڈالی۔ کیا ہم نہیں جانتے کہ یہ سڑک ہمارے لیے نہیں بلکہ چینی فوج کی نقل و حرکت کی آسانی کے لیے بنائی گئی ہے۔ ان کے لیے ہمارے عوام کی دکھ یا تکلیف کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے۔“ وزیراعظم اول نے نکتہ اٹھایا۔

”تمہارے بچے اور عورتیں چین کے خلاف نعرے لگاتے ہیں۔ ہمارے قومی تشخص اور وقار کے منافی گانے گاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی یہ روش ترک نہ کی تو نتائج کا ذمے دار ہمیں نہ ٹھہرانا۔“

”گانا گانے سے منع کر دیں؟“ وزیراعظم اول تڑپ ہی اٹھا۔ ”کل کو کہو گے کہ اپنے عوام کو سانس لینے سے بھی منع کر دو اور تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہمارے عوام کو اس حد تک لے جانے میں اصل کردار بھی تمہارا ہی ہے۔ ملکی سرزمین ہر انسان کے لیے بہت مقدس ہوتی ہے اور کوئی بھی غیرت مند شخص اس تقدس میں کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کرتا۔“ اس کے جواب سے جنرل نے تینزین گیاتسو کی جانب دیکھا اور اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”دلائی لامہ! ہمیں آپ کی متانت‘ بردباری‘ معاملہ فہمی اور تحمل مزاجی سے بہت اچھی توقعات ہیں۔ اس معاملہ میں آپ ہی اپنے عوام کی ذہن سازی کر سکتے ہیں۔“

”میں اور میرے وزرائے اعظم ایک ہی سوچ اور طرزِ فکر کے مالک ہیں۔ آپ کے سترہ نکاتی معاہدے میں یہ شق بھی درج تھی کہ مقامی افراد کو ان کے رسم و رواج پر عمل اور مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ آپ اپنا وعدہ نبھائیں ہم اپنا قول پورا کریں۔ ایفائے عہد کا بوجھ ایک فریق مکمل طور پر بھی نہیں اٹھا سکتا۔ آپ کو اپنے حصے کا بوجھ خود اٹھانا ہو گا۔“

گیاتسو کے اس جواب پر جنرل کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ ”آپ نے ہمیں بہت مایوس کیا ہے دلائی لامہ۔“

”جنرل! اگلی بار یہاں آؤ تو جوتے باہر ہی اتار کر

UUNOVELS.COM

آنا۔'' گیاتسو کے بائیں جانب کھڑے فالا نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لے کر اسے ایک اور کچوکا لگایا۔

اس ملاقات کے بعد عوامی سطح پر چینی افواج کا عمل دخل بہت تیزی سے بڑھنے لگا۔ جواب میں دلائی لامہ کے حامیوں کے مظاہروں میں بھی شدت آنے لگی۔ اس موقع پر تبتی خواتین بھی میدان میں آچکی تھیں۔ چینی فوجی جہاں سے گزرتے وہ دیواروں کے ساتھ طویل قطار بنا کر کھڑی ہو جاتیں اور اپنی جھولی اٹھا کر مخصوص انداز میں ان کے خلاف نعروں کا بازار گرم کر دیتیں۔ بچے بے خوف ہو کر سنگ زنی کیا کرتے۔ یہ باغیانہ رویہ چینی افواج کے غیظ وغضب میں اضافہ کرنے لگا۔ وہ اپنے جذبات کا اظہار تشددانہ انداز میں کرتے۔ عبادت میں مصروف بھکشو بھی ان سرگرمیوں سے محفوظ نہیں تھے۔ یہ صورتِ حال تبت انتظامیہ کے لیے ناقابل برداشت ہوئی تو گیاتسو نے ایک خصوصی وفد کے ساتھ چین جا کر ماؤزے تنگ سے ملاقات کا فیصلہ کرلیا۔ وزرائے اعظم اور دیگر عہدیداروں نے اسے روایتی انداز اور موسیقی کی گونج میں مناجات ادا کرتے ہوئے پیکنگ روانہ کر دیا۔ سفر کا آغاز جیپ میں ہوا۔ گیاتسو اپنے ہاتھوں میں تسبیح نما مالا کے منکے گراتے ہوئے پرسوچ میں بیرونی مناظر دیکھ رہا تھا۔

''یہ سڑک تو تعمیر شدہ ہے۔'' اگلی نشست پر بیٹھے ایک ساتھی نے اسے آگاہ کیا۔ ''چین نے ہمارے خطے کے لیے ترقیاتی کام تو کیے ہیں اگر یہ سڑک نہ ہوتی تو شاید اس سفر میں ہمیں مہینوں کا عرصہ درکار ہوتا۔ چین نے کہیں نہ کہیں ہمارے عوام کا بھلا تو کیا ہے۔''

''بھلا؟ کیسا بھلا؟'' فالا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''تبتی تو شاید کبھی چین جانا ہی نہیں چاہیں گے۔''

''آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی فالا۔'' گیاتسو نے افسردگی سے جواب دیا۔ ''عوام کیا چاہتے ہیں اس بارے میں تو کبھی کسی نے سوچا ہی نہیں۔ میرے نزدیک سڑکیں ترقی اور ارتقاء کی علامت نہیں صرف ایک سہولت ہیں، اگر مجھ سے پوچھا جائے تو اصل ارتقاء عوام کی خوشی، سکون اور تحفظ ہے لیکن مادیت پرستی کی لہر نے یہ سکون چھیننا ہی ترقی سمجھ لی ہے۔'' اس کے حقیقت پسندانہ تجزیے کے بعد جیپ میں خاموشی چھا گئی۔ ان سبھی کے دلوں میں ماؤزے تنگ سے ملاقات کے بعد حالات میں بہتری اور سمجھوتے کی اُمید موجود تھی لیکن یہ سبھی توقعات اس مختصر ملاقات کے بعد زمین بوس ہو گئیں۔ ماؤزے تنگ نے چودھویں دلائی لامہ کا استقبال بہت باوقار انداز میں کیا۔

''ہم اپنی عظیم سرزمین میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں دلائی لامہ۔ اُمید ہے کہ آپ یہاں یادگار وقت گزار کر خوشگوار یادیں لیے واپس جائیں گے۔''

''بہت شکریہ۔ میں باہمی امن اور سکون کے لیے دعا گو ہوں۔'' گیاتسو نے اسے اپنی ثقافت کے مطابق سفید پٹی تھما کر روایتی کلمات ادا کیے۔ چند مزید رسمی کلمات کے بعد ماؤزے تنگ اپنے اصل مدعا پر آ گیا۔

تبت میں تدفین کا عمل بھی بہت منفرد ہے۔ یہ عمل نجومی کی ہدایات پر انجام دیا جاتا ہے کہ لاش کو 'مٹی' 'ہوا' آگ، پانی اور لکڑی میں سے کس فطری عنصر کے حوالے کیا جائے۔ آسمانی تدفین کا رواج عام ہے۔ اس رسم میں لاش کو بیٹھنے کی حالت میں کفن پہنا کر کھلے پہاڑی علاقے میں لے جاتے ہیں۔ لاش کے ٹکڑے کر کے پرندوں کے کھانے کے لیے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ تسمپا سے ہڈیاں باندھ کر پرندوں کے لیے چھوڑی جاتی ہیں۔ بچے کھچے اجزاء کو بعد میں جلا دیا جاتا ہے یا دفنا دیا جاتا ہے۔ زمین میں تدفین صرف اس صورت میں ہوتی ہے جب پرندے لاش نہ کھائیں اور ایسا ہونا بہت برا شگون سمجھا جاتا ہے۔ لکڑی کی قلت اور مہنگی ملنے کے باعث لاش جلانے کا رواج کافی کم ہے۔ لاماؤں کی لاشیں نذر آتش ہی کی جاتی ہیں اور راکھ ایک 'سٹوپا' میں ڈال کر ان کی خانقاہ میں رکھ دیا جاتا ہے۔ چھوٹے بچوں اور بھکاریوں کی لاشیں سپرد آب کی جاتی ہیں۔ اعلیٰ ترین رتبے کے حامل لاماؤں کی نعشیں 'ممی' بنا کر محفوظ کر لی جاتی ہیں۔

☆☆☆

تبتی بدھ مت میں 'دوبارہ جنم' کا عقیدہ بہت مضبوط ہے۔ قریب المرگ شخص کے آخری لمحات میں بھکشو اسے اگلے جنم کے لیے ہدایات دیا کرتا ہے۔ تبت کے مشہور صحیفے 'مردے کی کتاب' کے مطابق موت کے اگلے جنم کے درمیان ایک 'بارڈو' نامی دنیا ہے۔ بارڈو کے سات حصے ہیں اور ہر حصے کی مزید سات ذیلی شاخیں بھی ہیں۔ بارڈو میں روح انچاس دن تک رہتی ہے۔ انہی انچاس دنوں کے دوران روح بھکشوؤں کی ہدایات کے مطابق بارڈو سے رہا ہو کر نیا جنم پانے کے لیے درست راستہ ڈھونڈتی ہے۔

UUNOVELS.COM

"آپ اشتراکیت کے متعلق کچھ جانتے ہیں دلائی لامہ؟"

"جی ہاں۔ مجھے اس کی بنیادی تعلیمات کے متعلق کافی معلومات ہیں۔" گیاتسو نے سنبھل کر کہا۔ ماؤزے تنگ نے مسکراتے ہوئے بے تکلفی کی اور مضبوط لہجہ میں گویا ہوا۔

"اشتراکیت ایک خوبی ہے۔ یہ انصاف اور مساوات کا دوسرا نام ہے۔ یہ سامراجیت اور استحصال کا براہِ راست قتل ہے۔ میں انصاف اور اشتراکیت کا اس قدر علمبردار ہوں کہ میں نے افراد کو ان کے تحت ناموں کی بجائے مخصوص نمبروں کی شناخت دینے کا فیصلہ بھی کر رکھا ہے۔ تبت تاریخی طور پر چین کا حصہ رہا ہے لہٰذا میں یہی نظام وہاں بھی نافذ کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمام عوام کو زندگی کی تمام بنیادی سہولیات دے کر ان کی ہر ضرورت پوری کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہم نے زندگی میں کبھی خواہشوں کا آزار پیدا نہیں کیا مسٹر چیئرمین۔" گیاتسو نے جواب دیا۔

"مجھے علم ہے دلائی لامہ۔ آپ یہ نہ سمجھیے کہ میں مذہب کے متعلق کچھ جانتا ہی نہیں۔ میری والدہ کا تعلق بھی بدھ مت سے ہی تھا۔ مجھے اس کی بنیادی تعلیمات اور عقائد کا بخوبی علم ہے۔ اس کے باوجود میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ مذہب خواہ کوئی بھی ہو ترقی پسند سوچ کے بغیر انسانی زندگی کو جمود کا شکار بنا دیتا ہے۔ صرف مذہبی تعلیمات کا سہارا لے کر ترقی نہیں کی جاسکتی۔ ارتقاء اور عروج حاصل کرنے کے لیے ایک ایسا فلسفۂ حیات درکار ہوتا ہے جس کی مدد سے ہم زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوسکیں۔ تبت اور منگولیا نے صرف مذہبی تعلیمات کو ہی مقصدِ حیات سمجھ لیا ہے۔ اس سوچ کو تبدیل کیجیے۔ اشتراکیت کا نفاذ ہی آپ لوگوں کو ممتاز کرے گا۔ آپ مادی ترقی کے بغیر دنیا سے کٹ کر بقاء حاصل کر ہی نہیں سکتے۔"

ماؤزے تنگ سے اس مختصر ملاقات نے مایوسی اور دل شکستگی میں اضافہ کر دیا۔ گیاتسو حقیقت پسندانہ ذہن کا مالک تھا اور اسے یہ حقیقت بخوبی سمجھ آگئی تھی کہ چین اور تبت میں مذاکرات کا دور کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ان کی سوچ اور طرزِ فکر میں صدیوں کا فاصلہ ہے۔ گیاتسو اور ماؤزے تنگ ان دو اقوام اور خطوں کے رہنما تھے۔ اوّل الذکر کے لیے مذہب مقصدِ حیات تھا۔ مذہبی تعلیمات کی اہمیت ان کے لیے اتنی ہی ناگزیر تھی جتنی بھوک، پیاس، درد اور بقاء جیسے جبلی تقاضے۔ موخر الذکر کی سوچ اس کے بالکل متضاد تھی۔ اس کے لیے مذہب سے بے جا وابستگی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ اس کا مطمع نظر ایک مخصوص نظریۂ حیات کے تحت صرف اور صرف مادی ترقی، سڑکوں، عمارتوں کا جال اور غمِ روزگار کی تسکین تھا۔ گیاتسو کے نزدیک ترقی کا مطلب سڑکوں، عمارتوں اور نفسانفسی کی بجائے مذہب سے وابستہ سکون، روحانی ارتقاء اور سوچ کی پاکیزگی تھی۔ یہ دونوں متضاد طرزِ افکار کبھی بھی مساوی طور پر نہیں پنپ سکتی تھیں۔ گیاتسو کا وجدان اور پیش بینی اسے چینی افواج اور اس کے حامیوں کے درمیان بڑھتی کشیدگی اور نفرت کی نوید دینے لگے۔ گزرتے وقت نے اس کے یہ خدشات بالکل درست ثابت کر دیئے۔ اگلے پانچ برس لامہ کے حامیوں کے لیے بہت کٹھن ثابت ہوئے۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے تحت کئی افراد نے نقل مکانی کر کے کھمپا واریئرز میں شمولیت اختیار کرلی۔ امن پسندی اور خاموشی سے حالات میں تبدیلی نہیں آسکتی تھی۔ کھمپا واحد جنگجو قوم تھی جو آغاز ہی سے چین کی راہ میں فولادی دیوار بن کر کھڑی تھی۔ وہ اپنی سرحدوں کی حفاظت میں تندہی سے جتے ہوئے تھے۔ گیاتسو ان بھی حالات و واقعات سے آگاہ تھا۔ سفارتی اور سیاسی سطح پر اس نے چین کو اپنا نقطۂ نظر اور مطالبات پہنچانے کا سلسلہ بھی ترک نہیں کیا تھا۔ وہ مسلسل کوششوں سے کامیابی کی جانب قدم بڑھاتے رہنا چاہتا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ حالات میں بہتری کی بجائے تنزلی آتی رہی۔ گیاتسو ایک بھرپور جوان بن چکا تھا۔ اس کی تعلیم اب اختتامی مراحل میں داخل ہوچکی تھی۔ تین مذہبی یونیورسٹیوں دریپنگ، سیرا اور گینڈن سے ابتدائی امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مذہبی میلے موئلم کے دوران آخری امتحان کا وقت آگیا۔ تینزین گیاتسو کا یہ امتحان جوکھنگ، لہاسا میں ہوا۔ صبح کے اوقات میں منطق کے تیس عالموں نے، سہ پہر کے وقت درمیانی راستے کے پندرہ عالموں اور شام کے وقت بدھ مت اور مابعد الطبیعات کے پینتیس عالموں نے ان گنت بھکشوؤں کے سامنے یہ امتحان لیا۔ تبت کی مذہبی اور سیاسی انتظامیہ کے لیے یہ ایک تاریخی موقع تھا۔ ان کا سیاسی اور روحانی پیشوا اپنی تعلیم و تربیت کے آخری مرحلے تک آپہنچا تھا۔ اس کے بعد گیشے لہارمپا (ڈاکٹریٹ آف بدھسٹ فلاسفی) کی ڈگری ملنا باقی تھا۔ اس تاریخی اور یادگار موقع پر چینی فوج کی اچانک آمد نے ماحول درہم برہم کر دیا۔ وہ چینی فوجی جرنیلوں کی جانب سے دلائی لامہ کو اپنے ثقافتی پروگرام میں مدعو کرنے آئے تھے۔ گیاتسو نے امتحانات کا عذر کر کے

UUNOVELS.COM

فوری آمد سے تو انکار کر دیا تاہم بعد میں ٹیلی فون پر دوبارہ ملنے والے دعوت نامہ پر دس مارچ کو اپنی شمولیت کی ہامی بھر لی۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ چینی فوج کے کئی اعلیٰ افسران نے مزاحمت اور باغیانہ روش کے خاتمہ کے لیے اسے اغواء کرنے کا منصوبہ بنالیا ہے۔ انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ طے کیا تھا کہ تبت کے روحانی اور سیاسی پیشوا کا ان کے قبضے میں چلے آنا مزاحمت کی کمر توڑ کر رکھ دے گا۔ جرنیلوں نے اپنے مقامی پیغام رساں کو بلوایا اور اگلے روز دلائی لامہ کے ساتھ روایتی بیس عدد محافظوں کی بجائے صرف تین نہتے محافظ لانے کا حکم صادر کر دیا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا جنرل۔ کندن کے ساتھ ہمیشہ بیس محافظ ہی رہا کرتے ہیں۔ اب بھی اتنے ہی آئیں گے۔'' پیغام رساں نے ٹھٹک کر کہا۔

''نہیں، مسلح افراد کی آمد سے یہاں کا ماحول خراب ہونے کا خدشہ ہے۔ ہوسکتا ہے مظاہرین اس بات کا فائدہ اٹھا کر کوئی فساد پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ہتھیاروں کی موجودگی میں خون خرابہ پیدا ہوگا۔ ہم ایسی کسی بھی صورت حال سے بچاؤ چاہتے ہیں۔ تمہیں جو ہدایات دی گئی ہیں اسی پر عمل کرو۔'' جنرل نے اسے ٹالا۔ پیغام رساں ان کے ارادے بھانپ گیا۔ اس نے فوری طور پر دلائی لامہ کو خطرے سے آگاہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ گیاتسو نے اس حقیقت سے آگاہی کے باوجود چینی کیمپ جانے کا فیصلہ تبدیل نہ کیا۔ چاروناچار اس پیغام رساں نے اپنا مقدمہ عوام کے سامنے رکھ دیا۔

☆......☆

وہ شخص ایک چبوترے پر کھڑا اپنے سامنے موجود مجمع سے مخاطب تھا۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتا اضطراب اور دکھ مجمع میں شامل افراد پر براہِ راست اثرانداز ہو رہا تھا۔

''میں بہت بڑا خطرہ مول لے کر یہاں پہنچا ہوں۔ میرے لیے کندن سے بڑھ کر کوئی بھی جذبہ نہیں ہے۔ کندن ہماری قوم کی آخری اُمید اور سہارا ہیں۔ میں نے اپنی سماعت سے سب کچھ سنا ہے۔ کندن کے متعلق ان کے عزائم اچھے نہیں ہیں۔ ہم کندن کو کہیں نہیں جانے دیں گے۔ ان کے ساتھ آج بھی اتنے ہی گارڈز جائیں گے جتنے ہمیشہ جاتے رہے ہیں۔ کندن چینیوں پر بھروسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نہیں۔ آؤ میرے ساتھ عہد کرو کہ ہم کندن کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کریں گے۔''

''ہم عہد کرتے ہیں۔ ہم قول دیتے ہیں کہ کندن کے لیے، تبت کے لیے اپنے خون کے آخری قطرے تک مزاحمت کریں گے۔'' مجمع کے نعرے فلک شگاف تھے۔ کچھ ہی روز میں یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ دلائی لامہ کو اغواء کرنے کا منصوبہ بنایا جارہا ہے۔ عوام دیوانہ وار پوتالہ محل کے سامنے اکٹھے ہونے لگے۔ ان کے چہرے جوش اور جذبوں کی حدت سے دہکتے نظر آتے تھے۔ ان کی زبانوں پر ایک ہی نعرہ ہوا کرتا۔

''تبت زندہ باد۔ تبت آزاد ہے۔ ہمیں غلامی قبول نہیں۔ چینی حکومت نامنظور، اشتراکیت نامنظور۔ تبت زندہ باد۔''

بیسیوں زبانیں سینکڑوں میں تبدیل ہوئیں، سینکڑوں نے ہزاروں کا روپ دھارا اور ہزاروں کی آواز لاکھوں کا آہنگ بن گئی۔ پوتالہ محل کے در و دیوار اور قرب وجوار ان کے نعروں سے مرتعش محسوس ہوا کرتے۔ گیاتسو عوام کا یہ جوش وجذبہ دیکھ کر دنگ تھا۔ وہ عوام کی اس گرمجوشی کا ردِعمل دینے کے لیے محل کی چھت پر چلا آیا۔ نشیب میں ہر جانب انسانی سر دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ سب میرے لیے یہاں آئے ہیں؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''جی ہاں کندن۔ ان سبھی کا ایک ہی مطالبہ ہے کہ وہ آپ کو چینی کیمپ نہیں جانے دیں گے۔ ان کی عقیدت اور محبت چینی فوج کے سامنے دیوار بن جانے کے لیے بھی تیار ہے۔ اگر ایسا ہوا تو بہت خونریزی ہوگی اور یہ بات آپ کو بھی معلوم ہے کہ ہمارے لوگ ہی اسلحہ و بارود کا نشانہ بنیں گے۔'' فالا نے حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا۔

''میں ایسا ہونے کی نوبت ہی نہیں آنے دوں گا۔ میں امن کا داعی ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔'' اس نے جواب دیا۔ فالا بھی تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دے کر عوام کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی طرف دیکھنے لگا جہاں ہر ایک لہر اب بھی نعرہ زن تھی۔

''چینی۔ تبت سے نکل جاؤ۔ تبت آزاد ہے۔''

گیاتسو انتظامی عہدیداران سے گفتگو کرنے کے لیے محل کے خصوصی کمرے میں چلا گیا۔ یہ ملاقات شروع ہوئے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک وزیر متوحش انداز میں وہاں چلا آیا۔

''کندن! باہر حالات بہت خراب ہوگئے ہیں۔ مظاہرین نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے۔''

''ناممکن۔ ایسا کیسے کر سکتے ہیں وہ بھلا؟'' گیاتسو

UUNOVELS.COM

مضطرب ہوا۔ فالا بھی اس خبر پر ساکت رہ گیا۔
"باہر چینی افسران آپ کو لے جانے کے لیے ایک گاڑی میں آئے تھے۔ یہ آدمی بھی انہی کے ساتھ شامل تھا۔ مظاہرین نے پہلے گاڑی پر پتھر برسائے اور پھر اسے بھی ہلاک کر دیا۔" اس انکشاف پر گیاتسو سوچ میں پڑ گیا۔ لمحاتی تذبذب کے بعد وہ فالا سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔
"جنرل کو پیغام بھیج دیجیے کہ میں ان کا دعوت نامہ فی الحال قبول نہیں کر سکتا۔ وہ میری طرف سے معذرت کے ساتھ یہ التجا بھی قبول کریں کہ چین سے یہاں کسی سفیر، افسر یا فوجی عہدیدار کو نہ بھیجا جائے۔ بصورت دیگر عوام کا غم و غصہ قابو نہ کر پانے کا شکوہ نہ کیا جائے۔"
اس کے بعد وہ وزیر کی جانب متوجہ ہو کر بولا۔ "آپ مظاہرین کو بتائیے کہ میرے لیے ان کی خواہشات اور محبت بہت اہم ہے۔ میں ان کی خواہش کے احترام میں چین جانے کا ارادہ غیر معینہ مدت تک مؤخر کر رہا ہوں۔ میں اپنے اس وعدے کا پاس رکھوں گا۔ اب وہ بھی محاصرہ ختم کر کے اپنے گھروں میں لوٹ جائیں۔"
نگران نے اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے محل کی بیرونی دیواروں میں نصب لاؤڈ اسپیکرز سے یہ اعلان نشر کروا کے عوام میں جوش و جذبہ کی ایک نئی لہر پھونک دی۔ وہ سب دلائی لامہ کے حق میں اور چین کے مخالف نعرے بلند کرتے وہاں موجود چینی افسران کے چہروں سے جھلکتے تناؤ اور مایوسی کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کندن کی جانب سے اس یقین دہانی کے باوجود وہ محاصرہ ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بیرونی جانب سے محل کی حدود میں کسی کو آنے دیں گے نہ ہی کوئی محل سے باہر جانے میں کامیاب ہو پائے گا۔ یہ عوام کی عقیدت و محبت کا انوکھا انداز تھا کہ ان کا روحانی اور سیاسی پیشوا اپنے ہی محل میں اسیر ہو کر رہ گیا۔

☆......☆

تبت کی یہ مزاحمت اور چینی فوج سے برتاؤ اعلیٰ افسران کے لیے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ چینی جنرل نے دلائی لامہ کو بارہا پیغام بھجوایا کہ وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ محل کے کسی بھی مخصوص حصہ میں منتقل ہو کر یہ بیان جاری کر دے کہ اسے باغی عناصر نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ چینی اہلکار اس کی مکمل حفاظت کرنے کے لیے بھی تیار تھے۔ مگر گیاتسو کی جانب سے خاموشی اور ان پیغامات کو نظرانداز کیے جانے پر وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہونے لگے۔
دوسری جانب عوام میں یہ تاثر پختہ ہونے لگا تھا کہ دلائی لامہ کو چینی حکومت سے شدید خطرات لاحق ہیں۔ اس کی یہاں موجودگی کسی ناقابل تلافی نقصان کا باعث بن سکتی ہے لہٰذا اسے تیرہویں دلائی لامہ کی طرح کچھ عرصہ کے لیے منظر عام سے غائب ہو جانا چاہیے۔ ڈیکائی اسپرنگ نے بھی خصوصی ملاقات میں اسے روپوشی کا ہی مشورہ دیا۔
"مجھے موت کا کوئی خوف نہیں ہے۔ میں اپنے عوام کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ کوئی میری بات سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔ وزیر، مشیر اور عوام بھی مجھے یہاں سے غائب ہو جانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔" گیاتسو افسردہ تھا۔
"وہ کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہے۔ اس وقت پورے تبت کو آپ کی زندگی درکار ہے کندن۔ کیا آپ کو علم نہیں کہ عوام کے لیے تبت کا دوسرا نام دلائی لامہ ہے۔ آپ کو ذرا سا بھی نقصان پہنچا تو لاکھوں لوگ اپنے مقصد حیات سے جدا ہو جائیں گے۔ موجودہ حالات کے تناظر میں آپ کی روپوشی ہی بہترین فیصلہ ہوگی۔" ڈیکائی نے کہا۔
گیاتسو یہ قدم اٹھانے سے گریز ہی کرنا چاہتا تھا لیکن دباؤ جب حد سے زیادہ بڑھا تو اس کے پاس نی چنگ سے فال نکلوانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ قدیم یونان کی طرح وہ بھی فال اور استخاروں پر بہت یقین رکھتے تھے۔ وہاں موجود گشک کے بھی اراکین سخت تناؤ زدہ تھے۔ نی چنگ ہاتھوں، بازوؤں اور قدموں کو مخصوص منظم انداز میں حرکت دے کر بے خود ہوتا نظر آنے لگا۔ اس کے سر پر ایک بڑی سی گول ٹوپی تھی جس پر تکونی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ان جھنڈوں میں بیرونی پٹی سبز اور اندرونی سرخ رنگ کی تھی۔ رقص کرتے کرتے نی چنگ پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اردگرد موجود افراد کے ساتھ وہیں بیٹھے تینزین گیاتسو کی حسیات بھی چوکنا ہو گئیں۔ دو اشخاص نے نی چنگ کے ہاتھ میں ایک سلیٹ تھما دی۔ اس نے اپنا سر دائیں بائیں پٹختے ہوئے سلیٹ پر آڑھے ترچھے حروف کھینچنے شروع کر دیے۔
"کندن کو آج رات تبت سے چلے جانا چاہیے۔"
ان الفاظ نے تینزین گیاتسو کو کئی لمحوں تک گنگ کیے رکھا۔ نی چنگ کے یہ الفاظ اس کے لیے نظرانداز کیے جانے کے قابل ہرگز نہیں تھے۔ اس کا عقیدہ اور مخصوص وجدان گواہی دینے لگا کہ خطرہ اب بالکل سر پر پہنچ چکا ہے۔ گشک

UUNOVELS.COM

سنے بھی نی چنگ کی اس رائے کو اپنا فیصلہ قرار دے دیا۔

گیاتسو کا دل بے حد بوجھل تھا۔ حالات کی اس تبدیلی نے اسے افسردہ کر رکھا تھا۔ وہ روانگی سے قبل ایک بار عوام سے مختصر ملاقات اور خطاب کرنا چاہتا تھا لیکن گمنگ نے اس خواہش کی سختی سے تردید کردی۔ انہیں بجا طور پر یہ خدشات لاحق تھے کہ عوامی اجتماع میں چین کے مخبر بھی لازماً موجود ہوں گے۔ کندن کی ایسی کوئی بھی بے احتیاطی اس کے لیے مہلک ثابت ہوسکتی تھی۔

تینزین گیاتسو کے لیے تاخیر کا اب کوئی عذر نہ تھا۔ وہ لباس تبدیل کر کے کتنی ہی دیر اپنی مسند پر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کی زندگی ایک عجیب دوراہے پر آ گئی تھی۔ جو سوچا تھا وہ ہوا ہی نہیں اور جو ہو رہا تھا ایسا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ امن اور مذاکرات کی تمام کوششیں ناکام ہوگئی تھیں۔ تبت اور عوام کو چھوڑنا اس سے بھی کٹھن مرحلہ تھا۔ مسند پر بوجھل دل سے ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ممکنہ لائحہ عمل ترتیب دیتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں فالا بھی اسی کی طرح عسکری لباس میں ملبوس وہاں چلا آیا۔ محل کی جانب الوداعی نظروں سے دیکھتے ہوئے دلوں میں یہ اُمید سلامت تھی کہ وہ ایک نہ ایک روز لوٹ کر ضرور آئیں گے لیکن واپسی کی معینہ مدت کا بالکل بھی اندازہ نہ تھا۔ وہ فوجی اہلکاروں کے روپ میں چہروں پر رومال باندھے روانگی کے لیے تیار تھے۔ ایک محافظ نے بندوق لا کر اسے تھمانی چاہی تو وہ تقدیر کی ستم ظریفی پر کوئی ردعمل ہی نہ دے سکا۔ محافظ نے خالی نظروں سے بے حس و حرکت اس بندوق کو دیکھتے گیاتسو کے کندھے سے خود ہی وہ ہتھیار لٹکا دیا۔ سترہ مارچ 1959 کی اس درمیانی شب نیم اندھیرے میں محتاط انداز سے نپے تلے قدم اٹھاتے جب وہ محل سے باہر آئے تو عوامی اجتماع کی اکثریت اس پہر بھی چوکس ہی دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں مذہبی عقیدت اور بقاء کے جنون کی تیز چمک دکھائی دے رہی تھی۔ کئی افراد زیرلب مناجات اور دعاؤں میں مصروف تھے۔ ان سبھی کو اپنے پیشوا کی حفاظت اور چینیوں کا تبت سے انخلاء درکار تھا۔ گیاتسو سب کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا آگے بڑھ گیا۔ گلی کوچوں کے مانوس مناظر بھی اس روز بہت اجنبی محسوس ہو رہے تھے۔ در و دیوار پر ماؤزے تنگ کی تصاویر اور اشتراکیت کو فروغ دیتے اشتہارات صورتِ حال کی سنگینی واضح کرنے لگے۔ تھوڑا سفر مزید طے کرلینے کے بعد وہ ایک آبی گزرگاہ تک آ پہنچے۔

تبت چین کے ان چند بڑے علاقوں میں سے ہے جہاں مویشی پالے جاتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ ہیکٹر سے زیادہ رقبہ مویشی پالنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اڑھائی کروڑ سے زیادہ ان مویشیوں میں یاک، تبتی بھیڑیں، بکریاں، گھوڑے، خچر اور گدھے شامل ہیں۔ یاک کو تبتی سطح مرتفع کے جہاز بھی کہا جاتا ہے۔ تبتی یاک کا دودھ بھی پیتے ہیں۔ ایک 'دری' یعنی مادہ یاک سال میں چار سے سات ماہ دودھ دیتی ہے۔ یاک کا دودھ گائے کے دودھ کی نسبت زیادہ چکنائی کا حامل ہوتا ہے۔ یاک کا گوشت لذت کے باعث مقامی افراد میں بہت مقبول ہے۔ اسے بھون کر، ابال کر اور بعض اوقات کچا بھی کھا لیا جاتا ہے۔ یاک کا گوبر اکٹھا کر کے اپلے بنائے جاتے ہیں جنہیں بطور ایندھن استعمال کیا جاتا ہے۔ یاک کے بالوں اور کھال سے دھاگا، کمبل، لباس، بوٹ، خیمے اور کشتیاں بنائی جاتی ہیں۔

☆☆☆

بدھ مت میں سجدہ بھی بہت منفرد شے ہے۔ پیروکار ہاتھ جوڑتے ہیں، جڑے ہوئے ہاتھ پیشانی، ہونٹوں اور سینے پر لگاتے ہیں اور منہ کے بل زمین پر لیٹ جاتے ہیں، ہاتھ سر کی طرف آگے بڑھاتے ہیں۔ دونوں کو گھما کر اطراف میں لاتے ہیں اور پھر سیدھے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک مشکل عمل ہوتا ہے لیکن بھکشو دن میں درجنوں بار یہ عمل کرتے ہیں۔ کئی پیروکاران سجدوں میں بارہ بارہ کلومیٹر کا سفر بھی طے کرجاتے ہیں۔

رات کی تاریکی اور چاند تاروں کی شفاف روشنی میں پانی کی مدھم آواز بظاہر بہت رومانوی تاثر دے رہی تھی لیکن اس وقت ہر مظہر فطرت پر ایک سا رنگ چھایا ہوا تھا۔ خوف، خدشات، بے یقینی، شناخت اور قومی تشخص کھو جانے کا کرب۔ مختصر مسافت کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں نصف درجن کے قریب مشعل بردار افراد پہلے سے ہی موجود تھے۔ یہ لوگ کھمپا کے جنگجو تھے جنہوں نے کندن اور اس کے اہل خانہ کو خطرے کی حدود سے باہر نکلنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔

لہاسا سے Chela پہنچنے کا سفر گھوڑوں پر طے ہوا۔ انہیں فی الحال اپنی اصل منزل کا علم نہ تھا۔ گیاتسو کے ذہن میں فی الوقت ایک ہی نکتہ تھا کہ کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر چینی وفد سے دوبارہ بات چیت کرتے ہوئے مفاہمت کا راستہ نکالا جائے۔ 'کیشنگ' کی سرحد پر پہنچ کر وہ بلند پہاڑی ٹیلے

UUNOVELS.COM

پر کشش ترائی میں پھیلے مکان اور گلیاں دیکھتے رہے۔ انہیں اپنے لوگوں سے جڑے احساس کی خوشبو اردگرد چکراتی محسوس ہو رہی تھی۔ گیاتسو نے اپنی ٹوپی اتاری اور وہیں ایک ٹیلے پر رکھ کر آگے بڑھ گیا۔

☆......☆

لہاسا سے فرار کے اس سفر کو اٹھارہ گھنٹے بیت چکے تھے۔ وہ مناسب وقفوں سے آرام کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ تبت کے ان دور افتادہ علاقوں میں آنے کے بعد انہیں علم ہوا کہ کچھ طبقات خود پر پڑنے والی چینی افتاد سے باخبر ہی نہیں ہیں۔ اٹھارہ مارچ کی اس رات انہوں نے ایک مقامی کے گھر قیام کیا۔ وہ لہاسا سے آئے ان مہمانوں کی بڑی محبت سے مہمان نوازی کرتا رہا۔

''لہاسا آنے کے لیے میرا بھی بہت دل چاہتا ہے۔'' اس نے کھانا پیش کرتے ہوئے کہا۔

''ضرور آنا میرے عزیز۔'' گیاتسو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بلکہ ایسا کریں گے کہ ہم تمہیں واپسی پر خود اپنے ساتھ وہاں لے جائیں گے۔''

''ہاں! یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔ میں کندن سے بھی مل لوں گا۔'' میزبان سادگی سے بولا۔

''ضرور آنا۔ اسی بہانے میں بھی ان سے ملاقات کرلوں گا۔''

''ویسے کندن ٹھیک تو ہیں ناں؟'' اس نے ایک پلیٹ میں کھانا نکالتے ہوئے ایک اور معصومانہ سوال کیا۔

''ہاں، بالکل ٹھیک ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد ان سے ملاقات کرلو گے۔'' گیاتسو کے اس جواب سے میزبان کے چہرے پر اطمینان، محبت اور سکون کی لہریں موجزن نظر آنے لگیں۔ وہ کئی ثانیوں تک یک ٹک ان رنگوں کی قوس قزح دیکھتا رہا۔ وہ اپنے عوام کی یہ امیدیں، محبت اور عقیدت کا واحد مرکز تھا۔ یہ محبت اسے طاقتور بھی بناتی تھی اور کہیں نہ کہیں کمزوری کا سبب بھی بن جاتی تھی۔ خدشات، امیدوں اور تذبذب کے پینڈولم میں جھولتا یہ قافلہ چوتھے روز Chenye تک پہنچا۔ ستانے کی غرض سے ایک مناسب مقام پر پڑاؤ ڈال لیا گیا۔ کچھ ہی دیر میں انہیں ایک جانب سے غبار اڑتا نظر آنے لگا۔ جنگجو محافظوں نے فوری طور پر ہتھیار سونت لیے۔ وہ کسی بھی خطرے کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تیار تھے تاہم نو وارد کوئی مخالف نہیں بلکہ لہاسا ہی کا رہائشی اور تحمل کا ایک محافظ تھا۔ وہ طویل مسافت اور شدت جذبات سے بے طرح ہانپ رہا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے جوان؟ لہاسا میں سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' فالا نے کسی فوری اندیشے کے تحت پوچھا۔ نو وارد نے اذیت سے اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔

''سب کچھ برباد ہو گیا۔ تباہی نے ہمارے تبت کا رستہ ہی دیکھ لیا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''آپ کے جانے کے دو روز بعد ہی نوربولنگکا کو تباہ کردیا گیا، لہاسا پر بھی بمباری ہوئی ہے۔ آپ جس قدر جلد ہوسکے یہاں سے بھی آگے محفوظ مقام پر چلے جائیے۔''

گیاتسو یہ سن کر وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ قافلہ میں موجود ہر شخص صدمہ و حیرت سے ساکت تھا۔

''کیا آپ اب بھی چین سے مذاکرات کے لیے کوئی راہ نکالنا چاہتے ہیں کندن۔'' فالا نے اپنی مخصوص نرمی سے دریافت کیا۔

''نہیں، چین سے بات کرنے یا مذاکرات کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں اپنے قافلے کا رخ تبدیل کرنا ہوگا۔''

''اب آپ کس ملک میں پناہ لینے کا سوچ رہے ہیں؟''

''بھارت۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چین سے مشترکہ مسائل کی وجہ سے وہی ہماری مدد کرسکتا ہے۔''

''کیا ہم بھارت پر اعتماد کرسکتے ہیں کندن؟'' فالا متذبذب تھا۔

''مجھے ابھی کچھ علم نہیں فالا۔ ایسا لگتا ہے کہ تباہی و بربادی کی اس نئی داستان نے میری سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت سلب کرلی ہے۔ دشمن کا دشمن بھی تو دوست ہی ہوتا ہے اس لیے موجودہ صورتِ حال میں بھارت سے بہتر کوئی جائے پناہ نہیں۔ میں بھوٹان بھی خط لکھ کر وسائل طلب کروں گا۔''

''لہاسا اور نوربولنگکا میں جانے کیا عالم ہوگا؟ ہمارے پیارے کس حال میں ہوں گے؟'' قافلے میں موجود ایک شخص نے نمناک لہجے میں کہا۔

☆......☆

تینزن گیاتسو کے قافلے کا وہ سفر بلا تعطل جاری تھا۔ تھکاوٹ اور اعصاب زدگی ان کے چہروں سے جھلکنے لگی تھی۔ ایک بستی میں مختصر قیام کے دوران ریڈیو پر سنی جانے والی خبروں سے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ لہاسا میں صورت

UUNOVELS.COM

حال بہت تناؤ زدہ ہے اور دلائی لامہ منظر عام سے غائب ہے۔ عوامی سطح پر ہونے والی تباہی کا کہیں کوئی ذکر ہی نہ تھا۔ یہ دو سطری خبر اس قافلے کے لیے سوچ کے کئی در وا کر گئی۔ انہیں اسی وقت احساس ہو گیا کہ عالمی برادری کی جانب سے کوئی حوصلہ افزا ردِعمل یا مدد نہیں ملے گی۔ اس احساس نے ہر ایک کی ذہنی کیفیت کو متاثر کیا۔ کھمپا قبیلے کے جنگجوؤں کا مزاج بھی بہت افسردہ اور کم گو ہو گیا تھا۔ پڑاؤ کی صورت میں ان کا سربراہ کسی نہ کسی پتھر سے پشت ٹکائے آسمان کی وسعتوں میں دیکھتا اپنی آزادی کے شب و روز پر مبنی مقامی گیت گانے لگتا۔ اس گیت میں گزشتہ زندگی کی بہاریں یاد کرتے ہوئے موجودہ خزاں سے نجات کی اُمید اور اچھے دنوں کے انتظار کی آس جھلکتی تھی۔ وہ اپنی موت سے آیندہ نسلوں کو ایک آزاد ملک دینے کے بعد چلے آنے کی التجا کرتا۔ اس گیت کے بول اور روح کی تڑپ قافلے میں موجود ہر فرد کا دل گرما کر ایک بار پھر مصائب اور مسافت کی صعوبتیں سہنے کے لیے تازہ دم کر دیتی۔

کچھ ہی گھنٹوں بعد ریڈیو کے ذریعے یہ خبر ملی کہ چین نے دلائی لامہ کی حامی تبتی حکومت تحلیل کر کے اپنا نظام حکمرانی رائج کر لیا ہے۔ اس وقت اہل تبت کو مثبت تحریک دینے اور چین کو جوابی پیغام پہنچانے کے لیے ایک بیانیہ جاری کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک خصوصی پروانے پر دستخط اور دلائی لامہ کی مخصوص مہر ثبت کر کے سترہ نکاتی معاہدہ کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ ان احکامات کے تحت یہ قانون بھی لاگو کیا گیا کہ مستقبل میں دلائی لامہ دنیا کے جس حصے سے بھی چاہے، تبتی حکومت کے احکامات نافذ کرنے کا مجاز ہوگا۔ سترہ نکاتی معاہدہ سے نجات اور جلاوطن ہی سہی لیکن تبتی حکومت کے قیام کے اس اعلان سے جنگجوؤں کا ولولہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ ان کی توانائی کو ایک مثبت اور نیا رخ مل گیا تھا۔

لہاسا سے شروع ہونے والا یہ سفر اپنے دسویں روز تک آ پہنچا تھا۔ طویل اور مسلسل مسافت کے بعد اب وہ اس مقام پر موجود تھے جہاں انہیں کھمپا جنگجوؤں کو شکریہ ادا کرتے ہوئے الوداع کہنا تھا۔ ان کی جانثاری اور وفاداری نے ہر پل اسے ایک حصار میں لے رکھا تھا۔

اگلی صبح سفر کا آغاز دوبارہ ہوا۔ ہر جانب سنگلاخ پہاڑوں، بے آب و گیاہ ماحول اور ذہنی تناؤ نے اسے کھانسی، بخار اور شدید تھکاوٹ سے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ اس سارے قضیے میں اپنی حیثیت اور کردار کا جائزہ لیتا رہا۔ خود احتسابی کے اس عمل میں ممکنہ مستقبل کی پریشانی اعصابی انتشار میں مزید اضافہ کر دیتی۔ انتیس مارچ کی اس رات وہ بخار سے سرخ رنگت لیے پتھریلی زمین پر تاروں بھرا آسمان اوڑھے لیٹا رہا۔ آسمان کی خوابناک تاریکی میں اسے اپنے بچپن کے کھیل کود، کہانیاں سننے کی فرمائشیں، بہن بھائیوں کا دانستہ طور پر چڑانا یاد آتا رہا۔ امیڈو میں تین مہمانوں کی آمد، پوتالہ محل منتقلی، کچھ عرصہ بعد والد کی وفات اور تدفین یاد آئی تو آنکھوں کے گوشے نمی سے بھیگ گئے۔ مختصر ترین اقتدار کے بعد اس طویل تر ہوتی آزمائش کا خیال اور غیر یقینی مستقبل اسے کسی طور چین لینے ہی نہ دے رہا تھا۔ رات قطرہ قطرہ پگھلتی رہی۔ صبح ہونے سے کچھ دیر پہلے فالا اس کے پاس چلا آیا۔

"ہماری مشکلیں ختم ہونے کا وقت آ گیا ہے کندن۔ بھارت نے ہمارے لیے اپنی سرحد کھولنے کی ہامی بھر لی ہے۔"

فالا کی یہ خبر سن کر اس نے آسودگی سے آنکھیں موند لیں۔

☆......☆

بھارت میں داخلہ کے بعد تینزن گیاتسو کی زندگی میں ایک ہی موسم ٹھہر گیا۔ جدوجہد اور انتظار۔ اسے علم ہی کہاں تھا کہ ماحول، وقت، افراد اور نظام کی تبدیلی میں اس نے آنے والی کئی دہائیوں میں اپنی ذات کو صرف اور صرف عوامی استحکام اور آزادی کے لیے طویل مسافت طے کرنی ہے۔

وہ سب لہاسا سے انخلاء کے تیرہویں روز تیس مارچ کو Twang پہنچے تھے۔ بھارتی افسر نے اس قافلے کا خوش دلی سے استقبال کیا۔ دلوں میں آزادی کی اُمید اور اچھے وقتوں کی آس لیے وہ ہندوستان کے شہر 'دھرم شالہ' میں مقیم ہو گئے۔ دھرم شالہ شمالی ہندوستان کی ریاست ہماچل پردیش کا شہر تھا۔ وادی کانگرہ میں واقع اس شہر کا بدھ مت سے بہت پرانا تعلق رہا تھا۔ یہاں کئی قدیم خانقاہیں بھی موجود تھیں۔ یہاں آمد کے بعد اس کی ملاقات ہندوستانی وزیر اعظم جواہر لال نہرو سے ہوئی۔ نہرو نے بھی ان کا استقبال خوشدلی سے کیا۔ اس نے اسے دھرم شالہ میں ہی جلاوطن حکومت بنانے کی پیشکش بھی کر دی۔ گیاتسو نے ہامی بھر لی۔

جلاوطن حکومت کے قیام کا اعلان ہوتے ہی اس حکومت کے اغراض و مقاصد بھی فوری طور پر واضح کر دیے گئے۔

1۔ تبتی پناہ گزینوں کی نمائندگی۔
2۔ تبتی بدھ مت، کلچر اور زبان کا فروغ۔
3۔ تبتی بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت۔

4۔ جلاوطنی میں اپنے قومی و ثقافتی تشخص کا تحفظ۔

5۔ جمہوری طرز حکمرانی کی اساس پر تبتی عوام کے حق خود اختیاری کا دفاع۔

6۔ تبت کی آزادی کے لیے جدوجہد۔

اڑتیس مربع کلومیٹر رقبہ پر محیط اس شہر کے متعلق گیاتسو نے اپنے ذہن میں مستقبل کا مبہم سا خاکہ تیار کرلیا تھا۔ اس نے 'جلاوطن حکومت تبت' قائم کرنے کے بعد اپنے امراء اور وقتاً فوقتاً ہندوستان آنے والے تبتیوں کی بستیاں بسانی شروع کردیں۔ تبتی بچوں کو ان کی زبان' تاریخ' مذہب اور ثقافت سے روشناس کرانے کے لیے فوری طور پر ایک تعلیمی نظام تشکیل دیا گیا۔ اسی برس 'تبتی انسٹی ٹیوٹ فار پرفارمنگ آرٹس' قائم کیا گیا۔ ہندوستان آمد کے بعد اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی خود کو اپنے مقصد سے الگ نہیں کیا تھا۔ پہلے ادارے کے بعد فوری طور پر 'مرکزی انسٹی ٹیوٹ برائے اعلیٰ تبتی مطالعات' بھی قائم کردیا گیا۔ یہ ادارہ ہندوستان میں تبت کے لیے اولین یونیورسٹی تھا۔ تبتی بدھ مت کی تعلیمات اور تبتی طرز حیات محفوظ رکھنے کے لیے دو سو پگوڈے بھی تعمیر کروانے کا آغاز ہوا۔ اس نے اپنی سربراہی میں ہندوستان اور نیپال میں تبتی پناہ گزینوں کے لیے 'ترپن' بستیاں بسائیں۔ تبتی بچوں کے لیے 'تبتی چلڈرنز ویلجز' نامی اسکول کھولے گئے۔ مقدس کتابوں اور روایتی تبتی طریقہ علاج کے تحفظ کے لیے خصوصی ادارے بنائے گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ 'فری تبت موومنٹ' نے کافی مقبولیت اختیار کرلی۔ امریکی سیاسی جماعتوں اور سی آئی اے اس تحریک کی حمایت کرتی رہی۔ ان کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا کہ وقتاً فوقتاً عوامی جمہوریہ چین پر سیاسی دباؤ بڑھانے کے لیے اسے استعمال کیا جاسکے۔

اگلے چند سالوں میں دیگر مغربی اقوام نے بھی دلائی لامہ اور اس کے مقاصد کو بے حد اہمیت دی۔ 'عدم تشدد فلسفہ' کئی فلمی اداکاروں' موسیقاروں' گلوکاروں اور اہم شخصیات میں پہلے ہی کافی مقبول تھا۔ دھیرے دھیرے وہ اس نیم مذہبی' نیم سیاسی تحریک کے مکمل ہم نوا بننے لگے۔ 1962 کی چین ہندوستان جنگ کے بعد بھارت نے بھی اپنی حکمت عملی تبدیل کردی۔ بھارت نے چین پر دباؤ بڑھانے کے لیے اس تحریک کو بھرپور تعاون فراہم کیا۔ 1959، 1961 اور بعدازاں 1965 میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے تبتی عوام کے حق خود اختیاری کو تسلیم کرتے ہوئے قراردادیں منظور کیں لیکن چین تبت کو اپنا تاریخی حصہ قرار دیتے ہوئے ان قراردادوں کی مخالفت کرتا رہا۔ 1963 میں گیاتسو نے ایک جمہوری آئین کا اعلان کردیا۔ اس آئین کی بنیاد 'انسانی حقوق کا آفاقی اعلامیہ' تھا۔ ہندوستان میں آکر آباد ہوجانے والے تبتیوں نے جلاوطن پارلیمنٹ کا انتخاب کیا۔ اس پارلیمنٹ نے جلاوطنی تبتی حکومت قائم کردی۔

☆......☆

وقت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ سدا ایک سا نہیں رہتا اور اسی وقت کے دھارے میں بہہ کر اقوام اور افراد کا رویّہ بھی غیر یکساں ہوجایا کرتا ہے۔ اقوام عالم کی مدد اور تعاون بھی اسی وقت کی چال کے محتاج ہوا کرتے ہیں۔ خارجہ پالیسی' داخلی معاملات اور سفارتی و معاشی تعلقات ان رویوں پر لازماً اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔ دلائی لامہ کی 'فری تبت موومنٹ' بھی اسی آفاقی المیہ کا شکار ہوگئی۔

کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں امریکی سی آئی اے نے اس کی بھرپور مدد کی۔ اس سے قبل 1950ء کی دہائی کے اواخر میں تبت میں مسلح بغاوت بھی سی آئی اے کے تعاون سے ہی ہوئی تھی۔ تبتی نوجوانوں کو 'کولولاڈو' میں گوریلا تربیت اور اسلحہ فراہم کیا جاتا رہا۔ کولولاڈو کا علاقہ تبت سے کافی مشابہت رکھتا ہے۔ تبتی نوجوانوں کو گوریلا تربیت اور اسلحے کا استعمال سکھا کر تبت میں شورش برپا کی جاتی رہی۔ یہ سلسلہ 1971 تک نہایت ہموار طریقہ سے جاری رہا۔ بعدازاں وسیع تر قومی مفاد کے تحت سی آئی اے کو امداد میں کمی کرنا پڑی۔ یہ وہ دور تھا جب امریکی صدر نکسن کے زیر اقتدار چین اور امریکا کے باہمی تعلقات میں بہتری پیدا ہونے کا آغاز ہوگیا تھا۔ نکسن مارکسیزم کا مخالف ہونے کے باوجود اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ چین ایک ابھرتی ہوئی مارکیٹ ہے۔ قومی سلامتی اور ترقی کے لیے ان کا جذبہ اور لگن بہت جلد انہیں اولین عالمی صفوں میں لاکھڑا کریں گے۔ موجودہ وقت میں جو ممالک ان سے بیر باندھ کر بیٹھے رہے وہ مستقبل قریب میں معاشی فوائد حاصل کرنے میں ناکام رہیں گے۔ نکسن نے عملیت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فری تبت موومنٹ کو پس پشت ڈالا اور چین کے ساتھ تعلقات میں بہتری لانے کے اقدامات کا آغاز کردیا۔ امریکا کی اس کایا کلپ نے دیگر مغربی ممالک نے اپنی خارجہ پالیسیوں پر نظر ثانی کی ابتداء کردی۔ ان بھی کی کوشش تھی کہ چین سے خوشگوار تعلقات قائم کیے جاسکیں۔

UUNOVELS.COM

نتیجتاً جلاوطن تبتی حکومت سے عالمی توجہ کم ہوتی گئی۔
عالمی برادری کے خیالات کی تبدیلی کے بعد دلائی لامہ نے اپنے کمیونٹی کے مسائل حل کرنے کے لیے اہل تبت کے ساتھ اجتماعی کوششیں شروع کردیں۔ اسی تناظر میں تبتی یوتھ کانگریس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اکتوبر 1970 میں دھرم شالہ میں ہی ایک اجلاس منعقد کیا گیا۔ گیاتسو نے اس موقع کو بہترین تصور کرتے ہوئے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں زور دیا کہ تبتی نوجوان اپنی کمیونٹی کی خدمت کو مذہبی شعار سمجھیں ان کے مسائل کے حل کے لیے جدوجہد کیا کریں۔ یہ تنظیم تبتی نوجوانوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ اس کے علاوہ 'تبتی عوامی تحریک برائے آزادی' نے بھی کافی مقبولیت حاصل کی۔ 1977 میں دہلی میں مظاہرہ کیا گیا۔ جلاوطن ہونے کے بعد یہ تبتیوں کا اپنی نوعیت کا پہلا مظاہرہ تھا۔ گیاتسو کی بھرپور کوششوں کے باوجود عوام میں احساس محرومی پروان چڑھنے لگا۔ ستر اور اسی کی دہائی میں تبتی اپنے رہنما کی حکمت عملیوں سے نالاں نظر آنے لگے۔ انہیں دلائی لامہ سے یہ شکوہ تھا کہ اس کی پالیسی اطمینان بخش نہیں ہے۔ انہی دہائیوں میں مقامی افراد نے مغربی ممالک تک آواز پہنچانے میں بلاتکان کام جاری رکھا لیکن آزادی کا خواب شرمندہ تعبیر ہوکے ہی نہ دیا۔

☆.....☆

وقت کا وہ سفر 'اسی' کی دہائی کے اختتامی پڑاؤ تک آپہنچا۔
تبتی کمیونٹی گزشتہ 'تیس' برس کی جلاوطنی اور اپنے بنیادی حقوق کے استحصال سے ذہنی دباؤ کی اس سطح پر آگئے تھے جہاں انہیں عدم تشدد اور پرامن جدوجہد ایک کار لاحاصل محسوس ہونے لگی۔ تینزین گیاتسو نے ان کی مخالفت کے باوجود اپنا فلسفہ حیات اور طرز فکر تبدیل نہیں کیا۔ اس کا موقف تیس برس بعد بھی واضح تھا کہ تبتی عدم تشدد کے ذریعے ہی اپنے حقوق بہ آسانی حاصل کرسکتے ہیں۔ اس کی تحریروں اور تقریروں میں امن پسندانہ موقف ہی غالب رہا۔ تبت کے لیے ان خصوصی کاوشوں کے علاوہ عمومی طور پر بھی وہ عالمی فروغ امن کے مقصد کی بھرپور تائید کرتا رہا اور پھر وقت نے وہ دن بھی دکھایا جب تیس سال کے اس سفر میں ذرائع ابلاغ میں ہونے والے اس اعلان نے ہزاروں تبتیوں کی آنکھیں نم کردیں۔
''ناروجین نوبل کمیٹی نے 1989 کا امن کا نوبل انعام تبتی عوام کے مذہبی اور سیاسی رہنما چودھویں دلائی لامہ تینزین گیاتسو کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ کمیٹی اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتی ہے کہ دلائی لامہ نے ہر مقام پر تبت کی آزادی کی اس جدوجہد کے دوران عدم تشدد کا نظریہ پروان چڑھایا ہے۔ انہوں نے اپنے عوام کی تاریخی اور ثقافتی ورثے کے تحفظ کی غرض سے تحمل اور باہمی احترام کی بنیاد پر پُرامن حل کو فروغ دیا ہے۔ اس فلسفہ امن میں ہر جاندار کا احترام مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد انسان اور فطرت کے یکساں احترام کا تصور ہے۔ کمیٹی کی رائے میں دلائی لامہ نے بین الاقوامی تنازعات 'انسانی حقوق کے معاملات اور عالمی ماحولیاتی مسائل کے حل کی خاطر تعمیری کام ہی کیے ہیں۔''
گیارہ دسمبر 1989 کے اس یادگار روز تبتی عوام اور رہنماؤں کی چار دہائیوں سے زائد عرصہ پر مشتمل جدوجہد کو امن کا نوبل انعام دے دیا گیا۔ تینزین گیاتسو نے یہ انعام حاصل کرتے ہوئے اپنی سوچ اور نظریہ بہت موثر انداز میں عالمی ایوانوں تک پہنچایا۔

سر عبداللہ ہارون

پیدائش 1872ء، وفات 27 اپریل 1942ء۔ سر عبداللہ ہارون ایک برطانوی ہندوستانی سیاست دان تھے جنہوں نے اقتصادی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی شعبوں میں مسلمانوں کے کردار کی اہمیت کو برصغیر میں اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

چودھری رحمت علی

پیدائش 16 نومبر 1897ء، وفات 3 فروری 1951ء۔ چودھری رحمت علی پاکستان کا نام تجویز کرنے والے ایک شخص سیاست دان تھے۔ انہیں دنیا کا پہلا پاکستانی کہا جاتا ہے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے ایک مکتب سے حاصل کی جو ایک عالم دین چلا رہے تھے۔ میٹرک اینگلو سنسکرت ہائی اسکول جالندھر سے کیا۔ 1914ء میں مزید تعلیم کے لیے لاہور تشریف لائے۔

UUNOVELS.COM

"بھائیو اور بہنو! جب میں دنیا کے مختلف خطوں میں لوگوں سے ملتا ہوں تو میرے ذہن میں ہمیشہ یہی سوچ پیدا ہوتی ہے کہ تمام انسان ایک جیسے ہیں۔ ہمارے لباس، رنگ، زبانیں ممکنہ طور پر مختلف ہوسکتی ہیں لیکن یہ فرق سطحی ہیں۔ بنیادی طور پر ہم انسان ہیں۔ اسی یکسانیت نے ہمیں باہمی طور پر جوڑ رکھا ہے۔ اسی مشترک پہلو کے باعث ہم ایک دوسرے کو سمجھنے اور دوست بننے کے قابل ہوئے ہیں۔

آج میں نے آپ کو ایسے مسائل کے حوالے سے اپنے خیالات سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جنہیں ہم 'انسانی گھرانے' کے ارکان کی حیثیت سے چاروناچار جھیلتے ہیں۔ کرۂ ارض کے باسی ہونے کی حیثیت سے ہم سبھی کو آپس میں ہی نہیں بلکہ فطرت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہوکر جینا سیکھنا چاہیے۔ یہ ایک خواب نہیں 'ضرورت' ہے۔ ہم کئی حوالوں سے ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں۔ ہمیں دوسروں کو اپنی خوشیوں میں شریک کرنا چاہیے۔ ہم الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔

آج ہم حقیقتاً عالمی خاندان ہیں۔ دنیا کے ایک حصہ میں ہونے والے واقعات دوسرے حصے کے رہائشیوں پر اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔ اس بات کا اطلاق صرف منفی پر ہی نہیں بلکہ مثبت واقعات پر بھی ہوتا ہے۔ جدید مواصلاتی ٹیکنالوجی کے باعث ہمیں دنیا کے ہر حصے میں ہونے والے واقعات کا علم ہی نہیں ہوتا بلکہ ہم ان سے براہِ راست متاثر بھی ہوا کرتے ہیں۔ مشرقی افریقا میں فاقہ زدہ بچوں کے متعلق جان کر ہم افسردہ ہوجاتے ہیں۔ دیوار برلن کے گرنے سے عوام کے دوبارہ متحد ہوجانے کی خبر ہمیں خوشی فراہم کرتی ہے۔ میلوں دور کسی بھی ملک میں ہونے والا ایٹمی حادثہ ہماری فصلیں اور مویشی زہر آلود کردیتا ہے۔ جب دیگر براعظموں میں متحارب فریقوں میں امن قائم ہو تو گویا ہماری اپنی سلامتی کو تحفظ مل جاتا ہے۔

مادی ترقی انسانی ارتقاء کے لیے بے حد اہم سہی لیکن میں ماضی میں بھی ایک ہی بات کہتا آیا ہوں کہ روحانی ترقی کے بغیر یہ سنگین مسائل کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ میں نے کئی ممالک ایسے دیکھے ہیں جہاں خارجی ترقی کو تو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لیکن ان کی داخلی ترقی کی رفتار کچھوے سے بھی زیادہ سست ہے۔ میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ اصل ترقی اور توازن کے لیے داخل اور خارج دونوں ہی کی اہمیت مسلمہ ہے۔ داخلی سکون کو نظرانداز کیا ہی نہیں جاسکتا۔ یہی وہ واحد شے ہے جس کا حصول خارجی مسائل کے نقصانات سے محفوظ رکھتا ہے۔ داخلی سکون نہ ہو تو ہزاروں مادی آسائشات کے باوجود آپ حالات کے ہاتھوں ہمیشہ پریشانی اور ناخوشی ہی پائیں گے۔

میں دنیا میں ہونے والی تعمیری پیش رفتوں پر بہت خوشی محسوس کرتا ہوں۔ میں اس بات پر بھی بہت مسرور رہتا ہوں کہ یورپی نوجوانوں نے معاشی ترقی کے نام پر ہونے والے ماحول کی تباہی کو روکنے کے لیے سنجیدہ اقدامات کیے ہیں۔"

☆......☆

چودھویں دلائی لامہ کی امن و آزادی کے لیے جدوجہد عالمی سطح پر تسلیم کرلی گئی لیکن اس اقرار کے باوجود آزادی کا اصل خواب شرمندہ تعبیر ہوکے ہی نہ دیا۔ جلاوطنی اور اپنے عوام سے دوری کی وہ تڑپ تو جوں کی توں برقرار تھی۔ اس کشمکش میں نوے کی دہائی نے بھی اپنے سفر کا آغاز کردیا۔ دنیا بھر کی نظریں بیسویں صدی کی آخری دہائی جلد از جلد گزار کر نئے 'میلینیم' کے استقبال پر تھیں اور ایک تینزن گیاتسو تھا کہ جس کی جدوجہد اس وقت بھی اپنا پیغام امن مختلف عالمی فورمز میں پہنچانے میں شب و روز کا فرق بھول چکا تھا۔ 'ایریزونا سٹیٹ یونیورسٹی' میں ہزاروں افراد کے اجتماع سے خطاب میں اس نے وقت کی نبض مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اسٹیج کے عقبی حصے میں موجود مقامی رپورٹرز، فوٹوگرافرز، سیکیورٹی کا عملہ، طلبا، عقیدت مندوں اور مخالفین کے جم غفیر کی جانب مسکراہٹ اچھالتے اور سلام کرتے ہوئے وہ ایک پردہ ہٹا کر اسٹیج پر پہنچ گیا۔ فلک شگاف نعروں اور تالیوں میں اس کا استقبال فقید المثال تھا۔ اس کی فرمائش پر روشنیاں مدھم نہ کی گئیں۔ اس کا زعفرانی لبادہ اور مشفقانہ مسکراہٹ مجمع کو مسحور کرنے لگی۔ تقریر کا آغاز کرتے ہی ہر طرف سناٹا طاری ہوگیا۔

"میرا خیال ہے کہ میں آپ میں سے اکثریت سے پہلی بار ملاقات کررہا ہوں۔ دوست پرانا ہو یا نیا مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا ازل سے ہی یہ عقیدہ رہا ہے کہ ہم سب ایک ہیں۔ ہم سب انسان ہیں۔ ہمارے تہذیبی پس منظر، عقائد، رنگ و نسل اور طرزِ حیات میں فرق ایک فطری بات سہی لیکن انسانیت کا باہمی رشتہ کبھی جھٹلایا ہی نہیں جاسکتا۔ ہمارا جسمانی ڈھانچا، ذہن اور فطرت ایک ہے اور ایک ہی رہے گی۔ میں جب بھی کسی شخص سے ملتا ہوں تو ہمیشہ یہی محسوس کرتا ہوں کہ ایک اپنے ہی جیسے انسان سے مل

رہا ہوں۔ اس سطح پر مجھے دوسروں کے ساتھ گفتگو میں بڑی سہولت اور سکون رہتا ہے۔ ہمارے درمیان فرق صرف قومیت اور مذہب کا ہے اگر کوشش کی جائے تو ان اختلافات کو بھی نظر انداز کر کے اپنے خیالات' نظریات اور تجربات بہ آسانی بانٹے جا سکتے ہیں۔''

تقریروں اور تحریروں میں انسانیت سے محبت اور امن کا درس دیتے نئی صدی کا آغاز ہو گیا۔ ایک عالم اس کی گفتگو اور نظریات کا گرویدہ تھا' جدوجہد کو سراہتا تھا' خیالات کی برملا داد دے کر نعروں اور تالیوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا کرتا تھا لیکن اس کی جلاوطنی ختم کروا کے آزادی کی نوید نہیں دلوا سکتا تھا۔ تبت کی آزادی کشمیر' فلسطین' بوسنیا اور چیچنیا کی طرح قراردادوں کی منظوری اور احتجاجی مظاہروں تک ہی سمٹ گئی۔ ٹی وی چینلز' ریڈیو اسٹیشنز اور دیگر ذرائع ابلاغ اس کے انٹرویوز لیتے' اس کے مطالبات عالمی ایوانوں تک پہنچاتے' امن کی جدوجہد پر مختلف انعام و اکرام سے نوازتے لیکن اصل مسئلہ تو اب بھی کسی کوہ گراں کی طرح برقرار تھا۔ یہ ستائش اور انعامات اس خلش اور تڑپ کو ختم نہیں کر سکتے تھے جو اسے اپنی مادری سرزمین کا تصور دیا کرتا۔

اکیسویں صدی کے سفر میں اس نے دنیا بھر میں ایسی اخلاقی' تہذیبی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہوتے دیکھیں جن کا تصور ہی بہت اذیت ناک تھا۔ ان میں شرمناک حد تک تکلیف دہ وقت وہ تھا جب بدھ مت کے پیروکاروں کی جانب سے میانمار میں روہنگیا مسلمانوں پر ظلم و تشدد کی خبریں سننے کو ملیں۔ تینزین گیاتسو کے لیے وہ وقت بہت کٹھن اور ناقابل یقین تھا۔ اس نے اہل میانمار کو یہ یاد دہانی کروانے کا آغاز کر دیا کہ ان کے مذہب میں تحمل' رواداری اور محبت بنیادی ستون رہے ہیں۔ قتل و غارت اور ظلم و تشدد کا فلسفہ کبھی ان کی تعلیمات کا حصہ نہیں رہا۔ جبر کی یہ لہر صرف روہنگیا تک ہی محدود نہیں تھی۔ عدم برداشت اور نفرت دھیرے دھیرے آفاقی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ان مسائل کا پُرامن حل نکالتے ایک اور سوال عالمی ایوانوں کے توسط اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''پندرہواں دلائی لامہ کون ہوگا؟''

تینزین گیاتسو کے لیے یہ محض ایک سوال نہیں بلکہ بھاری بھرکم ذمے داری تھی۔ اس کے نزدیک دلائی لامہ فرد واحد کی بجائے ایک مکمل ادارے کا نام تھا۔ تبتی قوم کے اگلے روحانی اور سیاسی پیشوا کا انتخاب کیسے ممکن ہوتا؟ اس کا جانشین تبت کے انہی گلی کوچوں میں کہیں موجود تھا جن کی خوشبو آج بھی اس کے حواس معطر رکھتی تھی یا وہ کہیں بھارت میں کہیں اسے ملتا؟ سوالات کا یہ طویل سلسلہ ختم ہونے سے قبل ہی خبریں ملیں کہ چین کے ترقی پسندوں نے دلائی لامہ کا یہ 'سلسلہ' ختم کر دینے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ ان کے نقطہ نظر سے کسی بھی مذہبی اور سیاسی رہنما کی 'پیدائش نو (اوتار)' منطقی اور سائنسی اعتبار سے ایک ناممکن امر تھی۔ موت کے بعد کسی نئے بدن میں دوبارہ حیات ہونا ایک گمراہ کن عقیدہ تھا اور وہ اپنے 'تاریخی حصہ' تبت کو گزشتہ پانچ صدیوں کی اس سوچ سے نجات دلوانا چاہتے تھے۔ کچھ عرصہ قبل دلائی لامہ نے تبت میں ایک لڑکے کو 'پنچن لامہ' کا نیا روپ قرار دیا تھا جس کے جواب میں ترقی پسندوں نے اسے نظربند کر کے اس کی جگہ اپنے منتخب شدہ فرد کو پنچن لامہ کا نیا اوتار ٹھہرا دیا۔ اس امر کے بعد تبتی قوم میں اگلے دلائی لامہ کے متعلق بھی ہزار ہا خدشات پیدا ہو گئے۔

عالمی ذرائع ابلاغ نے پندرہویں دلائی لامہ کے انتخاب کے متعلق گیاتسو سے بہت سوالات کیے۔ اس تفتیش کو وہ مسکرا کر ٹال دیتا۔ کسی موقع پر یہ کہتا کہ چودھویں دلائی لامہ کی مقبولیت اور کردار کے بعد یہ سلسلہ کہیں خوشگوار احساس اور مثبت یادوں کے ساتھ اختتام پذیر ہو جانا چاہیے تو کبھی کسی دوسرے موقع پر مبہم سے انداز میں اپنا بیانیہ بدلتے ہوئے معنی خیزی سے مخاطب کو کہتا کہ اپنی عمر کے نوے سال مکمل ہونے پر وہ تبت کے اعلیٰ مذہبی اداروں اور اپنے معتمد 'تلکووں' کو اگلے دلائی لامہ کے متعلق تحریری ہدایات سونپ دے گا۔ تبتی سرزمین کی اس پُراسرار ترین شخصیت کا مستقبل پہلے منظر عام پر آئے گا یا نصف صدی سے بھی زائد عرصہ پر محیط آزادی کی جدوجہد کامیاب ہو گی؟ اس کا جواب تو صرف وقت ہی دے گا۔ دیکھیں گے لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔ کیونکہ ہم نے یہ بھی تو دیکھا ہے کہ وقت سے بہتر جواب کوئی بھی نہیں دیتا۔

ماخذات:۔

دلائی لامہ از کرسٹوفر ابرلس ...... وکی پیڈیا

Kundan

Realizing Oneness in all Humanity- The Dalai Lama

In Search of Kundan

UUNOVELS.COM

حلف

زرین قمر

عوام کی جان و مال محفوظ رہے، وہ چین کی نیند لے سکیں، کوئی دشمن ان کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھ نہ سکے، اس حلف کے ساتھ فوجی جوان اپنے جسم پر وردی سجاتے ہیں اور اس وردی کی آبرو کی خاطر، عوام کے سکھ چین کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ بھی دے دیتے ہیں۔ زیر نظر کہانی برادر ملک ترکی کی ہے۔ اس کہانی پر ڈرامے بھی بنے اور کتابیں بھی لکھی گئیں۔

ان صف شکنوں کا ذکر جو ملک کی خاطر سر سے کفن باندھ کر نکلے تھے

پہاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹے سے بنجر زمین کے ٹکڑے پر ایک ٹیلے کے پیچھے صالح چھپا ہوا دفاعی فائرنگ کر رہا تھا۔ اس پر چاروں طرف سے گولیاں برس رہی تھیں۔ وہ دہشت گردوں کے نرغے میں پھنس گیا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی اپنی اپنی جگہ مورچے سنبھالے بیٹھے تھے۔ انہوں نے دہشت گردوں کے کئی افراد کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ اب بازی ان کے ہاتھ میں تھی کہ اچانک ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور صالح کے سر میں سوراخ کرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ صالح زمین پر گر گیا اسے گرتا دیکھ کر کمانڈر ڈپٹی لیفٹیننٹ ظفر یامن زور سے چیخا۔ ”صالح!“ لیکن صالح نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”صالح! صالح!“ اسکواڈ کمانڈر نے دوبارہ اسے پکارا دشمن کی فائرنگ بند ہو گئی تھی۔ شاید وہ فرار ہو چکے تھے اس لیے خاموشی چھا گئی تھی۔ کمانڈر اپنا مورچہ چھوڑ کر صالح

UUNOVELS.COM

کے قریب آ گیا۔ صالح زمین پر پڑا۔ فضا میں بارود کی بو رچی ہوئی تھی۔

"صالح! اسکواڈ کمانڈر ظفر نے پھر پکارا اور اس کا سر اپنے ہاتھوں سے تھاما۔ چند لمحے پہلے دہشت گردوں کے پھینکے ہوئے ہینڈ گرنیڈ سے اس کی سیدھی ٹانگ بھی اڑ چکی تھی۔ صالح کا جسم کانپا اس نے ایک ہچکی لی اور اس کی روح تن سے جدا ہو گئی۔ اسکواڈ کمانڈر نے اس کی آنکھیں آہستہ سے بند کر دی تھیں۔"

وطن کی حفاظت کرنے والے جیالے دل و جان سے اپنے وطن اور عوام کی خدمت کرتے ہیں۔ موت ہر وقت جن کے تعاقب میں رہتی ہے جو ہر وقت، اپنی ہر سانس کے ساتھ ہر گھونٹ اور ہر نوالے کے ساتھ، ہنستے ہوئے، چلتے ہوئے اپنے ہر قدم کے ساتھ اسے محسوس کرتے ہیں۔ ہر دم جان دینے کو تیار رہتے ہیں۔ وہ بھی ایسا ہی نوجوان تھا۔

صالح ترکی کی اسپیشل فورسز میں لیفٹیننٹ تھا اور ظفر یامین اس کا کمانڈر اور انسٹرکٹر تھا۔ ظفر نے ہی اس کی تربیت کی تھی اور وہ اسے بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ جس وقت اسے دہشت گردوں سے نمٹنے کے آپریشن پر جانے کی خبر ملی وہ ترکی کے فوجی اسپتال ریور میں اپنی بیوی کے ساتھ تھا، بچے کی ولادت ہونے والی تھی۔ اس کی شادی کو صرف چار سال کا عرصہ ہوا تھا اور اس عرصے میں زن و شوہر کی چار یا پانچ بار ملاقات ہوئی تھی۔

☆......☆

فوجی ایمبولینس اور ایک کرنل کی کار اس کے سامنے آ کر رکی تو اس کا دل جیسے سینے میں دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔ وہ خود محکمہ پولیس میں ملازمت کرتی تھی اور یونیفارم میں اپنے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ کرنل کار سے اتر کر اس کی طرف بڑھا دونوں کی نظریں ملیں اور وہ اس کے آنے کا سبب سمجھ گئی۔ ان کے ساتھ ایمبولینس کا ہونا اس بات کی گواہی تھا کہ اس کا شوہر یا تو شدید زخمی ہوا ہے یا شہید ہو گیا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے بولنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ وہ آنکھوں میں آنسو لیے اہم خبر سننے کی منتظر تھی۔ اس کی آنکھوں میں صالح سے آخری ملاقات کا منظر گھوم رہا تھا۔ ان کے سارے خواب ادھورے رہ گئے تھے اس کے قریب صالح کا باپ کھڑا تھا جو ایک برتن میں دودھ والے سے دودھ لے رہا تھا اس کی نظریں بھی فوجی ایمبولینس پر لگی تھیں۔

محلے کے لوگ فوجی ایمبولینس دیکھ کر وہاں جمع ہو گئے تھے کرنل اس کی طرف بڑھا تو اس کے ہاتھ سے دودھ کا برتن چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

"تمہارا بیٹا اپنے وطن پر شہید ہو گیا ہے۔" کرنل نے پُر احترام لہجے میں کہا۔ اسی سمے صالح کی ماں گھر کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی لیکن کرنل کے الفاظ سنتے ہی وہ چوکھٹ پکڑ کر وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"تمہارا بیٹا شہید ہو گیا ہے اس کے لیے دعا کرو۔" صالح کے والد نے کہا۔

اس واقعے کے بعد صالح کے تمام ہمسایوں نے اپنے گھروں پر ترکی کے جھنڈے لگا لیے تھے جو جھکے ہوئے تھے۔ یہ صالح سے عقیدت کا اظہار تھا۔ سارے گاؤں کو جھنڈوں سے سجا دیا گیا تھا اور جب نابینا امام سلیم اس کی نماز جنازہ پڑھا رہا تھا تو سارا گاؤں اور فوجی عملہ اس میں شریک تھا۔

☆......☆

ماروی بڑی عجلت میں ترکی کے شہر رودکو آئی تھی۔ اسے اس کے منگیتر یووز نے ملنے کے لیے بلایا تھا۔ یووز بارہ افراد کی اس ٹیم میں شامل تھا جس میں صالح بھی تھا اور یہ ٹیم خاص طور سے دہشت گردوں کا خاتمہ کرنے کے لیے ترتیب دی گئی تھی۔ اس میں ترکش آرمی کے بہترین افراد کو شامل کیا گیا تھا۔ یووز ماروی کو چاہتا تھا اور اس نے اسے منگنی کی انگوٹھی پہنانے کے لیے بلایا تھا۔ اس حقیقت سے ماروی آگاہ نہیں تھی۔ وہ اسے عام ملاقات سمجھ رہی تھی۔ جینز اور لمبے کوٹ میں ملبوس ماروی کاندھے پر بیگ اور ہاتھ میں موبائل تھامے رودکو شہر کے ایک بارونق چوک میں سڑک کے کنارے بنی چھوٹی سی منڈیر پر بیٹھی یووز کا انتظار کر رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنے موبائل میں دیکھتی۔ اسکرین پر اس کی اور یووز کی تصویر تھی جسے دیکھ کر وہ ہنس دیتی تھی۔ اچانک اس کے پاس ایک عمر رسیدہ خاتون آ کر بیٹھ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا کر خوش آمدید کہا۔

"یہ کون ہے؟" عمر رسیدہ خاتون نے اس کے موبائل میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ تصویر میں یووز، ماروی کے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑا تھا۔

"میرا منگیتر۔" ماروی نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کیا کرتا ہے؟"

"یہ فوجی ہے۔" ماروی نے فخر سے کہا۔

"تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے اور کوئی

UUNOVELS.COM

بہتر آدمی نہیں ملا؟'' عمر رسیدہ خاتون بولی۔

''کیا مطلب؟'' ماروی نے مسکرا کر پوچھا۔

''میرا مطلب ہے کوئی بینکار، تاجر یا پھر کوئی استاد......کوئی بھی؟''

''لیکن فوجی ہونے میں کیا حرج ہے؟''

''میرا باپ بھی فوجی تھا۔'' عمر رسیدہ عورت نے کہا۔ ''میری ماں ہمیشہ دکھی رہتی تھی کیونکہ میرے باپ کے پاس اپنی مصروفیات میں سے میری ماں کو دینے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ وہ مہینوں تنہا رہتی تھیں۔ ہر لمحہ میرے باپ کے انتظار میں کہ وہ خیریت سے گھر آجائے۔'' عورت نے کہا۔

''میں اس سے بہت پیار کرتی ہوں اتنا کہ یہ سب برداشت کرلوں۔'' ماروی نے اداس مسکراہٹ بکھیری۔

''خدا کرے کہ خوشیاں تمہارے گرد منڈلاتی رہیں، پیاری لڑکی۔'' عورت نے گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے دعا دی۔

''شکریہ میم۔'' ماروی نے کہا اور وہاں سے کھڑی ہو گئی اسی لمحے سیاہ پتلون اور سیاہ جیکٹ پہنے دو افراد اس کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ ان کے چہروں پر برستی نحوست بتا رہی تھی کہ ان کا تعلق شرفا سے بالکل نہیں ہے۔ وہ چھٹے ہوئے بدمعاش ہیں۔ ان میں ایک بولا۔ ''خاتون تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔''

''معافی چاہتی ہوں، کیا مطلب ہے؟'' ماروی کے چہرے پر حیرت تھی۔

''تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔'' اس شخص نے قدرے سختی سے جملہ دہرایا۔

''بھلا میں کیوں جاؤں تمہارے ساتھ؟ تم...کون ہو؟ کیا پولیس والے ہو؟ آخر معاملہ کیا ہے؟'' ماروی نے ایک ساتھ کئی سوال کر دیے۔ تو دونوں اشخاص نے شناختی کارڈ اسے دکھائے۔

''پلیز تعاون کرو۔'' دوسرے نے کہا۔

''دیکھیں آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے سر۔ کوئی دھوکا ہوا ہے۔''

''نہیں، ہمیں کوئی دھوکا نہیں ہوا۔'' دوسرے نے کہا اور اس کے ہاتھ سے اس کا بیگ لے لیا۔ ایک نے اس کا بازو پکڑ لیا تھا اور اسے گھسیٹنے والے انداز میں وہاں سے لے جانے لگے تھے۔

''میرا ہاتھ چھوڑ دو تم مجھے اس طرح نہیں لے جا سکتے۔'' ماروی نے سخت لہجے میں کہا۔

''یہ لڑکی خاصی اسمارٹ لگتی ہے، خدا جانے کیا کر آئی ہے۔'' پیچھے بیٹھی عمر رسیدہ خاتون نے زیر لب کہا جو کچھ ہی دیر پہلے اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اسی لمحے ایک ٹرالی پر چیزیں بیچنے والا اس کے قریب سے گزرا مگر اس کی توجہ لڑکی کی طرف نہیں تھی۔

دونوں افراد کھینچتے ہوئے ماروی کو ایک قریبی عمارت میں لائے اور اسے ایک کمرے میں بٹھا دیا پھر ان میں سے ایک نے اس کے موبائل کی اسکرین پر پرویز کی تصویر نکالی اور اس کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم اسے جانتی ہو؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔''

''تم مجھے تنگ کر رہے ہو، کیا چاہتے ہو؟''

''کیا یہ تمہارا اسکیتر نہیں ہے؟'' ایک شخص نے پوچھا۔

''ہاں، یہ میرا اسکیتر ہے۔''

''تم دونوں ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہو؟''

''دو سال.....یا اس سے کچھ زیادہ۔'' ماروی نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟'' دوسرے نے پوچھا۔

''ہاں، میں اسے چاہتی ہوں۔''

''کتنا چاہتی ہو؟''

''یہ کس قسم کے سوال ہیں؟''

''عام سے سوالات ہیں، تمہیں کیا یہ بات پسند نہیں ہے؟''

''ہمیں بتاؤ کہ تم اسے کتنا پیار کرتی ہو؟'' پہلے والے نے پھر پوچھا۔

''میں اسے بہت پیار کرتی ہوں، اتنا کہ میں اس کی خاطر اپنی ملازمت بھی چھوڑ سکتی ہوں، کوئی اور پیشہ اختیار کر سکتی ہوں۔'' ماروی نے جواب دیا۔

''کیا تم اس سے شادی کرو گی؟''

''ہاں'' کہہ کر اس نے سر جھکا لیا پھر بولی۔ ''دیکھیں سر آپ یہ کیسے سوالات پوچھ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ آپ کا مسئلہ کیا ہے؟''

''تمہارے خلاف ایک چوری کی شکایت آئی ہے۔'' ایک نے کہا اور اس کا بیگ کھول کر ساری چیزیں میز پر بکھیر دیں ان چیزوں میں ایک انگوٹھی کی سرخ رنگ کی ڈبیا بھی تھی جس میں ایک ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

UUNOVELS.COM

"یہ کیا ہے؟ یہ کس کی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم یہ میری نہیں ہے۔" ماروی نے حیرت سے انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارے بیگ سے نکلی ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ تم نہیں جانتیں کہ یہ کہاں سے آئی ہے۔"

"میں واقعی نہیں جانتی کہ یہ میرے بیگ میں کہاں سے آئی ہے۔"

"سارے چور یہی کہتے ہیں۔"

"اگر یہ تمہاری نہیں ہے تو گویا تمہارے منگیتر نے ابھی تک یہ انگوٹھی تمہیں نہیں پہنائی ہے پھر وہ تمہارا منگیتر کیسے ہوگیا؟" ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہاں اس نے نہیں پہنائی...... لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔"

"اگر وہ تم سے شادی کے لیے کہے تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟" دوسرے نے کہا۔

"تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟ دیکھو میں چور نہیں ہوں مجھے جانے دو۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے، پہلے ہمارے سوالوں کے جواب دو۔"

"میں اس سے ہاں کہوں گی کیونکہ میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔" ماروی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "دیکھو میں نے جو جرم کیا ہی نہیں اس کے الزام میں تم مجھے یہاں نہیں رکھ سکتے، مجھے جانے دو۔"

"اس کا فیصلہ جج کریں گے۔" پہلے والے نے کہا اور اپنے ساتھی کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا۔

"کون سے جج؟" ماروی نے پوچھا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں بتا رہی ہوں میں نے کچھ نہیں کیا سر آپ کہاں جا رہے ہیں؟" ماروی نے پوچھا لیکن وہ کمرے سے نکل گئے۔ نکلتے وقت انہوں نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ کمرے کی لائٹ بھی بند ہوگئی تھی۔

"اوہ یہ لائٹ کیوں بند ہوگئی۔" ماروی نے زور سے کہا۔ "سر! دروازہ کھولیں۔" اس نے کئی بار کہا لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا پھر اچانک دروازے پر دستک ہوئی، اس وقت ماروی کا چہرہ دیوار کی طرف تھا تبھی دروازہ کھلا۔

"دیکھیں، میں آپ کو بتا رہی ہوں پچھلے ایک گھنٹے سے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔" ماروی نے کہا۔ "میں بے گناہ ہوں۔" بولتے ہوئے وہ دروازے کی طرف پلٹی جہاں یوزر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے گہرے سرمئی کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر شرارت پھیلی ہوئی تھی۔ ماروی سمجھ گئی کہ اس کا یہاں لایا جانا اور سوالات کیے جانا یہ سب یوزر کی شرارت تھی۔ وہ اس کی طرف لپکی۔

"تم...... تم احمق......" وہ اسے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔

"میں اپنے بارے میں تمہارے خیالات جاننا چاہتا تھا۔ میں تمہیں پانے کا کوئی موقع بھی گنوانا نہیں چاہتا۔" یوزر نے کہا تو ماروی کے چہرے پر غصے کی جھلک عود آئی۔

"ابھی بتاتی ہوں۔" کہہ کر وہ اس کی طرف لپکی۔

"ٹھہرو...... ٹھہرو...... میری بات سنو۔" یوزر نے کئی گہرے گہرے سانس لیے جیسے کچھ کہنے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہو پھر سر جھکا کر چند لمحے سوچتا رہا اور اس کے بعد جب نظریں اٹھائیں تو وہ بہت سنجیدہ تھا۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے کہوں؟ کیا تم میری خاطر اپنی زندگی برباد کرنے کو تیار ہو؟" اس نے کہا تو ماروی اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

"اپنی تمام خوشیاں، تمام خواب مجھے دے سکتی ہو؟" یوزر نے کہا تو ماروی نے انکار میں سر ہلایا۔

"میں اپنی زندگی کو ان تمام چیزوں سے خالی کر چکی ہوں۔ میں صرف تمہاری ہوں۔" ماروی نے کہا۔

"میں ڈرتا تھا کہ اگر تم نے انکار کر دیا یا مجھے چھوڑ دیا تو میں کیا کروں گا۔"

"تم نے ایسا سوچا بھی کیوں؟ میں تو سب کچھ چھوڑ آئی ہوں۔"

"میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گا، ہمیشہ۔" یوزر نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور تم نے ابھی جو میرے ساتھ کیا میں اسے معاف نہیں کر سکتی اس کا بدلا لوں گی۔" ماروی مصنوعی غصے سے بولی۔

"تمہیں میں مل گیا تم اور کیا چاہتی ہو؟" یوزر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چلو مجھے بھوک لگی ہے باہر کچھ کھاتے ہیں۔" یوزر، ماروی کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آیا، پھر وہ دروازے کے قریب رکا اور اس نے میز پر رکھی ہوئی انگوٹھی اٹھا کر ماروی کو پہنا دی۔

کچھ دیر بعد وہ ایک شاپنگ مال کی تیسری منزل پر تھے اور ایک مشہور ریسٹوران میں داخل ہونے ہی والے

UUNOVELS.COM

تھے کہ یوز کی چھٹی حس بیدار ہو گئی..... اسے کچھ غیر معمولی نقل و حرکت محسوس ہوئی۔ کچھ مشتبہ افراد تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے تھے اور ان کی توجہ کا مرکز یوز ہی تھا۔

"جاؤ..... فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ پھر ملیں گے۔" یوز نے ماروی کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ تعداد میں چار تھے۔ ان میں سے ایک ٹرالی پر بچوں کی چیزیں بیچ رہا تھا۔ اس نے گرے کلر کا ٹراؤزر اور شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ رنگ گورا، قد لمبا، سیاہ مونچھیں، آنکھوں میں جانوروں جیسی خونخوار چمک.....! وہ شاپنگ مال کے احاطے میں ٹرالی چلاتا پھر رہا تھا۔ دوسرا شخص تیسری منزل پر جنگلا پکڑے کھڑا تھا۔ بظاہر اس کا رخ دوسری جانب تھا لیکن اس کی نظریں ماروی اور یوز پر تھیں، اس کے چہرے پر سیاہ داڑھی مونچھیں تھیں، وہ تشویشی نظروں سے اپنے دوسرے ساتھیوں کو دیکھ رہا تھا جو اس سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے، پھر اس نے آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ سب ایک ایک کر کے وہاں سے غائب ہو گئے۔ ایک عورت جو ادھیڑ عمر، دبلی پتلی تھی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اس نے بھی لمبا سفید کوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھی کبھی کبھی داڑھی والے شخص کو دیکھ رہی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اس کے اشارے کی منتظر ہو۔ یوز کی تجربہ کار نظروں نے سب کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس کی نظروں سے وہ اشارے بھی نہیں چھپے تھے جو داڑھی والے شخص نے اپنے ساتھیوں کو کیے تھے۔ داڑھی والا اپنے انداز اور وضع قطع سے ان کا لیڈر لگ رہا تھا پھر چند ہی لمحوں بعد وہ سب ایک دروازے سے باری باری نمودار ہوئے۔ اب ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے یوز کی نظریں ان کے لیڈر پر لگی تھیں اور اس نے اس کا پیچھا شروع کر دیا تھا۔ وہ کوٹ کے اندر گن چھپائے جا رہا تھا۔ یوز اس کے پیچھے تھا نیچے پہنچنے کے بعد اس نے سپر مارکیٹ کے کول گراؤنڈ کے اندر موجود لوگوں پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ یوز نے اس فائرنگ کا جواب دیا۔ اس سے پہلے اس نے راستے میں کھڑے ایک پولیس آفیسر کو اپنا کارڈ دکھا کر پولیس کو بلوانے کے لیے فون کرنے کو کہا تھا اور پولیس آفیسر نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

چند ہی لمحوں میں چاروں دہشت گرد مختلف ہتھیاروں سے لوگوں پر فائر کر رہے تھے کئی لاشیں گری تھیں۔ یوز نے بھی دو دہشت گردوں کو نشانہ بنایا تھا۔ ماروی جو واپس جا رہی تھی فائرنگ کی آواز سن کر پلٹ آئی اور یوز کو تلاش کرنے لگی کہ اس کی نظر ایک بارہ سالہ بچے پر پڑی جو سپر مارکیٹ کے گراؤنڈ میں کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں غبارے کی ڈوری تھی اور وہ سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ لوگ ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ دہشت گردوں کے لیڈر کی نظریں بچے اور ماروی پر لگی ہوئی تھیں۔ ماروی اپنی جگہ سے بھاگی اور بچے سے چمٹ گئی۔ وہ اسے گولیوں سے بچانا چاہتی تھی۔ لیڈر نے فائرنگ شروع کر دی تھی اور ماروی اپنی آڑ میں لیے ہوئے بچے کے ساتھ عمارت سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی اسی لیے یوز سامنے سے بھاگتا ہوا آیا اس کے ہاتھ میں مشینی پسٹل تھا۔ اس نے ماروی کے سامنے کھڑے دہشت گرد کو گولی ماری، عین اسی وقت وہ ادھیڑ عمر عورت جو کچھ دیر پہلے ایک لمبا کوٹ پہنے تیسری منزل کی ایک بینچ پر بیٹھی تھی، بھاگتی ہوئی گراؤنڈ میں داخل ہوئی۔ اس کے کوٹ کے سامنے کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ کوٹ ہوا سے پیچھے اڑا جا رہا تھا، عورت کے سینے پر خودکش جیکٹ بندھی تھی جو صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ ماروی اور بچے سے کچھ ہی فاصلے پر تھی۔ یوز نے نشانہ لیا اور عورت کے سر کو چھیدتی گولی دوسری طرف نکل گئی لیکن اسی وقت خودکش دھماکا ہوا۔ ہر طرف آگ کے شعلے اور دھواں بکھر گیا۔ ماروی بچے کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ اطراف میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مختلف شوروموں کے شیشے ٹوٹ کر ہر طرف بکھر گئے تھے۔ دہشت گردوں کا سرغنہ اپنا ہتھیار جیب میں رکھ کر وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔ یوز بھی شدید دھماکے کی شدت سے زمین پر گر گیا تھا جب اسے ہوش آیا تو ہر طرف چیخ و پکار پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف دھواں، پھٹے ہوئے کپڑے اور کٹے ہوئے جسم پڑے تھے۔

"ماروی..... ماروی....." وہ تیزی سے ماروی کی طرف لپکا جو شدید زخمی تھی۔

"یوز..... یوز....." ماروی نے کراہتے ہوئے کہا۔ ماروی کے ساتھ جو بچہ تھا اس کا دور دور تک کوئی پتا نہیں تھا۔ یوز نے ماروی کو ہاتھوں میں اٹھایا اور شاپنگ مال کی عمارت سے باہر آ گیا جہاں بہت سی ایمبولینس کھڑی تھیں، ان میں سے ایک میں اس نے ماروی کو اسٹریچر پر لٹایا اور اسپتال روانہ کر دیا۔

☆.....☆

ماروی آپریشن تھیٹر میں ٹیبل پر لیٹی بے ترتیب

URDUNOVELS.COM

سانسیں لے رہی تھی۔ اس کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر بہار اسے دیکھ رہی تھی اور باہر ہال میں یووز ویٹنگ لاؤنج میں ٹہل رہا تھا۔ اسپتال میں بہت رش ہو گیا تھا۔ جائے حادثے سے قریب ہونے کی وجہ سے سارے زخمی یہاں ہی لائے جا رہے تھے۔ اسپتال میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی تھی۔ سارے عملے کو بلا لیا گیا تھا۔

''ڈاکٹر...... ڈاکٹر...... میری منگیتر ماروی کی حالت کیسی ہے۔ وہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔'' یووز نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا جو ابھی آپریشن تھیٹر سے باہر آیا تھا۔

''ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں، بہت Bleeding ہو رہی ہے۔ اگر خون نہیں رکا تو اس کی جان کو خطرہ ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ڈاکٹر کچھ بھی کریں اسے بچا لیں۔'' یووز نے کہا۔

''ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں آپ یہاں انتظار کریں۔'' ڈاکٹر نے کہا اور ایک دوسرے ڈاکٹر کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور آپریشن تھیٹر میں چلا گیا۔ یووز بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

☆......☆

ترکی کے شہر کاراباک کے آرمی ہیڈ کوارٹر میں بٹالین کمانڈر کرنل اردن کرکمز (ERDEM KARKMAZ) اپنے آفس میں بیٹھا ٹی وی پر ہنگامی صورتِ حال کا بلیٹن دیکھ رہا تھا۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ''ابھی پتا نہیں چل سکا ہے کہ کتنے لوگ جاں بحق ہوئے ہیں۔''

''ہمیں سرکاری ذرائع کا انتظار ہے۔ ابھی ہم حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

''نقصانات کا اندازہ لگایا جا رہا ہے رپورٹ آنے پر ہی کچھ بتا سکیں گے۔''

مختلف لوگ مختلف باتیں کر رہے تھے، کچھ چشم دید گواہ واقعے کے بارے میں اپنے تاثرات بتا رہے تھے۔ اچانک کرنل کے کمرے کا دروازہ کھلا اسی وقت ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا کہ استنبول پولیس کا چیف اور گورنر جائے حادثے پر بیٹھے تھے کرنل کی نظریں ٹی وی اسکرین پر تھیں کہ فرسٹ لیفٹیننٹ بلال کمرے میں داخل ہوا، کرنل نے اپنے قریب رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''سر! کیا کسی نے ابھی تک اس حادثے کی ذمے داری قبول کی ہے؟'' بلال نے پوچھا۔

''میں نے ابھی کمانڈر سے بات کی تھی اس نے Intel سے معلومات کی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ دھماکا کوس نے کیا ہے جو بدنام ترین دہشت گرد ہے یہ دہشت گرد اب جنگ کو شہروں تک لے آئے ہیں اور عوام کو نشانہ بنا رہے ہیں۔'' کرنل اردن نے کہا اسی وقت دوبارہ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور ایک فوجی اردلی اندر آیا اس نے ایک تصویر کرنل کو دی تھی۔

''سر، فرسٹ لیفٹیننٹ یووز جائے حادثے پر دیکھا گیا ہے۔'' آنے والے نے بتایا کرنل اردن کی نظریں تصویر پر ہی تھیں۔

''خبر ملی ہے کہ اس کی منگیتر شدید زخمی ہے سر۔'' آنے والے نے کہا۔

تصویر میں بھی کرنل دیکھ رہا تھا کہ یووز نے ماروی کو گود میں اٹھا رکھا ہے اور ایمبولینس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

''میرے لیے استنبول کی پہلی فلائٹ میں بکنگ کروا دو۔'' کرنل اردن نے کہا اور سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔

''یس...... سر۔''

☆......☆

آپریشن تھیٹر میں سرجن اور چند نرسیں موجود تھیں۔ وہ ماروی کو بچانے کی پوری کوشش کر رہی تھیں، ڈاکٹر صباہ بھی موجود تھی۔

''اس کی نبضیں ڈوب رہی ہیں کہیں پھر اسے کھو نہ دیں۔'' ڈاکٹر صباہ نے کہا۔

''2 mg adrenaline جلدی کرو۔'' ڈاکٹر صباہ نے کہا۔ ''اس کا بہت خون ضائع ہو گیا ہے۔''

''CPR...... جلدی کرو۔'' ڈاکٹر نے کہا اور اس کے دل کی جگہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر وقفے وقفے سے دباؤ ڈالنے لگی۔ ''الیکٹرو شاک 120 تیار کرو...... جلدی چارج ابھی۔''

''ریڈی۔'' سسٹر نے ڈاکٹر کے ہاتھوں میں لوشن ڈالتے ہوئے کہا۔

''میں تیار ہوں...... ریڈی 1,2,3۔'' ڈاکٹر نے کہا اور ایک شاک ماروی کو لگایا لیکن کچھ نہ ہوا۔ ''160۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ریڈی۔'' اس نے دوسرا شاک لگایا لیکن کچھ نہیں ہوا۔

''360...... ریڈی 1,2,3۔'' اس نے تیسرا شاک لگایا لیکن ماروی میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد ایک نرس نے آ کر یووز کو آپریشن تھیٹر کی طرف جانے کا اشارہ کیا وہ کھڑا ہوا اور چند قدم ہی چلا تھا کہ ایک اسٹریچر پر ماروی کو

UUNOVELS.COM

باہر لایا گیا۔ اس پر چادر پڑی تھی۔ ایک نرس نے چادر ہٹا دی۔ ماروی کا پُرسکون چہرہ یوز کے سامنے تھا اور وہ ساکت کھڑا تھا ماروی اسے چھوڑ گئی تھی۔

دوسرے روز ماروی کی تدفین کے موقع پر قرآن کی تلاوت ہو رہی تھی اس کے جسم کو قبر میں اتارا جا رہا تھا۔ یوز دوسرے سوگواروں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے ماروی کو قبر میں اتارا تھا اور اس کی قبر پر مٹی ڈالی تھی۔ تدفین میں کرنل ارڈن بھی موجود تھا۔ ماروی کی قبر پر کتبہ لگا دیا گیا تھا جس پر تاریخ 1991-2017ء درج تھی وہ چھبیس سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئی تھی۔ اس کی ماں بلک بلک کر رو رہی تھی۔ یوز سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

''تمہاری منگیتر شہید ہوئی ہے یوز، لوگ ہمیشہ اسے شہید کہیں گے۔'' کرنل ارڈن نے کہا۔

''تم خوش قسمت ہو کہ تم ایک شہید لڑکی کے منگیتر ہو۔'' کرنل نے پھر دلاسا دیا۔ یوز خاموش تھا۔

''لیکن شہید تو مجھے ہونا چاہیے تھا سر۔'' یوز نے کہا۔

''ان کا نشانہ میں تھا وہ نہیں...... وہ تو بچے کو بچاتے ہوئے بیچ میں آ گئی۔''

''میری بیٹی۔'' اس وقت ماروی کا باپ آگے بڑھا اور یوز کے گلے لگ گیا۔

''میری بیٹی مر گئی بغیر دلہن کا جوڑا پہنے۔ میں اس کی شادی کی تیاریاں کر رہی تھی۔'' ماروی کی ماں بین کر رہی تھی۔

''وہ میری خاطر شاپنگ مال آئی تھی۔'' یوز نے سسکی لے کر کرنل ارڈن سے کہا۔ ''اس نے میری خاطر سب کو چھوڑ دیا تھا اگر وہ مجھے اپنی زندگی نہ سمجھتی اور مجھ سے ملنے نہ آتی تو یہ سب نہ ہوتا۔'' یوز سسکیاں لے کر کہہ رہا تھا۔ ''وہ ابھی زندہ ہوتی سر۔''

''حادثات ہی ہمیں اچھے انجام کی طرف لے جاتے ہیں یوز۔'' کرنل نے سمجھایا۔ ''جب کبھی بھی کسی شہید کے بارے میں بات کرو تو افسوس کا اظہار مت کرنا، آنسو پونچھ لو۔''

''کاش اس کی جگہ میں مر جاتا۔'' یوز نے کرنل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مت رو میرے بچے...... مت رو۔'' ماروی کے باپ نے اسے گلے لگایا۔ ''اگر تم روؤ گے تو میری بیٹی کی روح پریشان ہو گی۔ مت رو میرے بیٹے...... ادھر میری طرف دیکھو، تم میرے بیٹے ہو، تم اور تم جیسے دوسرے جانباز نہ ہوتے تو انہوں نے نہ جانے اور کتنے لوگوں کی جانیں لے لی ہوتیں۔ میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اگر میری کوئی اور بیٹی ہوتی تو میں اس کی شادی تم سے کر دیتا۔'' ماروی کے باپ نے کہا اور یوز نے سسکی لی۔

''تم مت رو میرے بیٹے، تم کبھی اپنا سر نہ جھکانا۔'' ماروی کے باپ نے کہا اور ایک بار پھر یوز کو گلے سے لگا لیا۔

☆......☆

اسپتال میں ڈاکٹر صباہ اداس کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ماروی کے گلے سے اترا ہوا ایک لاکٹ تھا جو آپریشن کے وقت میز پر رہ گیا تھا۔ اس نے لاکٹ اس ارادے سے اٹھا کر رکھ لیا تھا کہ اگر کبھی کوئی پوچھتا ہوا آیا تو وہ اسے لوٹا دے گی۔ اس لاکٹ میں ایک لڑکی اور لڑکا بنے ہوئے تھے جو رقص کی پوزیشن میں تھے۔ ڈاکٹر صباہ اسے دیکھ کر یہی سوچ رہی تھی کہ ماروی کے گلے میں ضرور یہ کسی کے پیار کی نشانی ہو گی۔

''صباہ تم کیوں پریشان ہو؟'' اس کی والدہ نے اس سے پوچھا جو اسی اسپتال میں سپروائزر تھی۔

''آپ جانتی ہیں مرنے والی ماروی کو میں اب تک بھلا نہیں سکی ہوں۔ وہ تو عمر لڑکی بغیر قصور کے کسی کی زندگی بچاتے ہوئے اس دنیا سے چلی گئی۔ دہشت گردوں نے عوام کا جینا محال کر دیا ہے۔'' ڈاکٹر صباہ نے اداسی سے کہا۔

''تمہیں اس زخمی لڑکی کو اٹینڈ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے تم پر اچھا اثر نہیں ڈالا۔'' اس کی والدہ نے کہا۔

''آپ کا کیا خیال ہے۔ میں زخمیوں کو یونہی دیکھتی رہتی؟''

''میں بس یہ چاہتی ہوں کہ تم مسائل سے دور رہو۔'' اس کی والدہ نے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر صباہ نے کہا اور اپنا ہاتھ کھول کر دیکھا اس کے ہاتھ میں ماروی کا لاکٹ چمک رہا تھا۔

''یہ کس کا ہے؟'' اس کی والدہ نے پوچھا۔

''کسی کا نہیں۔'' ڈاکٹر صباہ نے جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

☆......☆

دو روز بعد یوز پھر ماروی کی قبر پر گیا تھا، کرنل ارڈن بھی اس کے ساتھ تھا۔

''ماروی اللہ تمہاری روح کو سکون بخشے۔ تم پُرسکون رہو، پُرسکون رہو۔'' وہ سسکیاں لے رہا تھا اور ماروی کی قبر پر جھکا ہوا تھا۔

UUNOVELS.COM

''یوزر۔'' کرنل ارڈن نے اسے پکارا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اسے صبر کرنے کی تلقین کر رہا ہو۔

''یوزر۔'' کرنل نے پھر کہا۔

''کیا تم نے کبھی کسی پیار کرنے والے کو کھویا ہے؟'' یوزر نے پوچھا۔ ''اور کیا بالکل میری طرح کھویا ہے؟''

''صبر کرو یوزر۔'' کرنل نے کہا۔

''تم وہاں نہیں تھے۔ پہلے لوگوں کا شور، ان کی چیخ و پکار، شدید فائرنگ، وہ بچی بچائی وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دہشت گرد جو ہمارے خاص دشمن ہیں۔ انہوں نے اسے میرے ساتھ دیکھ لیا تھا اور اب وہ اسے نشانہ بنانا چاہتے تھے، تقریباً ان سے بچ نکلی تھی کہ اچانک خودکش جیکٹ پہنے وہ عورت سامنے آگئی۔ اس نے ماروی اور بچے کے قریب آکر خود کو اڑالیا۔ ایک شدید دھماکا ہوا، ہر طرف آگ اور خاک کا بادل چھا گیا۔ میں زمین پر گر گیا تھا مجھ پر ماروی اور اس بچے کا خون اور راکھ گر رہی تھی۔ کیا تم نے بھی کسی کو ایسے کھویا؟'' یوزر نے کہا۔ ''انسانوں کے ساتھ ان کے خوابوں کی بھی موت، باقی جو رہ گیا وہ صرف غصہ اور دکھ ہے ایسا دکھ جو برداشت نہیں ہو رہا۔'' یوزر نے کہا اور اپنی جیب سے ایک رومال نکال کر اس میں قبر کی مٹی رکھی اور اسے لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔

''وہاں ایک تیسرا آدمی بھی تھا جس نے اس حملے کی پلاننگ کی تھی اور وہ کوس تھا۔'' کرنل ارڈن نے کہا۔

''ہاں، میں نے بھی سنا ہے۔'' یوزر نے کہا۔

''میں...... ابھی رجمنٹ میں واپس جا رہا ہوں، تم بعد میں آجانا۔'' کرنل نے کہا۔

''میں نے ماروی سے وعدہ کرلیا ہے میں اس حادثے کے ذمے دار کو ڈھونڈ کر انجام تک پہنچاؤں گا۔''

''لیکن تمہاری ملازمت تمہیں انتقام کی اجازت نہیں دیتی، اپنے جذبات و احساسات کو اس سے الگ رکھو، تم ایک پیشہ ور فوجی ہو، کوئی عام آدمی نہیں۔ کبھی ہرگز بھی انتقام کی بات مت کرنا اور اپنی ڈیوٹی کو نظر انداز مت کرنا۔ اگر تم یہی احمقانہ باتیں کرتے رہو گے تو اس کا انجام ٹھیک نہیں ہو گا، وہ لڑکی کی غلطی تھی۔''

''ہاں وہ مجھ سے پیار کرتی تھی یہی اس کی غلطی تھی۔'' یوزر نے کہا۔ ''وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی اس لیے وہ وہاں آئی تھی، میں نے ہی وہاں بلایا تھا۔''

''یوزر! ایسا پہلی بار نہیں ہوا ہے کہ ہم نے کوئی محبت کرنے والا کھویا ہے۔ یہ ہماری ملازمت کا حصہ ہے ہمیں اس غم سے نکلنا ہوگا۔ تمہاری خود کی کوئی حیثیت نہیں ہے تم اداس تو رہ سکتے ہو لیکن تم رو نہیں سکتے۔ آنسو نہیں بہا سکتے، آہیں نہیں بھر سکتے اور نہ ہی انتقام کی بات کر سکتے ہو۔ تم ایک فوجی ہو اور تمہیں ایک فوجی ہی کی طرح رہنا چاہیے۔'' کرنل نے کہا تو یوزر نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے چل دیا۔

☆......☆

کاراباک کی مارکیٹ کے درمیانی حصے میں ایک لڑکی ٹھیلے سے سامان خرید رہی تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل بیس سال تھی۔ دکانیں کھلی تھیں اور کاروبار زندگی عروج پر تھا۔ لوگ مختلف چیزیں خرید رہے تھے۔ اچانک ایک سیاہ کار آکر رکی اس میں سے ایک شخص سیاہ لباس میں ملبوس نکلا اور اس نے لڑکی کو دبوچ لیا۔

''چھوڑو مجھے چھوڑو۔'' لڑکی زور سے چیخی تھی لیکن اس شخص نے لڑکی کو گھسیٹ کر کار میں بٹھالیا تھا۔

''کوئی پولیس کو فون کرو۔'' قریب ہی سے کوئی چیخا لیکن اتنی دیر میں کار وہاں سے جا چکی تھی۔

☆......☆

یوزر ٹیکسی میں سفر کر رہا تھا کہ ٹیکسی کے ریڈیو سے خبر نشر ہوئی۔

''اگر آپ بائے روڈ سفر کر رہے ہو تو آپ کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ ساحلی روڈ کو پولیس نے بلاک کر دیا ہے۔''

''کیا معاملہ ہے؟'' یوزر نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

''پولیس نے ساحلی روڈ بلاک کر دیا ہے۔ میں ہائی وے کی طرف سے جا رہا ہوں۔'' ڈرائیور نے بتایا۔

''انہوں نے روڈ کیوں بلاک کیا ہے؟'' یوزر نے پوچھا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اپنا وائرلیس مائیک اٹھایا اور اپنے ساتھیوں سے بات کرنے لگا۔

''ہیلو! دوستو ساحلی روڈ کیوں بلاک ہے۔ کوئی مجھ سے انفارمیشن شیئر کرے گا؟'' ڈرائیور نے کہا اور کچھ دیر دوسری طرف کی گفتگو سنتا رہا۔

''وہ بتا رہے ہیں کہ شاپنگ مال سے دہشت گردوں نے ایک لڑکی کو اغوا کرلیا ہے۔'' ڈرائیور نے اسے بتایا اور اس نے پارک میں پناہ لی ہے۔''

''مجھے وہیں لے چلو۔'' یوزر نے کہا اور ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی کا رخ موڑ دیا تھا۔

چند منٹوں بعد وہ جائے حادثے پر موجود تھا۔ حادثے

UUNOVELS.COM

کی جگہ پر حفاظتی فیتہ لگا دیا گیا تھا اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پولیس اہلکار پہرہ دے رہے تھے۔

"ہیلو! میں ایک فوجی ہوں اور جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں کیا ہوا ہے؟" یوزر نے حفاظتی فیتہ ہٹا کر اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن ایک پولیس اہلکار نے اسے روک دیا۔

"نہیں ہم معذرت چاہتے ہیں برادر، ہماری اسپیشل برانچ آرہی ہے۔"

"فائن! میں کچھ کروں گا نہیں، بس ایک نظر جائے حادثہ دیکھوں گا اور چلا جاؤں گا۔" یوزر نے کہا۔

"کیا بات ہے؟" ایک دوسرے پولیس افسر نے پوچھا جو قریب ہی کھڑا تھا۔

"یہ کہتا ہے یہ فوجی ہے اور جگہ دیکھنے کی ضد کررہا ہے۔" پولیس افسر نے اپنے ساتھی کو بتایا۔

"کیا تم پاگل ہو؟ ہم خود یہاں پریشانی میں ہیں، اسے یہاں سے ہٹاؤ۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے اس کی ضرورت نہیں میں خود چلا جاتا ہوں۔" یوزر نے کہا اور وہاں سے ہٹ گیا پھر وہ ٹہلتا ہوا اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ چند قدم کے فاصلے پر اسپیشل برانچ کے لوگ دائرے میں کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار ایک سمت میں تانے ہوئے تھے۔ یوزر نے اس سمت میں دیکھا تو ایک سیاہ لباس شخص نے ایک بیس سالہ لڑکی کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا اور وہ چیخ رہی تھی۔

"مجھے بچاؤ..... مجھے بچاؤ....."

"اپنی گنیں نیچی کرلو ورنہ میں لڑکی کو ماردوں گا۔" سیاہ پوش نے کہا۔ "قریب مت آنا ورنہ میں اسے ماردوں گا۔"

"مجھے چھوڑ دو۔" لڑکی پھر چیخی۔

"چپ ہوجاؤ۔" سیاہ پوش نے لڑکی کو ڈانٹا۔

"تم اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو۔" ایک پولیس آفیسر نے کہا۔ "تمہارے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔" سیاہ پوش چیخا۔ "میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

یوزر موقع کا جائزہ لیتا ہوا آگے نکل گیا تھا جہاں یہ کارروائی ہورہی تھی۔ اس عمارت کے پیچھے دریا بہتا تھا اور یوزر دریا میں کود کر عمارت کے پچھلی جانب سے عمارت میں داخل ہوسکتا تھا جس کے سامنے وہ سیاہ پوش لڑکی کو پکڑے کھڑا تھا، پھر یوزر نے ایسا ہی کیا اور وہ اتنی مہارت سے عمارت تک پہنچا تھا کہ کسی کو شبہ تک نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنی گن نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی تھی اور محتاط قدم اٹھاتا ہوا مجرم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ جائے واردات پر پہنچ کر اس نے ایک کارنر سے سر نکال کر مجرم کی طرف دیکھا۔ مجرم کی توجہ پولیس افسران کی طرف تھی اور یوزر اس کی پشت پر تھا۔ وہ بے آواز اس کی طرف بڑھا۔ اب پولیس افسران بھی اسے دیکھ سکتے تھے اور حیرت کا اظہار کررہے تھے۔

"یہ کون ہے؟" ایک پولیس افسر نے پوچھا۔

"آخر یہ وہاں کیسے پہنچا؟" دوسرے نے حیرت کا اظہار کیا۔

"میں قسم کھاتا ہوں میں اسے ماردوں گا ورنہ یہاں سے چلے جاؤ۔" سیاہ پوش نے پولیس افسران سے کہا۔

اس وقت تک یوزر اس کی پشت پر پہنچ گیا تھا اچانک سیاہ پوش نے ہاتھ اوپر کرکے دو فائر کیے اور اسی وقت یوزر نے پھرتی سے داؤ آزمایا اور اسے گردن کے بل پکڑ کر زمین پر گرادیا۔ لڑکی اس کی گرفت سے نکل گئی تھی یوزر نے پسٹل سے سیاہ پوش کو نشانے پر لے لیا تھا۔ سیاہ پوش حیرت سے یوزر کو دیکھ رہا تھا۔

"شاباش بہادر۔" ایک پولیس والے نے نعرہ لگایا۔

"نہیں..... تم شوٹ مت کرنا۔" دوسرا پولیس افسر چیخا۔

"مجھے جانے دو..... مجھے معاف کردو..... مجھ پر رحم کرو۔" سیاہ پوش رحم کی بھیک مانگ رہا تھا اور یوزر اس پر گن تانے کھڑا تھا۔ ایک دن میں کسی خاتون کے اغوا کی یہ دوسری واردات تھی۔

"برادر اپنی گن گرادو۔" ایک پولیس افسر نے آواز لگائی۔

"پلیز، پلیز مجھے مت مارو۔" سیاہ پوش پھر چیخا لیکن یوزر کی نظروں کے سامنے ماروی کا چہرہ تھا جو دھماکے کے بعد فرش پر پڑی تھی۔ زخموں سے نڈھال تھی پھر بھی یوزر نے گولی نہیں چلائی تھی اور مجرم گرفتار کرلیا تھا لیکن اس کے ساتھ یوزر بھی حراست میں تھا۔

جیل میں کرنل اوڈن اس سے ملنے آیا کیونکہ اس کے یہ بتانے پر کہ اس کا تعلق فوج سے ہے اس کی گرفتاری کی اطلاع اس کے کمانڈر کو دی گئی تھی اور کرنل اوڈن اس سے ملنے جیل پہنچا تھا۔

"کیا تم جانتے ہو اس کا کیا مطلب ہے۔" کرنل نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے ترکی کے جھنڈے کا بیج اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں

UUNOVELS.COM

کمرے میں تنہا تھے یوونز نے بج ہاتھ میں اٹھالیا۔

''یہ وہ ہے جس کے لیے ہم سب زندہ ہیں۔'' یوونز نے کہا۔

''تمہیں اس کا مقصد پتا ہے؟'' کرنل نے پوچھا۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں۔ اس کا مقصد ہم سب کو یکجا رکھنا ہے، ہر فرقے، خاندان اور رنگت سے بالاتر رہتا ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ ہر صبح جب ہم آزاد فضا میں آنکھیں کھولیں اور سانس لیں تو اس کا شکر ادا کریں۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اس کے لیے ہمیں بہت سی قربانیاں دینا ہیں۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اس کی خاطر کتنے لوگ شہید ہوئے ہیں تاکہ یہ جھنڈا ترکی کی فضاؤں میں لہراتا رہے اور ان سب سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ ہمیں ایک فرض شناس، قانون کو ماننے والا محب وطن بناتا ہے لیکن تم؟ تم بچوں کو مارنے والے لوگوں کی طرح سلوک نہیں کر سکتے کیونکہ تم اپنے کاندھے پر اس جھنڈے کی ذمے داری اٹھائے ہوئے ہو۔ تم دہشت گردوں کی طرح برتاؤ نہیں کر سکتے۔''

''اس دہشت گرد نے میری آنکھوں کے سامنے تین سے زیادہ لوگوں کو مارا تھا بغیر ان کے کسی قصور کے۔''

''لیکن ایک فوجی اپنے افسر کے حکم پر عمل کرتا ہے، اپنی مرضی پر نہیں۔'' کرنل نے غصے سے کہا۔ ''وہ اپنی ذات کے لیے نہیں لڑتا، سارا مسئلہ یہی ہے کہ تم اپنی منگیتر کا انتقام لے رہے ہو اور ایک فوجی کا یہ کام نہیں۔''

''میں رجمنٹ میں واپس آنا چاہتا ہوں۔'' یوونز نے کہا۔

''کسی کو ڈھونڈنے کے لیے؟'' کرنل نے پوچھا۔

''نہیں تم نہیں آسکتے۔''

''اس کا کیا مطلب ہے؟''

''میں نے تم سے کہا تھا کہ تم کچھ دن آرام کرو پھر اپنی تمام قوت جمع کر کے اٹھو اور واپس آجاؤ اگر تم پھر میرے احکامات نہیں مانو گے تو تم کبھی بھی اسپیشل فورسز میں واپس نہیں آسکو گے۔''

''سر! مجھ سے میری وردی نہ چھینیں، اس سے بہتر ہے میری کھوپڑی میں ابھی ایک گولی اتار دیں۔''

''میں نے کہا ہے کہ تم ایک جذباتی آدمی کی طرح برتاؤ مت کرو لیکن بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی۔''

''میں اپنی ٹیم کا کمانڈر ہوں، میرے پاس میرے ساتھی فوجی ہیں، دوست ہیں۔'' یوونز چیخا۔

''ہاں لیکن میں ان کی زندگیاں خطرے میں نہیں ڈال سکتا اور انہیں تمہارے جیسے شخص کے حوالے نہیں کر سکتا جس کی ذہنی حالت ٹھیک نہ ہو۔'' کرنل نے غصے سے کہا اور بج اٹھا کر کمرے سے نکل گیا اس کے جانے کے بعد جیل کا سپرنٹنڈنٹ آیا تھا۔

''تم اس طرح لوگوں کو تکلیف پہنچاؤ گے؟ خدا کا شکر ادا کرو کہ اللہ نے تمہیں ایک شہید کا منگیتر بنایا مجھے افسوس ہے کہ تمہاری منگیتر دھماکے میں شہید ہوئی۔''

''شکریہ دوست۔'' یوونز نے کہا۔

''اپنے کمانڈر کی بات مان لو اور اسی طرح زندگی گزارو جیسے ایک فوجی گزارتا ہے، دہشت گردوں کا مقابلہ دہشت گردوں کی طرح نہیں بلکہ فوجی کی طرح کرو۔''

☆----☆

جیل سے نکلنے کے بعد کرنل واپس جارہا تھا کہ راستے میں اس کے موبائل کی بیل بجی اس نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو۔۔۔ گولر۔'' دوسری طرف سے اس کی بیوی بول رہی تھی۔

''دہشت گردوں نے ہماری بیٹی کو اغوا کرلیا ہے۔ نازلی ان کی تحویل میں ہے۔''

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''ہم مارکیٹ گئے تھے وہ کچھ دیر کے لیے مجھ سے جدا ہوئی تھی اور جب میں واپس وہاں پہنچی تو وہ وہاں نہیں تھی، وہاں موجود لوگوں نے بتایا کہ دہشت گرد ایک کار میں اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔'' گولر نے بتایا۔ میں اس وقت بھی مارکیٹ میں ہوں یہاں پولیس موجود ہے۔''

''تم پریشان مت ہو، میں آرہا ہوں۔۔۔ کچھ دیر میں تمہیں کال کرتا ہوں۔'' اردن نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔ تم جلدی آجاؤ۔'' گولر نے کہا اور فون بند کردیا۔

''جلدی کرو ڈرائیور۔۔۔ ایئرپورٹ چلو۔'' کرنل اردن نے کہا اور پھر موبائل پر نمبر ملانے لگا۔

''میں لیفٹیننٹ کرنل اردن بول رہا ہوں۔ میں اپنے چیف آف اسٹاف سے ارجنٹ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

کچھ دیر بعد لائن پر اس کی بات چیف آف اسٹاف سے ہو رہی تھی۔

''صبح بخیر سر، یہ بہت ضروری بات ہے۔''

''ہاں میں سن رہا ہوں۔''

''سر، میری بیٹی۔۔۔ اسے ابھی دہشت گردوں نے

UUNOVELS.COM

اغوا کرلیا ہے۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو ارڈن؟"

"سر، وہ میری بیوی کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی۔ یہ واقعہ وہیں ہوا ہے۔"

"اس کی صحیح لوکیشن بتاؤ۔"

"میں ابھی وہیں جا رہا ہوں لیکن AD نے بھی تحقیقات شروع کردی ہیں میں انہیں کہہ دوں گا کہ آپ کو بھی تفصیل سے آگاہ کردیں۔"

"ٹھیک ہے میں ابھی وارننگ جاری کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

"تم تدفین میں شرکت کرنے استنبول گئے تھے نا؟"

"ہاں...... میں راستے میں ہوں واپس آرہا ہوں۔"

"جیسے ہی یہاں پہنچو مجھ سے ملو۔"

"یس سر۔"

جب کرنل ارڈن کاراباک پہنچا تو فوجی ہیڈ کوارٹر کے سامنے گولر اس کی منتظر تھی۔ کرنل ارڈن کار سے اترا اور اس نے ڈیوٹی پر موجود سیکیورٹی آفیسر کو سلام کیا۔

"کیا صورتِ حال ہے؟" کرنل نے پوچھا۔

"چیف آف اسٹاف آپ کے منتظر ہیں۔" اس نے جواب دیا اور ارڈن استقبالیہ کی طرف بڑھا جہاں اس کی بیوی اس کی منتظر تھی۔

"ارڈن، کیا ہوا؟ وہ لوگ ہماری بیٹی کو ڈھونڈ رہے ہیں نا؟" گولر نے پوچھا۔

"وہ اسے ڈھونڈ لیں گے گولر پریشان مت ہو۔ آفیسرز کلب جاؤ اور وہاں میری کال کا انتظار کرنا۔"

"آفیسر کلب کیوں؟ آخر معاملہ کیا ہے؟ میں مرجاؤں گی ارڈن۔" گولر نے روتے ہوئے کہا۔

"گولر پلیز جیسے میں کہہ رہا ہوں ویسے ہی کرو۔ پریشان مت ہو، ڈرو بھی نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ارڈن، گولر سے رخصت ہو کر عمارت کے اندر چلا گیا اور گولر آفیسرز کلب کے لیے روانہ ہو گئی۔

کچھ دیر بعد ارڈن اپنے چیف کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا فرسٹ لیفٹیننٹ بھی تھا۔

"لیفٹیننٹ کرنل ارڈن۔"

"فرسٹ لیفٹیننٹ بلال۔" چیف کمانڈر نے کہا۔

"بیٹھو ارڈن۔ کیا تمہیں دہشت گردوں کی تلاش کے لیے کورٹ آرڈر مل گیا؟" چیف نے پوچھا۔

"یس سر۔"

"آخری سیکیورٹی فوٹیج کے مطابق ان کی گاڑی شہر چھوڑ چکی ہے۔" پال نے کہا۔ "UAVs نے کچھ تصویریں دیکھی ہیں۔ وہ گاڑی آخری بار پہاڑی علاقے میں دیکھی گئی ہے۔" بلال نے کہا۔ اسی وقت ایک فوجی افسر اندر آیا۔ اس نے ایک پیپر میز پر رکھ دیا تھا۔

"اس سے پتا چلتا ہے کہ مس نازلی کے فون سے آخری سگنل کب آیا تھا۔" بلال نے پیپر دیکھتے ہوئے کہا تو کرنل ارڈن نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ رپورٹ ٹیلی کوم ڈائریکٹر کی طرف سے آئی ہے۔" بلال نے بتایا۔

"جب انہوں نے نازلی کو اغوا کیا تھا اس کے فوراً بعد ہی اس کا فون کہیں پھینک دیا گیا تھا۔" ارڈن نے کہا۔

"سر! یہاں ایک چیز ہے شاید آپ دیکھنا چاہیں۔" اس کمرے میں موجود ایک فوجی نے کہا جو ایک کمپیوٹر کھولے اس پر کچھ کام کر رہا تھا۔ "میں آپ کو دکھاتا ہوں۔" اس نے کہا اور ایک بٹن دبا دیا۔ کمپیوٹر اسکرین پر ایک ویڈیو چل رہی تھی۔ ایک کمرے میں دیوار پر سرخ اور سیاہ رنگ کی بڑی سی تصویر لگی تھی جس میں کچھ گنیں، پہاڑ، سورج اور دہشت گرد دکھائے گئے تھے جن کے چہروں پر نقاب تھے۔ کمرے کے درمیان میں ایک کرسی پر کرنل ارڈن کی بیٹی نازلی بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اس کے دائیں ہاتھ پر جو دہشت گرد کھڑا تھا اس نے سیاہ لباس پر بلٹ پروف جیکٹ پہنی ہوئی تھی اور اپنے ہاتھ سے نازلی کے بال پکڑے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر نقاب تھی۔ دوسرا دہشت گرد بائیں جانب کھڑا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ہوئے تھے اس۔۔۔ نے بھی بلٹ پروف جیکٹ اور چہرے پر نقاب پہنی تھی۔

"ہمارے پاس ترک حکومت کی ایک لڑکی یرغمال ہے اگر تم نے ہمارے ساتھی کو رہا نہیں کیا جسے گرفتار کیا گیا ہے تو ہم تمہیں اس لڑکی کا سر بھیجیں گے۔" ایک نقاب پوش نے کہا۔

"نازلی!" بے ساختہ کرنل ارڈن کے منہ سے نکلا۔

"تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" دہشت گرد نے کہا اور کرنل ارڈن نے غصے اور صدمے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ چیف کی نظریں اس پر تھیں۔

"یہ ویڈیو کہاں سے نشر ہو رہی ہے؟" چیف نے پوچھا۔

UUNOVELS.COM

"یہ نارتھ عراق سے انٹرنیٹ پر نشر ہو رہی ہے سر۔" کمپیوٹر آپریٹر نے بتایا۔

"میں ابھی اپنے کمانڈر سے بات کرتا ہوں۔" چیف نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ کرنل بھی اس کی تعظیم میں کھڑا ہوا تھا اور پھر اس کے جانے کے بعد بیٹھ گیا۔

"پریشان مت ہوں جناب ہم آپ کی بیٹی کو بچا لیں گے وہ جانور شکست کا منہ دیکھیں گے۔" فرسٹ لیفٹیننٹ بلال نے کہا۔ "ہمارے ساتھی انہیں تلاش کر رہے ہیں۔"

☆......☆

بند کمرے میں دہشت گرد نازلی پر تشدد کر رہے تھے۔ وہ چیخ رہی تھی مگر ان پر اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کمرے میں تنہا تھے دو وہی نقاب پوش جو ویڈیو میں نظر آ رہے تھے اور ایک دوسرا شخص جس نے سیاہ لباس پر بلٹ پروف تو پہنی ہوئی تھی لیکن اس کے چہرے پر نقاب نہیں تھا بلکہ سفید اور کالی داڑھی تھی۔

"پلیز...... مجھے جانے دو...... مجھے چھوڑ دو......" نازلی بار بار چیخ رہی تھی کہ ایک نقاب پوش اسے کھینچتے ہوئے ایک چھوٹے کمرے میں لے گیا۔

"میں کچھ نہیں جانتی مجھے چھوڑ دو۔" نازلی پھر چیخی لیکن اس نے دھکا دے کر اسے فرش پر گرا دیا۔

"پلیز...... مجھے جانے دو...... میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ بار بار کہہ رہی تھی لیکن اس شخص نے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور نازلی زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔

"دروازہ کھولو...... مجھے جانے دو۔"

☆......☆

ڈاکٹر صباہ ایسل اسپتال کے استقبالیہ پر کھڑی تھی۔ اس نے سیاہ لمبا کوٹ پہنا ہوا تھا اور وہ بیرونی دروازے کے شیشوں سے باہر دیکھ رہی تھی جہاں اسپتال سے دور بالکل سامنے یووز کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی وہ کبھی اِدھر اُدھر دیکھتا اور کبھی اداس نظروں سے اسپتال کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ وہ دروازے سے باہر آئی اس کی نظریں مسلسل یووز پر تھیں جو اب سر جھکائے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر چلتی ہوئی گئی۔ بار بار مڑ کر یووز کو دیکھتی ہی رہی تھی۔

☆......☆

ایک لمبے کمرے میں میز کے گرد بیٹھے کرنل اردن، فرسٹ لیفٹیننٹ بلال اور چیف کمانڈر میٹنگ اٹینڈ کر رہے تھے۔

"سر، لیفٹیننٹ کرنل اردن اور میں آپ کو سن رہے ہیں۔" چیف کمانڈر نے کہا۔ وہ اپنے کمانڈر کے ساتھ ویڈیو کانفرنس میں بات کر رہا تھا۔

"اردن جو کچھ ہوا مجھے اس پر افسوس ہے۔" کمانڈر انچیف نے کہا۔

"شکریہ سر۔"

"میں نے بھی ویڈیو دیکھی ہے۔ تمہاری بیٹی یا کسی اور کی بیٹی ہمارے لیے سب برابر ہیں تمام ترک شہری برابر حیثیت رکھتے ہیں۔" کمانڈر انچیف نے کہا جس کے دونوں جانب ان کے اسسٹنٹ بیٹھے تھے اور دونوں ہی جانب ترکی کے سرخ پرچم لہرا رہے تھے جن پر سفید چاند ستارہ بنا ہوا تھا۔

"ہم کبھی نہیں چاہیں گے کہ اسے دہشت گردوں کے رحم و کرم پر چھوڑا جائے ہم سے جو کچھ ہو سکا ہم اس کی رہائی کے لیے کریں گے اردن۔"

"شکریہ سر۔" اردن نے کہا۔

"اس کے علاوہ میں نے ابھی شاپنگ مال کے حملے کے سلسلے میں انقرہ سے بات کی ہے، تمہیں نئے آپریشن آرڈرز ملیں گے۔"

"یس سر۔" کرنل اردن نے کہا۔

"سر، وہ لوگ ہم سے سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں۔" چیف کمانڈر نے کہا۔

"میں جانتا ہوں صورت حال کتنی نازک ہے لیکن ہم ہمت نہیں ہاریں گے اور اپنی بیٹی کو بچائیں گے، اللہ ہم سب کی حفاظت کرے، نیک تمنائیں، شکریہ۔"

"شکریہ سر۔" چیف کمانڈر نے کہا۔ میٹنگ ختم ہوتے ہی کمپیوٹر آپریٹر نے ایک کاغذ لا کر کرنل اردن کو پکڑا دیا تھا۔

"آپریشن آرڈرز آ گئے ہیں جناب۔ انقرہ سے آئے ہیں۔" وہ پیپر چیف کمانڈر نے کرنل سے لے لیا اور پڑھنے لگا۔

"ڈیوٹی سولجرز کی ٹیم میں سے ایک اسپیشل ٹیم بناؤ۔" انہوں نے کرنل اردن سے کہا۔ "جس کو یہ کام دو کہ وہ دہشت گرد تنظیم کے لیڈر کو ڈھونڈ کر ٹھکانے لگائے۔" چیف کمانڈر نے کہا۔ "ان کی بہادرانہ صلاحیتیں ایک بار پھر آزماؤ۔"

"یس سر۔"

"اللہ تمہاری مدد کرے۔"

"شکریہ سر! مجھے اجازت ہے؟" کرنل نے اٹھتے ہوئے کہا اس کے ساتھ اس کا فرسٹ لیفٹیننٹ بھی کھڑا ہو گیا اور چیف کمانڈر کے اثبات میں سر ہلانے کے بعد وہ کمرے

UUNOVELS.COM

سے نکل گئے۔

''بلال، تم نے سنا چیف کمانڈر کیا کہہ رہے تھے۔'' کرنل ارڈن نے فرسٹ اسسٹنٹ سے پوچھا۔

''یس سر۔''

''اب جلد از جلد مجھے بارہ ایسے افراد تلاش کر کے دو جو فوجی ہوں لیکن ان کی جرأت و بہادری بے مثال ہو جنہیں شکست دینا ناممکن ہو اور جو دہشت گردوں کو ڈھونڈ کر انجام تک پہنچا سکیں۔''

''یس سر۔'' فرسٹ لیفٹیننٹ نے کہا۔

''خیال رکھنا ان کا تعلق انفرا اسپیشل برانچ سے ہونا چاہیے۔''

''یس سر!'' لیفٹیننٹ نے مستعدی سے کہا۔

☆......☆

ٹی وی پر بار بار اعلان نشر ہو رہا تھا کہ دہشت گرد تنظیم کی طرف سے مسلسل دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ ان کے ساتھی کو آزاد کیا جائے ورنہ وہ ایک ایک کر کے شہریوں کو نشانہ بناتے رہیں گے۔ ان کی طرف سے ایسی ویڈیوز جاری کی جا رہی ہیں جنہیں بین کر دیا گیا ہے، جب کہ ذمے داران کی طرف سے واضح کیا گیا ہے کہ دہشت گردوں سے کسی قسم کا سمجھوتا نہیں کیا جائے گا۔ کرنل ارڈن کی بیوی گولر ٹی وی پر چل رہی خبروں پر نظر جمائے ہوئے تھی۔ رہ رہ کر بیٹھی سسکیاں بھی لے رہی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے گولر؟'' کپڑے تبدیل کر کے کرنل ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، بیوی پر نظر پڑتے ہوئے بولا۔

''یہ کس قیدی کو رہا کروانے کی بات کر رہے ہیں میری نازلی کے بدلے میں؟'' گولر نے روتے ہوئے پوچھا۔ ارڈن صوفے پر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''شاپنگ مال کے خودکش دھماکے میں جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں وہ اور ایک عورت کو اغوا کرنے والا دہشت گرد جسے یوز نے گرفتار کروایا تھا، ان کی رہائی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔'' ارڈن نے بتایا۔

''تو آپ مان لیں...... میری بچی کی جان خطرے میں ہے۔'' گولر نے روتے ہوئے کہا۔

''میں ان کے ساتھ سمجھوتا نہیں کر سکتا۔''

''کیا؟''

''گولر، صبر کرو، ان کے پاس ہماری بیٹی یرغمال ہے پھر بھی ہم سمجھوتا نہیں کر سکتے۔ اگر ایک بار ان کی بات مان لی تو وہ بار بار یہی کریں گے پھر نہ جانے کتنے شہری ان کے ظلم کا نشانہ بنیں۔''

''اور اگر انہوں نے اسے مار دیا تو...... تو کیا ہوگا؟ سنو ارڈن! میں ہر حالت میں اپنی بیٹی کی واپسی چاہتی ہوں اسے بچاؤ...... خدا کے لیے۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا گولر۔'' ارڈن نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''مجھے واپس بٹالین میں جانا ہے۔'' ارڈن نے کہا اور اسی وقت گھر سے روانہ ہو گیا۔ گولر سسکتی رہ گئی تھی۔

☆......☆

ارڈن نے اپنے فرسٹ اسسٹنٹ کے ساتھ مل کر بارہ افراد کا انتخاب کیا تھا جو نہایت بہادر، باہمت اور جوشیلے تھے، جنہیں اپنی جان سے زیادہ اپنے وطن سے محبت تھی۔ جو اپنی جان قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے ان میں ایک علی حیدر تھا جو بہت سی زبانوں کا ماہر تھا۔ اس کی بیوی اسپتال میں تھی اور بچے کی ولادت ہونے والی تھی۔ وہ دشمن کو تلاش کرنے کا ماہر تھا، اس نے اپنے جانے کے بارے میں اپنی بیوی کو بتایا تو اس نے علی حیدر کو روکنے کی بہت کوشش کی۔

''اگر تم وہاں نہیں جاؤ گے تو وہ مر نہیں جائیں گے تمہارے بغیر بھی کام ہو جائے گا۔'' اس کی بیوی نے کہا۔ ''مجھے اس وقت یہاں تمہاری ضرورت ہے، تم باپ بننے والے ہو، میں یہاں تنہا ہوں۔'' وہ رو رہی تھی۔

''وہ میرے بغیر نہیں مریں گے لیکن میں یہاں مر جاؤں گا، اگر وقت پڑنے پر اپنے وطن کے کام نہ آیا تو یہ شرمندگی مجھے ساری عمر جینے نہیں دے گی۔'' علی حیدر نے کہا اور اس سے رخصت ہو گیا۔

اگلا فوجی فتح تھا جو زیادہ سے زیادہ دوری پر بھی ٹھیک نشانہ لگانے کا ماہر تھا۔ اس کے بعد لیفٹیننٹ کمانڈر کی باری تھی جو اس وقت اس علاقے میں موجود تھا جہاں نازلی کو یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا۔ اس نے ایک مسافر کا روپ دھارا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ایک گدھا تھا جس پر کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ گیارہ فوجیوں کا انتخاب کرنے کے بعد فرسٹ اسسٹنٹ بلال نے یوز کی فائل پیش کی اور بتایا کہ یوز بھی بہترین فوجی ہے کئی معرکے جیت چکا ہے چنانچہ اسے بھی اسپیشل فوج میں شامل کیا جائے۔

''نہیں، وہ ابھی اس کنڈیشن میں نہیں ہے کہ اسے ایسی ذمے داری دی جائے۔'' کرنل ارڈن نے کہا عین اسی

UUNOVELS.COM

وقت اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''یس۔'' ارڈن نے کہا اور ایک فوجی اندر داخل ہوا۔

''سر! ابھی دہشت گردوں نے ایک ویڈیو انٹرنیٹ پر ڈالی ہے۔'' فوجی نے بتایا۔

''کیسی ویڈیو ہے؟''

''سر، اس میں نازلی کو دکھایا گیا ہے۔'' فوجی نے بتایا۔

''مجھے دکھاؤ۔'' ارڈن نے فوراً کہا اور فوجی نے ہاتھ میں پکڑا لیپ ٹاپ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''جو وقت ہم نے ترکی حکومت کو دیا تھا وہ تیزی سے گزر رہا ہے۔'' ویڈیو میں ایک دہشت گرد نقاب پوش بول رہا تھا اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔

''ہمارا دوست اب بھی قید ہے ابھی تم جو دیکھنے والے ہو وہ محض وارننگ ہے۔'' اس نے کہا۔ اور پیچھے ہٹ گیا اسی وقت ایک کچے گھر کا دروازہ کھلا اور نازلی روتی ہوئی باہر آئی۔

''مجھے جانے دو۔'' وہ رو رو کر کہہ رہی تھی اور اس کے پیچھے موجود نقاب پوش دہشت گرد اسے دھکے دیتا ہوا باہر لا رہا تھا۔

''پلیز...... مجھے جانے دو...... مجھے جانے دو۔'' وہ تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر کرنل ارڈن کے چہرے سے غصہ نمایاں ہونے لگا اور اس کی سانسیں تیز چلنے لگیں۔ دوسرے دہشت گرد نے جیب سے اپنا پستول نکال لیا تھا اور نازلی کا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔ اسی وقت نازلی نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

''تم...... جنگلی جانور......'' وہ زور سے چیخی۔

''اگر تم ہمارے ساتھ تعاون نہیں کرو گے تو ہم اس کے اندر جگہ جگہ سوراخ کر دیں گے۔'' ان کے لیڈر نے کہا اور نازلی کی ہتھیلی پر پستول رکھ دیا۔

''نہیں...... خدا کے لیے نہیں...... مجھے چھوڑ دو۔'' نازلی چیخی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن دہشت گرد کو کوئی رحم نہیں آیا تھا۔ اس نے بلا تاخیر پستول اس کی ہتھیلی پر رکھ کر چلا دی تھی اور نازلی درد کی شدت سے چیخ اٹھی تھی۔

''نازلی!'' ارڈن اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا اور اس نے میز پر پوری قوت سے مکا مارا تھا اس کے ساتھ ہی لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

''وحشی انسان۔'' وہ غصے سے دیواروں پر مکے مار رہا تھا اور آنکھوں میں آنے والے آنسو صاف کر رہا تھا۔

''سر آپ ٹھیک ہیں؟'' اس کے فرسٹ اسسٹنٹ بلال نے پوچھا۔ ''سر، ہمارے چیف آف اسٹاف یہاں موجود ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ آپ نے پوری بٹالین منتخب کر لی؟''

☆......☆

نقاب پوش دہشت گردوں کی نظریں نازلی پر لگی تھیں جبکہ وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

''اسے پہلے تکلیف ہو گی لیکن پھر یہ تکلیف بھول جائے گی۔'' ایک دہشت گرد نے دوسرے سے کہا۔ نازلی گہری گہری سانسیں لے رہی تھی کہ ایک نوعمر دہشت گرد نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے کچھ ہی دیر بعد نازلی کو ہوش آ گیا۔

''اللہ تم سے مظلوموں کا بدلا لے گا۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''اس لڑکی کو مرنے نہیں دینا۔ یہ ہماری بہت سی پریشانیوں کا حل ہے۔'' ان کے لیڈر نے کہا اور ایک دہشت گرد نازلی کی ہتھیلی پر پٹی باندھنے لگا۔

☆......☆

ہیڈ کوارٹرز میں فوجیوں کی پریڈ کے بعد چیف کمانڈر ان سے خطاب کر رہے تھے۔ ''اسپیشل فورسز بٹالین آپ کے آرڈرز لینے کے لیے تیار ہے سر۔'' کرنل ارڈن نے چیف کمانڈر سے کہا۔

''ہیلو جوانو! آپ کیسے ہیں؟'' چیف کمانڈر نے پوچھا۔

''شکریہ سر۔'' بٹالین کے نوجوانوں نے ایک ساتھ سیلیوٹ کرتے ہوئے ایک آواز میں جواب دیا۔

''نوجوانو! سکون سے میری بات سنو۔ اس وقت تمہارے کمانڈر کی بیٹی دہشت گردوں کے پاس یرغمال ہے۔ وہ ایک آفیسر کی بیٹی ہے، اس سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ وہ اس سرزمین کی بیٹی ہے اور اس وقت دہشت گرد تنظیم کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ ان ہزاروں لوگوں میں سے ہے جنہیں یرغمال بنایا گیا۔ زخمی کیا گیا اور مار دیا گیا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس کی بیٹی ہے یا کس کی رشتے دار ہے۔ ہماری ملازمت کا مقصد اس ملک کے ہر شہری کی حفاظت کرنا ہے چاہے اس کا پیشہ کچھ بھی ہو اور اس کا تعلق کسی بھی شہر سے ہو ہمیں ہمیشہ اور ہر جگہ ہر شہری کی حفاظت اور خدمت کرنا ہے۔ یاد رکھو، ہمارے عوام تب ہی سکون کی نیند سو سکیں گے جب تم ہر وقت اپنی جان کی قربانی دینے کے

UUNOVELS.COM

لیے تیار رہو گے۔"

"تم تیار ہو؟"

"یس سر!" سب نے یک زبان کہا۔

"آج اور ابھی سے سب کی چھٹیاں منسوخ کر دی گئی ہیں، تم سوؤ گے نہیں کھاؤ گے نہیں، تم اپنی بیویوں اور دوستوں سے فون پر بات نہیں کرو گے، تمہاری سانس اس لیے چلنا چاہیے کہ تمہیں وطن کے بچوں کو بچانا ہے۔ کیا تم سمجھ گئے؟"

"یس سر!" سب نے جواب دیا۔

"ایک بات ان دہشت گردوں کی سمجھ میں آ جانا چاہیے کہ اس لڑائی کا نتیجہ چاہے جو بھی ہو لیکن دہشت گردوں کے ساتھ کوئی سمجھوتا نہیں ہوگا۔ میں کبھی بھی اپنے ملک کی عزت اور شان پر کوئی سمجھوتا نہیں کروں گا جو اس کے زوال کا باعث بنے، تم سمجھ گئے؟"

"یس سر!" تمام فوجیوں نے کہا۔

"تم جو اس ملک کا سرمایہ ہو اس مقصد کو پورا کرو گے۔ اس وقت اس ملک کی ایک شہری ان دہشت گردوں کے ہاتھ میں ہے یہ ان ہزاروں میں سے ایک ہے جنہیں ان دہشت گردوں نے زخمی کیا یا مار دیا، سمجھ گئے؟"

"یس سر۔"

"اللہ تم سب کی حفاظت کرے۔"

☆......☆

یوز کو تیسرا دن تھا۔ وہ زی ایچ اسپتال کے سامنے کھڑا تھا جہاں ماروی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسپتال کے اندر استقبالیہ کاؤنٹر کے قریب ڈاکٹر صباہ کھڑی بیرونی دروازے کے شیشے کے پیچھے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کئی لمحے گزر گئے تو اس نے ایک وارڈ بوائے کو بلایا۔

"نعمان! میرا ایک کام کرو گے؟"

"یس ڈاکٹر!"

"وہ دیکھو سامنے سڑک کے پار بجلی کے پول کے نیچے ایک شخص کھڑا ہے، سیاہ پتلون اور سیاہ جیکٹ پہنے۔"

"یس، ڈاکٹر۔"

"وہ کئی راتوں سے اسی طرح وہاں کھڑا ہوتا ہے جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو یا کسی کا منتظر ہو۔ اسے بلا کر لاؤ۔" ڈاکٹر صباہ نے کہا۔

"یس ڈاکٹر۔" نعمان نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

یوز اسپتال کے سامنے کھڑا خالی خالی نظروں سے اسپتال کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی سفید رومال تھا جس میں اس نے ماروی کی قبر کی مٹی رکھ کر انتقام لینے کا عہد کیا تھا۔ تصور کی آنکھوں سے وہ ماروی کے حسن میں کھویا ہوا تھا۔

"سالگرہ مبارک ہو یوز۔"

"سالگرہ مبارک ہو یوز!"

تصور میں ماروی بار بار اس سے کہہ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں بڑا سا کیک تھا جس میں موم بتیاں روشن۔ اس نے ہلکا گلابی لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔

"یہ موم بتیاں بجھاؤ اور کوئی دعا مانگو۔" ماروی کہتی ہے۔

"ٹھیک ہے۔" یوز مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔ آنکھیں چند لمحوں کو بند کرتا ہے اور پھونک مار کر موم بتیاں بجھا دیتا ہے پھر وہ ماروی کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کا ماتھا چوم لیتا ہے۔

"تم نے اللہ سے کیا مانگا؟" ماروی پوچھتی ہے۔

"میں نے تمہیں مانگا۔"

"جھوٹ میں تو خود تمہارے پاس موجود ہوں۔" ماروی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں ہمیشہ کے لیے مانگا ہے۔" یوز نے کہا اور ماروی اداس ہو گئی۔

"تم اداس کیوں ہو گئیں؟" اس نے پوچھا۔

"تم واپس کب جا رہے ہو؟"

"کل۔"

"کیا پھر سرحدوں پر جا رہے ہو؟"

"نہیں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ میں جانتی ہوں تم آپریشن پر جا رہے ہو۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں؟ کسی نہ کسی کو تو ان لوگوں سے لڑنا ہے۔"

"یوز میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں لیکن سچ بولنا۔"

"اس کا انحصار تو تمہارے سوال پر ہے۔"

"کیا تم نے کبھی کسی کو مارا ہے؟ میرا مطلب ہے جان سے مارا ہے؟"

"میں فوجی ہوں، میں مارتا نہیں بلکہ معاشرے کو برے لوگوں سے پاک کرتا ہوں۔"

UUNOVELS.COM

"اس میں گن سے لوگوں کو شوٹ کرنا بھی شامل ہے؟"

"جو لوگ باتوں سے ماننے والے نہیں ہوتے یہ ان کا انتخاب ہوتا ہے میرا نہیں۔"

"یوز، میں بہت خوفزدہ ہوں۔"

"میں جانتا ہوں...... میں جانتا ہوں...... لیکن یہی میری زندگی ہے اور اس کا انجام شاید یہ ہو کہ ایک دن دو فوجی تمہارے دروازے پر دستک دیں اور اپنے ساتھ لایا ہوا ترکی کا جھنڈا تمہیں پیش کریں، میری طرف سے تمہارے لیے چھوڑا جانے والا تحفہ یہی ترکی کا جھنڈا ہوا اور یہ کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔" یوز نے چند لمحے بعد کہا۔ "تم مانگو مجھ سے کیا مانگتی ہو؟ میری جب تک زندگی ہے تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا لیکن کبھی بھی میری ڈیوٹی کے راستے میں مت آنا۔" یوز نے کہا اور ماروکی نے اداسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا اس لیے تمہیں حقیقت بتا دی ہے۔"

"پھر میں اتنی خوفزدہ کیوں ہوں؟"

"شاید اس لیے کہ تم نے مجھے یونیفارم میں دیکھا اور جب ملاقات ہوئی تو خودکش حملے کا سامنا ہوا۔"

خیالوں میں ماروکی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی کہ اچانک وارڈ بوائے نعمان اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"برادر! کئی دن سے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"کیا تمہیں کسی کا انتظار ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تم یہاں کیوں کھڑے رہتے ہو؟"

"میں اسپتال کو دیکھتا ہوں۔"

"لیکن کیوں؟"

"کیوں کہ میرے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں ہے۔"

"آؤ...... میرے ساتھ اندر آؤ اور ایک کپ چائے پی لو۔" نعمان نے پیشکش کی اور یوز کا ہاتھ تھامے اسپتال میں آ گیا لیکن جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا سامنے لابی میں ایک شخص دوسرے سے لڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر صباہ اس کے قریب کھڑی تھی۔

"تم سب کیا کر رہے ہو؟ میرا بھائی زخمی ہے۔" اس نے غصے سے کہا۔

"تمہارے بھائی کو طبی امداد دی جا رہی ہے اس کو ٹانکے لگ رہے ہیں۔" ڈاکٹر صباہ بولی۔

"سن لو اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں اس اسپتال کو تباہ کر دوں گا۔" اس نے طیش میں کہا۔

"پلیز خاموش ہو جائیں، کچھ خیال کریں۔ یہ اسپتال ہے۔" ڈاکٹر صباہ نے سمجھایا۔ "آپ مریضوں کو پریشان کر رہے ہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتا، میرے بھائی کو ابھی لے کر آؤ، میں تم کو کہتا ہوں کہ اگر اسے کچھ ہوا تو میں تمہیں مار ڈالوں گا۔"

"خاموش ہو جاؤ۔ شور مت کرو۔" ڈاکٹر صباہ نے ڈانٹا۔

"تم چپ ہو جاؤ، تم نے میرے بھائی کے ساتھ کیا کیا ہے۔ بتاؤ جلدی بتاؤ۔" وہ زور سے چیخا۔ ارد گرد لوگ جمع ہو گئے تھے اور اس شخص نے چاقو نکال لیا تھا۔

"چاقو پھینک دیں جناب۔" یوز نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"بتاؤ...... بتاؤ...... تم نے میرے بھائی کے ساتھ کیا کیا ہے؟" وہ چاقو لہرا لہرا کے ڈاکٹر صبا سے کہنے لگا۔

"برادر...... پرسکون رہو...... ٹھہرو...... میری بات سنو۔" یوز اس کی طرف بڑھا۔

"تم کیا چیز ہو؟ میں تمہیں چاقو مار دوں گا۔ کون ہو تم؟" اس شخص نے یوز سے کہا اور اس پر حملہ آور ہو گیا۔

یوز خود کو بچاتے ہوئے اسے قابو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"میں تمہیں مار دوں گا۔" وہ شخص بار بار دھمکی دے کر حملہ کر رہا تھا۔ مگر وہ بھول رہا تھا کہ یوز کمانڈو ہے۔ چند لمحوں کی جدوجہد کے بعد یوز نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"کون ہو تم؟ کیا دہشت گرد ہو؟" یوز نے پوچھا۔

"پولیس کو کال کرو۔" اس نے زور سے کہا اور استقبالیہ کاؤنٹر سے کلرک نے پولیس کا نمبر ملا لیا۔

"مجھے چھوڑو...... مجھے چھوڑو۔" اجنبی خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا تب تک دوسرے لوگوں نے بھی یوز کی مدد کی تاکہ ملزم کو قابو میں رکھا جا سکے۔

"اوہ تم تو زخمی ہو۔" ڈاکٹر صباہ نے آگے بڑھ کر اس کا دایاں بازو پکڑ کر سامنے کرتے ہوئے کہا۔ اس کی جیکٹ چاقو کے وار سے کٹ گئی تھی اور آستین خون سے لال ہو رہی تھی۔

"اس کا فوراً علاج ہونا ضروری ہے۔ آپ میرے

UUNOVELS.COM

ساتھ آئیں۔"

"نہیں نہیں...... اس کی کوئی ضرورت نہیں میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"نہیں...... اس پر ٹانکے لگیں گے۔ آپ آئیں۔" ڈاکٹر صباہ نے کہا اور ایک کمرے میں گئی جہاں کئی بیڈ بچھے تھے۔ ایک ٹیبل پر دوائیں اور فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔

"اپنی جیکٹ اور قمیص اتاریں۔" اس نے سامان ایک ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا اور ڈاکٹر صباہ ٹرے میں سامان لے کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ یوز نے جیکٹ اور شرٹ اتار دی تھی۔ ڈاکٹر صباہ کی نظریں اس کی کمر پر لگے زخموں کے نشانات پر پڑی تھیں۔ اس نے دستانے پہنے تھے اور ایک انجکشن میں دوا بھر کر تیار کیا تھا۔

"آپ کا شکریہ...... میں ایسے ہی ٹھیک ہو جاتا۔" یوز نے ایک بیڈ کے کونے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر نے اس کی بات کو سنی اَن سنی کر کے انجکشن لگا دیا پھر وہ اس کے زخموں کو صاف کرنے لگی۔

"کیا تم پولیس میں ہو؟" ڈاکٹر صباہ نے پوچھا۔

"میں ایک فوجی ہوں۔" یوز نے بتایا۔

"تمہارے جسم پر پرانے زخموں کے بہت سے نشان ہیں۔" ڈاکٹر صباہ نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ میں اب بھی زندہ ہوں۔ یہ زخموں کے نشان نہیں میری کامیابیوں کے تمغے ہیں۔"

"تمہاری ڈیوٹی کہاں ہے؟"

"کاراباک میں، میں چھٹی پر ہوں۔"

"میں زخموں پر ٹانکے لگانے لگی ہوں تیار ہو جاؤ۔" ڈاکٹر صباہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" یوز نے جواب دیا۔ پھر جب وہ ٹانکے لگا رہی تھی تو یوز کے چہرے پر کسی تکلیف کے آثار نہیں تھے۔ وہ پُرسکون بیٹھا تھا۔

"تمہیں تکلیف تو نہیں ہو رہی؟"

"مجھے تکلیف ہے لیکن اسے محسوس نہیں کر پاتا کیونکہ میں اس کا عادی ہو گیا ہوں۔"

"میں پچھلے کئی دنوں سے تمہیں اسپتال کے سامنے کھڑے دیکھتی رہی ہوں تم کسی کا انتظار کر رہے ہو؟"

"کسی کا نہیں۔"

"کیا تمہارا کوئی رشتہ دار بچھڑ گیا ہے یا......"

"میری منگیتر۔"

"کیا اس کا انتقال یہاں ہوا تھا؟"

"ہاں۔"

"مجھے دکھ ہوا۔" ڈاکٹر صباہ نے کہا۔

"اللہ ہمارے وطن کو ہمیشہ قائم رکھے۔" یوز نے کہا۔

"کیا تم اس سے بہت محبت کرتے تھے؟"

"جتنی زیادہ محبت کوئی کسی سے کر سکتا ہے میں اس سے کرتا تھا۔" یوز نے کہا۔

ڈاکٹر صباہ ٹانکے لگا چکی تھی اور وہ اپنی شرٹ پہن رہا تھا ڈاکٹر کی نظر اس کے گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ پر گئی جو بالکل ویسا ہی تھا جیسا اسپتال میں مرنے والی لڑکی کا تھا۔ وہ ڈاکٹر صباہ کے پاس تھا اس میں ایک لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو بانہوں میں لیے رقص کر رہے تھے۔

"کیا تم تھوڑی دیر انتظار کرو گے۔ میں ابھی واپس آئی۔" ڈاکٹر صباہ نے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔ وہ سیدھی اپنے آفس میں آئی اور اپنے بیگ میں لاکٹ ڈھونڈنے لگی۔ یوز جیکٹ پہن کر کمرے سے باہر آیا تو لابی میں لگے ٹی وی میں خبریں آ رہی تھیں۔

"ابھی ابھی پولیس کی جانب سے ایک خبر آئی ہے کہ دہشت گردوں کی طرف سے ایک تصویر جاری کی گئی ہے جس کو "کوس" کا نام دیا گیا ہے۔ یہ اس شخص کا نام بھی ہے جس نے دہشت گرد گروپ بنایا، یہ تصویر بھی اسی کی ہے، اس پر 300000 لیرا انعام رکھا گیا ہے۔ یہ دہشت گرد تین بار پہلے بھی گرفتار ہو چکا ہے Most Wanted list میں اس کا نام موجود ہے۔ اس کے لیے ساری دنیا کو خبردار کر دیا گیا ہے۔"

یوز یہ خبر سنتے ہی تیز تیز قدموں سے اسپتال کے مرکزی دروازے کو پار کر گیا۔ ڈاکٹر صباہ جب لاکٹ لے کر اس کمرے میں واپس پہنچی تو وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ تیزی سے لابی میں آئی پھر ایک گزرتی ہوئی نرس سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ ابھی اسپتال سے باہر نکلا ہے۔ ڈاکٹر صباہ ہاتھ میں لاکٹ لیے اداس کھڑی رہ گئی۔

☆......☆

کاراباک کے ایک غیر آباد علاقے میں سارجنٹ اٹلس ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ایک چرواہا بچہ کھڑا تھا جس کی بھیڑیں کچھ فاصلے پر چر رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔

"کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ تم نے یہاں اطراف میں کچھ ایسا دیکھا ہے جو عجیب لگا ہو؟" اس نے پوچھا۔

UIUNOVELS.COM

''ہاں ایک ایسا منظر دیکھا تھا میں نے تین لوگوں کو دیکھا تھا وہ ایک گھر میں داخل ہو رہے تھے ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی اسے وہ زبردستی اندر لے جا رہے تھے۔''

''وہ کس مکان میں گئے تھے؟''

''میں بھیڑیں چرا رہا تھا وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس مکان میں داخل ہو گئے تھے۔ اس نے ہاتھ سے دور نظر آنے والے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں نے کل رات اس لڑکی کو ٹی وی پر بھی دیکھا تھا۔'' لڑکے نے کہا۔

''تمہیں یقین ہے؟''

''ہاں، مجھے یقین ہے سر۔'' لڑکے نے کہا۔ ''ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ ہمیں ان لوگوں سے بچاؤ وہ ہمیں تنگ کرتے ہیں ہمارے گھروں کو اور ہمیں جلاتے ہیں انہوں نے میرے والد کو بھی مار دیا تھا۔''

''اچھا، ٹھیک ہے۔'' میجر سارجنٹ اٹلس نے کہا اور جیب سے نکال کر اس کو ایک چاکلیٹ دی وہ لڑکا چلا گیا اور کمانڈر نے اپنی جیب سے ایک کیمرا نکال کر اس گھر کی تصویر کھینچ لی پھر کیمرا واپس جیب میں ڈال لیا۔

☆......☆

ہیڈ کوارٹر میں کرنل ارڈن اور چیف کمانڈر آفس میں بیٹھے تھے اور ان کے سامنے دیوار پر لگی اسکرین میں ایک منظر نظر آ رہا تھا۔ ایک ویران علاقے میں ٹیلوں اور پہاڑیوں کے درمیان ایک گھر بنا ہوا تھا۔ یہ وہی گھر تھا جس کی تصویر کچھ دیر پہلے سارجنٹ اٹلس نے کھینچی تھی۔

''سر! سارجنٹ اٹلس نے کچھ تصویریں بھیجی ہیں اور کہا ہے کہ کرنل ارڈن کو دکھائی جائیں۔ ان میں جو گھر نظر آ رہا ہے یہاں کرنل کی بیٹی نازلی کو رکھا گیا ہے۔''

''ان سے کہو تفتیش جاری رکھے۔ سخت نگرانی کریں میں کوئی بھی غلطی نہیں چاہتا مجھے سو فیصد درست معلومات ملنا چاہئیں۔'' چیف کمانڈر نے کہا، کرنل ارڈن کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں نظر آ رہے تھے۔ اسی وقت ایک فوجی اندر داخل ہوا۔

''سر میں سارجنٹ فرسٹ کلاس، گلو گلو ہوں۔ کیا میں کرنل ارڈن سے بات کر سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا تو چیف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''سر آپ کی بیوی گولر یہاں ہیں، وہ باہر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔'' اس نے کرنل سے مخاطب ہو کر کہا۔

''معافی چاہتا ہوں سر۔'' کرنل ارڈن نے چیف سے اجازت چاہی۔

''ٹھیک ہے ارڈن۔''

ارڈن باہر آیا تو راہداری میں گولر کھڑی تھی۔

''گولر تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی میں پاگل ہو رہی ہوں ارڈن۔'' گولر نے اداس آواز میں کہا۔ ''کسی بھی طرح میری بیٹی کو ڈھونڈو۔''

''کام ہو رہا ہے۔ صبر کرو۔'' ارڈن نے کہا۔

''میں کتنے ہی دن سے سوئی نہیں ہوں۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے، وہ کہاں ہے؟ وہ کیسی ہے؟ اسے ہماری مدد کی ضرورت ہے۔''

''ہر کوئی ہماری بیٹی کو تلاش کر رہا ہے۔''

''وہ خیریت سے تو ہے نا؟''

''وہ ٹھیک ہو گی۔ پریشان مت ہو مجھے بہت اہم کام کرنے ہیں تم صبر سے کام لو۔''

''صبر...... صبر...... آخر کب تک میں صبر کروں۔ جب کہ میری بیٹی مشکل میں ہے میں مزید برداشت نہیں کر سکتی کیا تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟''

''میں کسی سے کچھ نہیں چھپا رہا ہوں۔ ابھی تم جاؤ۔ میرے لیے مزید مشکلات پیدا مت کرو۔'' کرنل ارڈن نے کہا اور واپس کمرے میں چلا گیا۔

☆......☆

کچھ دیر بعد وہ اپنے آفس میں بیٹھا تھا جہاں چاروں طرف دیوار پر اسکرین لگے ہوئے تھے جس میں اس علاقے کے مختلف مقامات دکھائے جا رہے تھے جہاں نازلی کو رکھا گیا تھا۔ تبھی سارجنٹ اٹلس، فرسٹ آفیسر بلال کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ''سب علاقے کی نگرانی کر رہے ہیں، ہمیں جیسے ہی مطلوبہ جگہ کی تصویر ملتی ہے ہم کارروائی کریں گے۔'' سارجنٹ نے کہا تو کرنل ارڈن نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسکرین پر ایک جہاز نظر آیا جس نے نیچے زمین پر ایک گھر کی نشاندہی کی ہوئی تھی۔ گھر ایک چوکور سرخ نشان میں نظر آ رہا تھا۔

''سر ہمیں ایک ویژول موصول ہوا ہے، یہ وہ گاڑی ہے جس میں دہشت گرد مس نازلی کو لے کر گئے تھے۔'' سارجنٹ نے بتایا۔ کرنل ارڈن نے دیکھا کہ گھر کے قریب سرخ رنگ کی ایک جیپ کھڑی تھی جو اسی لمحے گھر کے سامنے آ کر رکی تھی۔ یہ وہی گھر تھا جس کی تصویر میجر سارجنٹ نے

UUNOVELS.COM

بھی بھیجی تھی۔

"بلال ٹیم کو ریڈی کرو۔" کرنل اردن نے کہا۔

"میں چیف سے بات کرتا ہوں۔"

"یس سر!" بلال نے کہا اور میجر سارجنٹ اٹلس کے ساتھ کمرے سے نکل گیا جہاں راہداری میں یووز موجود تھا جو بلال سے لپٹ گیا تھا۔

"کیسی کہاں گئی ہے؟" یووز نے پوچھا۔

"نہیں پتا چل گیا ہے کہ نازلی کہاں ہے؟" بلال نے کہا۔

"کون نازلی؟" یووز نے پوچھا۔

"کیا مطلب تمہیں نہیں معلوم؟ کرنل اردن کی بیٹی۔ اسے دہشت گردوں نے اغوا کرلیا ہے۔" بلال نے بتایا۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟ لیفٹیننٹ کرنل اردن کی بیٹی نازلی؟" یووز نے کہا اور بغیر جواب کا انتظار کیے کرنل اردن کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ "کرنل۔"

"تم یہاں کیا کررہے ہو؟" کرنل نے پوچھا۔

"میں اس آپریشن میں شامل ہونا چاہتا ہوں جناب۔" یووز نے کہا۔

"یہ آپریشن بلال کی ذمے داری ہے۔"

"مجھے بھی جانے دیں سر۔"

"نہیں...... تم نہیں...... تم بہت جذباتی ہو۔"

"سر، اس معاملے کی تہہ میں کوس ہے جو نہایت ہوشیار اور خطرناک ہے۔ ان لوگوں کا سربراہ ہے جنہوں نے آپ کی بیٹی کو اغوا کیا ہے۔"

"تم پریشان مت ہو۔ لوگ کام کررہے ہیں۔" کرنل نے کہا۔

"کیوں سر؟"

"اس لیے کہ میں چاہتا ہوں کہ تم اس معاملے سے دور رہو۔" پھر اس نے مڑ کر کمرے میں کھڑے فوجی سے کہا۔ "فرسٹ لیفٹیننٹ یووز کو فوجی علاقے سے باہر نکال دیا جائے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے، میں خود چلا جاؤں گا۔" یووز نے کہا اور کمرے سے نکل گیا اسی وقت کمپیوٹر آپریٹر نے ایک کاغذ اردن کے سامنے لاکر رکھا۔

"چیف آف اسٹاف نے یہ بھیجا ہے سر۔" اس نے کہا۔

اردن نے کاغذ اٹھا کر دیکھا جس میں ٹیم کے آپریشن پر بھیجنے کی ہدایت تھی۔ اس نے کاغذ پڑھ کر روانگی کا حکم دے دیا تھا اور ٹیم ایک ہیلی کاپٹر میں روانہ ہوگئی تھی۔ یووز انہیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ ٹیم کے لوگوں نے رک کر اسے سیلیوٹ کیا اور وہ وہاں سے روانہ ہوگیا۔

راستے میں اس نے ایک سفید رنگ کی کار کھڑی دیکھی۔ ایک شخص نے اس کا انجن کھولا ہوا تھا اور انجن پر جھکا تھا، اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی کا انتظار کررہا ہے۔ یووز نے اپنی بائیک کو کافی فاصلے پر لے جا کر روک لی، پتا نہیں کیوں، وہ شخص اسے مشکوک لگا تھا اس سے وہ اتنی دور کھڑا تھا کہ کار والا اسے نظر انداز کرتا۔ بائیک روکنے کے بعد اس نے سارجنٹ اٹلس کو فون ملایا۔

"کیا تمہارے پاس اٹیل ہے؟" یووز نے پوچھا۔

"یس سر۔"

"مجھے چاہیے۔"

"وہ ایک مقامی لڑکے کے پاس ہے۔"

"مجھے مل سکتی ہے؟"

"ہاں آپ اس سے لے لیں وہ فوجی علاقے کے باہر موجود ہے۔"

"کیا تم نے لڑکی کو دیکھا ہے؟" یووز نے اس سے پوچھا۔

"نہیں سر۔"

"اچھا میں بعد میں فون کرتا ہوں۔" یووز نے کہا اور فون بند کردیا۔ اسی وقت فوج کا ہیلی کاپٹر چھاؤنی سے بلند ہوا۔ کار والے شخص نے آسمان کی طرف دیکھا اور فون ملا کر کسی کو ہیلی کاپٹر کی روانگی کی اطلاع دی پھر وہ کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے روانہ ہوگیا۔ یووز یہ سب دیکھ رہا تھا وہ شخص ہیلی کاپٹر کا تعاقب کررہا تھا۔ یووز اس کے پیچھے روانہ ہوگیا تھا۔ درمیان میں کافی فاصلہ رکھا تھا۔

ہیلی کاپٹر ایک سرسبز پہاڑی علاقے میں اترا تھا جب کہ یووز اس سے پہلے ہی اس گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا جس میں نازلی کو رکھا گیا تھا۔ وہ پہاڑیوں کے درمیان موجود ایک چھوٹے سے میدان میں تھا جو اینٹوں اور تختوں کی مدد سے بنایا گیا تھا۔ جس شخص کا تعاقب کرتا یووز یہاں تک آیا تھا وہ اس گھر کے دروازے پر ہی کار روک کر اندر داخل ہوگیا۔ اس نے سر پر لال ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔

یووز پہاڑی پر جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے اسے دہشت گردوں کا ٹھکانا صاف نظر آرہا تھا۔ گھر کے باہر ایک مٹی کا اونچا سا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ یووز نے اپنی گن ہاتھ میں تھامی ہوئی تھی اور وہ نہایت محتاط انداز میں پہاڑی سے اتر

UUNOVELS.COM

کر تھوڑے فاصلے پر واقع پہاڑی تودے کی آڑ میں چھپ گیا تھا۔اس نے گن چیک کی وہ لوڈ تھی اس نے ایک لمحہ لگا کر موبائل پر کسی کو میسج کیا تھا اور موبائل واپس جیب میں رکھ لیا۔اسی وقت گھر کا دروازہ کھلا اور سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک نقاب پوش باہر آیا۔اس کی رائفل اس کے کاندھے پر لٹکی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھوں میں پیٹرول کا ایک گیلن اور موٹی سی رسی تھی۔یوز پہاڑی ٹکڑے کی آڑ سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔اس نقاب پوش نے موٹی رسی کا بنا ہوا پھندا ایک کرسی پر چڑھ کر برآمدے کے سامنے والے شہتیر میں باندھا اور کرسی سے اتر گیا تھا جو شاید اسی مقصد کے لیے وہاں رکھی گئی تھی۔یوز اس شخص کے گھر میں جاتے ہی پہاڑی پتھر کی اوٹ سے نکل کر گھر کے سامنے پوزیشن سنبھال چکا تھا۔

☆......☆

اسی علاقے میں کچھ فاصلے پر فوجی ہیلی کاپٹر ایک پہاڑی کے دامن میں اترا اور سارجنٹ اٹلس کی سربراہی میں فوجی دستہ ہیلی کاپٹر سے باہر آیا۔ہیلی کاپٹر فوجیوں کو اتارنے کے بعد واپس چلا گیا۔یہاں بھی پہاڑوں کے درمیان ہو بہو ویسا ہی گھر موجود تھا جیسے گھر کے سامنے کچھ فاصلے پر یوز تنہا موجود تھا۔سارجنٹ اٹلس نے فوجیوں کو مختلف سمتوں میں اشارے کیے اور فوجی گھر کے اطراف بکھر گئے پھر وہ وقفے وقفے سے پوزیشن بدلتے گھر کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔سارجنٹ اٹلس ہر لمحے کرنل ارڈن سے رابطے میں تھا۔کرنل اس آپریشن کی لائیو ویڈیو اپنے آفس میں دیکھ رہا تھا۔

☆......☆

یوز کے سامنے موجود گھر کے دروازے سے وہی شخص باہر آیا تھا جو کار ڈرائیو کرتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔اس کے سر پر لال ٹوپی تھی اس کے ہاتھ میں مووی بنانے والا کیمرا تھا جس سے مووی لائیو ٹیلی کاسٹ ہو رہی تھی۔اس نے چبوترے کے سامنے اسٹینڈ پر کیمرا رکھا تھا اور گھر کو فوکس کیا تھا۔یوز کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی خطرناک کھیل کھیلنے والے تھے اس کے بعد ایک داڑھی والا شخص باہر آیا اس نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا لیکن اس کے چہرے پر نقاب نہیں تھی اور یوز کے یقین کے مطابق وہ کوس تھا۔اس کے ہاتھ میں گن تھی اس نے باہر آ کر اطراف کا جائزہ لیا پھر لال ٹوپی والے شخص نے ویڈیو بنانا شروع کر دی تھی۔یوز بڑی چابکدستی سے اپنی جگہیں بدل رہا تھا اور مکان کے بہت نزدیک آ گیا تھا۔

☆......☆

کرنل آرڈن آفس میں بیٹھا آپریشن کی لائیو ویڈیو دیکھ رہا تھا۔اس کے فوجی گھر کے چاروں طرف پھیل چکے تھے۔چار فوجی گھر کے پچھلے حصے کی طرف چلے گئے تھے جہاں سفید رنگ کا لکڑی سے بنا پچھلا دروازہ موجود تھا دروازے کے باہر فوجی کو ایک بجھا ہوا سگریٹ پڑا نظر آیا۔تو اس نے دوسرے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔''میرے خیال میں دہشت گرد اندر موجود ہیں۔''

اس نے یہ بات سرگوشی میں کہی تھی، سب چوکنے ہو گئے تھے۔تبھی سارجنٹ اٹلس نے اشارہ کیا اور دو فوجیوں نے فائرنگ کر کے دروازہ کھول دیا۔وہ ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔وہاں کمرے میں کوئی کمبل اوڑھے لیٹا تھا۔اس پر سب کو حیرت ہوئی وہیں انہیں سگریٹ کا ایک خالی پیکٹ بھی خالی ملا تھا ایک فوجی نے آگے بڑھ کر کمبل ہٹایا تھا تو اس کے نیچے ایک انسانی ڈمی موجود تھی جس کے چہرے پر مسخروں والا میک اپ تھا۔

''نکلو... جلدی نکلو... یہ ٹریپ ہے۔'' سارجنٹ اٹلس زور سے چیخا تھا اور سب باہر کی طرف بھاگے تھے اسی وقت زوردار دھماکا ہوا اور گھر کی دیوار گر گئی تھی۔ہر طرف آگ اور دھوئیں کے بادل چھا گئے تھے تمام فوجی گھر سے باہر آ گئے لیکن ایک فوجی صالح گھر میں ہی دھماکے کی زد میں آ کر شہید ہو گیا۔

☆......☆

دوسری طرف لیفٹیننٹ یوز کے سامنے والے گھر کا دروازہ کھلا اور نازلی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی باہر آئی اس کے ہاتھ اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور وہ رو رہی تھی۔

''مجھے چھوڑ دو... میں نے کچھ نہیں کیا... مجھے چھوڑ دو۔''

''یہ ترکی کی حکومت اور اس کے محافظوں کا انجام ہے۔'' دہشت گرد کوس چیخا۔''تم نے ہمارے آدمی نہیں چھوڑے اب انجام دیکھو۔'' اس کی نظریں سامنے ویڈیو کیمرے پر تھیں اور وہ نہایت طیش میں گفتگو کر رہا تھا۔''ہم ایک ایک کر کے تم سب کو اس لڑکی کی طرح پھانسی لگا دیں گے۔اسے لٹکاؤ۔'' اس نے زور سے اپنے ساتھی سے کہا اور اس کے ساتھی نے جو لڑکی کے ساتھ ہی باہر آیا تھا لڑکی کو کرسی پر چڑھا کر اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا۔یوز نے چند لمحے سوچا اور پھر وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔اس نے نشانہ لے کر لگاتار فائر کیے اور کوس کے دونوں ساتھی لڑکھڑا

کر گر گئے۔ دونوں کے سر میں گولیاں لگی تھیں لیکن سرغنہ کوس بھاگ کر گھر میں داخل ہو گیا۔

یوز تیزی سے بھاگتا ہوا لڑکی کے پاس پہنچا اس کے گلے سے رسی نکالی اور اسے کرسی سے اتار کر اس کے ہاتھ کھول دیئے۔

''پرسکون ہو جاؤ...... چپ ہو جاؤ...... تم محفوظ ہو۔'' اس نے لڑکی کو کھینچتے ہوئے پہاڑی کی طرف دوڑ لگا دی۔ ساتھ ہی ساتھ اسے دلاسہ دیا۔

پہاڑی کی آڑ لیتے ہی لڑکی نے اس سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر اس نے موبائل پر کسی کا نمبر ملایا۔

☆......☆

کرنل اروڈن وائرلیس پر برابر سارجنٹ اٹلس سے پوچھ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ اس نے دھماکے کی آواز سنی تھی اس کے بعد لائیو ویڈیو کا رابطہ ٹوٹ گیا اس حادثے میں ان کا ایک فوجی مارا گیا۔ فوجیوں نے اس پرترکی کا جھنڈا اڑا دیا۔ ہر طرف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ہر فوجی اپنی جگہ ساکت تھا۔ جو جہاں جس پوزیشن میں تھا ویسے ہی وہاں ساکت ہو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو آخر ایک فوجی نے وائرلیس اٹھایا تھا اور اروڈن کو مخاطب کیا۔ ''یہاں پر لڑکی نہیں ہے ہمیں غلط بتا دیا گیا تھا۔ یہ ٹریپ تھا دھماکے میں ہمارا ایک فوجی صالح مارا گیا ہے۔''

کرنل اروڈن نے وائرلیس رکھ دیا اور اداسی سے کرسی پر بیٹھ گیا اسی وقت کرنل کے کمپیوٹر آپریٹر نے اسے مخاطب کیا۔ ''جناب فرسٹ لیفٹیننٹ یوز نے ایک سگنل بھیجا ہے جو سیٹلائٹ پر آیا ہے۔''

اس کی بات پر اروڈن چونکا اور دوسرے فوجی نے دوڑ کر کمپیوٹر اسکرین دیکھی۔

''وہ کہاں ہے؟'' اروڈن نے پوچھا۔

''وہ اسی علاقے میں ہے جہاں ابھی حادثہ ہوا ہے۔ وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر...... وہ مدد کی درخواست کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے اسے آپ کی بیٹی مل گئی ہے۔'' فرسٹ اسسٹنٹ نے کہا۔

''جلدی سے نئی ٹیم کو بھیجو۔'' اروڈن نے حکم دیا۔

☆......☆

یوز لڑکی کو باہر ہی چھوڑ کر اپنی گن کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا تھا جہاں دو کمرے تھے۔ پہلا کمرا خالی تھا پھر جیسے ہی یوز دوسرے کمرے میں داخل ہوا اس کی نظر کوس پر پڑی۔ کوس نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ جیسے ہی یوز آگے بڑھا کوس نے اپنی جگہ سے اچھال بھری۔ اس نے بڑی پھرتی سے لات مار کر یوز کی گن دور گرا دی تھی اور اب دونوں گتھم گتھا تھے۔ یوز کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کوس بھی ٹرینڈ فائٹر ہے مگر جلد ہی یوز نے اسے قابو کر لیا اور اس کی پشت پر پہنچ کر اس کے منہ میں وہی رومال ٹھونس دیا جس میں ماروی کی قبر کی مٹی رکھی تھی۔ جو ہر لمحے اس کی جیب میں موجود رہتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے کوس کی ناک بھی بند کر دی تھی۔ وہ اسے سانس نہیں لینے دے رہا تھا۔ کوس اس کی گرفت میں تڑپ رہا تھا پھر وہ نڈھال ہو گیا اور اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ تب یوز نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ بے جان سا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

یوز آہستہ آہستہ تھکے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے سینے میں تلاطم برپا تھا اسے ایک بار پھر ماروی یاد آ گئی تھی جسے کوس کی دہشت گردی نے ہلاک کیا تھا۔

''خدا تمہیں غارت کرے، خدا تمہیں نہیں چھوڑے گا۔'' یوز نے زیر لب کہا پھر اس نے آگے بڑھ کر اپنی گن اٹھائی اور پلٹا، پتا نہیں کب کوس نے بھی گن اٹھالی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ ایک دوسرے پر فائر کیے۔ یوز جھکائی دے کر بچ گیا لیکن اس کی گولی سیدھی کوس کے ماتھے میں گھس گئی۔ وہ ڈھیر ہو گیا تھا یوز دروازہ کھول کر باہر آیا تو لڑکی کھڑی رو رہی تھی۔

''سب ٹھیک ہے...... چپ ہو جاؤ۔'' یوز نے اسے دلاسا دیا اور اپنے ساتھ لے کر گھر کے چبوترے سے اتر گیا۔ وہ اسے لیے پہاڑی ٹیلے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ عقب سے دہشت گردوں کی دو بھری ہوئی گاڑیاں وہاں پہنچ گئیں۔ یوز نے انہیں دیکھ لیا تھا اور ٹیلے کے پیچھے لڑکی کے ساتھ چھپ گیا تھا۔ دہشت گردوں نے گاڑیوں سے اترتے ہی فائرنگ شروع کر دی وہ تعداد میں آٹھ تھے۔ انہوں نے گھر کی ٹوٹی ہوئی باؤنڈری کے پیچھے سے فائرنگ شروع کر دی۔ یوز وقفے وقفے سے ان کی فائرنگ کا جواب دے رہا تھا۔ اس نے تین دہشت گردوں کو نشانہ بھی بنایا تھا جو ڈھیر ہو گئے تھے۔ لڑکی اب بھی رو رہی تھی اور خوف سے کانپ رہی تھی۔ کچھ دہشت گرد گھر کی چھت پر پہنچ گئے تھے اور وہاں سے یوز اور لڑکی کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے تبھی یوز کا دل دھڑکا تھا اس کی گن میں گولیاں ختم ہو گئیں اور یہ بات دہشت گردوں پر آشکارا ہو گئی تھی۔ ایک

UUNOVELS.COM

دہشت گرد فائر کرتا ہوا یوذ اور لڑکی کے سامنے آ گیا۔ یوذ بے بس ہو گیا اور اس کے سامنے کوئی چارہ نہیں تھا وہ لڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا کہ اگر دہشت گرد فائر کرے تو گولی لڑکی سے پہلے اس کو لگے یہ دیکھ کر وہ دہشت گرد نوجوان حیران ہوا تھا اور ایک لمحے کو ٹھٹھکا تھا۔ اسی وقت پہاڑ کی اونچائی سے ایک فائر ہوا اور اس دہشت گرد کی کھوپڑی میں سوراخ ہو گیا۔ یوذ نے پلٹ کر دیکھا، پیچھے پہاڑی کی چوٹی پر اسپیشل برانچ کے فوجی نظر آ رہے تھے، ایک ہیلی کاپٹر انہیں چھوڑ کر واپس جا رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر نے بھی کئی دہشت گردوں کو نشانہ بنایا اور فوجیوں نے پہاڑی سے اتر کر باقی دہشت گردوں کو گرفتار کر لیا۔

☆......☆

فوجی ٹرک میں لیفٹیننٹ صالح کی میت ہیڈ کوارٹر لائی گئی تھی جسے پہلے سے کھڑی ایمبولینس میں رکھا گیا جو ترکی کے سرخ پرچم میں لپٹی ہوئی تھی۔ کرنل اردن جو وہاں پہلے سے ان کی آمد کا منتظر تھا اس نے میت کو سلامی دی۔

''میری طرف سے سلام ہو۔'' کرنل اردن نے صالح کی میت دیکھتے ہوئے کہا۔

''ملک کی سلامتی ہو۔'' سارجنٹ اٹلس اور بلال نے یک زبان کہا۔

میت کو ایمبولینس میں رکھنے کے بعد ایمبولینس چلی گئی تھی۔

''تم لوگ ٹھیک ہو؟''

''جی سر۔'' سارجنٹ اٹلس نے جواب دیا اسی وقت دوسرا ٹرک ہیڈ کوارٹر کی حدود میں داخل ہوا اور اردن اس کی طرف بڑھا۔

''میری بیٹی؟'' اس نے سارجنٹ سے پوچھا تو سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر یوذ بیٹھا تھا اور نازلی اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر موجود تھی۔ دروازہ کھول کر وہ چھلانگ مار کر اتری اور کرنل اردن سے لپٹ گئی۔

''بابا۔''

''نازلی۔'' اردن نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''وہ بہت خطرناک تھے۔'' وہ پھر رو رہی تھی۔

''میری پیاری بیٹی...... اب تم محفوظ ہو...... سب ٹھیک ہے۔'' اردن نے کہا اسی وقت یوذ ٹرک سے اتر کر ٹرک کے پچھلے حصے میں گیا تھا اور وہاں کا جنگلا کھول کر فوجیوں کو اترنے میں مدد دی تھی۔ فرسٹ اسسٹنٹ بلال اسے دیکھ رہا تھا اور کرنل اردن اپنی بیٹی کے اس زخمی ہاتھ کو دیکھ رہا تھا جس پر پٹی بندھی تھی۔ دہشت گردوں نے اس کی ہتھیلی پر گولی ماری تھی۔

''آؤ...... آؤ...... میرے ساتھ۔'' اردن نے نازلی سے کہا اور اسے اپنے ساتھ لے کر وہاں سے چلا گیا۔ یوذ اپنے فوجی دستے کے ساتھ وہیں کھڑا تھا۔

''آپ ٹھیک ہیں سر؟'' ایک ساتھی نے اس سے پوچھا۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں، ایک لمحے کو مجھے لگا تھا کہ شاید میں ناکام ہو گیا، میرے پاس گولیاں ختم ہو گئی تھیں اور دشمن سامنے کھڑا تھا کہ اچانک تم لوگ آ گئے۔''

''نئی صورت حال کی اطلاع ملتے ہی ہمیں یہاں سے روانہ کر دیا تھا۔'' ساتھی فوجی نے کہا تو یوذ نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆......☆

گولر بڑی بے تابی سے فوجی اسپتال ریویو میں داخل ہو گئی اسے نازلی کی برآمدگی کی اطلاع مل گئی تھی۔ اس کی ملاقات نازلی سے اسپتال کے صدر دروازے ہی پر ہو گئی تھی جو ہاتھ کی بینڈیج کے بعد باہر آ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی بے تابی سے اس کی طرف بھاگی۔

''ماں۔'' نازلی بھی اس سے چمٹ گئی۔ یہ لمحہ بڑا سکون بخش اور دل پذیر تھا ایک بیٹی کو بچاتے ہوئے صالح نے جان دے دی تھی اور اس سے پہلے فوجی مہمد نے بھی ایسی ہی قربانی دی تھی تاکہ اس کے ملک کے بچے ماؤں کی گودوں میں پُرسکون نیند لے سکیں۔ لیفٹیننٹ صالح شہید ہوا تاکہ ترکی کا جھنڈا ہمیشہ فضاؤں میں اونچا لہراتا رہے۔ اس نے اپنے ملک سے وفاداری کا جو حلف اٹھایا تھا پورا کر دیا تھا اور یہی ایک فوجی کی معراج ہوتی ہے۔

☆......☆

فوجی بیس میں ہونے والی تعزیتی تقریب میں سارجنٹ صالح کی بیوہ اپنے پولیس کے یونیفارم میں موجود تھی اور اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کر رہی تھی۔

''ہر روز صالح جیسے فوجی شہید ہوتے ہیں تاکہ ہزاروں اور بیٹے پیدا ہو سکیں۔'' اس نے زیر لب کہا۔ کیونکہ وہ بھی اُمید سے تھی اب اس کے پاس صالح کی نشانی تھی جسے اس کو صالح کے نقش قدم پر چلانا تھا۔

تقریب کے اختتام پر کرنل اردن نے یوذ کو گلے لگالیا تھا۔

UUNOVELS.COM

"بٹالین میں واپسی مبارک ہو یوذ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شکریہ سر۔" یوذ نے کہا اور قریب کھڑے بلال کی طرف دیکھا جو اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔

"تمہاری کمانڈ میں نئی بٹالین دی جا رہی ہے۔ یہ سارے شیر ہیں۔" کرنل ارڈن نے قریب کھڑے نئی بٹالین کے فوجیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جو اسی مشن کے لیے تیار کیے گئے تھے۔

"ان کا کوئی ٹیم لیڈر نہیں ہے۔" کرنل نے کہا۔

"ہمیں ہمارا لیڈر مل گیا ہے سر۔" ایک فوجی نے کہا۔

"ہمیں فرسٹ لیفٹیننٹ یوذ دے دیں اور ہم آپ کو وہ کامیابیاں دیں گے جن کی آپ ہم سے توقع کریں گے۔"

"کیا تمہیں منظور ہے یوذ؟" کرنل ارڈن نے پوچھا تو یوذ نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆......☆

دوسرے روز لیفٹیننٹ یوذ اپنا یونیفارم پہن کر ہیڈ کوارٹر پہنچا تو سیکیورٹی گارڈ نے اطلاع دی کہ ایک خاتون ویٹنگ روم میں اس کی منتظر ہے۔

"وہ کون ہے؟"

"اس کا کہنا ہے کہ وہ آپ کو جانتی ہے۔" گارڈ نے کہا تو یوذ ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گیا وہاں ڈاکٹر صباہ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ بھلا وہ اس سے ملنے وہاں کیوں آئی ہے۔

"آپ یہاں؟" یوذ نے حیرت سے کہا۔

"ہاں، اس روز جب آپ اسپتال آئے تھے اور میں نے آپ کے زخم پر ٹانکے لگائے تھے تو میں آپ سے کہہ کر گئی تھی کہ آپ میرا انتظار کیجیے گا۔" ڈاکٹر صباہ نے کہا۔

"ہاں، لیکن مجھے عجلت میں جانا پڑ گیا تھا۔" یوذ نے کہا۔

"میں جان گئی ہوں۔ میں نے رات کی خبریں دیکھی تھیں تب مجھے پتا چلا کہ آپ مجھے کہاں مل سکتے ہیں۔"

"تو کیا آپ کو میری تلاش تھی؟"

"ہاں لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ آپ کہاں ملیں گے۔"

"آپ مجھے کیوں تلاش کر رہی تھیں؟"

"دراصل میرے پاس آپ کی ایک امانت ہے۔"

"میری امانت؟"

"ہاں، اس کا تعلق آپ کی منگیتر سے ہے۔" ڈاکٹر صباہ نے کہا تو یوذ مزید چونکا اور ڈاکٹر صباہ نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک لاکٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ یوذ حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا وہ لاکٹ تو ماروی سے اس کے پیار کی نشانی تھی۔ ایسا ہی دوسرا لاکٹ اس کے گلے میں بھی تھا۔

"یہ آپ کو کہاں سے ملا؟" یوذ نے پوچھا۔

"جس رات آپ کی منگیتر زخمی حالت میں اسپتال آئی تھی تو میں نے اس کا آپریشن کیا تھا۔ وہ جانبر نہ ہو سکی اس کا مجھے افسوس ہے بعد میں آپریشن ٹیبل سے یہ مجھے ملا تھا اور میں نے اسے دیکھ کر سوچا تھا کہ یقیناً یہ دو محبت کرنے والوں کی نشانی ہے میں نے اسے رکھ لیا تھا اور ایک نہ ایک دن اس کے حقدار کے پاس پہنچانے کا عہد کیا تھا۔" ڈاکٹر صباہ نے لاکٹ یوذ کو دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" یوذ نے کہا۔ "میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے ماروی کے آخری لمحات میں اس کی جان بچانے کی کوشش کی۔" یوذ نے کہا۔

"یہ تو میرا فرض تھا، ہم ڈاکٹر بھی آپ فوجیوں کی طرح اپنی ذمے داریوں کا حلف اپنے خدا کے سامنے اٹھاتے ہیں کہ ہر مریض اور زخمی کی مدد کریں گے پورے خلوص اور محبت کے ساتھ، غریبوں کا مفت علاج کریں گے اور جس وطن نے ہمیں اس قابل بنایا ہے اس کو بدلے میں اپنی بہترین خدمات کا تحفہ پیش کریں گے۔" ڈاکٹر صباہ نے کہا تو یوذ مسکرا دیا۔

"ڈاکٹر صباہ! آپ جیسے لوگوں سے ہی ہمارے ملک کا وقار قائم ہے۔"

"اور ہمارے فوجیوں سے بھی جو ہر وقت ملک کی خاطر اپنی جان اور اپنی جان سے پیاری...... ہستیاں...... بھی قربان کر دیتے ہیں۔ آپ نے کرنل ارڈن کی بیٹی کو بھی اپنی جان پر کھیل کر بچایا ہے۔"

"خطروں سے کھیلنا ہمارا مقدر ہوتا ہے اور ہمارے حلف کا حصہ بھی، میں نے بھی حلف اٹھایا ہے کہ مرتے دم تک اپنے ملک پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ اللہ مجھے میرے حلف پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

"آمین۔" ڈاکٹر صبا نے کہا اور اس سے رخصت ہو گئی۔ یوذ نے ماروی کا لاکٹ اپنی جیب میں رکھا اور ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ناسور

ابو الفرح ہمایوں

اس وقت دشمنانِ اسلام بڑے زور شور سے مسلمانوں پر الزام لگا رہے ہیں کہ مسلمان دہشت گردی پھیلا رہے ہیں جب کہ بغور دیکھیں تو بات کچھ اور نظر آئے گی۔ غیر مسلم ممالک میں کس طرح سے دہشت گردی کا بیج بویا جا رہا ہے اس کی ایک جھلک۔ ہٹلر کے تعصب، صلیبی جنگوں کی بات ہم نہیں کر رہے ہیں، دورِ حاضر میں کس طرح تعصب پھیلایا جا رہا ہے، اس کا اندازہ اس تحریر سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔

مغرب میں تعصب کس طرح پروان چڑھ رہا ہے

ایمٹ اسپائکس نے جھک کر بلخ کے بدن پر ہاتھ پھیرا جو کالے پلاسٹک کے پنجرے میں بند پھدک رہی تھی۔ سامنے گھٹنوں گھٹنوں تک اُگی ہوئی گھاس تھی جس کی وجہ سے یہاں چلنا پھرنا مشکل تھا پھر بھی وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ خود کو گھسیٹتا ہوا وہ ساحل کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ جسم سے پسینے کی دھار بہہ رہی تھی۔ اس کی قمیص اس کی پشت پر چپک کر رہ گئی تھی۔ ماہ اگست کی خوشگوار ہوا میں بھی اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

فوبے سورنس نے ایک ہاتھ سے اپنی ایک آنکھ بند کی اور چٹان کی طرف دیکھا۔ اس کے گھنگریالے بال ہوا میں

اڑتے ہوئے اس کے چہرے پر پھیل گئے۔ اس پُر وقار جاسوسہ نے ہمدرد نگاہوں سے ایسٹ کی طرف دیکھا اور پھر اچھلتے پانی کا نظارہ کرنے لگی۔

"ریرکن نے مجھے بتایا ہے کہ وہ بھی آپ کا آدمی ہے۔" ایسٹ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا، وہ پچیس سال سے ملازمت کر رہا تھا جس میں سے زیادہ عرصہ اس نے ونسٹن سالم پولیس ڈپارٹمنٹ کے جولین سیکشن میں گزارے تھے۔ اسے یہ نوجوان جاسوسہ اس لیے پسند تھی کہ وہ انتہائی ذہین، تیز طرار ہوشیار اور مردم شناس عورت تھی مگر یہی بات وہ ریرکن کے بارے میں نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ مغرور و خود پسند تھا اور جہاں تک ایسٹ کا تجربہ تھا وہ کسی سے تعاون بھی نہیں کرتا تھا مگر اس کے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ یہ معاملہ نوبے کے ہاتھ میں تھا اور ریرکن مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔

"میں بخوشی اپنی خدمت پیش کرنے کو تیار ہوں۔" ایسٹ نے کہا اور پھر وہ ایک سیاہ فام نوجوان کی جانب بڑھا۔ اس کا نام دیشوان دیو تھا۔ "نوبے! تمہیں مجھ سے کچھ کہنا ہے؟"

"ابھی تک کچھ زیادہ معلومات تو نہیں ہوئی ہیں۔ جہاں تک میرے علم میں ہے کہ اینالڈ ہائی اسکول کے ایک طالب علم نے صبح آٹھ بجے کے قریب جب وہ اسکول جا رہا تھا تو اس نے لاش دیکھی۔ لاش دیکھتے ہی وہ تیزی سے اسکول کی طرف بھاگا تاکہ پرنسپل کو بتا سکے۔" نوبے اپنی نوٹ بک پر نظریں جمائے مزید بتانے لگی۔ "جان ٹیٹ بھی وہاں آ گیا اور معلومات حاصل کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ لڑکا سیکنڈری کلاس کا طالب علم تھا۔"

ایسٹ ایک ایسے گروپ میں بھی کام کر چکا تھا جس کی ذمے داری عوام کی جان و مال کی حفاظت تھی۔ اس نے پوچھا۔ "مگر وہ مرا کیسے؟"

"اس کے سر کے پچھلے حصے میں گولی لگی ہے۔ ابھی تحقیقات جاری ہیں۔ میں نے پورے علاقے کو خالی کرا لیا ہے۔ اسٹوڈنٹ اور پرنسپل بھی پوری طرح تعاون کر رہے ہیں۔ میں نے سختی سے حکم جاری کر دیا ہے کہ موقع واردات پر کوئی نہیں آئے گا۔"

"مگر معاملہ اس قدر طول کیوں پکڑتا جا رہا ہے؟ جیسا کہ تم نے بتایا اس کی لاش صبح آٹھ بجے کے قریب دریافت ہوئی ہے۔"

"شاہراہ پر ایک بڑا حادثہ ہوا ہے۔ جس میں تین یا چار کاریں ایک دوسرے سے ٹکرا گئی ہیں۔ کئی جانوں کا نقصان ہوا ہے۔ اسپتال والے صبح سے زخمیوں میں الجھے ہوئے ہیں۔" اس نے اپنی نگاہیں نقش پر مرکوز کر دیں۔ "اس لڑکے کے بارے میں تمہاری کیا معلومات ہیں؟"

"جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے۔" ایسٹ کہنے لگا۔ "دیشوان کو ایک چرچ کی طرف سے بلایا گیا تھا اور وہ نہایت خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ بڑا ہی نیک لڑکا تھا۔ کسی نشہ آور شے سے بھی اسے رغبت نہ تھی۔ اسکول باقاعدگی سے جاتا تھا اور کسی قسم کے جھگڑے وغیرہ میں بھی نہیں پڑتا تھا۔ اس کی تمام رپورٹس انتہائی شاندار تھیں۔"

"کیا تمہیں ایسی کوئی معلومات ہیں جن کی بناء پر شک ہو کہ راماریز سے اس معاملے کا کوئی تعلق ہو؟"

ایسٹ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "اگرچہ دونوں ایک ہی سیکنڈری اسکول میں پڑھتے تھے مگر میرا خیال ہے کہ دونوں کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں تھا۔"

دیشوان عمر میں دو سال بڑا تھا اور جب اس نے اسکول جوائن کیا تو اس وقت اس کی انگریزی بہت کمزور تھی۔ ابھی اسے ملک میں داخل ہوئے چند ہی ہفتے ہوئے تھے کہ وہ غیر قانونی طور پر آنے کے جرم میں پکڑا گیا۔ تیسری بار جب گرفتار ہوا تو وہ چھ ماہ اسٹون وال جیکسن یوتھ ڈیولپمنٹ سینٹر، کانکورڈ میں قید رہا۔

رہائی کے تین ماہ بعد اس کا مردہ جسم ایک شاپنگ سینٹر کے پارکنگ لاٹ میں پایا گیا، جو کہ شہر کے مشرق کی طرف واقع تھا۔ موت کی وجہ سر کے پچھلے حصے میں لگی گولی تھی۔ ریرکن ان دنوں ہومی سائیڈ انویسٹی گیشن میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا۔ اس حادثے کو پانچ یا چھ ہفتے ہو گئے تھے لیکن ایسٹ کو ابھی تک کوئی حوصلہ افزا اطلاع نہیں ملی تھی۔ "ریرکن کہہ رہا تھا کہ راماریز کوکین کی اسمگلنگ کرتا تھا۔" نوبے نے انکشاف کیا۔

"اور دیشوان کے بارے میں کیا خبر ہے؟"

"وہ ماریجوانا کا کاروبار کرتا تھا۔ پڑوسی ممالک سے نشہ آور دواؤں کی خرید و فروخت بھی کرتا تھا۔ جب اسے گرفتار کیا گیا تو وہ انہی حرکتوں میں ملوث تھا۔" ایسٹ نے جواب دیا۔

"ہمیں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ وہ واقعی ایسا کر رہا تھا لیکن لوگوں کا یہی کہنا ہے۔ اس کے پاس سے بھی

UUNOVELS.COM

اسی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی ہے لیکن ریزن کا خیال ہے کہ اس کی موت کا تعلق منشیات سے ہی ہے؟"

"یہ تازہ ترین نظریہ ہے۔"

ایمٹ نے نیچے کی طرف دیکھا اور نعش پر ایک نظر ڈالی۔ منشیات کے تاجروں کی شکل ہی کچھ اور ہوتی ہے مگر یہ دونوں بالکل معصوم بچے لگ رہے ہیں۔ کسی کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ ان بچوں سے ایسا بھیانک جرم سرزد ہوا ہے۔ "اگر تم کسی اور قسم کی مدد چاہو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں ڈیشان کی دادی کو جانتا ہوں۔ یہ حادثہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگا۔" وہ عورت ایمٹ کے چرچ کی ایک ممبر تھی اور ایمٹ اسے گزشتہ بیس بائیس سال سے جانتا تھا۔ اس کے پوتے کو جب گرفتار کیا گیا تھا تو اس نے ایمٹ سے ہی مدد کی درخواست کی تھی۔

فوبے نے ایمٹ کی جانب تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ "شکریہ ایمٹ! مجھے تمہاری صلاحیت پر فخر ہے۔ جب ضرورت ہوگی تو میں تمہیں بتا دوں گی۔"

یہ چھ ماہ بعد ایک ہفتے کی صبح کا ذکر ہے۔ فوبے نے ایمٹ کو فون کیا۔ اس وقت ایمٹ گھاس پھونس کی صفائی کررہا تھا۔ موسم میں غیر معمولی گرمی تھی لیکن حالیہ بارش نے ایسی ہلچل مچائی تھی کہ لان کسی میدانِ جنگ کی طرح نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ بڑھا کر اپنی بیوی سے فون لیا۔ دوسرے ہاتھ سے ٹھنڈی چائے پکڑنے کی کوشش کی جو اس کی بیوی مسکراتے ہوئے اس کی طرف پیش کررہی تھی۔

"ہاں فوبے! کہو کیا؟"

"ایمٹ! تمہیں ویک اینڈ پر تکلیف دینے کی معافی چاہتی ہوں مگر یہاں ایک اور حادثہ ہوگیا ہے۔ ایک اور لڑکے کو گولی ماردی گئی ہے۔"

"کوئی اور لڑکا؟" ایمٹ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے۔ ایجوکیشن بلڈنگ کے باہر کوڑے دان میں اس کی لاش دریافت ہوئی ہے۔ ایک خاکروب نے اطلاع دی ہے۔ مرنے والے کی شناخت نہیں مل سکی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ایک نظر دیکھ لو، شاید تم اسے پہچان سکو۔"

"کیا تمہارا خیال ہے کہ اس کا تعلق بھی پچھلے دو لڑکوں سے ملتا ہے؟"

"ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ اس کی عمر بھی ان دونوں کے برابر ہی ہے اور قتل کا انداز بھی وہی ہے۔"

ایمٹ نے جلدی سے چائے کا گھونٹ حلق سے اتارا اور گلاس کو ایک طرف پھینک دیا۔ "یہ سب کیا ہورہا ہے فوبے؟" اس نے جائے واردات پر پہنچ کر پوچھا۔

"پتا نہیں، اسی لیے تو میں نے تمہیں بلایا ہے کہ تم سے کچھ رہنمائی حاصل کرسکوں۔ ابھی تک تو پہلے دو لڑکوں کی موت کا معما بھی حل نہیں ہوا ہے۔ منشیات کی اسمگلنگ کا شک و شبہ بھی ابھی تک زیرغور ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا ہے۔"

"میں لاش کو جلد از جلد دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ایمٹ یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا کہ اس لڑکے کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا ہے جو دو ماہ قبل دوسرے دو لڑکوں کے ساتھ ہوچکا تھا۔ لڑکا ابھی تو جوانی کے دور میں داخل ہی ہوا تھا۔ وہ سیدھا لیٹا ہوا تھا گویا آسمان کی طرف دیکھ رہا ہو۔ یہ ایک سفید فام لڑکا تھا اور ایمٹ نے اسے فوراً پہچان لیا۔ "یہ ائن مابے!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اسسٹنٹ ریزن نے تبصرہ کیا۔ "کیسا اتفاق؟"

"ابھی اس کی عمر تیرہ یا چودہ سال ہوگی۔" ایمٹ نے ریزن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہ جانے وہ کس مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ ہنسنے اور طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا مگر یہ تینوں کوئی فرشتہ بھی نہیں تھے۔ وہ قاتل نفرت حلقے کے لیے کام کررہے تھے اور اس کا انجام بھی ہوتا ہے۔" ایمٹ کے جواب دینے سے قبل ریزن فوراً وہاں سے غائب ہوگیا۔

"سوری ایمٹ!" فوبے نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "وہ آج کل بے حد پریشان ہے، اسی لیے الٹی سیدھی بولتا رہتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ ائن کے بارے میں تمہاری کیا معلومات ہیں؟"

"ایک سال قبل اس کی ماں نے CCS سے رابطہ کیا تھا جب ائن چند لڑکوں کے ساتھ کئی کاروں کی توڑ پھوڑ میں ملوث پایا گیا تھا۔ وہ اسکول جانے کے بجائے اپنے غنڈہ دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا رہتا تھا۔ اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو راہِ راست پر لے آئے گی۔ بس اس مرتبہ اسے معاف کردیا جائے۔" اس نے فوبے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جہاں تک مجھے علم ہے یہ ائن بھی ڈیشان ریوز کے قریب ہی تھا جس کا ایک چرچ میں آنا جانا تھا۔"

"گویا کہ وہ سب ایک دوسرے سے واقف تھے۔"

UUNOVELS.COM

فوبے نے کہا۔ ''لیکن ہم رامریز اور ریوز کے درمیان کسی تعلق کا پتا نہ لگا سکے۔ رامریز کا خاندان یہ شہر چھوڑ کر شرق وسطیٰ چلا گیا۔ لڑکے کی نعش یہیں رہ گئی اور ریوز کے قتل کے بعد بھی ہم قاتلوں کو گرفتار نہیں کر سکے۔''

''کیا تم ڈیشوان کے بارے میں چرچ کے افراد سے کچھ گفتگو کرنا پسند کرو گی؟''

''ریرین ان سے مل چکا ہے۔ پادری نے بتایا کہ ڈیشوان اپنی موت سے قبل اس پروگرام سے علیحدہ ہو چکا تھا اور یہاں آنا جانا ملتوی کر دیا تھا۔''

ایمٹ کا ذہن فوراً اس طرف منعکس ہو گیا جب ڈیشوان کی موت کے بعد اس کی دادی سے کچھ بات چیت ہوئی تھی۔ دادی نے بڑے اعتماد اور یقین سے بتایا تھا کہ ڈیشوان اب اچھا بچہ بنتا جا رہا ہے۔

''اب میں ذرا اس بات کی بھی تحقیقات کر لوں کہ کیا برائن بھی اس پروگرام میں شامل ہوتا رہا ہے؟'' ایمٹ کی بات جاری تھی۔ ''اس طرح ہم یہ جان سکیں گے کہ ان لڑکوں سے بھی اس کا کوئی تعلق رہا تھا۔ ابھی تک پولیس کی نظروں میں یہ سب مشکوک ہیں لیکن اس تیسرے قتل کے بعد ثابت ہوا کہ ایسا کوئی شخص ہے جو نوجوان بچوں کی جان کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں اس معاملے پر ذرا سنجیدگی سے غور کرنا چاہتا ہوں فوبے؟''

''یہ ایک محنت طلب کام ہے اور ہمیں پوری سمجھ بوجھ اور ذمے داری کے ساتھ یہ کام کرنا پڑے گا۔''

ایک ماہ اور گزر گیا مگر قاتل کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ SBI اور FBI کے افسران حیران و پریشان تھے۔ کسی بدفعلی کے امکانات بھی نظر نہیں آئے تاکہ شک و شبہ کسی اور جانب جا سکے۔ ایمٹ نے مرنے والوں کے لواحقین اور دوستوں وغیرہ سے کافی تفصیلی گفتگو کر لی تھی مگر بے سود۔ ہر ایک کی طرف سے یہی جواب ملا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی کسی پر شک ظاہر کر سکتے ہیں۔

برادری اور محلے میں چھان بین کے بعد ایمٹ نے بالآخر رامریز کے خاندان سے فون پر رابطہ کیا جو اپنے چہیتے بیٹے کی موت کے بعد غیر قانونی طور میکسیکو فرار ہو گئے تھے اور پولیس سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی زبانی بھی معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا کسی قسم کی نشہ آور چیز سے دور تھا، باقاعدگی سے اسکول جا رہا تھا اور انتہائی شریف تھا۔ چرچ میں وہ شاندار کارکردگی دکھا رہا تھا اور وہ نہیں جانتے کہ کون ان کے بیٹے کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔

یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد ایمٹ نے ایک گہری سانس لی اور اسے احساس ہونے لگا کہ ان معاملات پر کوئی بھی کھل کر گفتگو کرنے کو تیار نہیں ہے۔ پتا نہیں کیوں؟ وہ خود بھی اس سوال کا جواب نہ جان سکا۔ فوبے سے بات کیے ہوئے کئی دن گزر چکے تھے اور کوئی بھی سرا ہاتھ نہ آ رہا تھا۔ اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ ابھی تک تمام تحقیقات اس نہج پر ہو رہی تھیں کہ لڑکے کسی ایسی غیر قانونی حرکت میں ملوث تھے جس کی وجہ سے ان کی جان گئی۔ شاید وہ کسی معاملے کے عینی شاہد تھے یا کچھ جانتے تھے جس کی بنا پر منشیات اسمگل کرنے والے گروہ کو خطرے کا احساس ہونے لگا تھا مگر ابھی تک کوئی شہادت سامنے نہیں آئی تھی۔

ایمٹ نے رنگ کیا تو دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو ہو گئی۔ ''فوبے! میں نے ایک بار پھر رامریز فیملی سے رابطہ کیا ہے۔ وہ ابھی تک اس بات پر مصر ہیں کہ انہیں اپنے بیٹے کے قتل کے سلسلے میں کچھ معلوم نہیں ہے لیکن انہوں نے یہ ضرور بتایا کہ وہ اس چرچ کے نوجوان گروپ کا حصہ تھا جس میں ڈیشوان اور برائن شامل تھے۔ وہ لوگ اس معاملے میں درست بیان دے رہے ہیں کہ لڑکے باقاعدگی سے اسکول جا رہے تھے، سوائے چند ایک ضروری اور ہنگامی چھٹیوں کے۔ چھ ماہ کی حاضری کی گواہی اس کا ثبوت ہے اور کسی نشہ آور شے کے استعمال کے نشانات بھی نہیں پائے گئے۔''

ٹاسک فورس کا ممبر ہونے کے باوجود ایمٹ ان تمام معلومات سے آگاہ نہیں تھا جو اسے ہونی چاہیے تھیں۔ وہ اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگا کہ اس نے آگے بڑھ کر خود مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ ''ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس معاملے میں منشیات کا شک و شبہ بے بنیاد ہے۔ اگر وہ اس سلسلے میں کچھ کام کر رہے تھے تو بھی خود استعمال نہیں کر رہے تھے۔''

''مگر ریرین اس بات پر بضد ہے کہ یہ بات خارج از امکان نہیں۔''

''تم کو معلوم ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ لڑکوں کے پاس سے زیادہ رقوم بھی برآمد نہیں ہوئی ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' فوبے نے کہا۔ ''مگر اس کے باوجود ہم ابھی تک آگے بڑھنے سے قاصر ہیں۔''

ایمٹ کی آواز میں غصے کا عنصر شامل ہو گیا۔ تمام مقتولین کے وارثوں کا کہنا ہے کہ قتل کے وقت تک لڑکے

UUNOVELS.COM

باقاعدگی سے چرچ کے پروگرام میں جا رہے تھے۔"

"زیرین نے برائن کے بارے میں پادری سے معلوم کیا۔ انہوں نے بھی یہی کہانی سنائی کہ وہ ڈیشوان کے ساتھ تھا، دونوں لڑکوں نے موت سے تقریباً دو ماہ قبل پروگرام میں آمد بند کر دی تھی یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے بارے میں نہیں جانتے۔"

"ٹھیک ہے مگر اس کا واسطہ ان باتوں سے نہیں بنتا جو ان کے خاندان والے کہہ رہے ہیں۔ وہ یہی رٹ لگائے ہوئے ہیں کہ ان کے بچوں کا منشیات سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ چرچ کے پروگرام پر توجہ دے رہے تھے۔ اب تم بتا رہے ہو کہ تم نے پہلے دو بچوں کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہیں۔ ہمیں مزید بات چیت کے لیے ایک بار پھر چرچ جانا پڑے گا۔ یہی ایک راستہ فی الحال ہمارے سامنے ہے۔ کیا پروگرام میں دوسرے بچوں سے اس معاملے پر کوئی بات چیت ہوئی ہے؟"

"زیرین نے اس پہلو پر بھی توجہ دی ہے۔" فوبے کہنے لگی۔ "اس نے یقیناً ہر اس آدمی اور لڑکے سے انٹرویو لیا ہے، جس کا کوئی تعلق مقتولین سے رہا ہوگا۔" اس کا اندازہ بڑا ہی پُراعتماد تھا۔

"ہم اس سلسلے کو ایک بار پھر دہرا سکتے ہیں۔" ایمٹ نے زور دے کر کہا۔ "بچے شاید خوف زدہ ہوں کہ وہ کسی اور آفت میں نہ پھنس جائیں اگر پولیس سے کچھ کہا تو وہ یقیناً کچھ نہ کچھ جانتے ہوں گے مگر اقرار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔"

فون بند کرنے سے قبل فوبے اور ایمٹ میں یہ بات طے پا گئی کہ وہ لوگ چرچ کے لڑکوں سے ایک بار پھر انٹرویو کریں گے اور زیرین کو اس بار شامل نہیں کیا جائے گا۔

ہوا بڑی تیز و تند چل رہی تھی مگر آسمان پر بادل کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ موسم کی رنگینی اور دلفریبی نے ایمٹ کو شاداں و فرحاں کر دیا کہ دفتر کی آلودگی سے تو نجات ملی۔ اس نے گاڑی کا رخ فوبے کی طرف موڑ دیا اور پھر وہ اور فوبے اپنی مہم پر چل پڑے۔ وہ چرچ جا رہے تھے۔

"یہ جگہ تو بالکل الگ تھلگ لیکن بڑی بارونق ہے۔" ایمٹ کہہ رہا تھا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کاؤنٹی میں ایک ایسا خوب صورت اور شاندار علاقہ بھی ہے۔"

اس وقت وہ شہر کی حدود سے باہر ونسٹن سالم کے علاقے میں سفر کر رہے تھے۔ عملی طور پر یہ جگہ شیرف کے زیر تسلط تھی۔ "کیا کوئی نائب ہمیں لینے آئے گا؟" ایمٹ نے

وجۂ ناز

قومی ائرلائن میں بطور پائلٹ فرائض انجام دینے والی دو بہنیں مریم مسعود اور ارم مسعود نے پی آئی اے کا طیارہ 777 اڑا کر نئی تاریخ رقم کی۔ اس سے قبل تاریخ میں دو سگی بہنوں نے کبھی بھی اس طرح طیارہ نہیں اڑایا جب کہ دونوں بہنوں نے ایشیا کی پہلی پائلٹ خواتین ہونے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ دونوں بہنوں نے متعدد فلائٹس اکٹھے اڑائیں۔ وہ لاہور سے کراچی، مانچسٹر اور نیو یارک تک جہاز اڑا چکی ہیں۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز ہٰ۔ وہاڑی

پوچھا۔

فوبے نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ لوگ راستے میں ہیں اور ٹاسک فورس کا حصہ ہیں لیکن شاید وہ چاہتے ہیں کہ اس معاملے کو ہم دونوں ہی اپنے طور پر نمٹائیں۔"

ایمٹ کو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ وہ دونوں اپنے فیصلوں میں آزاد ہیں۔ اس کا تجربہ یہ کہتا تھا کہ نوعمر بچوں کے ساتھ بات نرم انداز اور خوشگوار ماحول میں کی جائے۔ انہیں یہ احساس نہ ہو کہ ان کے ساتھ زبردستی کی جا رہی ہے۔ فوبے کی دلفریب اور دلچسپ شخصیت اس معاملے میں بڑی کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ گزشتہ کئی سالوں کے تجربے سے اس نے یہ سیکھا تھا کہ بچوں کو کس طرح رام کیا جا سکتا ہے۔

ایک موڑ کاٹنے کے بعد انہیں چرچ سامنے نظر آنے لگا۔ چرچ کا مضبوط لیکن بوسیدہ دروازہ گواہی دے رہا تھا کہ یہ عمارت بے حد قدیم ہے۔ داہنی جانب سے ایک سیڑھی اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ کھڑکیوں میں بھورے اور سبز رنگ کے شیشے جڑے ہوئے تھے جو جگہ جگہ سے ٹوٹ رہے تھے۔ پارکنگ ایریا میں ایک سیڈان کار اور ایک اسکول بس کھڑی تھی جس کا رنگ نیلا تھا۔ اس کی پیشانی پر یہ عبارت کندہ تھی۔ "مقدس چرچ۔ نیک کام اور اصلاح کے لیے" سیاہ حروف بڑے نمایاں تھے۔

ایمٹ نے اپنی کار جو پولیس کے نشانی سے مبرا تھی۔ بس کے پیچھے کھڑی کر دی۔ وہ اور فوبے کار سے نیچے اترے۔ عمارت میں سے ایک شخص باہر نکلا اور ان کی طرف بڑھا۔ درمیانہ قد و قامت، دبلا پتلا، چھوٹے چھوٹے سنہری

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ہال، کسی فوجی کی طرح لگ رہا تھا۔

''جناب سراغ رساں! میرا نام ریوانڈ میکائیل ہے۔'' اس نے صاف ستھرے گمبھیر لہجے میں کہا۔'' آپ کی آمد سے ہمیں بے حد خوشی ہوئی مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ ایسے سوگوار ماحول میں بھی ہماری ملاقات ہو رہی ہے۔''

فوبے نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ایمٹ کی طرف دیکھا۔'' ریوانڈ میکائیل! یہ سراغ رساں اسپیکس ہیں اور جو پلیس سیکشن میں کام کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے آپ کو فون پر بتایا تھا، ہم CCS پروگرام کے بچوں سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں تمام بچوں کے والدین کی اجازت حاصل ہے کہ ہم جو سوال چاہیں، ان سے پوچھ سکتے ہیں۔''

''آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ڈیٹیکٹو اسپیکس!'' میکائیل نے ہاتھ ملایا۔ ایمٹ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ کسی شکنجے میں اس کا ہاتھ آ گیا ہے۔ قبل اس کے کہ ایمٹ کوئی جواب دیتا۔ مائیکل واپس مڑا اور اس دروازے میں غائب ہو گیا جہاں سے وہ باہر آیا تھا۔ ایمٹ اور فوبے اس کے تعاقب میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چل پڑے۔

''لڑکے ایجوکیشن ہال میں آپ کے منتظر ہیں۔ ہم نے انہیں بتا دیا ہے کہ چند حضرات ملاقات کی غرض سے آ رہے ہیں لیکن یہ نہیں بتایا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں۔ میری دانست میں بہتر یہی ہوگا کہ اپنی آمد کا مقصد آپ لوگ خود ہی بیان کریں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بچوں کا تجربہ پولیس کے بارے میں کچھ اچھا نہیں ہے۔'' میکائیل نے طویل مکالمہ ادا کرنے کے بعد دروازہ کھولا۔

''کیا اس پروگرام میں بھی صرف لڑکے ہی لڑکے شامل تھے؟ کوئی لڑکی نہیں ہے؟'' ایمٹ نے پوچھا۔

میکائیل نے خشمناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔'' ہم لوگ مخلوط محفل کے حامی نہیں ہیں۔ ہمارے پاس اتنا اسٹاف بھی نہیں ہے کہ ہم دونوں جنسوں کی الگ الگ کلاس مرتب کر سکیں۔ ممکن ہے بعد میں لڑکیوں کا الگ کوئی پروگرام ترتیب دیا جائے لیکن فی الحال ایسا نہیں ہے۔''

''کیا یہاں اسکول بھی ہے؟'' ایمٹ نے پوچھا۔

''مقدس تعلیمات کے لیے بچوں کا ایک مختصر اسکول موجود ہے۔ پرائمری سے ہائی اسکول تک جس میں عیسائی انداز فکر کی تعلیم دی جاتی ہے۔'' میکائیل نے دروازہ کھولا اور فوبے اور ایمٹ کو اندر آنے کی دعوت دی۔'' بچو! یہ ہیں سراغ رساں سوران سن اور ڈیٹیکٹو اسپیکس۔ آج یہ لوگ آپ سے کچھ باتیں کریں گے۔ جب آپ لوگ پڑھائی ختم کر لیں تو گرجا میں آ جائیے گا جہاں دعا بھی کرائی جائے گی۔'' اس نے ایمٹ اور فوبے کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور دروازہ بند کر دیا۔

فارمیکا کی بڑی میز کے گرد اسٹیل کی کرسیوں پر بیٹھے چند نوجوان لڑکے وہاں موجود تھے۔ میز پر بائبل کا نسخہ کھلا ہوا رکھا تھا اور ہر لڑکے کے پاس بھی ایک بائبل موجود تھی۔ فوبے اور ایمٹ نے اپنی اپنی نشست سنبھالی۔ ماحول پر ایک عجیب سی سنجیدگی طاری تھی۔ ایمٹ نے گفتگو شروع کی۔

''ڈیٹیکٹو سوران سن اور میں، ہم دونوں جوان (JUAN) ڈیشوان اور برائن کے بارے میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ ہم سے تعاون کریں گے۔''

''آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ ہم اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں؟'' یہ سوال ایک دراز قد لاغر سے لڑکے کی طرف سے آیا۔ اس کا سر بائبل پر جھکا ہوا تھا اور نگاہیں عبارت پر مرکوز تھیں۔ اس کی دیکھا دیکھی دیگر لڑکوں نے بھی کتاب پر نگاہیں جما دیں۔

لڑکا بے حد کم عمر تھا اور ایمٹ کے خیال میں ابھی لیڈر بننے کے قابل نہیں ہوا تھا لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ سب لڑکے اس کی تقلید کر رہے تھے۔'' ہم اتنا تو ضرور جانتے ہیں کہ جوان، ڈیشوان اور برائن اس پروگرام کا حصہ تھے لہٰذا تم لوگ ان سے ضرور واقف ہو گے۔ اگر آپ اپنی معلومات ہمیں فراہم کریں گے تو اس کی روشنی میں ہم ان کے قاتلوں کا پتا چلا سکتے ہیں۔'' ایمٹ نے تمام لڑکوں پر ایک نگاہ ڈالی لیکن کسی لڑکے نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

''انہوں نے اس پروگرام کو خیر باد کہہ دیا تھا۔'' لمبا لڑکا ایک بار پھر بول اٹھا۔ اس مرتبہ اس نے ایمٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گستاخ لہجے میں بات کی۔ ''ہمیں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہے۔ ہم نے یہ بات پہلے سراغ رسان کو بھی بتا دی تھی۔''

''پھر بھی ہمیں اپنی کارروائی تو پوری کرنی ہی ہے۔'' ایمٹ نے کہا۔'' انہوں نے کب اور کیوں یہ پروگرام چھوڑا؟''

ماحول میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ سب لڑکے بڑی تندہی سے بائبل پر جھک گئے لیکن حیرت انگیز طور پر ان کے چہرے سے

UUNOVELS.COM

عیاں تھی۔ بائبل کے اوراق پر ان کی انگلیاں پھسلنے لگیں۔ ٹھنڈک اور سردی کے باوجود بعض لڑکوں کے پسینے چھوٹ گئے۔ ایمٹ کے سوال نے لڑکوں کو حواس باختہ کر دیا تھا۔

دو گھنٹے بعد ایمٹ اور فوبے، ریورنڈ میکائیل کو تلاش کر رہے تھے۔ وہ ایجوکیشن ہال میں موجود تھا۔ اس نے ان دونوں کو دیکھا اور سرسری لہجے میں پوچھا۔ ''کیا آپ لوگوں نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ آپ لوگ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔''

ایمٹ کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے ہمیں یہاں آنے اور لڑکوں سے باتیں کرنے کی اجازت دی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ سب لڑکے یہاں موجود تھے۔'' خدا حافظ کہہ کر دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

گاڑی میں بیٹھ کر ایمٹ نے ہیٹر آن کیا اور کہنے لگا۔

''سب لڑکوں نے ایک ہی بات کہی۔''

''اور الفاظ بھی ہو بہو ایک ہی تھے۔'' فوبے بولی۔

''میرے خیال میں ہمیں ان لڑکوں سے الگ الگ بات کرنی چاہیے۔'' ایمٹ کہنے لگا۔ ''مگر وہ اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں اور اِدھر سے اُدھر ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ ان کے پاس کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے لیکن وہ کہہ نہیں رہے۔ شاید وہ کسی سے خوف زدہ ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اس مصیبت سے کیسے نجات حاصل کی جائے۔''

☆......☆

آواز رفتہ رفتہ دھیمی پڑتی جا رہی تھی اور ایمٹ کے لیے مشکل ہوتی جا رہی تھی کہ وہ واضح انداز میں اس آواز کو سمجھ سکے لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس آواز میں درد و کرب اور خوف نمایاں تھا۔ ''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ شاید اگلا شکار میں ہی ہوں گا۔'' ایک نوخیز مردانہ آواز اس کے کانوں میں آئی۔ آواز میں تھرتھراہٹ اور دہشت کی جھلک تھی۔

ایمٹ نے کریڈل اپنے کاندھے پر لٹکایا اور ایک کاغذ پر کچھ لکھنے لگا۔ ''لڑکے! تم کہاں ہو؟''

''دریا کے پاس، درختوں کے ایک جھنڈ میں وہ اپنے ساتھ ایک کتا بھی لے کر آیا ہے۔''

چرچ میں سوال و جواب کے بعد فوبے اور ایمٹ نے سب لڑکوں کو اپنے اپنے کارڈ بھی دے دیے تھے جس میں براہ راست سیل فون کے نمبر موجود تھے لیکن اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ جیسے ہی وہ لوگ وہاں سے باہر نکلے، لڑکوں نے فوراً کارڈ ضائع کر دیے۔

''چرچ میں کیا ہو رہا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' لڑکے نے تھوک نگل کر حلق صاف کیا۔ ''میں بہت دیر سے یہاں پھنسا ہوا ہوں۔''

دریائے یاڈکن جنوب میں تقریباً ایک میل دور تھا۔

''تم شمال کی طرف ہو یا جنوب کی طرف۔'' ایمٹ کے سوال کے جواب میں خاموشی چھا گئی۔ ''کیا تم دریا کے کنارے داہنی سمت حرکت کر رہے ہو یا بائیں طرف؟''

''داہنی سمت۔'' آواز میں کچھ جان آ گئی۔

''تمہارا نمبر کیا ہے؟'' ایمٹ نے فوراً لکھ لیا۔

''کیا تمہارے پاس میرا کارڈ ہے؟''

''ہاں!''

''مجھے سیل پر دوبارہ فون کرو اور اسی طرف چلتے رہو جدھر جا رہے ہو۔ دریا کو اپنی نظر کے سامنے رکھو۔ ہم تمہارے پاس پہنچنے والے ہیں۔''

ایمٹ کے پاس وقت کم تھا۔ پیٹرول بھی ختم ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت شیرف کے دفتر کے قریب تھا اور اسے اُمید تھی کہ کوئی نہ کوئی امداد اس کو مل جائے گی۔ وہ کار کو تیزی سے بھگاتا ہوا فوبے کے پاس پہنچا جو اپنے دفتر میں کام کر رہی تھی۔ وہ فوراً ایمٹ کے ساتھ پسنجر سیٹ پر آن بیٹھی اور ایمٹ نے چابی گھما دی۔

ایمٹ نے اپنا سیل فون فوبے کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''اس لڑکے کو رابطے میں رکھو۔''

وہ خاموشی سے سفر کرتے رہے اور چند ضروری الفاظ کے علاوہ اور کچھ نہ بولے۔ فوبے فون پر مصروف رہی۔ اس نے لڑکے سے کہا کہ وہ بھی خاموش رہے جہاں مناسب ہو گا وہ خود ہی بتائے گی۔ ایمٹ اپنے آپ کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ شاید اس بات پر کہ اسے لڑکوں کے بارے میں غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ کسی سے خوف زدہ ہیں۔

پارکنگ لاٹ میں دو لینڈ کروزر اور ایک WSPD پیٹرول کار شیرف کے دفتر کے قریب کھڑی تھیں۔ ایمٹ نے وہاں گاڑی روک دی۔ شیرف کا ایک نائب لینڈ کروزر کے پاس کھڑا تھا مائیکروفون اس کے ہاتھ میں تھا۔

ایمٹ آہستگی سے دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا انہوں نے میکائیل کا پتا چلا لیا ہے؟''

اس نے گردن کو جنبش دی۔ ''ابھی بہت سا کام باقی ہے۔ کتے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ ہماری ایک ٹیم اس کے اور دریا کے جنوب میں مصروف ہے۔ اُمید ہے کہ وہ جلد

UUNOVELS.COM

ہی پکڑا جائے گا۔"

"لڑکا کہہ رہا تھا کہ ریورینڈ کے پاس اپنا کتا بھی ہے۔"

یہ اطلاع جنگل میں موجود تمام افسران اور نائبین کو پہنچا دی گئی۔ ایمٹ نے اپنا سیل فون فوبے سے واپس لے لیا۔ "کوئی ایسی جگہ تلاش کرو جہاں تم تھوڑی دیر کے لیے چھپ سکو۔" اس نے لڑکے سے کہا۔ "شیرف کے آدمی دریا کے پاس ہیں اور تمہاری طرف بڑھ رہے ہیں۔ چرچ کی طرف سے ایک ٹیم بھی پہنچنے والی ہے۔"

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ ایمٹ نے جنگل کی طرف دیکھا۔ بہت دور دیکھنا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے بڑا ہی مشکل تھا۔ اچانک فائرنگ کی آواز نے ماحول میں ہلچل مچا دی۔ دو فائر ہوئے اور پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ ایمٹ نے فوراً فون سنبھالا۔ اس کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔ "کیا تم ٹھیک ٹھاک ہو لڑکے؟ مجھ سے بات کرو۔"

"یہ کیسی آواز تھی؟" نوجوان سرگوشی کر رہا تھا مگر یہ ظاہر تھا کہ وہ خیریت سے ہے۔

کار کے ریڈیو سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ ایمٹ نے اس پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ "ان لوگوں نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔ اپنی جگہ پر انتظار کرو۔ نائبین دریا کے قریب ہیں اور اس کو لے کر تمہارے پاس آ رہے ہیں۔"

ایمٹ کی کار میں تین اشخاص سوار تھے۔ ایمٹ اور وہ نوجوان پچھلی نشست پر اور فوبے آگے پسنجر سیٹ پر۔ نوجوان اس بھورے رنگ کے دبیز کمبل میں لپٹا ہوا تھا جو ایک نائب نے اسے مہیا کیا تھا اور آرام سے چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ فوبے چرچ کے کچن سے ابھی ابھی بنا کر لائی تھی۔ لڑکے نے عمارت میں قدم رکھنے سے انکار کر دیا۔

"میں اسی دن آپ کو کچھ بتانا چاہ رہا تھا جب آپ لوگ یہاں آئے تھے مگر لیمونٹ نے مجھے سختی سے روک دیا۔"

ایمٹ کا شک پختہ ہو گیا کہ وہی دبلا پتلا سنکی لڑکا ان کا لیڈر تھا۔ "وہ کہتا تھا کہ ہم اس وقت تک محفوظ ہیں جب تک کہ ہم اپنی زبان بند رکھیں گے۔"

"جوان، ڈیشوان اور برائن کیا اس وقت تک گروپ میں شامل تھے جب تک ان کی موت واقع نہ ہوگئی؟" ایمٹ نے پوچھا۔

لڑکے نے اپنے ہاتھ میں موجود کپ پر نگاہیں جما دیں۔ "پہلے پہل ہم صرف یہ سمجھے کہ کوئی خاص بات ظہور پذیر ہونے والی ہے۔ ریورینڈ میکائیل نے کہا کہ جوان کچھ شرارت کر رہا ہے اور وہ منشیات کا شوق کرنے لگا ہے مگر ہمیں جوان میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ ہم لوگ آپس میں بہت قریب تھے۔"

اس نے ایمٹ کی طرف دیکھا جو اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ "جب ڈیشوان مارا گیا تب ریورینڈ میکائیل نے کہا کہ پولیس ہم سے بات کرنے کے لیے آنے والی ہے اور ہم انہیں یہ بتائیں گے کہ ہم نے ڈیشوان کو ایک مہینے سے نہیں دیکھا۔ وہ پروگرام سے علیحدہ ہو گیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر ہم نے ایسا نہیں کہا تو وہ لوگ پروگرام بند کر دیں گے اور ہم لوگوں کو یوتھ ڈیویلپمنٹ کے تحت ابتدائی پروگرام میں جانا پڑے گا۔ ہم ڈر گئے۔ ہم میں سے کوئی وہاں نہیں جانا چاہتا تھا چنانچہ ہم نے وہی کیا جس کی ہدایت ہمیں دی گئی تھی۔"

"ریورینڈ میکائیل نے کہا کہ پولیس نے اسے بتایا ہے کہ برائن بری صحبت میں پڑ گیا تھا اور اسی وجہ سے مارا گیا۔ خدا کی رضامندی اور معاملات کے سدھار کی خاطر ہمیں اپنا پروگرام جاری رکھنا چاہیے۔" لڑکے نے یکا یک اپنا رخ کھڑکی کی طرف موڑ لیا جہاں سے ایک کار چرچ کی طرف جا رہی تھی۔

"ہمارا فرض تھا کہ جو کچھ ہمیں معلوم ہے وہ بتا دیا جائے۔ ممکن ہے کہ برائن ابھی زندہ ہو۔"

اس نے ایمٹ کی جانب پُراُمید نگاہوں سے دیکھا۔

"میکائیل نے ایسا کیوں کیا؟ تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟" ایمٹ نے لڑکے کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔

"وہ کہتا تھا کہ خدا کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ اچھائی کے ساتھ برائی بھی پھلے پھولے۔ صلیب کے دشمنوں سے ہمیں نجات حاصل کرنا ہوگا۔ اپنی سرزمین کو پاک کرنا ہوگا۔"

پہلی بار ایمٹ نے محسوس کیا کہ لڑکے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔ "شاید اس کا خیال ہے کہ ہمارے درمیان بھی چند کالی بھیڑیں گھس آئی ہیں جو ہمارے پروگرام میں رخنہ ڈال رہی ہیں۔ ان سے بھی نجات حاصل کرنی ہوگی۔"

اس دن ایمٹ کو احساس ہوا کہ مذہب کی آڑ لے کر معصوم ذہن کو ورغلایا جا رہا ہے، اپنے مقصد کی خاطر مذہب کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

پریگننٹ مین

کوثر اسلام

سائنس ہر ناممکن کو ممکن بناتا جارہا ہے۔ بچے پیدا کرنا صرف عورت کے لیے مختص ہے۔ کسی کے ذہن میں یہ خیال آ ہی نہیں سکتا کہ مرد بھی بچے پیدا کر سکتے ہیں لیکن اس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ سائنس کی کرشمہ سازی نے پوری دنیا کو حیران کر دیا ہے۔

وہ اپنے بچوں کا باپ بھی ہے اور ماں بھی

ٹریسی اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ٹی وی پر مار دھاڑ سے بھرپور کوئی فلم چل رہی تھی۔ فلم کے اختتام پر ٹریسی نے ماں سے کہا۔ ''مما......! میں کراٹے کلب میں داخلہ لینا چاہتی ہوں۔''

''کیوں بیٹا...... وہاں تو صرف لڑکے جاتے ہیں۔'' ماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''تو کیا میں لڑکوں سے کم ہوں میں ہر وہ کام کرنا چاہتی ہوں جو لڑکے کرتے ہیں میں کسی بھی معاملے میں ان سے پیچھے رہنا نہیں چاہتی۔'' ٹریسی نے دلیل دی۔

''او کے بابا...... تمہارے پاپا دفتر سے آجائیں تو ان

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

سے بات کرتی ہوں وہ داخلہ دلوا دیں گے۔'' اس کی ماں نے قائل ہوتے ہوئے کہا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ٹریسی جس کام کا ارادہ کر لیتی ہے اسے کر کے ہی چھوڑتی ہے اور بحث میں تو کوئی بھی اسے ہرا نہیں سکتا۔

''اوہ سویٹ مام'' ٹریسی نے دونوں بازو ماں کی گردن کے گرد حمائل کیے اور اسے چوم لیا۔

☆......☆

ٹریسی کی ماں سان فرانسسکو سے جب کہ باپ کورین نژاد تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے رفتہ رفتہ ان کی چاہت عشق میں بدلی اور بالآخر 1972 میں انہوں نے ہوائی کے جزیرے ہونولولو میں شادی کر لی۔

20 جنوری 1974 کو ان کے ہاں ایک بچی نے جنم لیا جس۔۔کا نام انہوں نے ٹریسی رکھا۔

ٹریسی جوں جوں بڑی ہوتی گئی وہ اپنے ماں باپ کو حیران کرتی گئی۔ وہ بچپن سے بہت ذہین اور غیر معمولی تھی۔ اسے وہ تمام کھیل کھیلنے کا شوق تھا جو اس وقت تک صرف لڑکے ہی کھیلتے تھے۔ جب وہ دس سال کی تھی تو اکثر اکیلے بیٹھ کر گھنٹوں سوچا کرتی۔ ''کاش وہ لڑکی نہ ہوتی، کاش وہ لڑکا ہوتی۔''

شاید یہی وجہ تھی کہ ہر اس کھیل میں دلچسپی لینے لگی تھی جو لڑکے کھیلا کرتے، ہر اس کام کو وہ کرنے لگی تھی جو لڑکوں کے لیے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی خواہش کو تسکین پہنچانے لگی تھی۔ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے وہ کراٹے کلب جانے لگی۔ شوق محنت اور لگن کی وجہ سے اس نے بہت جلد بلیک بیلٹ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد اس نے جمناسٹک میں اپنا لوہا منوایا پھر وہ باڈی بلڈنگ کی جانب متوجہ ہوئی اور کچھ ہی عرصے میں اسے بھی سر کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ماڈلنگ بھی کرتی تھی۔ کئی ڈراموں میں اس نے کردار ادا کیا۔ اپنے علاقے میں وہ مس ہوائی کے نام سے مشہور تھی۔

ٹریسی تعلیمی میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھی۔ ہر کلاس میں اس نے اوّل پوزیشن حاصل کی۔ اس کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے اس کے اساتذہ اس کے روشن مستقبل کے بارے میں کافی پُرامید تھے۔

ٹریسی نے 1996 میں یونیورسٹی آف ہوائی سے گریجویشن مکمل کی۔ گریجویشن میں اس کا مضمون بائیولوجیکل سائنسز تھا۔ دورانِ تعلیم اس پر یہ بات آشکارا ہوئی کہ وہ میڈیکل سائنس کے ذریعے اپنی دیرینہ خواہش کو عملی جامہ پہنا سکتی ہے۔ اس نے تحقیق کی تو اسے پتا چلا کہ کچھ سائنسدان جنس کی تبدیلی کو یقینی بنانے کے لیے تجربات کر رہے ہیں۔ یعنی اگر کوئی مرد ہے تو اسے عورت کیسے بنایا جائے اور اگر کوئی عورت ہے تو اسے مرد کیسے بنایا جائے چنانچہ ٹریسی ان کے پاس گئی اور ان کے سربراہ سے بات کی۔

''میں سائنس کی طالب علم ہوں مجھے پتا چلا ہے کہ آپ جنس کی تبدیلی کے بارے میں تجربات کر رہے ہیں۔''

''ہاں بالکل...... ہم تجربہ کر رہے ہیں کہ مرد کو عورت اور عورت کو مرد میں کیسے بدلا جائے۔''

''کیا ابھی تک آپ نے کسی پر اس کا تجربہ کیا ہے۔''

''نہیں...... حقیقت یہ ہے کہ ہمیں آج تک کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس پر تجربہ کر کے ہم اس کی جنس کو تبدیل کر سکیں۔''

''اگر اس کے لیے میں اپنے آپ کو پیش کر دوں تو......''

''تو ہمارے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہوگی اور اگر یہ تجربہ کامیاب ہوا تو تاریخ اس حوالے سے تمہیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔''

''تو پھر ٹھیک ہے میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

''ہمیں اس کے لیے کچھ قانونی کارروائیاں کرنی ہوں گی۔ اگلی ملاقات میں ہم آپ کو اس سے آگاہ کر کے معاملات طے کر لیں گے۔''

''جی ضرور...... اور بہت بہت شکریہ۔''

''شکریہ تو آپ کا بنتا ہے کہ آپ ہمارے کام میں مدد کر رہی ہیں۔''

☆......☆

اگلی ملاقات میں تفصیلی بات چیت کے بعد ٹریسی نے ایک معاہدے پر دستخط کیے۔ معاہدے کی رو سے تجربات کے دوران اگر ٹریسی کے جسم یا صحت کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچا تو ادارہ کسی بھی حوالے سے اس کا ذمے دار نہیں ہوگا۔

ٹریسی مختلف قسم کے تجربات سے گزرتی گئی۔ اس دوران اس کے جسم میں ٹیسٹوسٹیرون نامی ہارمون داخل کیے گئے۔ یہ ہارمون مردوں کے چہرے اور جسم پر بالوں کی نشوونما ان کی آواز کے بھاری پن اور سوچنے سمجھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ٹیسٹوسٹیرون ہارمون کی وجہ سے ٹریسی کے جسم میں مردوں کی خصوصیات پیدا ہونا شروع ہوئیں یہاں تک کہ 2001 تک یہ تقریباً مرد بن گئی۔ اس کے بعد اس نے اپر

UUNOVELS.COM

سرجری کے ذریعے اپنے پستان ختم کر کے سینے کو باقی جسم کے برابر کر دیا۔ اب وہ بالکل مردوں کی طرح نظر آنے لگی تھی۔ بچپن کے خواب کو پورا ہوتے دیکھ کر وہ پھولے نہیں سما رہی تھی۔ 2002 میں اس نے اپنے شناختی کارڈ، اسکول سرٹیفکیٹ، برتھ سرٹیفکیٹ، جم سرٹیفکیٹ، بلیک بیلٹ سرٹیفکیٹ، ڈرائیونگ لائسنس اور پاسپورٹ سمیت تمام کاغذات میں اپنی جنس عورت سے تبدیل کر کے مرد کرا دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنا نام تھامس بیٹی (Thomas beatie) رکھ لیا۔

اس کا برسوں کا خواب پورا ہو گیا اور اب وہ ایک مکمل مرد کی طرح زندگی گزارنے لگی۔ تمام لوگ اب اسے مرد سمجھنے لگے کیونکہ اس کی داڑھی نکل آئی تھی۔ اس کی آواز میں مردوں جیسا بھاری پن در آیا تھا۔

5 فروری 2003 کو اس نے نینسی نامی ایک لڑکی سے شادی کر لی۔ نینسی تھامس کے ساتھ بہت خوش تھی۔ دونوں کی زندگی کا سفر ہنسی خوشی گزر رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں دو سال کا عرصہ گزر گیا۔

وقت نے انگڑائی لی اور نینسی نے تھامس سے ایسی خواہش کا اظہار کر دیا جس کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ اس نے کہا۔ "تھامس۔۔۔! میں چاہتی ہوں کہ دوسری عورتوں کی طرح میرے بھی بچے ہوں۔ وہ مجھے مما اور آپ کو پاپا کہیں۔ اور ہم ان سے پیار کریں۔"

تھامس نے اس کی بات غور سے سنی اور چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "میں آپ کی بات سے متفق ہوں۔ کل ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ اس بارے میں ان سے مشورہ کرتے ہیں۔"

"آپ بہت اچھے ہیں تھامس۔۔۔" نینسی نے محبت پاش نظروں سے تھامس کو دیکھ کر کہا۔

"وہ اس لیے کہ تم بہت خوبصورت ہو۔" تھامس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو دونوں ہنس پڑے۔

☆---☆

اگلے دن وہ ڈاکٹر کے پاس گئے۔ ڈاکٹر نے نینسی کا معائنہ کیا۔ مختلف ٹیسٹ کرنے کے بعد ان پر یہ عقدہ کھلا کہ نینسی بانجھ ہے اور وہ بچے پیدا کرنے سے قاصر ہے۔

یہ خبر سنتے ہی ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ نینسی بہت پریشان ہو گئی۔ تھامس نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں نینسی۔۔۔ زندگی

UUNOVELS.COM

امتحانوں سے عبارت ہے، اگر زندگی میں کوئی امتحان نہ ہو کوئی مشکل کوئی رکاوٹ نہ ہو تو۔۔زندگی کا کیا مزہ۔‘‘

’’مگر ہمارے بچے کیسے ہوں گے تھامس...... ڈاکٹرز نے تو کہہ دیا کہ میں بچے پیدا نہیں کرسکتی۔‘‘ نینسی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

’’کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی نینسی...... تم خوانخواہ خود کو پریشان مت کرو۔ پتا ہے۔ جب تم پریشان ہوتی ہو تو میں بھی اداس ہو جاتا ہوں۔‘‘ تھامس نے اسے بانہوں میں بھر کر پیار بھرے لہجے میں کہا۔

نینسی نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا اور تھامس اسے تھپتھپانے لگا۔

☆......☆

بہت سوچ بچار کے بعد تھامس نے قربانی دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ہارمون کے انجکشن جو وہ باقاعدگی سے لیتا تھا بند کردیے۔ اس کے بعد اس نے ڈونر سپرم لے کر اپنے جسم میں داخل کردیے۔ چونکہ اس کے جسم میں عورتوں والا سسٹم موجود تھا لہٰذا اس کے اندر موجود انڈوں نے فرٹیلائزیشن کا عمل شروع کردیا اور اس کے ہاں تین بچے اکٹھے فرٹیلائز ہوگئے۔

اس کے حمل کی خبر جب لیک ہوئی تو دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ اسے پریگننٹ مین کا نام دیا گیا۔ بیوی کی محبت میں نہ اسے دنیا کی پروا تھی نہ دنیا کی باتوں کی۔ اس کی صرف اور صرف ایک خواہش تھی اور وہ یہ کہ اس کے بچے پیدا ہوں مگر تقدیر کو کچھ اور منظور تھا اس حمل کا نتیجہ بہت مایوس کن نکلا اور وہ تینوں کے تینوں بچے ضائع ہوگئے۔

تھامس کی کوشش ناکام ہوگئی...مگر اس نے ہار نہیں مانی، ہار کا لفظ اس کی ڈکشنری میں نہیں تھا وہ بچپن سے کوشش اور جدوجہد کا قائل تھا لہٰذا اس نے دوبارہ اسپرم ڈونیٹ کروائے۔ اس بار نتیجہ حوصلہ افزا رہا اور 29 جون 2008 کو اس نے ایک صحت مند بیٹی کو جنم دیا۔ بیٹی کا نام اس نے سوسن جولیٹ رکھا۔ بیٹی کی پیدائش کے ساتھ ہی وہ دنیا کا پہلا مرد بنا جس نے ایک بچی کو جنم دیا۔ اس کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج ہوگیا۔

بیٹی کی پیدائش کے بعد ڈاکٹروں نے اسے مشورہ دیا...کہ اگر وہ مزید بچے پیدا کرنا چاہے تو وہ پیدا کرسکتا ہے... چنانچہ جون 2009 اور جولائی 2010 میں اس نے مزید دو بچے پیدا کیے۔ مجموعی طور پر وہ تین بچوں یعنی ایک بیٹی اور دو بیٹوں کا باپ بن گیا۔ تھامس اور نینسی کی زندگی ایک بار پھر خوشیوں سے بھر گئی۔

وقت کا پہیا گھومتا رہا یہاں تک کہ 2012 میں تھامس نے لوور سرجری کے ذریعے مردانہ اعضاء لگوا لیے لیکن اب حالات نے ایک اور پلٹا کھایا نینسی جس کے لیے تھامس نے قربانی دی تھی اب تھامس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس نے عدالت کے ذریعے تھامس سے طلاق کا مطالبہ کرلیا۔ تھامس نے نینسی کو طلاق دے دی اور یوں محبت کی ایک اور کہانی پریشان کن انجام سے دوچار ہوئی۔

بچوں کی تقسیم کے معاملے پر جج الجھن کا شکار ہوا۔ اس سے پہلے اس نے ایسا مقدمہ زندگی میں نہیں دیکھا تھا جس میں ایک شخص باپ بھی ہے اور ماں بھی۔ مرد بھی ہے اور بچے بھی اس نے پیدا کیے ہیں۔

کافی بحث مباحثے اور سوچ بچار کے بعد عدالت نے تینوں بچے تھامس کو دے دیے۔

زندگی کی گاڑی چلتی رہی 2016 میں تھامس نے امبر نکولس نامی عورت سے دوسری شادی کرلی۔ تھامس اور امبر دونوں خوش ہیں، تینوں بچے ان کے پاس ہیں۔ دونوں میاں بیوی اکثر ٹیلی ویژن پر آتے رہتے ہیں۔

تھامس نے وہ سب کچھ حاصل کیا جو اس نے چاہا۔ اس نے ایم بی اے کیا میڈیکل سائنسز میں گریجویشن کی، بلیک بیلٹ حاصل کی۔ جمناسٹک میں ماہر بنا، باڈی بلڈنگ میں مہارت حاصل کی، ایکٹنگ کی، ایکٹر سنگر اور قلم کار بنا۔ وہ صرف اور صرف کوشش اور جدوجہد پر یقین رکھتا ہے۔ اس کی نظر میں ناممکن کچھ بھی نہیں بس کوشش اور جدوجہد شرط ہے۔

2008 میں اس نے اپنی پہلی کتاب لکھی جس کا نام لیبر آف لو ہے۔ اس کتاب میں اس نے ذکر کیا ہے کہ کس طرح اس نے بچے کے لیے جدوجہد کی۔

2008 ہی میں ڈسکوری نے پریگننٹ مین کے نام سے اس کی زندگی پر ڈاکومنٹری بنائی۔ اس ڈاکومنٹری نے شہرت کی بلندیوں کو چھوا۔

2015 میں فرنچ ڈائریکٹر جان کپلن (Jan Caplin) نے اس کی زندگی پر ایک شارٹ فلم بھی بنائی۔

جنس تبدیل کرنے والوں کی جو کمیونٹی ہے وہ اسے بہت عظیم مانتے ہیں اور اسے دیوتا کا درجہ دیتے ہیں۔

UUNOVELS.COM

باپ بیٹے

انور فرحاد

پاکستان کی فلمی تاریخ سے ان باپ بیٹوں کے نام حذف کرنا ممکن نہیں، انہوں نے کس جانفشانی سے فلمی صنعت کو سنبھالا۔ کتنی یادگار فلمیں دیں۔ کس طرح اس گلشن کو سنوارہ۔ کیسی کیسی دشواریوں کو پرے دھکیل کر اپنی راہ نکالی۔ یہ واقعات..... سدق ہیں۔ کس طرح اپنی دنیا آپ بسائی جاسکتی ہے۔ کس طرح ناموافق حالات میں آگے بڑھا جاسکتا ہے، یہ ان کی حالاتِ زندگی سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔

نئی معلومات کے شائقین کے لیے کئی ان کہی داستان

اللہ تعالیٰ بھی اسی کی مدد کرتے ہیں، جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ میں آج ایک ایسے ہی شخص کا ذکر کروں گا، جو ایک عام آدمی تھا، بے یارو مددگار مگر اس نے تمام تر ناساعد حالات کے باوجود اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے محنت کی، کوشش کی، جدوجہد کی، دشواریاں اور کٹھنائیاں برداشت کیں اور ہمت و حوصلے سے اپنا سفر جاری رکھا۔ جس کے نتیجے میں ایک دن وہ زیرو سے ہیرو بن گیا۔ وہ جو

کبھی کچھ نہ تھا بہت کچھ بن گیا۔ کامیابی اور کامرانی کے آسمان پر چاند سورج بن کر چمکنے دمکنے لگا۔ اس باہمت اور بلند حوصلہ کی شخصیت کا نام شباب کیرانوی ہے۔ انہیں ہم اور آپ ایک معروف صحافی، ایک کامیاب مصنف، متعدد کامیاب فلموں کے فلم ساز و ہدایت کار، مستند شاعر اور نغمہ نگار و اسٹوڈیو آنر کی حیثیت سے جانتے اور پہچانتے ہیں مگر ہم میں سے بہت سے لوگ یہ نہیں جانتے کہ اس مقام تک وہ کیسے پہنچے؟ ان کو عزت، شہرت، مقبولیت اور دولت ایک دم کسی نے پلیٹ میں رکھ کر پیش نہیں کی انہیں بڑی جان ماری کرنی پڑی تھی، ایک ایک قدم آگے بڑھانے کے لیے صبر آزما حالات و واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب یہ دیکھا کہ میرا یہ بندہ اپنی بہتری کے لیے محض مجھ سے دعا ئیں نہیں مانگتا۔ اپنی کامیابی کے لیے خود بھی جدوجہد کر رہا ہے تو انہوں نے اس کے لیے کامیابی و کامرانی کے دروازے کھول دیے۔ اللہ کے اس بندے کی کہانی کچھ یوں شروع ہوتی ہے کہ انہوں نے گوشہ گمنامی میں جنم لیا۔ وہ 1926ء میں کیرانہ (متحدہ ہندوستان کا ایک علاقہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام حافظ نذیر احمد تھا۔ ''حافظ'' کا لفظ ان کے نام کے ساتھ یوں لگ گیا تھا کہ انہوں نے کلام پاک حفظ کیا تھا۔

ابھی وہ بہت چھوٹے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ یتیمی کا دکھ کیا ہوتا ہے یہ وہی لوگ جانتے ہیں جن کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ جاتا ہے۔ بیوگی میں والدہ نے ان کی پرورش و پرداخت کس طرح کی، ہر حساس آدمی اس کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

کیرانہ ایک چھوٹا سا علاقہ تھا جہاں بڑے شہروں کے مقابلے میں کم سہولتیں میسر تھیں لہٰذا انہوں نے سوچا۔ مجھے کسی ایسی جگہ رہنا چاہیے جہاں میرے بچے کو اپنے بہتر مستقبل کے لیے کھلی فضا ملے، محنت اور جدوجہد کے لیے زیادہ مواقع حاصل ہو سکیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے ایسے ہی ایک شہر کا انتخاب کیا اور وہ اپنے کمسن بیٹے نذیر احمد کو لے کر لاہور آ گئیں۔ لاہور شروع سے ہی علم و ادب اور صنعت و ثقافت کا گہوارہ رہا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نذیر احمد بھی بڑے ہوتے گئے۔ انہوں نے ماں کی خواہش پر قرآن پاک حفظ کر لیا اور اسکول کی تعلیم بھی جاری رکھی۔ یہ ان کی والدہ اور ان کے لیے بڑا کٹھن ٹائم تھا۔ ان کی والدہ سخت محنت کرتی تھیں پھر جب وہ ذرا بڑے ہوئے، محنت مزدوری کرنے کے قابل ہوئے تو انہوں نے بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ جس طرح کا کام مل جاتا وہ کر لیتے۔ کبھی یہ نہیں سمجھا کہ فلاں کام اچھا ہے اور فلاں کام اچھا نہیں ہے۔ بس بھیک مانگنا اور چوری کرنا برا کام ہے۔ باقی ہر طرح کی محنت مزدوری میں کوئی برائی نہیں ہے۔

لاہور چونکہ ادب اور ثقافت کا گہوارہ تھا اس لیے نذیر احمد کو بھی لاہور کی ہوا اور فضا نے شاعر بنا دیا۔ شاید یہ قدرت کا پہلا عطیہ تھا جو انہیں ملا تھا۔ طبیعت موزوں تھی۔ وہ جلد ہی اچھے شعر کہنے لگے۔ کچھ لوگوں نے ان سے کہا۔ ''حافظ صاحب! شعر و شاعری کرتے ہو تو کوئی اچھا سا ادبی نام بھی رکھ لو۔''

بس انہوں نے اپنا تخلص شباب رکھ لیا اور کیرانہ کی نسبت سے کیرانوی کہلانے لگے۔ پھر کچھ سینئر شاعروں اور ادیبوں نے مشورہ دیا۔ ''شباب صاحب! کسی بڑے اور مستند شاعر کو اپنا کلام دکھا لیا کرو۔ ابتدائی دور میں اصلاح کی ضرورت پڑتی ہے۔''

''تو پھر آپ ہی نوک بتائیے میں کس کے پاس جاؤں؟''

''تاجور نجیب آبادی ایک مستند اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان سے مل کر اصلاح لیا کریں۔''

جواں سال شباب کیرانوی، جناب تاجور نجیب آبادی سے ملے اور کہا۔ ''حضور! مجھے اپنی شاگردی میں قبول کیجیے اور میری رہنمائی فرمایئے۔''

شاعر محترم نے ان کا ذوق شوق دیکھ کر کہا۔ ''آپ کا شعری ذوق اچھا ہے۔ شعر بھی اچھے کہتے ہیں مگر شاعری کی کچھ شرائط و ضوابط بھی ہوتے ہیں جن کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر آپ کے ہاں ایسی لغزشیں ہوں گی تو انہیں درست کر دوں گا۔''

اس طرح وہ مشہور شاعر تاجور نجیب آبادی کے شاگرد بن گئے۔ قیام پاکستان کے وقت وہ لاہور ہی میں تھے اور اپنی روزی روٹی کمانے کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری بھی کرتے رہے۔ لاہور میں چونکہ قیام پاکستان سے پہلے بھی فلمیں بنتی تھیں تو انہیں بھی شوق ہوا کہ وہ بھی فلموں کا حصہ بنیں مگر کیسے؟ ہیرو تو وہ نہیں بن سکتے۔ ''ہاں ___'' انہوں نے سوچا۔ میرے پست قد ہونے کی وجہ سے مجھے ہیرو کا چانس کبھی نہیں ملے گا اور چھوٹے موٹے ثانوی کردار کرنے

UUNOVELS.COM

UUNOVELS.COM

کا کوئی مزہ نہیں۔''

یہ اور ایسی ہی باتیں سوچ کر انہوں نے اداکاری کا خیال تو ذہن سے جھٹک دیا مگر یہ سوچنے لگے۔

''میں شاعر ہوں۔ شاعری کر سکتا ہوں۔ کیوں نہ فلمی نغمہ نگار بن جاؤں۔ ہاں یہ تو مجھ سے ہو سکتا ہے مگر......'' اس ''مگر'' کے آگے سوالیہ نشان تھا۔ ''مگر میری یہ خواہش کیسے پوری ہو گی؟ مگر فلم والوں سے مجھے کون ملائے گا؟ مگر فلم والے مجھ جیسے ایک بے نام و نمود نوجوان سے کیوں نغمہ نگاری کرائیں گے؟ مگر...... مگر...... مگر......''

سوچتے سوچتے انہیں خیال آیا۔ ''یہ جو اپنے پڑوس میں اے حمید صاحب رہتے ہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ فلم والوں سے ان کی صاحب سلامت ہے کیوں نہ ان سے مل کر......''

اے حمید صاحب بڑے سیدھے سادے اور درویش صفت انسان تھے۔ جب حافظ نذیر احمد المعروف شباب کیرانوی نے ان سے مل کر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ''محترم! میری خواہش ہے کہ میں فلموں میں نغمہ نگاری کروں۔ میں اچھی خاصی شاعری کر لیتا ہوں۔ مولانا تاجور نجیب آبادی کا شاگرد ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ فلم والوں سے آپ کی کچھ جان پہچان ہے۔ کیا آپ میری مدد کریں گے؟'' وہ دم لینے کے لیے ذرا رکے تھے کہ حمید صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکتے ہوئے کہا۔

''بس جتنا آپ کہہ چکے، اتنا ہی کافی ہے۔ میں کوشش کروں گا۔ آگے اللہ کی مرضی۔''

وہ اچھا زمانہ تھا۔ اچھے لوگ تھے۔ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا لوگ عبادت سمجھتے تھے۔ پھر اے حمید صاحب تو بڑے نیک دل انسان تھے۔ انہوں نے فلمی نغمہ نگار بننے کے شوقین نوجوان کو تسلی دی اور پھر ایک دن وہ انہیں اپنے ساتھ فلم اسٹوڈیو لے گئے اور کئی فلم سازوں اور موسیقاروں سے ملوا کر کہا۔ ''یہ بڑے اچھے شاعر ہیں۔ ان سے بھی کبھی کچھ گیت لکھوا لینا۔''

سب نے وعدہ کیا لکھوائیں گے پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ چند دنوں کے بعد دو فلموں کی نغمہ نگاری کے لیے انہیں بلوایا گیا۔ حافظ نذیر احمد (شباب کیرانوی) کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انہوں نے پہلے اللہ کا شکر ادا کیا پھر حمید صاحب کا اور خوشی خوشی نگار خانے پہنچ گئے۔ وہ فلمی نغمہ نگاری کے حوالے سے بالکل نئے تھے لیکن موسیقاروں کے معیار پر پورے اترے اور انہوں نے دونوں فلموں کے لیے دو دو چار چار گیت لکھ دیے۔ فلم والے ان کے کام سے مطمئن تھے اس لیے وہ اپنے مستقبل کے حوالے سے سہانے خواب دیکھنے لگے کہ اگر اللہ نے فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے مجھے کامیاب کر دیا تو انشاء اللہ میرے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ آئیں بائیں شائیں قسم کی نوکری کرنے سے نجات مل جائے گی۔ ڈھنگ کی زندگی بسر کر سکوں گا۔ ماں کو بھی آرام پہنچا سکوں گا۔

ایک فلم کا نام جس کے لیے انہوں نے گیت نگاری کی تھی۔ ''پہلی بار'' تھا جب کہ دوسری کا نام ''بے درد'' تھا مگر ان کے سارے خواب جلد ہی چکنا چور ہو گئے۔ انہوں نے پہلی بار جو سندر سپنا دیکھا تھا وہ بڑا بے درد نکلا۔ جانے کیا گڑبڑ گھوٹالا ہو گیا کہ دونوں فلمیں ابتدائی مرحلے ہی میں دم توڑ گئیں۔ ابھی ان فلموں کی کاغذی تیاریاں ہی مکمل ہوئی تھیں کہ یہ افسوسناک حقیقت سامنے آ گئی کہ یہ فلمیں نہیں بن سکیں گی۔ اس وقت شباب کیرانوی کی حالت اس مصرعے کے مصداق تھی۔ ''حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے''

انہوں نے بڑے دکھ کے ساتھ اے حمید صاحب کو اس ''سانحے'' کی اطلاع دی۔ انہوں نے صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ہوا کہ یہ فلم اپنے ابتدائی مرحلے ہی میں اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ گانے ریکارڈ ہو جاتے یا ان کی پکچرائزیشن ہو جاتی تو اور زیادہ تکلیف ہوتی تمہیں۔''

''مگر حمید صاحب! ایسا کیوں ہوا؟''

''فلمی دنیا میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ فلم بنانے والوں اور سرمایہ لگانے والوں میں کوئی کھٹ پٹ ہو گئی ہو گی۔ یا کوئی اور جھگڑا ہو گا۔ بہت سی فلمیں بہت سی باتوں کی وجہ سے مکمل نہیں ہوتیں۔ تکمیل کے کسی نہ کسی مرحلے میں ادھوری رہ جاتی ہیں۔''

شباب صاحب کو اس وقت فلم اور فلم والوں کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم نہیں تھا اس لیے وہ بہت مایوس ہوئے اور انہوں نے آہستہ آہستہ نغمہ نگاری کی خواہش کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔ مگر وہ اپنے موجودہ روزگار سے مطمئن نہیں تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی ایسا کام کریں جس میں نام بھی ہو۔

انہیں شاعری کرنے کے علاوہ کہانیاں اور ناول پڑھنے کا بھی بڑا شوق تھا اور اپنے فراغت کے اوقات میں رسالوں اور ناولوں کا مطالعہ ضرور کرتے تھے۔ ایک دن

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

اچانک انہیں خیال آیا۔

''کیوں نہ میں ناول لکھنا شروع کر دوں؟'' انہوں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''کیا میں ناول لکھ سکوں گا؟''

گویا ان کے دل سے آواز آئی۔ ''کیوں نہیں لکھ سکوں گا۔ کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔''

اور انہوں نے بسم اللہ پڑھ کر ایک دن اپنی ناول نگاری کی ابتدا کر دی۔ بچپن سے ہی وہ ذہین تھے اور تھوڑی سی کوشش کے بعد اپنی ذہانت کے سہارے ہر کام کر لیتے تھے۔ ناولوں کا مطالعہ کرتے کرتے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ناولوں کے لیے کن مال مصالحوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ پڑھنے والے ناولوں میں کیا پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ انہی سب باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر انہوں نے ناول لکھنا شروع کیا تو ہفتہ عشرہ میں اسے مکمل کر لیا پھر اطمینان سے اسے شروع سے آخر تک ایک قاری کی حیثیت سے پڑھا تو انہیں اچھا لگا۔ ''اگر مجھے اچھا لگا ہے تو دوسروں کو بھی پسند آئے گا۔'' انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔

لاہور شروع سے نشر و اشاعت کا بھی مرکز رہا ہے۔ اس شہر میں چھوٹے بڑے بے شمار پبلشرز ہیں۔ جو ہر طرح کی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ شباب کیرانوی صاحب ایک ایسے پبلشر کے پاس پہنچ گئے جس کے شائع کیے ہوئے بہت سے ناول پڑھ چکے تھے۔

''جناب! میں نے ایک ناول لکھا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اسے آپ چھاپیں۔''

پبلشر نے انہیں سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا پھر کچھ سوچ کر کہا۔ ''آپ مسودہ لائے ہیں؟''

''جی ہاں، لایا ہوں۔''

''اسے ہمارے پاس چھوڑ جایئے۔ ہم اسے پڑھ کر دیکھیں گے کہ وہ ہمارے معیار کا ہے یا نہیں۔ اگر ہو گا تو آپ سے اس کا سودا کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' کہہ کر انہوں نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا۔

''آج ہی کے دن۔ اگلے ہفتے ہم سے ملیے۔''

اور جب اگلے ہفتے شباب صاحب اپنے دھڑکتے دل کے ساتھ پبلشر سے ملے تو انہوں نے مسکراتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ ''آؤ نوجوان آؤ۔ ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔''

''کیسا لگا ہمارا ناول؟''

''اچھا ہے۔ ہم اسے چھاپ دیں گے اور اس کا کچھ معاوضہ بھی آپ کو دیں گے مگر......''

''مگر کیا؟''

''اس کے جملہ حقوق ہمارے نام کرنا ہوں گے جس کے بعد اس کی جملہ ملکیت ہماری ہو گی۔ ہم جتنی بار چاہیں گے اسے شائع کریں گے مگر اس کے دوسرے ایڈیشن پر آپ کو کوئی پائی پیسا نہیں دیں گے۔''

''ٹھیک ہے جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی کروں گا۔''

''آج ہی کے دن ہمارے پاس آنا اور ناول کا محنتانہ لے جانا۔''

شباب کیرانوی اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے واپس لوٹے کہ ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی اور انہوں نے جلد ہی دوسرا ناول لکھنا شروع کر دیا اور ایک نئے موضوع پر اسی عوامی پسندیدگی کو سامنے رکھ کر نئے ناول کی عمارت کھڑی کرنا شروع کر دی۔

اگلے ہفتے وہ پبلشر سے ملے تو انہوں نے ان سے ایک کاغذ پر دستخط کروایا۔ جو گویا ایک اقرار نامہ تھا کہ میں نے اس ناول کے جملہ حقوق فلاں صاحب کو بعوض اتنی رقم کے دے دیئے ہیں اب وہی اس کے مالک و مختار ہیں۔

ناول کے معاوضے کے طور پر جو رقم ملی تھی وہ بہت زیادہ تو نہیں تھی مگر ان کے خیال میں بہت کم بھی نہیں تھی۔ رقم لے کر اور شکریہ ادا کر کے واپس آنے لگے تو شیخ صاحب کی آواز آئی۔

''میاں! اور کچھ لکھو تو پہلے ہمیں دکھا لینا۔''

شباب صاحب خوش خوش گھر لوٹے تھے۔ ہفتہ دس دن کی محنت سے جو کمائی ہوئی تھی وہ ان کے موجودہ پیشے کے لحاظ سے بری نہیں تھی۔ باعزت بھی تھی اور گھر بیٹھے کرنے والے کام کی بھی تھی۔ وہ سوچنے لگے میرا پہلا ناول اگر شیخ صاحب کی طرح پڑھنے والوں کو بھی پسند آ گیا تو اللہ کے حکم سے میری ناول نگاری کی گاڑی چل پڑے گی۔

حافظ نذیر احمد کو ان کی ماں کی دعائیں بھی حاصل تھیں۔ وہ نیک دل خاتون ہمیشہ اپنے بن باپ کے بیٹے کی بہتری اور کامیابی کی دعائیں مانگتی رہتی تھیں۔ اگلے مہینے جواں سال شباب کیرانوی کا نیا ناول تیار ہو گیا تھا۔ وہ اس کا مسودہ لے کر پبلشر کی دکان پر گئے تو ان کے سلام کا جواب

دینے کے بعد شیخ صاحب بولے۔ "پتر! پہلے یہ بتاؤ۔ خالی ہاتھ آئے ہو یا نئے ناول کا مسودہ لے کر آئے ہو؟ اس کے بعد کوئی اور بات کریں گے۔"

"آپ کے پاس خالی ہاتھ کیسے آتا؟ آپ کے حکم کی تعمیل تو کرنی تھی۔"

"شاباش! لاؤ مسودہ دو۔"

جواباً شیخ صاحب نے ان کا شائع شدہ ناول کے ساتھ ہی نئے ناول کا معاوضہ بھی تھما دیا۔ "بس تم ہر ناول اس طرح لکھو کہ وہ پہلے سے بہتر ہو۔ کچھ نئی بات ہو کچھ نیا پن ہو۔ کچھ نئی دلچسپی ہو۔"

"آپ کی سرپرستی حاصل رہی تو آپ کی خواہشوں اور معیار پر پورا اترنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہوں گا۔"

نوجوان ناول نگار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا پہلا ناول عوامی مقبولیت حاصل کرنے میں سرخرو رہا ہے۔ جبھی شیخ صاحب اس قدر مہر و محبت کے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب ناول اور کہانیاں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ آج کی طرح نہ ٹی وی تھا نہ انٹرنیٹ۔ ریڈیو تھا یا کتابیں اور میگزین۔ اس زمانے میں تھوڑے بہت بھی پڑھے لکھے لوگ پڑھتے ضرور تھے۔ خواتین بھی پڑھتی تھیں اور مرد بھی۔

شباب صاحب کا دوسرا ناول بھی ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ اب وہ ہر مہینے ایک تازہ ناول لکھ کر پبلشر کو تھما دیتے تھے۔ اس طرح انہوں نے کوئی درجن بھر ناول لکھ لیے۔ اس ناول نگاری سے جہاں انہیں باعزت طریقے پر روزی روٹی کمانے کا ذریعہ نصیب ہوا وہیں ان کی ایک معزز لکھاری کی حیثیت سے شناخت بھی ہوئی اور اس دور کے ایک مشہور فلمی رسالے "ڈائریکٹر" میں انہیں بطور ایڈیٹر نوکری بھی مل گئی۔ یہ باعزت ملازمت بھی تھی، تنخواہ بھی معقول تھی جب کہ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انہیں فلمی دنیا سے وابستہ لوگوں سے جان پہچان بھی ہونے لگی اور فلمی دنیا میں داخل ہونے کا یہیں سے موقع مل گیا۔ انہوں نے فلمی نغمہ نگاری سے مایوس ہو کر اپنی جس خواہش کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا وہ خواہش ایک بار پھر بیدار ہو گئی مگر اس وقت کے اور اب کے حالات میں بڑا فرق تھا۔ لہٰذا انہوں نے فلمی دنیا میں انٹری کے لیے اب محض نغمہ نگاری کا سہارا نہیں لیا بلکہ بڑے پیمانے پر بڑی منصوبہ بندی کی اور ایک دم فلم سازی کا ارادہ کر لیا۔

فلم بنانے کے لیے سب سے پہلی اور اہم چیز سرمایہ کی موجودگی ہوتی ہے مگر ان کے پاس کوئی سرمایہ نہیں تھا اور ایک بالکل نئے فلم ساز کو کوئی انویسٹر بھی فنانس نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے سرمائے کی فراہمی کے لیے ایک نیا اور انوکھا طریقہ کار اختیار کیا۔ انہوں نے اپنے رسالے "ڈائریکٹر"

شباب کیرانوی کی فلمیں

بطور ڈائریکٹر

ثریا، جناب، ماں کے آنسو، شکریہ، تمیلہ، عورت کا پیار، فیشن، آئینہ، انسانیت، دل دیوانہ، میری دوستی میرا پیار، تم ہی ہو محبوب میرے، انسان اور آدمی، انصاف اور قانون، افسانہ زندگی کا، بازار، دل اک آئینہ، من کی جیت، دامن اور چنگاری، آئینہ اور صورت، بے مثال، میرا نام ہے محبت، انسان اور فرشتہ، دیوار، نشیمن، محبت ایک کہانی، شمع محبت، سنگم، انمول محبت، وعدے کی زنجیر، دوراستے، دامن، لاجواب، یہ زمانہ اور ہے، ایک دن بہو کا۔

مشہور گیت

چاند نکلا ہے تیرے حسن کی تصویر لیے (آغراز پروین، قلم جوش انتقام) سو کے ہی زندگی میں ایک با (مہدی حسن، قلم انصاف اور قانون) تکلف برطرف ہم تو سر بازار ناچیں گے (رونا لیلیٰ، قلم بازار) میں کھیلوں کا راجا (رنگیلا، آخر میں بھی تو انسان ہوں) تک دھنا دھن گائے رے جیرا (احمد رشدی، قلم آئینہ اور صورت) تمہارے بنا زندگی بجھ بجھ سی تھی (مہناز، قلم انسان اور فرشتہ) تیری خوشی کے لیے تیرا پیار چھوڑ چلے (ناہید اختر قلم محبت ایک کہانی) میرے محبوب کا آیا ہے محبت نامہ (ناہید اختر، قلم شمع محبت) اپنی دنیا آپ بسائیں گے ہم دل والے (اخلاق احمد، قلم انمول محبت) دیوانہ نہیں تم کو نہ دیوانہ بنا دے (غلام عباس، قلم دیوار) آنکھیں بڑی پاگل ہیں ہر بات بتا دیتی ہیں (مہناز، قلم دامن) سامنے آئے تجھ کو پکارا نہیں (مہدی حسن، قلم درد)

شباب کیرانوی کی ٹاپ 10 فلمیں

میرا نام ہے محبت، انسان اور آدمی، انصاف اور قانون، دامن اور چنگاری، انسانیت، آئینہ، ماں کے آنسو، سہیرن، پردے میں رہنے دو، افسانہ زندگی کا۔

UUNOVELS.COM

کے ذریعے عوامی سرمایہ کاری کی مہم کا آغاز کیا اور اپنی پہلی فلم ''جلن'' کے شیئرز فروخت کرنا شروع کر دیئے۔ اس سلوگن کے ساتھ کہ فلم کی کامیابی پر آپ کو آپ کے اصل کے علاوہ منافع میں بھی حصہ ملے گا۔

یہ طریقہ واردات قدرے کامیاب ہوا جب کہ ''ڈائریکٹر'' کے مالک فضل حق صاحب نے بھی کچھ مالی معاونت کی۔ شباب صاحب نے اپنی اس پہلی فلم کی ہدایت کاری کی ذمے داری اپنے پرانے پڑوسی اور محسن اے حمید کو سونپی جو اب فلموں کے مستند عکاس بھی بن گئے تھے۔ مرکزی کرداروں کے لیے عنایت حسین بھٹی اور ایک نئی رقاصہ نادرہ کا انتخاب کیا۔ عنایت حسین بھٹی، نذیر صاحب کی فلم ''شہری بابو'' میں ایک مختصر مگر پُراثر کردار کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے فلم ساز ادارے کا نام سیر بین لیمیٹڈ رکھا تھا۔ ان کی پہلی فلم کی کاسٹ کے دیگر اداکاروں میں منور ظریف اور جی این بٹ کے نام قابل ذکر ہیں۔ موسیقی کا شعبہ بھی ایک غیر معروف موسیقار محمد علی منو کو دیا۔ ان کی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر مشیر کاظمی، سیف الدین سیف اور شباب کیرانوی نے نغمہ نگاری کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس فلم میں مجموعی طور پر آٹھ گانے تھے جن میں سے چھ گیت خود شباب صاحب نے تحریر کیے جب کہ سیف الدین سیف اور مشیر کاظمی سے ایک ایک گیت لکھوائے۔

خدا خدا کر کے ''جلن'' کسی نہ کسی طرح مکمل ہوئی اور 2 ستمبر 1955ء کو ریلیز کر دی گئی جو بری طرح ناکام ہوئی کیونکہ کم سرمائے کی وجہ سے نئے اور ناتجربہ کار فنکاروں اور ہنرمندوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ تکنیکی اعتبار سے بھی ''جلن'' بہت کمزور فلم تھی۔ اس فلم کی ناکامی سے جہاں شباب کیرانوی کو بہت مایوسی ہوئی تھی وہاں انہیں فلم سازی کے بارے میں کچھ تجربات بھی حاصل ہوئے تھے۔ وہ اپنی پہلی ناکامی سے ہمت نہیں ہارے بلکہ نئے عزم و ارادے کے ساتھ کچھ دنوں کے بعد اپنی نئی فلم ''ٹھنڈی سڑک'' کا آغاز کر دیا۔

اس فلم کی کہانی اور اسکرپٹ انہوں نے علی سفیان آفاقی سے تحریر کروائی۔

آفاقی صاحب کو انہوں نے کہا۔ ''آفاقی صاحب! کوئی ایسی کہانی لکھو جس پر بنی ہوئی فلم دیکھ کر تماشائی بہت محظوظ ہوں۔ ہنستے مسکراتے ہوئے سینما گھروں سے نکلیں۔''

آفاقی صاحب سے جو لوگ ملتے ملاتے رہے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ موصوف بڑی چنچل اور شوخ طبیعت کے تھے۔ چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق ان کی عادت ثانیہ تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے آپ اطمینان رکھیں۔ آپ جیسا چاہتے ہیں ویسی ہی کہانی لکھ دوں گا۔''

اور انہوں نے واقعی ایک ہنستی مسکراتی کہانی لکھ دی جسے ''ٹھنڈی سڑک'' کے نام سے پکچرائز کیا گیا۔ یہ فلم سپر ہٹ موویز کے بینر تلے بنی۔ اس کے ہدایت کار اے حمید ہی تھے اور موسیقار بھی محمد علی منو ہی تھے۔ اس فلم میں اس دور کی خوب صورت اور پسندیدہ اداکارہ مسرت نذیر کو بطور ہیروئن اور سید کمال کو ہیرو منتخب کیا گیا۔ سید کمال کی یہ پہلی فلم تھی اور وہ نامور بھارتی سپر اسٹار راج کپور کے ہو بہو کاپی تھے اس لیے انہیں پاکستانی راجکپور کے طور پر پیش کیا گیا تھا اور اندر کی ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ دور پار کے آفاقی صاحب کے کزن بھی ہوتے تھے۔ منور ظریف اور اداکارہ ریکھا نے دیگر اہم کردار کیے تھے۔ (ریکھا کا اصل نام عذرا پیٹر اور ان کی پہلی فلم ''سیلاب'' تھی۔ معروف ہدایت کار و فلم ساز شیخ اقبال سے شادی کر کے مسلمان ہو گئی تھیں) اس فلم کے لیے سیف الدین سیف، سکندر بہزاد اور شباب کیرانوی نے نغمہ نگاری کی تھی جب کہ غالب کی بھی ایک غزل شامل کی گئی تھی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان دنوں شباب صاحب ماہنامہ ''ڈائریکٹر'' کی ادارت سے مستعفی ہو گئے تھے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ شباب کیرانوی صاحب نے یکسو ہو کر فلم بنانے کا ارادہ کیا ہو۔ بہر حال ''ٹھنڈی سڑک''، ''جلن'' کے مقابلے میں جلد مکمل ہوئی اور 2 مئی 1957ء کو نمائش کے لیے پیش کر دی گئی۔ اسے دیکھنے والے تماشائی سینما گھر سے ہنستے مسکراتے نکلتے تھے مگر بقول آفاقی صاحب ''ہمارے حصوں میں رونا اور اشکوں سے منہ دھونا ہی آیا۔'' کیونکہ ''ٹھنڈی سڑک'' نے بہت ٹھنڈا بزنس کیا تھا۔ اس دور میں رونے رلانے والی فلمیں پسند کی جاتی تھیں اس لیے ہنسنے ہنسانے والی اس فلم کو تماشائیوں کی اکثریت نے مسترد کر دیا۔

شباب صاحب کو ایک بار پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ہماری فلم انڈسٹری میں جو جیتا وہی سکندر کہلاتا ہے۔ ہارنے والے کے آگے کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔ اس دوسری ناکامی نے زیادہ دکھ پہنچایا تھا مگر شاباش ہے ان کی جواں ہمتی کی کہ وہ گھبرا کر فلم انڈسٹری سے بھاگے نہیں اور اپنے آپ کو بھی

کہہ کر تسلی دیتے رہے کہ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔ سیانوں کا کہنا ہے ٹھوکر کھا کر بھی انسان سیکھتا ہے۔ انہوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور بالآخر کچھ دنوں کے بعد ایک نئی فلم ''گلبدن'' کے نام سے شروع کردی۔ یہ ایک جادوئی نوعیت کی فلم تھی۔ انہوں نے اس بار عام تماشائیوں کو متاثر کرنے کے لیے ایک ہلکی پھلکی تفریحی کہانی کا انتخاب کیا تھا۔ مسرت نذیر، اعجاز، ناصرہ، شیخ اقبال اور نذیر فلم کی کاسٹ میں تھے۔ اس کی ہدایت کاری بھی اپنے محسن اے حمید سے کروائی۔ اس بار موسیقی کی ذمے داری اختر حسین کو سونپی اس فلم کے لیے شباب کیرانوی نے چار جب کہ ناظم پانی پتی، فرحت شاہ جہاں پوری اور رحمان ہیائی نے ایک ایک گیت تحریر کیے۔ شباب صاحب کے چار گیتوں میں ایک کی موسیقی محمد علی منو نے کمپوز کی تھی جس کے بول تھے ''میری برباد دنیا کا تماشا دیکھتے جاؤ۔''

متذکرہ فلم ''گلبدن'' قدرے کامیاب رہی۔ شباب صاحب کی یہ پہلی فلم تھی جس نے انہیں ناکام ہو کر مایوس نہیں کیا تھا۔ یاد رہے کہ اس فلم کی تکمیل کے دوران ہی انہوں نے اپنا ذاتی رسالہ ''پکچر'' نکالنا شروع کردیا تھا۔ ''گلبدن'' 1960ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

شباب صاحب بنیادی طور پر شاعر تھے اور شعروادب سے ہی ان کی اصلی وابستگی تھی۔ نوعمری سے انہوں نے جو شاعری شروع کی تھی وہ ان کے برے سے برے وقت میں بھی جاری رہی اور جب فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے تب بھی شعروشاعری ترک نہیں کی۔ ضرورتاً ناول نگاری کی۔ صحافتی ذمے داری بھی نبھائی، ادب اور ادیبوں سے رشتہ جوڑے رکھا۔ ان کے دو شعری مجموعے ''موجِ شباب'' اور ''بازارِ صدا'' شائع ہو کر ادبی حلقوں میں مقبول ہوئے۔ جب انہوں نے اپنا ذاتی جریدہ ''پکچر'' نکالا تو اس کا دفتر ادیبوں اور شاعروں کی گویا بیٹھک بن گیا۔ سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، شوکت تھانوی اور علی سفیان آفاقی جیسے اہلِ قلم ان کے دفتر آتے جاتے رہتے تھے۔ شباب صاحب اچھے صحافی، ادیب و شاعر ہی نہیں ایک مخلص ملنسار محبت کرنے والے انسان بھی تھے اسی لیے اپنے قلم قبیلے کے لوگوں سے انہوں نے ہمیشہ خوشگوار رشتہ استوار رکھا۔ ان کے حسنِ اخلاق اور شگفتہ مزاجی کے بھی معترف تھے۔

دوستو! شباب کیرانوی کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ برے سے برے وقت میں بھی ہمت نہیں ہارتے تھے۔ ان کی ابتدائی دو فلمیں ''جلن'' اور ''ٹھنڈی سڑک'' کاروباری طور پر بری طرح ناکام ہوگئی تھیں لیکن وہ ہمت نہیں ہارے اور اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ جس کے نتیجے میں ان کی تیسری فلم ''گلبدن'' میں انہیں ناکامی کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ تجارتی خسارہ نہیں ہوا۔ تھوڑا فائدہ ہی حاصل ہوا پھر جب انہوں نے اپنی اگلی فلم ''ثریا'' شروع کی تو ربِ رحیم وکریم نے انہیں مزید نوازا۔ اللہ پر بھروسا کر کے انہوں نے اس فلم کی ہدایت کاری کے فرائض خود انجام دیئے۔ یہ فلم عمدہ، معیاری اور کامیاب ثابت ہوئی اور ان کی ہدایت کارانہ صلاحیتوں کو ناقدین، مبصرین اور ناظرین نے تسلیم کیا اور کہا کہ شباب کیرانوی آنے والے دنوں میں اور اچھی فلمیں بنائیں گے۔

''ثریا'' کی خاص بات اس کی کہانی تھی جو ایک جنم جلی عورت کی آپ بیتی تھی۔ نیر سلطانہ اور حبیب نے مرکزی رومانوی کردار ادا کیے تھے۔ اس فلم کی دوسری خوبی اس کی موسیقی اور گیت تھے۔ دو موسیقاروں اختر حسین اور محمد علی منو نے ''ثریا'' کی خوب صورت موسیقی ترتیب دی تھی۔ شباب صاحب نے اپنے پرانے ساتھی محمد علی منو کو فراموش نہیں کیا تھا۔ چند گیتوں کے نمونے درج ذیل ہیں۔

☆ آج میرے منے کی سالگرہ ہے (بول: عادل۔ آواز: آئرن پروین)

☆ بچپن بیتا آئی جوانی۔ بولو کیا اقرار کروں (بول: شباب کیرانوی۔ آواز آئرن پروین۔ موسیقی: اختر حسین)

☆ بڑا ظالم زمانہ ہے۔ بڑی ظالم خدائی ہے (بول: شباب کیرانوی۔ آواز: منیر حسین)

''ثریا'' کے لیے سرمایہ کاری بابو محمد علی نے کی تھی اور یہ فلم سپرہٹ موویز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ 1961ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس فلم کی کامیابی سے شباب کیرانوی کا نام کامیاب ہدایت کاروں کی فہرست میں شامل کرلیا گیا۔

''ثریا'' کے فنانسر بابو محمد علی سے کسی وجہ سے شباب صاحب کے اختلافات ہوگئے تھے۔ لہٰذا شباب صاحب نے ان کا فلم ساز ادارہ سپرہٹ موویز چھوڑ دیا اور اپنا ذاتی ادارہ شباب پروڈکشن قائم کرلیا اور اس ادارے کے تحت اپنی پہلی فلم ''سپیرن'' کا اعلان کردیا۔ اس کی ہدایت کاری داؤد چاند سے کروائی۔ اس فلم میں حبیب کے مقابل شباب صاحب نے اداکارہ لیلیٰ کو بطور ہیروئن پیش کیا۔ لیلیٰ کی یہ

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

پہلی فلم اس کے لیے بہت لکی ثابت ہوئی۔ اس فلم کی سپرہٹ کامیابی کے بعد لیلیٰ کامیاب ہیروئنوں کی صف میں شامل ہو گئی۔ اس فلم کے سارے ہی گیت شباب کیرانوی نے تحریر کیے تھے۔ منظور اشرف کی دھنوں پر شباب کیرانوی کے گیتوں نے دھوم مچادی اور اس کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ نامور گلوکار احمد رشدی کی آواز میں گایا ہوا یہ گیت بہت مشہور ہوا۔

چاند سا مکھڑا گورا بدن
جل میں لگائے گوری اگن

اس گیت کی گائیکی پر احمد رشدی کو نگار ایوارڈ بھی ملا۔

''سپیرن'' شباب صاحب کی اب تک کی ریلیز ہونے والی فلموں میں سب سے زیادہ کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم کی سپرہٹ کامیابی سے شباب پروڈکشن کی ساکھ فلم ٹریڈ میں مستحکم ہوگئی۔

''مہتاب'' شباب صاحب کی اگلی فلم تھی جو 1962ء میں نمائش پذیر ہوئی اور اس نے سپرہٹ کامیابی حاصل کر کے فلمی حلقوں میں تہلکہ مچادیا۔ اس کا یہ گانا

''گول گپے والا آیا گول گپے لایا''

نے اسٹریٹ سانگ کی حیثیت سے کامیابی حاصل کر کے دھوم مچا دی۔ اسے احمد رشدی نے گایا تھا اور عوامی اداکار علاؤالدین پر پکچرائز ہوا تھا، ان کی کردار نگاری اس فلم میں بہت پسند کی گئی تھی۔ جب کہ احمد رشدی کو ایک بار پھر اس گیت پر بہترین گلوکار کا نگار ایوارڈ ملا تھا۔ اس فلم میں دوسرا نگار ایوارڈ بہترین صدا بندی پر ''سی منڈوڈی'' کو دیا گیا تھا۔ نیر سلطانہ اور حبیب ایک بار پھر اس فلم میں ایک دوسرے کے مقابل پیش ہوئے تھے۔ منظور اشرف اس فلم کے موسیقار تھے جب کہ گیت نگار مشیر کاظمی، شباب کیرانوی اور حزیں قادری تھے۔ اس بار اے حمید نام بطور فلم ساز دیا گیا تھا۔ ہدایت کاری شباب صاحب نے خود کی تھی۔ شباب کیرانوی کی گھریلو سپرہٹ فلم نے پہلی بار گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ اس فلم کی کامیابی سے ان کی مالی پوزیشن بہت مستحکم ہوگئی تھی۔

شباب صاحب کی اعلیٰ ظرفی کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ انہوں نے اے حمید کے احسان کے بدلے میں ہمیشہ انہیں اپنے ادارے سے وابستہ رکھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اے حمید کا نام ان کے لیے نیک شگون ہے۔ اے حمید ہی وہ پہلی شخصیت تھے جنہوں نے ان کو پہلی بار فلم والوں سے ملوایا تھا اور دو فلموں کی نغمہ نگاری کا شرف بخشا تھا۔ یہ احسان وہ زندگی بھر نہیں بھولے اور جب تک زندہ رہے ان کے نام کو اپنے ساتھ رکھا۔

اگلے سال 1963ء میں شباب صاحب نے ''ماں کے آنسو'' بنا کر ایک بار پھر اپنی کامیابی کا جھنڈا لہرا دیا۔ یہ فلم بھی گولڈن جوبلی ہٹ ثابت ہوئی۔ اس کے فلم ساز اے حمید اور ہدایت کار شباب کیرانوی تھے۔ منظور اشرف اس فلم کے بھی موسیقار تھے جب کہ گیت مشیر کاظمی اور شباب کیرانوی نے تحریر کیے تھے۔ نیر سلطانہ اور حبیب اس فلم کے بھی مرکزی کردار تھے۔ کاسٹ میں نغمہ اور زینت بیگم بھی شامل تھیں۔ زینت نے ایک غم زدہ عورت کا لاجواب کردار ادا کیا تھا۔ نغمہ کو اس فلم کے ذریعے متعارف کرایا گیا تھا۔ اس فلم کا یہ گیت بہت مقبول ہوا تھا۔

اتنے بڑے جہاں میں کوئی نہیں ہمارا۔ دنیا کی ٹھوکروں میں پھرتے ہیں بے سہارا (بول: شباب کیرانوی۔ آواز: آئرن پروین)

''ماں کے آنسو'' کے دو اور گیت بھی بہت پاپولر ہوئے تھے۔ دونوں گیت مشیر کاظمی کے تحریر کردہ تھے۔

☆ جھکا گرگیلو رے کراچی کے بجار میں۔ جھکا گرگیلو رے (آواز: نذیر بیگم)

☆ سماں جب پیارا پیارا ہو۔ پیار کا دل کو سہارا ہو (آوازیں: نذیر بیگم، احمد رشدی)

شباب پروڈکشنز کی اگلی فلم ''تیس مار خان'' تھی جو پنجابی زبان میں بنائی گئی تھی اور 1963ء ہی کی پیشکش تھی۔ اس کی ہدایت کاری فلم ساز شباب کیرانوی نے حیدر چودھری سے کروائی تھی۔ اداکارہ شیریں اور علاؤالدین نے مرکزی کردار کیے تھے۔ شباب صاحب کی یہ پہلی پنجابی فلم تھی۔ ان کا یہ تجربہ بھی کاروباری طور پر کامیاب ثابت ہوا تھا۔ شیریں کی یہ پہلی فلم تھی۔ اس کو متعارف کروانے والے بھی شباب صاحب تھے۔ یہ نویلی اداکارہ جسمانی طور پر بڑی بھرپور اور بے حد پرکشش تھی۔ اس مناسبت سے اس پر فلمایا ہوا گیت سونے پر سہاگا ثابت ہوا تھا۔ ''دو نموں دا جوڑا......''

اس فلم پر اس نے زبردست انداز میں پرفارم کر کے فلم انڈسٹری میں اپنے لیے مقام حاصل کرلیا تھا۔ بابا عالم سیاہ پوش کے اس گیت کے علاوہ یہ گیت بھی مشہور ہوا تھا۔ ''میری جھانجھر چھن چھن چھنکے''

UUNOVELS.COM

اسی برس (1963ء) شباب پروڈکشنز کی ایک اور فلم ''نیلم'' بھی ریلیز ہوئی تھی جس میں اداکارہ رخسانہ کے مقابل شباب صاحب نے لالہ سدھیر کو مرکزی رول میں پیش کیا تھا۔ اس کے ہدایت کار اے حمید اور موسیقار منظور اشرف تھے اور تمام تر نغمات مشیر کاظمی نے تحریر کیے تھے۔ بدقسمتی سے یہ فلم بری طرح ناکام ہوگئی۔ اس ناکامی کے نتیجے میں شباب صاحب نے سدھیر کو پھر اپنی کسی بھی فلم میں کاسٹ نہیں کیا۔

''نیلم'' کی ناکامی کا شباب پروڈکشنز پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اگلے سال اس ادارے کی تین فلمیں منظر عام پر آئیں۔ 1964ء کی یہ تین فلمیں شکریہ، جیلر اور عورت کا پیار تھیں۔ ان میں صرف ''شکریہ'' کامیاب ثابت ہوئی۔ ''شکریہ'' کے فلم ساز اے حمید ہدایت کار شباب کیرانوی اور موسیقار منظور اشرف تھے۔ نغمات کے تخلیق کار مشیر کاظمی تھے۔ اس فلم کے چھ گیتوں میں سے یہ دو گیت بہت مشہور ہوئے۔

☆ اک میرا چاند اک میرا تارا۔ اسی کی لاڈلی ابو کا پیارا (آواز: نسیم بیگم)

☆ میرے دل کا بنگلہ خالی ہے۔ اور اس کا کرایہ کوئی نہیں (آوازیں: نسیم بیگم، احمد رشدی)

یہ ایک میوزیکل اور رومانی فلم تھی اس لیے کامیاب ثابت ہوئی۔ اس کی کاسٹ میں رخسانہ، حبیب اور صابرہ سلطانہ شامل تھیں۔ شباب صاحب نے صابرہ سلطانہ کو اس فلم سے متعارف کرایا تھا۔

دوسری فلم ''جیلر'' کے فلم ساز بھی اے حمید، ہدایت کار شباب کیرانوی، موسیقار منظور اشرف اور نغمہ نگار مشیر کاظمی تھے مگر یہ فلم باکس آفس پر کامیابی حاصل نہیں کرسکی تھی۔

''عورت کا پیار'' بھی ناکام ہوگئی تھی جس کے ہدایت کار شباب کیرانوی، موسیقار منظور اشرف اور گیت نگار مشیر کاظمی تھے۔ اس کی کاسٹ میں رانی، محمد علی، ناصرہ اور علاؤ الدین شامل تھے۔ اس ناکام فلم کا ایک گیت بہت پسند کیا گیا تھا جس کے بول تھے ''حال دل ہم نے سنایا تو برا مانو گے۔ جان کہہ کر جو بلایا تو برا مانو گے'' (آواز: احمد رشدی)

''عورت کا پیار'' کے نام سے ریلیز ہونے والی فلم کے گانوں کے ریکارڈ پر اس فلم کا نام ''عورت کا پیار اور خانم'' درج ہے۔

شباب پروڈکشنز کی دوسری پنجابی فلم ''لاڈلی'' تھی جو 1964ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے فلم ساز شباب کیرانوی اور ہدایت کار حیدر چودھری تھے۔ موسیقی منظور اشرف کی اور گیت تھے بابا عالم سیاہ پوش اور وارث لدھیانوی کے۔ زیادہ لاڈ پیار میں بچوں کا جو حشر ہوتا ہے وہی اس فلم کا بھی ہوا۔

''فیشن'' شباب کیرانوی کی 1965ء کی فلم تھی۔ یہ ایک سبق آموز اور اصلاحی فلم تھی۔ اس کے فلم ساز اے حمید اور ہدایت کار خود شباب کیرانوی تھے۔ موسیقار بخشی وزیر اور نغمہ نگار قتیل شفائی تھے۔ یہ فلم اچھی اور معیاری ہونے کے باوجود متوقع کامیابی حاصل نہ کرسکی۔

اسی سال ریلیز ہونے والی دوسری فلم ''ناچے ناگن باجے بین'' تھی۔ اس کے فلم ساز شباب کیرانوی تھے اور ہدایت کار حیدر چودھری تھے۔ موسیقی طالب جعفری کی تھی اور گانے مشیر کاظمی، تنویر نقوی، بشیر منذر اور شباب کیرانوی کے تھے۔ شباب صاحب کے لکھے ہوئے بول تھے۔ ''ٹھنڈی پونیا ساون مہینا۔ ناچے گی ناگن'' (آواز: نسیم بیگم)

یہ فلم کامیاب ہوئی تھی۔ ناقدین اور مبصرین نے اس موقع پر کہا تھا کہ ہمارے ناظرین کی اکثریت اچھی اور معیاری فلمیں پسند نہیں کرتی۔ عام فلم بینوں کو عام اور ہلکے پھلکے موضوعات کی فلمیں ہی پسند آتی ہیں۔

اگلے سال 1966ء میں بھی شباب پروڈکشنز کے بینر تلے تین فلمیں وطن کا سپاہی، گھر کا اجالا اور آئینہ پیش کی گئیں۔

''وطن کا سپاہی'' جنگ ستمبر سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھی۔ اس کے فلم ساز شباب کیرانوی، ہدایت کار اے حمید اور موسیقار منظور اشرف تھے۔ نغمہ نگار حبیب جالب اور مشیر کاظمی تھے۔ یہ اداکار نھا کی پہلی فلم تھی۔ یہ فلم بھی تماشائیوں کو ہضم نہیں ہوئی اور فلاپ ہوگئی۔

''گھر کا اجالا'' فلم ساز اے حمید اور ہدایت کار شباب کیرانوی کی فلم تھی۔ منظور اشرف اس کے موسیقار اور مشیر کاظمی، بشیر منذر اور شباب کیرانوی نغمہ نگار تھے۔ اس کے ستاروں میں رانی، حبیب، زینت، رنگیلا اور ساقی شامل تھے۔ اس فلم کا یہ گیت پسند کیا گیا تھا۔ ''ذرا آنکھ ہم سے ملا کر تو دیکھو۔ محبت کی دنیا بسا کر تو دیکھو (آواز: مالا۔ بول:

UUNOVELS.COM

شباب کیرانوی)

یہ فلم کاروباری طور پر اوسط درجے کی ثابت ہوئی تھی۔

"آئینہ" اس سال کی سپر ہٹ فلم تھی۔ اس کے فلم ساز اے حمید اور ہدایت کار شباب کیرانوی تھے۔ اس فلم کو چربہ ہونے کے الزام میں سنسر بورڈ نے بین کر دیا تھا لیکن بعد ازاں یہ الزام غلط ثابت ہونے پر اسے نمائش کی اجازت مل گئی تھی۔ یہ شباب کیرانوی کی 1966ء کی ریلیز ہونے والی کامیاب ترین فلم ثابت ہوئی۔ اس کی کاسٹ میں دیبا، محمد علی، زینت اور کمال ایرانی نمایاں آرٹسٹ تھے۔ موسیقار منظور اشرف تھے لیکن ایک گانے "دل ویراں ہے، تیری یاد ہے تنہائی ہے" کی موسیقی تصدق حسین نے ترتیب دی تھی۔ "آئینہ" کے تمام نغمات آج بھی روزِ اوّل کی طرح مقبول ہیں۔

☆ حسن والوں کو جلانے کی بری عادت ہے
(آوازیں: مسعود رانا، آئرن پروین)

☆ تم ہی ہو محبوب مرے میں کیوں نہ تمہیں پیار کروں (آواز: آئرن پروین)

☆ اللہ جھٹ پٹ سے ہیرو بنا دے مجھے (آواز: احمد رشدی)

☆ تم ہی ہو محبوب میرے میں کیوں نہ تمہیں پیار کروں (آواز: مسعود رانا)

☆ دل ویراں ہے تیری یاد ہے تنہائی ہے (آواز: مہدی حسن)

اس فلم کے تمام تر نغمات خواجہ پرویز کے تحریر کردہ تھے جو بے حد پسند کیے گئے اور ان کی وجہ سے فلم کی کامیابی پر بھی خوشگوار اثر پڑا۔ اس فلم کے سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ جب اس پر چوری کی کہانی کا الزام لگا تو اس کے تقسیم کار نے شباب کیرانوی سے اپنی ایڈوانس دی ہوئی رقم واپس مانگنی شروع کر دی۔ شباب صاحب نے اسے سمجھانے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔ وہ کسی طرح بھی اس فلم سے مطمئن نہ تھا۔ لہٰذا شباب صاحب نے اس کی رقم واپس کر دی اور اپنا ذاتی فلم ڈسٹری بیوشن ادارہ قائم کر لیا۔ "آئینہ" اس تقسیم کار ادارے سے ریلیز کی اور اس ادارے کی یہ پہلی فلم ہی سپر ہٹ ثابت ہوئی۔ اس فلم کی فقید المثال کامیابی سے شباب پکچرز کی بنیاد مضبوط تر ہو گئی اور انہوں نے اس کے بعد شباب اسٹوڈیو کی بنیاد رکھی۔ "آئینہ" ایک رومانوی اور نغماتی فلم تھی جس کی کہانی شباب صاحب نے خود ہی لکھی تھی۔ جن لوگوں نے اس فلم پر چربہ ہونے کا الزام لگایا تھا وہ کسی طور بھی اسے ثابت نہ کر پائے۔ اس فلم کی زبردست کامیابی کو دیکھ کر اس تقسیم کار کو بڑا پچھتاوا ہوا جس نے اپنی دی ہوئی ایڈوانس رقم واپس لے لی تھی۔

شباب کیرانوی کی اگلی فلم "انسانیت" تھی۔ اس کے فلم ساز اے حمید اور ہدایت کار شباب کیرانوی اور مصنف شاطر غزنوی تھے۔ یہ فلم جب سنسر بورڈ کے سامنے پیش کی گئی تو اس پر بھی چربہ کہانی کا الزام لگا کر کہا گیا یہ بھارتی فلم "دل ایک مندر" کا چربہ ہے اس لیے اسے نمائش کی اجازت نہیں دی جائے گی لیکن جب بورڈ کے سامنے یہ ثبوت پیش کیا گیا کہ "دل ایک مندر" خود ایک پاکستانی فلم "حسرت" سے لی گئی کہانی پر بنائی گئی تھی تو "انسانیت" سے پابندی اٹھالی گئی اور 24 فروری 1967ء کو ریلیز کر دی گئی۔

شباب پروڈکشن کی یہ ایک جذباتی اور نغماتی فلم تھی جو عظیم الشان کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اس فلم کی کاسٹ میں زیبا، وحید مراد، فردوس، زینت، آشا پوسلے، ننھا، رضیہ، حمید وائن اور طارق عزیز شامل تھے۔ طارق عزیز کو پہلی بار بطور اداکار اس فلم میں متعارف کرایا گیا تھا۔ اس فلم کی کامیابی میں وحید مراد، زیبا اور فردوس کی جذباتی اداکاری اور اس کے مقبول گیتوں کا بڑا دخل تھا۔ اس فلم میں فردوس نے ایک پاگل عورت کا اور وحید مراد نے ایک کامیاب ڈاکٹر کا ناقابل فراموش کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کی موسیقی بھی منظور اشرف نے ترتیب دی تھی۔ دوستو! یہ منظور اور اشرف دو بندے تھے جو مل کر کام کرتے تھے۔ فلموں کی موسیقی دونوں مل کر کمپوز کیا کرتے تھے۔ یہ بات ہم اس لیے بتا رہے ہیں کہ آگے چل کر جب ایم اشرف کا نام آئے گا تو آپ سوچیں گے یہ صاحب کہاں سے ٹپک پڑے؟ قصہ یوں ہوا کہ منظور صاحب کسی قتل کے الزام میں گرفتار ہو گئے تو شباب صاحب کی فلموں کی موسیقی محمد اشرف دینے لگے اور وہ اپنا نام ایم اشرف کے طور پر استعمال کرنے لگے چند سال بعد منظور صاحب سزا کاٹ کر بری ہو گئے تو اکیلے موسیقی ترتیب دینے لگے پھر کچھ عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ "انسانیت" تک تو دونوں کا ساتھ تھا۔ ان دونوں کی جوڑی نے شباب کیرانوی، ناظم پانی پتی اور خواجہ پرویز کے تحریر کردہ گیتوں کی دھنیں ترتیب دی تھیں۔ اس فلم کے چند نغمات درج ذیل

ہیں۔

☆ محبت میں سارا جہاں جل گیا ہے (آواز: مالا۔ بول: شباب کیرانوی)

☆ میرے ہمدم میرے ساتھی۔میں تیری دم ساز ہوں (آواز: مالا۔ بول: شباب کیرانوی)

☆ محمد کملی والے ہیں امت غم خوار (آواز: مالا۔ بول: تاجم پانی پتی)

☆ ہائے رے محبت ہائے ری تو نے (آواز: مالا۔ بول: شباب کیرانوی)

ہدایت کار شباب کیرانوی کی ایک اور فلم ''دل دیوانہ'' 1967ء میں ریلیز ہوئی تھی۔اس کی کاسٹ میں دیبا، کمال، زینت، مہتاب اور ساقی شامل تھے۔ تصدق رتنا نے موسیقی ترتیب دی تھی۔ مشیر کاظمی، شباب کیرانوی اور تاجم پانی پتی نے نغمہ نگاری کی تھی۔ یہ فلم درمیانے درجے کی ثابت ہوئی تھی۔

شباب صاحب کی بطور فلم ساز، مصنف اور نغمہ نگار ایک کامیاب فلم ''سنگدل'' تھی جو 2 جنوری 1968ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ ندیم نے پہلی بار مغربی پاکستان میں اسی فلم سے اپنی اداکاری کا آغاز کیا تھا جب کہ اداکار مسعود اختر کی یہ پہلی فلم تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کی ہدایت کاری کے فرائض شباب صاحب کے بیٹے ظفر شباب نے انجام دیئے تھے۔ ایم اشرف اس کے موسیقار، خواجہ پرویز اور شباب کیرانوی نغمہ نگار تھے۔اس فلم میں رنگیلا کا تکیہ کلام۔ ''تین سال تک ہانگ کانگ کے نلکوں کا پانی پیا ہے کوئی حقہ نہیں پیا'' بہت مقبول ہوا تھا۔ یہ ایک میوزیکل، رومانٹک، گھریلو اور ڈرامائی فلم تھی اور بہت کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ اس کی کاسٹ میں ندیم، دیبا، روزینہ، کمال ایرانی، ننھا، صاعقہ، رنگیلا، زینت اور مسعود اختر شامل تھے۔اس فلم میں نو گانے تھے۔چند مقبول گیت یہ تھے۔

☆ ہو، سن لے او جانِ وفا تو ہے دنیا میری (بول: خواجہ پرویز۔اس گیت کو مالا اور رشدی نے الگ الگ گایا تھا)

☆ میری پائل کی جھنکار۔لوٹے دل کا قرار (آواز: مالا، احمد رشدی۔ بول: خواجہ پرویز)

☆ کہتے ہیں سبھی مجھ کو دیوانہ تمہارا (آواز: احمد رشدی۔ بول: شباب کیرانوی)

متعارف کرائے نئے چہرے

بابرہ شریف فلم میرا نام ہے محبت۔ غلام محی الدین فلم میرا نام ہے محبت۔ طلعت حسین فلم انسان اور آدمی۔ مسعود اختر فلم سنگدل۔ طارق عزیز فلم انسانیت۔ ننھا فلم وطن کا سپاہی۔ شیریں فلم تیس مار خان۔ رونق بانو فلم انسان اور فرشتہ۔ انجمن فلم وعدے کی زنجیر۔ عمران فلم بازار۔ نغمہ فلم ماں کے آنسو۔ صابرہ سلطانہ فلم شکریہ۔ لیلیٰ فلم سپیرن۔ اسد بخاری فلم مہتاب۔

باپ بیٹوں کی فلمیں

شباب کیرانوی نے بطور فلم ساز و ہدایت کار، کہانی نویس، مکالمہ نگار اور نغمہ نگار 75 فلمیں اپنے نام سے وابستہ کیں۔ ظفر شباب نے 25 اور نذر شباب نے 25 فلمیں بنائیں۔

شباب کیرانوی کی بطور ہدایت کار 8 فلمیں سلور جوبلی، 9 فلمیں گولڈن جوبلی اور ایک فلم پلاٹینم جوبلی کامیاب ہوئیں۔

☆ ظفر شباب کی 12 فلمیں سلور جوبلی، 4 فلمیں گولڈن جوبلی اور ایک فلم نے پلاٹینم جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔

نذر شباب کی 8 فلموں نے سلور جوبلی، 9 فلموں نے گولڈن جوبلی اور 2 فلموں نے ڈائمنڈ جوبلی کامیابی حاصل کی۔

شباب کیرانوی نے دو پنجابی فلمیں تیس مار خان اور لاڈلی کی ہدایات دیں جب کہ ایک پنجابی فلم حیدر خان کے وہ فلمساز تھے۔ ظفر شباب نے دو پنجابی فلمیں رب دی شان اور کوچوان ڈائریکٹ کیں۔ نذر شباب کی پنجابی فلموں کی تعداد بھی دو ہی تھیں۔ انہوں نے اپنی ہدایت کاری کا آغاز ہی پنجابی فلم ''سجن بیلی'' سے کیا تھا۔ جب کہ ان کی دوسری پنجابی فلم ''تیری میری اک مرضی'' تھی۔

عجیب اتفاق ہے کہ تینوں باپ بیٹوں کی کسی بھی پنجابی فلم نے قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں کی۔ ظفر شباب کی 25 میں سے 19 فلمیں کامیاب ہوئیں جب کہ نذر شباب کی 21 فلمیں کامیاب ہوئیں۔

UUNOVELS.COM

☆ دل کو جلائے تیرا پیار۔ ڈر موہے لاگے سیاں
(آواز: مالا۔ بول: خواجہ پرویز)

اسی سال (1968ء) شباب پروڈکشنز کی دو اور فلمیں "جوش انتقام" اور "میری دوستی میرا پیار" ریلیز ہوئی تھیں۔ دونوں فلموں کے فلم ساز شباب کیرانوی تھے۔ دونوں میں شباب صاحب نے گیت بھی لکھے تھے۔ "جوش انتقام" کے موسیقار تصدق حسین اور نغمہ نگار کلیم عثمانی اور مشیر کاظمی تھے۔ "میری دوستی میرا پیار" کے ڈائریکٹر اے حمید، موسیقار تصدق حسین اور نغمہ نگار شباب کیرانوی، خواجہ پرویز اور ریاض الرحمان ساغر تھے۔ معیار اور کاروبار کے لحاظ سے دونوں فلمیں واجبی رہی تھیں۔

1969ء میں شباب کیرانوی کی دو فلمیں بطور فلم ساز اور ایک فلم بطور ہدایت کار ریلیز ہوئیں۔ بطور فلم ساز ان کی فلمیں "درد" اور "فسانہ دل" تھیں۔ ان دونوں فلموں کے ہدایت کار ظفر شباب تھے جب کہ موسیقار ایم اشرف۔ "درد" کی کاسٹ میں دیبا، اعجاز، مسعود اختر اور زینت جب کہ "فسانہ دل" کی کاسٹ میں دیبا، ندیم، صاعقہ، نیر سلطانہ اور درپن شامل تھے۔ "درد" کے نغمہ نگاروں میں شباب کیرانوی اور خواجہ پرویز جب کہ "فسانہ دل" کے گیت نگار بھی شباب کیرانوی اور خواجہ پرویز ہی تھے۔ دونوں فلموں کے کئی گیت ہٹ ہوئے تھے۔

"تم ہی ہو محبوب میرے" کے ہدایت کار شباب کیرانوی اور فلم ساز اے حمید تھے۔ یہ کامیاب فلم 23 مئی 1969ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اس میں وحید مراد اور دیبا نے بہت عمدہ اداکاری کی تھی۔ اس کے سارے گانے خواجہ پرویز نے لکھے تھے مگر ایک غزل شاعر مزدور احسان دانش کی بھی شامل کی گئی تھی۔

بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے

"تمہی ہو محبوب میرے" شباب کیرانوی کی پہلی رنگین فلم تھی جس نے ان کو کاروباری طور پر بھی فائدہ پہنچایا تھا۔

شباب پروڈکشنز کی دو فلمیں "سجن بیلی" اور "انسان اور آدمی" 1970ء میں ریلیز ہوئیں۔ پنجابی زبان میں بننے والی فلم "سجن بیلی" کے فلم ساز شباب کیرانوی اور ہدایت کار ان کے دوسرے بیٹے نذر شباب تھے۔ موسیقی تصدق حسین کی تھی۔ گانے خواجہ پرویز، افتخار شاہد اور اقبال چودھری نے لکھے تھے۔ کاسٹ میں رانی، عنایت حسین بھٹی، رخسانہ اور کیفی شامل تھے۔

دوسری فلم "انسان اور آدمی" کے فلم ساز اے حمید اور مصنف و ہدایت کار شباب کیرانوی تھے۔ موسیقی ایم اشرف کی اور نغمہ نگاری شباب کیرانوی، تسلیم فاضلی کی تھی۔ اس فلم میں محمد علی اور زیبا نے ینگ ٹو اولڈ کردار پہلی بار ایک ساتھ کیا تھا اور ایسی کردار نگاری کی تھی کہ دیکھنے والے داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اس فلم کی کہانی، مکالمے، ہدایت کاری، کردار نگاری، گیت اور موسیقی فن کی بلندیوں پر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے خاص و عام دونوں طبقوں کے فلم بینوں نے بے حد سراہا۔ یہ فلم شباب کیرانوی کی شاہکار فلموں میں سرفہرست ہے۔ محمد علی، زیبا، آسیہ، زرقا، اسلم پرویز، شاہدہ، منور ظریف، ریحان، زینت، راشد اور فاروق جلال (طلعت حسین) نے اپنے اپنے کردار میں زبردست اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ یاد رہے کہ طلعت حسین ان دنوں فاروق جلال کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے اور یہ ان کی پہلی فلم تھی اور اس فلم کی تکمیل کے دوران ان کا قیام محمد علی کے گھر پر تھا۔ اس سپرہٹ فلم کی کہانی پر انڈیا میں کئی چربہ فلمیں بنائی گئیں اور کامیاب ہوئیں۔ ان میں سے ایک فلم "انصاف کا ترازو" بھی تھی جس کے ہدایت کار بی آر چوپڑہ تھے۔

"انسان اور آدمی" کے سپرہٹ چند گیت یہ ہیں۔

☆ تو جہاں کہیں بھی جائے میرا پیار یاد رکھنا
(آوازیں: نور جہاں، مہدی حسن۔ بول: شباب کیرانوی)

☆ زمانے کی نظروں میں میں بے وفا ہوں (آواز: نور جہاں۔ بول: تسلیم فاضلی)

☆ خط پڑھ کے اب دل بہلتا نہیں ساجنا (آواز: نور جہاں۔ بول: تسلیم فاضلی)

☆ میں ہوں تتلی عجیب۔ دیکھو آنا نہ میرے قریب
(آواز: نور جہاں۔ بول: تسلیم فاضلی)

☆ ہم نے تم سے پیار کیا ہے۔ الفت کا اقرار کیا ہے
(آواز: رنگیلا۔ بول: تسلیم فاضلی)

محمد علی نے "انسان اور آدمی" میں ایک وکیل اور ناکام عاشق کا کردار اس خوبی سے ادا کیا تھا جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس فلم نے چار نگار ایوارڈ حاصل کیے تھے۔

1۔ بہترین اداکارہ کا ایوارڈ زیبا کو ملا۔
2۔ بہترین اداکار کا ایوارڈ محمد علی کو ملا۔
3۔ بہترین صدابند کا ایوارڈ اختر جیلانی کو ملا۔
4۔ بہترین معاون اداکار کا ایوارڈ اسلم پرویز کو ملا۔

URDUNOVELS.COM

''انصاف اور قانون'' شباب پروڈکشنز کی ایک اور معرکۃ الآراء فلم تھی جو 1971ء میں سلور اسکرین کی زینت بنی تھی۔ اس کے فلم ساز اے حمید، ہدایت کار شباب کیرانوی، موسیقار ایم اشرف اور نغمہ نگار تسلیم فاضلی و شباب کیرانوی تھے۔ اس فلم میں بھی محمد علی اور زیبا کی اداکاری فن کی بلندیوں پر تھی۔ ان دونوں کی اداکاری کے انمٹ نقوش آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ اس فلم کی عمدہ ٹریٹمنٹ نے شباب کیرانوی کی اس فلم کو ایک یادگار فلم بنا دیا تھا جب کہ اس فلم کے گیتوں نے بھی اس فلم کی کامیابی میں خاص کردار ادا کیا تھا جو آج بھی روزِ اوّل کی طرح مقبول ہیں اور ان کی پسندیدگی میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ خاص طور پر یہ گیت

☆ سو برس کی زندگی میں ایک پل۔ تو اگر کرلے کوئی اچھا عمل (آواز: مہدی حسن۔ بول: تسلیم فاضلی۔ اس گیت کو نور جہاں نے بھی گایا تھا)

☆ تو اگر برا نہ مانے تجھے پیار میں سکھا دوں (آواز: احمد رشدی۔ بول: تسلیم فاضلی)

''انصاف اور قانون'' شباب صاحب کی چند اعلیٰ ترین فلموں میں ایک تھی اس کی اداکاری کا معیار بہت ہی بلند تھا۔ اس فلم میں بھی محمد علی نے ینگ ٹو اولڈ زبردست کردار نگاری کی تھی۔ محمد علی اور زیبا کے علاوہ اس فلم کی کاسٹ میں سنگیتا، زرقا، لہری، راشد، اسلم پرویز، زینت، فاخرہ، ریحان، اختر شاد، تانی، نیناں، آشا پوسلے، ایس ایم سلیم، سندھی فلموں کے نامور اداکار وسیم، کراچی ریڈیو اور ٹی وی کے سینئر صداکار رضوان واسطی شامل تھے۔ سبھی نے اپنے اپنے کردار بڑی خوبی سے نبھائے تھے۔ اس فلم نے بھی ''انسان اور آدمی'' کی طرح عوام اور خواص کو متاثر کیا تھا اور کامیابی حاصل کی تھی۔

شباب کیرانوی بہت زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن ان کا مشاہدہ بہت وسیع تھا اس لیے انہوں نے اچھی اور کامیاب فلمیں بنا کر پاکستانی فلمی صنعت میں اپنا ایک خاص مقام بنایا جہاں انہوں نے بہت اچھی اور معیاری فلمیں بنائیں وہاں فلم انڈسٹری سے اپنی انمٹ محبت کا ثبوت دینے کے لیے متعدد نئے آرٹسٹوں کو متعارف کرایا جو آگے چل کر بڑے فنکار ثابت ہوئے۔ جن میں ننھا، بابرہ شریف، غلام محی الدین، طلعت حسین، مسعود اختر اور طارق عزیز کے نام قابل ذکر ہیں۔ وہ اپنی بیشتر فلموں میں نئے چہرے ضرور پیش کرتے تھے۔ فلم کے بجٹ کو متوازن رکھنے کے لیے وہ بڑے اور نامور فنکاروں کے ساتھ چھوٹے اور نئے آرٹسٹوں کو کاسٹ کر کے فلم کے اخراجات میں کمی کرتے تھے۔ ان کے پروڈکشن ہاؤس سے چونکہ سال میں تین چار فلمیں ضرور ریلیز کی جاتی تھیں اس لیے آرٹسٹ اور ہنرمند چاہتے تھے کہ شباب صاحب کی گڈ بک میں ان کا نام درج رہے تاکہ وہ ان کی زیادہ سے زیادہ فلموں میں کاسٹ کیے جاتے رہیں۔ بڑے فنکار بھی کبھی ان سے معاوضے کے سلسلے میں سودابازی نہیں کرتے تھے۔ معاوضوں کی ادائیگی کے سلسلے میں بھی وہ کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے۔ ان کی احتیاط اور میانہ روی کے نتیجے میں ان کی ناکام فلموں کی تعداد کم اور کامیاب فلموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس دور میں جب تشہیر کے ذرائع کم تھے، شباب صاحب پرنٹ میڈیا کا خاص خیال رکھتے تھے، فلم اور شوبز سے متعلق جتنے بھی چھوٹے بڑے اخبارات و جرائد تھے ان میں بڑی باضابطگی سے اشتہار دیا کرتے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی نئی فلم شروع کرتے تو اس کا اشتہار سب کو ارسال کرتے اور پھر اس کی نمائش کے وقت دوسرا اشتہار دیتے اور ان کی ادائیگی بروقت کر دیتے تھے۔ اس طرح ان کی ہر فلم کی پبلسٹی ٹھیک ٹھاک طریقے پر ہو جاتی تھی۔

1972ء میں شباب پروڈکشنز کے بینر تلے چار فلمیں بنائی گئیں۔ ان چاروں فلموں کی ڈائریکشن شباب کیرانوی نے دی۔ یہ فلمیں افسانہ زندگی کا، بازار، دل ایک آئینہ اور من کی جیت تھیں۔ ''افسانہ زندگی کا'' رنگین فلم تھی۔ اس کے فلم ساز اے حمید تھے اور موسیقار ایم اشرف۔ یہ فلم بھی معیار کے لحاظ سے اوّل درجے کی تھی۔ یہ فلم 7 جنوری 1972ء کو ریلیز ہوئی۔ محمد علی اور زیبا نے اس فلم میں اعلیٰ کردار نگاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی دیگر کاسٹ میں فرح جلال، زینت اور ریحان قابل ذکر تھے۔ اس فلم نے گولڈن جوبلی کی تھی۔ اس کے گانے بھی مقبول ہوئے تھے جن میں چند یہ بھی ہیں۔

☆ زندگی کے سفر میں اکیلے تھے ہم۔ آپ جیسا ہمیں مہرباں مل گیا (آوازیں: احمد رشدی، نور جہاں)

☆ سن میری بٹیا سن میری رانی۔ غم کا فسانہ غم کی کہانی (آواز: نور جہاں)

☆ دل میں محبت ہے لیکن۔ کہتے ہوئے کیوں شرماتے ہو (آواز: مہدی حسن)

''بازار'' کے فلم ساز بھی اے حمید تھے اور موسیقی بھی ایم اشرف کی تھی۔ نشو، سنگیتا، عادل، طالش اور عمران اس فلم

UUNOVELS.COM

کے نمایاں ستاروں میں شامل تھے۔ عمران کی یہ پہلی فلم تھی۔

''دل ایک آئینہ'' 7 جولائی 1972ء کو ریلیز ہوئی تھی جو بین الاقوامی معیار کی فلم تھی۔ اس کے فلم ساز بھی اے حمید تھے اور موسیقار ایم اشرف۔ فلمی پنڈتوں کے خیال میں یہ فلم شباب صاحب کی ایسی فلم تھی جو ان کی فلموں میں ایک نمایاں حیثیت کی حامل شمار کی جائے گی۔ یہ ایک نفسیاتی موضوع پر بنائی گئی فلم تھی جس میں شائستہ قیصر نے ایک اہم ترین کردار ادا کر کے فلم کی کامیابی کو یقینی بنا دیا تھا۔ شائستہ قیصر کے علاوہ اس فلم میں شاہد، سنگیتا، تانی بیگم، صابرہ سلطانہ اور قوی نے کلیدی کردار ادا کیے تھے جب کہ محمد علی اور زیبا نے مرکزی کردار کیے تھے۔ ''دل ایک آئینہ'' کے گانے بھی مقبول ہوئے تھے۔ ان میں چند درج ذیل ہیں۔

☆ کسی نے ایک نظر میں دل چرا لیا ابھی ابھی
(آوازیں: مسعود رانا، رونا لیلیٰ)

☆ میری آہوں سے محبت کا جہاں جلنے لگا۔ یہ زمیں جلنے لگی اور آسماں جلنے لگا (آواز: رجب علی)

☆ میرے دل کی ہر تمنا (آواز: طاہرہ سید)

☆ تیرے چمن کی بہار (آواز: رونا لیلیٰ)

☆ جانِ من تجھ سے کیا (آواز: مہدی حسن)

اس سال شباب کیرانوی کی ڈائریکشن میں بننے والی چوتھی فلم ''من کی جیت'' تھی جو یکم دسمبر 1972ء کو نمائش پذیر ہوئی۔ اس کے فلم ساز بھی اے حمید اور موسیقار ایم اشرف تھے۔ ندیم، شبنم، اعجاز، سنگیتا، شاہنواز، فرخ جلال اور ننھا اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ اس فلم کے بیشتر گانے سپرہٹ ہوئے تھے۔ شباب صاحب کی ہدایت کاری بھی عمدہ اور معیاری تھی۔ اس فلم نے بھی کامیابی حاصل کی تھی۔

☆ تمہیں کیوں نہ چاہیں (آواز: ندیم۔ بول: شباب کیرانوی)

☆ دنوا دنوا میں گنوں کب آئیں گے سانوریا
(آواز: رونا لیلیٰ۔ بول: تسلیم فاضلی)

''پردے میں رہنے دو'' و ''دامن اور چنگاری'' 1973ء کی دو اہم فلمیں تھیں جن کی ہدایت کاری شباب کیرانوی نے کی تھی دونوں ہی فلمیں ہٹ ہوئی تھیں۔ دونوں فلموں کے فلم ساز اے حمید اور موسیقار ایم اشرف تھے۔ ''پردے میں رہنے دو'' کے ستارے رنگیلا، صاعقہ، صوفیہ بانو، زرقا اور منور ظریف تھے۔ یہ ایک نغماتی فلم تھی جس کے گیت بے حد پسند کیے گئے تھے۔ اس فلم میں اداکارہ صوفیہ بانو کی بہترین کردار نگاری پر بہترین معاون اداکارہ کا نگار ایوارڈ ملا تھا۔

''دامن اور چنگاری'' شباب کیرانوی کی اعلیٰ ترین فلم تھی جو 28 اکتوبر 1973ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کی کاسٹ میں محمد علی زیبا، عالیہ، ندیم، زرقا، منور ظریف، اسلم پرویز اور علاؤالدین شامل تھے۔ اس فلم نے اپنی کئی خوبیوں کی وجہ سے گولڈن جوبلی حاصل کی تھی۔ اس کے گانے بھی سپرہٹ ثابت ہوئے تھے۔

☆ سہیلی تیرا بانکپن لٹ گیا۔ آئینہ توڑ دے (آواز: نور جہاں۔ بول: قتیل شفائی)

☆ دیس پرائے جانے والے۔ وعدہ کر کے جانا
(آواز: نور جہاں۔ بول: شباب کیرانوی)

☆ ایک ہاتھ پہ سورج رکھ لو۔ ایک ہاتھ پہ چاند
(آواز: نور جہاں)

☆ یہ وعدہ کرو کہ محبت کریں گے۔ سدا ایک دوجے کے دل میں رہیں گے (آوازیں: مسعود رانا، نور جہاں۔ گیت: تسلیم فاضلی)

☆ بڑی بڑی آنکھیں میرے دل پر ستم ڈھائیں
(آواز: احمد رشدی۔ بول: مسرور انور)

☆ اصلی چہرے پر ہم نے بھی۔ نقلی چہرہ سجا لیا
(آواز: نور جہاں)

☆ ہمارے دل سے مت کھیلو۔ کھلونا ٹوٹ جائے گا
(آواز: مہدی حسن)

اس فلم کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ ندیم کی زیبا کے ساتھ یہ پہلی فلم تھی۔ اس فلم کا شمار شباب کیرانوی کی سدا بہار فلموں میں ہوتا ہے۔

1974ء میں بھی شباب کیرانوی نے اپنی بہترین ہدایت کاری کا ثبوت دیتے ہوئے ''آئینہ اور صورت'' جیسی فلم پیش کی تھی جس کی ہدایت کاری، اداکاری اور موسیقی نے بہت پذیرائی حاصل کی تھی۔ اس فلم کے فلم ساز بھی اے حمید تھے اور موسیقی بھی ایم اشرف کی تھی۔ محمد علی، شبنم، علاؤالدین اور اسلم پرویز نے اس فلم میں اپنی سپر کلاس اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ محمد علی کو اس فلم کی پرفارمنس پر سال کے بہترین اداکار کا نگار ایوارڈ ملا تھا۔

اگلے برس 1975ء میں شباب پروڈکشنز کی دو فلمیں منظر عام پر آئی تھیں۔ یہ دو فلمیں ''بے مثال'' اور ''میرا نام ہے محبت'' تھیں۔ دونوں کی ہدایت کاری شباب

UUNOVELS.COM

صاحب نے کی تھی۔ دونوں کے فلم ساز اے حمید اور موسیقار ایم اشرف تھے۔ دونوں ہی فلمیں بے مثال اور ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔

''بے مثال'' کی کاسٹ میں محمد علی، شبنم، علاؤ الدین، صابرہ سلطانہ اور علی رضا شامل تھے جب کہ دوسری فلم ''میرا نام ہے محبت'' کے کہانی نویس بھی شباب کیرانوی تھے اور اس کے سپر ہٹ گانوں کے خالق جواں سال نغمہ نگار تسلیم فاضلی تھے جب کہ اس کی کاسٹ میں بابرہ شریف اور غلام محی الدین کی یہ پہلی فلم تھی۔ شباب صاحب نے ایک امریکی ناول ''لو اسٹوری'' سے متاثر ہو کر اس فلم کی کہانی لکھی تھی۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس فلم کے لیے پہلے ندیم اور دیبا کا انتخاب کیا گیا تھا لیکن ندیم نے دیبا کے ساتھ کام کرنے سے معذرت کی تو شباب صاحب نے ندیم کو بھی ڈراپ کر دیا اور یوں سمجھیے کہ ضد کے طور پر بالکل نئے جوڑے کو لے کر فلم بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ شباب صاحب نے بابرہ شریف اور غلام محی الدین کو لے کر ''میرا نام ہے محبت'' بنائی اور ریلیز کر دی مگر تماشائیوں کی جانب سے پہلے ہفتہ کوئی رسپانس نہ مل سکا۔ فلم دیکھنے والوں کی اکثریت نے یہ سوچ کر اس فلم کی طرف توجہ نہیں دی کہ نئے ہیرو اور نئی ہیروئن نے کیا اداکاری کی ہو گی۔ کچھ لوگوں نے تو یہاں تک کہا۔

''شباب صاحب کا یہ جذبہ ضرور اچھا ہے کہ وہ اپنی فلموں میں نئے چہرے متعارف کراتے ہیں مگر مرکزی کردار تو بڑے اور مستند فنکاروں سے کرانا چاہیے۔''

شباب صاحب کو جب اس بات کا علم ہوا کہ نئے رومانوی پیئر کی وجہ سے اس فلم پر تماشائی توجہ نہیں دے رہے ہیں تو انہیں تھوڑا سا پچھتاوا بھی ہوا اور انہوں نے سوچا۔

''واقعی مجھے اتنا بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا اگر اتنی اچھی کہانی پر بنائی گئی اتنی خوب صورت فلم ناکام ہو گئی تو اس کا ذمے دار میں...... اور...... صرف میں ہوں گا۔''

وہ صابر و شاکر انسان تھے۔ انہوں نے آگے کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ اب جو کچھ ہو گا میرے مولا کی مرضی اور رضا کے مطابق ہی ہو گا۔

اور وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ نیک نیتی سے کیا ہوا کوئی کام رائیگاں نہیں جاتا۔ اللہ تعالیٰ اس کا انعام ضرور دیتے ہیں۔ کچھ بھولے بھٹکے لوگ جو ٹکٹ خرید کر یہ فلم دیکھنے چلے گئے تھے۔ وہ فلم دیکھ کر باہر نکلے تو انہوں نے اس فلم کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔

''ارے یار! اتنی اچھی فلم ہے کہ مت پوچھو۔''

''شباب صاحب نے تو اس بار کمال ہی کر دیا۔ اتنی پیاری فلم بنائی ہے کہ......''

''اور نئے جوڑے نے بھی اتنی زبردست پرفارمنس دی ہے کہ......''

اور پھر اخبارات میں جب اس فلم کے تبصرے شائع ہوئے تو اس نے گویا شہرت آسمان پر پہنچ گئی۔ ناقدین اور مبصرین نے اس فلم کو ان کی کامیاب ترین فلم قرار دیا اور نئے جوڑے کو زبردست خراج تحسین پیش کیا جن کی اداکاری نے کسی لمحہ بھی یہ سوچنے کی مہلت نہیں دی کہ وہ نئے پرفارمر ہیں۔ اچھی اداکاری، اچھی ہدایت کاری، اچھی کہانی، اچھی موسیقی اور گیتوں نے اس فلم کو سپر کلاس بنا دیا ہے۔

اس کے بعد تماشائیوں کا ہجوم سینما گھروں کی طرف بڑھا تو اسے روکنا محال ہو گیا۔ تقسیم کار ادارہ جو اس فلم کو ڈبوں میں بند کرنے کا ارادہ کر رہا تھا اسے مزید سینما گھروں کا بندوبست کرنا پڑا۔ پورے ملک میں اس نے زبردست بزنس کیا۔ اس کی مقبولیت نے بیرونی ممالک کے تقسیم کاروں کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا۔ چین جو پاکستان کا دیرینہ دوست ملک ہے اور جہاں اکثر پاکستانی فلمیں دکھائی جاتی ہیں وہاں چینی زبان میں ڈب کر کے یہ فلم دکھائی گئی تو وہاں بھی اس فلم نے فقید المثال کامیابی حاصل کی۔ چینی عوام اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے چین کے بڑے شہروں میں بابرہ شریف اور غلام محی الدین کے مجسمے بنا کر شاہراہوں پر نصب کیے۔ اس فلم کے گانے بھی بہت مقبول ہوئے جن کی پسندیدگی آج بھی برقرار ہے۔ یہ فلم اگست 1975ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

☆ تجھے پیار کرتے کرتے میری عمر بیت جائے

☆ یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہمدم۔ کہانی محبت کی زندہ رہے گی

☆ آتے جاتے ملتے جلتے رہیے گا۔ آنکھ ملی ہے ایک نہ ایک دن۔ دل بھی مل جائے گا اپنا۔

اور دیگر خوب صورت گیتوں نے بھی اس فلم کی پسندیدگی میں اہم کردار ادا کیا۔ بابرہ شریف اور غلام محی الدین نے اپنی لاجواب اداکاری کی وجہ سے اپنی پہلی ہی فلم سے اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔ اس فلم کی وجہ سے پاکستانی فلموں کو غلام محی الدین جیسا پاور فل اداکار اور بابرہ

URDUNOVELS.COM

شریف جیسی وراسٹائل اداکارہ نصیب ہوئی۔

شباب کیرانوی کی اس معرکۃ الآرا فلم کو 7 نگار ایوارڈز سے نوازا گیا۔

بہترین فلم کا ایوارڈ۔ بہترین ہدایت کار کا ایوارڈ۔ بہترین کہانی نویس کا ایوارڈ شباب کیرانوی۔ بہترین موسیقار کا ایوارڈ۔ بہترین تدوین کا ایوارڈ۔ اسپیشل ایوارڈ بطور اداکارہ بابرہ شریف۔ اسپیشل ایوارڈ بطور اداکار غلام محی الدین۔

شباب صاحب کی اگلی فلم ''دیوار'' تھی جو 1976ء میں ریلیز ہوئی اور ناکام ثابت ہوئی۔ اس فلم کے پروڈیوسر بھی اے حمید، ہدایت کار شباب کیرانوی اور موسیقار ایم اشرف تھے۔ اس فلم میں بھی بابرہ شریف اور غلام محی الدین کا رومانوی پیئر تھا مگر فلم کی کامیابی میں اس نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ غالباً کہانی بہت کمزور تھی اس لیے یہ فلم فلاپ ہوگئی۔

اسی سال 1976ء میں ان کی دوسری فلم ''انسان اور فرشتہ'' تھی جس میں انہوں نے ٹیلی ویژن کی نامور اداکارہ روحی بانو کو پہلی بار فلمی اداکارہ بننے کا موقع دیا تھا۔ وہ بھی کامیاب ہوئیں اور فلم نے بھی سلور جوبلی کامیابی حاصل کی۔

1976ء ہی میں شباب کیرانوی کی ایک اور فلم ''نشیمن'' ریلیز ہوئی۔ اس کے فلم ساز بھی اے حمید اور موسیقار ایم اشرف تھے۔ کاسٹ میں محمد علی، بابرہ شریف، اسلم پرویز، نرالا اور ننھا شامل تھے۔ اس فلم نے درمیانے درجے کی کامیابی حاصل کی تھی۔

اگلے برس 1977ء میں شباب پروڈکشنز کے بینر تلے ایک فلم ''محبت ایک کہانی'' 11 فروری کو ریلیز ہوئی۔ اس کے فلم ساز و ہدایت کار شباب کیرانوی تھے اور موسیقی حسب معمول ایم اشرف نے ترتیب دی تھی۔ ندیم، کویتا، مسعود اختر، امبر، نیر سلطانہ، اسلم پرویز اور ننھا اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ اس فلم نے کامیاب بزنس کیا تھا۔

''شمع محبت'' بھی اسی سال کی فلم تھی۔ اس کے فلم ساز اور ہدایت کار بھی شباب کیرانوی ہی تھے اور موسیقی ایم اشرف کی تھی۔ اس کی کاسٹ میں شبنم، شاہد، غلام محی الدین، ننھا اور تمنا شامل تھے۔ اس فلم کے گانے بھی مقبول ہوئے تھے۔ جن میں یہ سرفہرست تھے۔

☆ تو شمع محبت ہے میں ہوں تیرا پروانہ

☆ میں چھپا سکوں گا کیسے تیرے پیار کو جہاں سے

فلم ساز و ہدایت کار کی حیثیت سے ''سہیلی'' شباب کیرانوی کی اگلی فلم تھی جو 1978ء میں شباب پروڈکشن کے بینر تلے ریلیز کی گئی تھی اور اس نے گولڈن جوبلی کامیابی حاصل کی تھی اس کی کاسٹ میں شبنم، وحید مراد، رانی اور غلام محی الدین نے کلیدی کردار کیے تھے۔ یہ فلم اس لیے اہم شمار کی جاتی ہے کہ اس میں ایک طویل وقفے کے بعد شبنم اور وحید مراد یکجا ہوئے تھے۔ اس وقفے کی وجہ دراصل یہ تھی کہ شبنم کے شوہر روبن گھوش نے یہ پابندی لگا رکھی تھی کہ شبنم وحید مراد کے ساتھ کام نہیں کرے گی کیونکہ ان کے خیال میں وحید مراد اپنی ہیروئنوں کے ساتھ بڑے فری ہو جاتے تھے اور یہ بات روبن گھوش کو پسند نہیں تھی مگر اس بات کو غلط قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ وحید مراد گانا پکچرائز کرا رہے ہوں یا جذباتی و رومانوی سین فلم بند کرا رہے ہوں تو اپنی اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا کرتے تھے۔ بہرحال یہ پابندی یوں ختم ہوئی کہ شباب صاحب نے روبن گھوش کو یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے جو تم سوچتے ہو اور تم میری اس فلم کی شوٹنگ کے وقت سیٹ پر موجود رہنا، پوری فلم انڈسٹری شباب صاحب کی عزت اور احترام کرتی تھی۔ روبن گھوش ان کی یقین دہانی پر رضامند ہوگئے۔

اس فلم کو وحید مراد اور شبنم کے چاہنے والوں نے بڑے شوق سے دیکھا اور کامیاب کرایا۔ ''سہیلی'' کے یہ گیت بھی پسند کیے گئے اور انہوں نے اس فلم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ گیت شباب کیرانوی کے تحریر کردہ تھے۔

☆ آنکھیں غزل ہیں آپ کی۔ اور ہونٹ ہیں گلاب

☆ آواز وہ جادو سا جگاتی ہوئی آواز (آواز: اسد امانت علی خان)

☆ اللہ تیری شان یہ اپنوں کی ادا ہے (آواز: ناہید اختر)

☆ یہ دل ہے تمہارا ہمارا نہیں (آواز: ناہید اختر)

☆ بے وفا دیکھ چکے ہم تو (آواز: ناہید اختر)

1978ء کی ایک اور فلم ''انمول محبت'' تھی جو 13 اکتوبر کو ریلیز ہوئی تھی۔ اس نے سلور جوبلی کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کے فلم ساز و ہدایت کار شباب کیرانوی تھے اور یہ شباب پروڈکشنز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ ایم اشرف کی دھنوں پر گیتوں نے پسندیدگی حاصل کی تھی۔ شبنم، ندیم، ننھا، شاہنواز، مسعود اختر اور اسلم پرویز نے اس فلم میں اہم کردار ادا کیے تھے۔

''وعدے کی زنجیر'' شباب پروڈکشنز کی اگلی تخلیق تھی

URDUNOVELS.COM

جس کے فلم ساز و ہدایت کار شباب کیرانوی، کہانی نویس ستار طاہر، مکالمہ نگار ریاض الرحمٰن ساغر، موسیقار ایم اشرف اور نغمہ نگار تسلیم شفائی تھے۔ اس فلم کی کاسٹ میں انجمن، محمد علی، وحید مراد، صبیحہ خانم، مسعود اختر، علی اعجاز، شہلا گل، ننھا، غزل سبحان، بندیا، تمنا اور چکرم شامل تھے۔ اداکارہ انجمن کی یہ پہلی اردو فلم تھی۔ یہ فلم 2 فروری 1979ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی اور اس نے سلور جوبلی منائی تھی۔

''دوراستے'' بھی فلم ساز و ہدایت کار شباب کیرانوی کی فلم تھی جو اسی سال 23 مئی 1979ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ موسیقار ایم اشرف ہی تھے۔ اس کے کئی گیت مشہور بھی ہوئے تھے۔ ممتاز، ندیم، شاہد، انجمن، علی اعجاز، ننھا اور رنگیلا اس فلم کے نمایاں آرٹسٹوں میں شامل تھے۔ شباب صاحب کی یہ فلم کوئی رنگ نہ جما سکی۔ تماشائیوں کو متاثر نہ کر سکی۔

''دامن'' 1980ء میں ریلیز ہونے والی شباب کیرانوی کی فلم تھی جس کے موسیقار ایم اشرف ہی تھے۔ اس کی کاسٹ میں بابرہ شریف، آصف رضا میر، علی اعجاز، نیر سلطانہ اور اسلم پرویز شامل تھے۔ شباب صاحب کی یہ فلم بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

1981ء میں شباب پروڈکشنز کی دو فلمیں ''لاجواب'' اور دوسری فلم ''یہ زمانہ اور ہے'' ریلیز ہوئیں اور دونوں نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ دونوں فلموں کے فلم ساز و ہدایت کار شباب کیرانوی اور موسیقار ایم اشرف تھے۔ دونوں فلموں کے گانے پاپولر ہوئے تھے۔

''لاجواب'' کی کاسٹ میں ندیم، بابرہ شریف، تانی بیگم، جمیل فخری اور شجاعت ہاشمی شامل تھے جب کہ ''یہ زمانہ اور ہے'' میں بابرہ شریف، ایاز، فیصل الرحمٰن، تانی بیگم، ممتاز، ساقی اور جمیل فخری نے اہم کردار ادا کیے تھے۔

1982ء میں شباب پروڈکشنز کے بینر تلے ریلیز ہونے والی فلم ''ایک دن بہو کا'' بہت پسند کی گئی جس کے فلم ساز و ہدایت کار شباب کیرانوی اور موسیقار ایم اشرف تھے۔ اس کی کاسٹ میں بابرہ شریف، ایاز نائیک، تانی بیگم، بازغہ، بندیا، ننھا اور جمیل فخری شامل تھے۔ یہ فلم خواتین فلم بینوں میں بہت پسند کی گئی جبکہ شباب کیرانوی کی بطور ہدایت کار یہ آخری فلم تھی۔ ''جلن'' سے ''ایک دن بہو کا'' تک ان کی فلمی مصروفیت کا عرصہ 30 برسوں پر محیط ہے۔ اس دوران انہوں نے 75 کے قریب فلمیں بنائیں جن میں بطور فلم ساز ہدایت کار کہانی نویس، مکالمہ نگار اور نغمہ نگار سب شامل ہیں۔

شباب کیرانوی نے 50 سے زائد فلموں کے گیت بھی لکھے۔ ان کے تحریر کردہ نغمے زیادہ تر ہٹ ہوئے۔ شباب صاحب اپنی فلموں کا اسکرپٹ بھی خود لکھتے تھے جو فلم کی بنیادی چیز ہوتی ہے۔

فلم ساز، ہدایت کار اور نغمہ نگار شباب کیرانوی بہت سی خوبیوں اور اچھائیوں کے مالک تھے۔ وہ حافظ قرآن اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ اپنے ابتدائی دور میں ماہ رمضان میں نماز تراویح سے بھی ایک عرصے تک بہرہ مند ہوتے رہے۔ قرأت کے ساتھ کلام پاک کی تلاوت بھی کرتے تھے۔ ان کے دو بیٹے ظفر شباب اور نذر شباب بھی فلم انڈسٹری سے منسلک رہے انہوں نے بطور ہدایت کار بڑی عمدہ اور معیاری فلمیں بنائیں۔ شباب صاحب کی ایک صاحبزادی معروف اداکارہ زینت بیگم کے صاحبزادے جبار سے بیاہی گئی تھیں۔

شباب صاحب فلمی کاروبار میں بھی دیانتداری کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔ ان کی ترقی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ وعدے کے پکے اور کھرے انسان تھے۔ اداکاروں اور ہنر مندوں کو معاوضے کے سلسلے میں بھی ان سے کسی قسم کی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر ایک کا معاوضہ بلا حیل وحجت وقت سے پہلے ادا کر دیا کرتے تھے۔ وہ ہماری فلم انڈسٹری کے واحد فلم ساز تھے جن کی ہر مہینے ایک دو فلمیں ضرور ریلیز ہوا کرتی تھیں اور کامیاب بھی ہوتی تھیں۔ ان کی ناکام ہونے والی فلموں کی تعداد کم ہے جب کہ کامیابی سے ہمکنار ہونے والی فلموں کی تعداد زیادہ ہے۔ شباب صاحب کے انتقال پر ملال کے بعد بھی ایک فلم بطور فلم ساز ان کے نام سے ریلیز ہوئی تھی۔ یہ پنجابی فلم ''حیدر خان'' تھی جس کے فلم ساز شباب کیرانوی، ہدایت کار یونس راٹھور اور موسیقار ایم اشرف تھے۔ یہ فلم 1985ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔

شباب کیرانوی مختصر علالت کے بعد 5 نومبر 1982ء کو اس جہان رنگ وبو سے رخصت ہو گئے اور اپنے پیچھے ایک سنہری تاریخ چھوڑ گئے اور اپنے ذاتی اسٹوڈیو شباب اسٹوڈیو میں آسودۂ خاک ہوئے۔ یاد رہے کہ ان کی والدہ بھی اسی اسٹوڈیو میں مدفون ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، آمین!

☆......☆

شباب کیرانوی کی طلب، ان کی جستجو، محنت، مشقت

UJUNOVELS.COM

اور جدوجہد جتنی تھی اسی اعتبار سے ان کی جھولی بھری گئی۔ انہیں کامیابی دی گئی۔ عزت، شہرت اور دولت سے نوازا گیا مگر سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پرورش پانے والے ظفر شباب کی زندگی میں باپ جیسی آب وتاب نہیں تھی۔ شباب صاحب نے اپنے کام اور پیشے میں اپنے بیٹوں کو بھی لگایا تھا کہ وہ اس صنعت میں سے فائدہ اٹھائیں مگر ظفر شباب نے اس ضمن میں ان کی خواہش کے مطابق زیادہ مستعدی وتیزی نہیں دکھائی اس لیے انہوں نے فلم انڈسٹری میں اپنے والد شباب کیرانوی اور بھائی نذر شباب کی طرح اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا نہیں منوایا۔ تمام سہولتیں موجود ہونے کے باوجود کم فلمیں بنائیں اور کم کامیابیاں حاصل کیں۔

ظفر شباب نے اپنی 18 سالہ ہدایت کاری کے دوران 23 اردو اور دو پنجابی فلمیں بنائیں جن میں چند فلموں نے قابل ذکر کامیابی حاصل کیں باقی واجبی رہیں یا ناکام ہو گئیں۔ ''سنگدل'' ظفر شباب کی ہدایات میں بننے والی پہلی فلم تھی جس نے گولڈن جوبلی کامیابی حاصل کی تھی مگر اس کامیابی کے پس منظر میں ندیم، شباب کیرانوی، ایم اشرف اور خواجہ پرویز تھے۔ ندیم کی مغربی پاکستان میں یہ پہلی فلم تھی۔ کہانی شباب کیرانوی کے زور قلم کا نتیجہ تھی اور تماشائیوں کے مزاج کے مطابق تھی۔ ایم اشرف نے جاندار دھنیں کمپوز کی تھیں۔ خواجہ پرویز اور شباب صاحب کے گیت دلوں میں اتر جانے والے تھے اس لیے یہ فلم معیار اور کاروبار کے لحاظ سے کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ یہ فلم 2 جنوری 1968ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ 51 ہفتے چل کر اس نے گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ اس کی کاسٹ میں ندیم، دیبا، روزینہ، کمال ایرانی، ننھا، صاعقہ، زینت، مسعود اختر اور نگیلا شامل تھے۔ یہ ایک گھریلو میوزیکل رومانٹک فلم تھی۔

''بھروسا'' ظفر شباب کی ہدایت کاری میں بننے والی ایک اور کامیاب فلم تھی جو 1977ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔ یہ عید الفطر کا موقع تھا مگر دلچسپ بات یہ تھی کہ اس فلم کی کوئی پبلسٹی نہیں کی گئی تھی۔ تقسیم کار ادارہ کاشف فلمز نے کراچی اور سندھ سرکٹ میں اسے نمائش کے لیے پیش کیا تھا پبلسٹی نہ ہونے کے باوجود اس فلم کی عوامی پذیرائی کو دیکھتے ہوئے کراچی کے سینما مالکان نے کاشف فلمز کے مالکان سے درخواست کی کہ روزانہ ایک اضافی شو گیارہ بجے چلانے کی اجازت دیں مگر تقسیم کار نے اجازت نہیں دی۔ البتہ دوسرے ہفتے میں ان تمام سینماؤں کو فلم مل گئی۔ کاشف فلمز نے جانے کیوں ''بھروسا'' پر بھروسا نہیں کیا اور 72 ویں ہفتے میں اسے اتار دیا۔ اگرچہ ''بھروسا'' بڑی آسانی سے مزید تین ہفتے چل کر پلاٹینم جوبلی کرسکتی تھی۔ ''بھروسا'' کی کامیابی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ایک طویل وقفے کے بعد محمد علی کی کوئی فلم نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اس کی کامیابی میں محمد علی کے پرستاروں کا بڑا حصہ تھا۔

اسی طرح ظفر شباب کی فلم ''آواز'' جو 1978ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ کاشف فلمز نے اس فلم کے ساتھ بھی بڑا نامناسب رویہ اختیار کیا تھا اور اسے 91 ہفتے چلنے کے بعد اتار دیا اور سو ہفتے مکمل کرنے کا موقع نہ دے کر اسے ڈائمنڈ جوبلی کے اعزاز سے محروم کردیا۔ ''آواز'' کی کہانی، موسیقی، اداکاری کے علاوہ ہدایت کاری نے بھی اس فلم کی پسندیدگی میں اضافہ کیا تھا۔

ہدایت کار ظفر شباب کی فلم ''ترانہ'' ایک سپر کلاس میوزیکل فلم تھی جو 9 مارچ 1979ء میں سینما گھروں کی زینت بنی تھی اور کراچی کے 19 اور حیدرآباد کے 4 سینما گھروں میں ایک ساتھ دکھائی جارہی تھی اور کامیابی سے اس کی نمائش جاری تھی کہ کاشف فلمز نے اسے اس وقت اتار دیا جب یہ گولڈن جوبلی سے چند ہفتے دور تھی اس لیے گولڈن جوبلی سے محروم ہوگئی۔ ہاں کراچی کے نشیمن اور حیدرآباد کے ڈیلکس سینما گھروں نے اسے مارننگ شو کے طور پر اتوار کی صبح دکھانا شروع کردیا۔ یاد رہے کہ اس فلم سے پہلے صرف جمعہ کے دن مارننگ شو ہوا کرتے تھے۔

اداکارہ رانی نے ''ترانہ'' میں ڈبل رول ادا کیے تھے جب کہ ان کے مقابل وحید مراد اور غلام محی الدین تھے دیگر ستاروں میں ننھا، ظل سبحانی اور نیا چہرہ امجد شامل تھے۔

''وقت'' ظفر شباب کی ہدایات میں بننے والی ایک اچھی فلم تھی جو 1976ء میں ریلیز کی گئی تھی اس فلم کا ایک گانا ''دل توڑ کے مت جیو برسات کا موسم ہے'' سپرہٹ ہوا تھا۔ اسے تسلیم فاضلی نے لکھا تھا اور بابرہ شریف پر عکسبند ہوا تھا۔ شنید ہے کہ یہ گیت بھارتی فلم ''روٹی، کپڑا اور مکان'' کے مشہور گیت ''ہائے ہائے یہ مجبوری......'' کی مقبولیت سے متاثر ہوکر تسلیم فاضلی سے لکھوایا گیا تھا۔ یاد رہے کہ ''روٹی کپڑا اور مکان'' کے فلم ساز وہدایت کار منوج کمار تھے اور ان کا متذکرہ گیت آج بھی شوق سے سنا جاتا ہے اور ''وقت'' کا گیت بھی آج تک مقبول ہے۔ ''دل توڑ کے مت جیو برسات کا موسم ہے۔''

UUNOVELS.COM

ناہید اختر کی آواز میں صدا بند ہوا تھا۔ ''وقت'' کو متوقع کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس فلم میں وحید مراد کو جس گیٹ اپ میں پیش کیا گیا تھا وحید مراد کے پرستاروں کو وہ بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شمیم آراء کو وحید مراد کی ماں کے رول میں بھی تماشائیوں نے مسترد کر دیا تھا۔ اس لیے ''وقت'' کو بے وقت اتار دیا گیا۔ اس نے 24 ہفتے ہی مکمل کیے تھے۔ ایک اور ہفتہ چلا کر سلور جوبلی کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔

''میں بھی تو انسان ہوں'' ظفر شباب کی پہلی رنگین فلم تھی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ یہ فلم بھارتی فلم ''اسٹریٹ سنگر'' کا چربہ قرار دی گئی تھی۔ بابرہ شریف اس فلم کی ہیروئن تھیں۔ ان کی موجودگی کے باوجود یہ فلم ناکام ہو گئی۔

ظفر شباب کی ناکام فلموں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں ایک ایسی فلم بھی ہے جو مکمل طور پر امریکا میں بنائی گئی مگر فلاپ ہو گئی۔ یہ فلم ''وائٹ گولڈ'' تھی۔

''دامن کی آگ'' ظفر شباب کی ایسی فلم تھی جسے انہوں نے بڑے اہتمام سے بنایا۔ بڑے آرٹسٹوں کو کاسٹ کیا، کئی سپرہٹ گانے اس میں شامل تھے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر اسے کراچی کے 19 اور حیدرآباد کے 4 سینما گھروں میں ایک ساتھ نمائش کے لیے پیش کیا گیا مگر اس کے پہلے شو نے ہی تماشائیوں کو مایوس کیا اور ان کی جانب سے اسے فلاپ فلم قرار دے دیا گیا۔ کراچی کے کئی سائیڈ سینما گھروں میں تو یہ فلم پورے ہفتے بھی نہ چلی اور اسے اتار دیا گیا۔ یہ فلم جو بڑی دھوم دھام سے بنی تھی اور بہت شاندار انداز میں 1976ء کی جاندار فلم کی حیثیت سے ریلیز کی گئی تھی۔ بڑی مشکلوں سے 25 ہفتے مکمل کر سکی۔ محمد علی، شبنم، ندیم اور صاعقہ جیسے بڑے فنکاروں نے بھی اس فلم کو کامیاب کرانے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ یہ ایک ٹرائی اینگل لو اسٹوری پر مبنی فلم تھی جس کی موسیقی اور گانے بھی اچھے اور خوب صورت تھے مگر یہ فلم متوقع کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

''شکوہ'' بھی ظفر شباب کی ایسی فلم تھی جس میں محمد علی، دیبا، غلام محی الدین اور نشو جیسے ٹاپ کے پرفارمر تھے مگر یہ فلم بھی ناکامی سے دوچار ہوئی۔ یہ فلم بھی کراچی کے 19 سینما گھروں میں ایک ساتھ ریلیز کی گئی تھی اور اس کے تقسیم کار ایورریڈی پکچرز تھے۔ کاشف فلمز کو غالباً اس خیال سے یہ فلم نہیں دی گئی تھی کہ وہ فلموں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے مگر ڈسٹری بیوشن کی تبدیلی کے باوجود ظفر شباب کی قسمت نہیں بدلی۔ قیاس اغلب ہے کہ ظفر شباب کی تخلیقی صلاحیتیں اس معیار کی نہیں تھیں کہ وہ شباب کیرانوی اور نذر شباب کی طرح فلموں کی منصوبہ بندی کرتے۔ فلموں کی کامیابی کے سارے فارمولوں پر عمل درآمد کرتے۔ اپنی ڈائریکشن میں جان پیدا کرتے۔ بے شک فلم اجتماعی کوششوں سے بنتی ہے مگر ڈائریکٹر ان سب کا کپتان ہوتا ہے جس طرح فوج لڑتی ہے مگر سپہ سالار کی حکمت عملی فتح یا شکست کی ذمے دار ہوتی ہے اسی طرح تمام فنکاروں اور ہنر مندوں سے بہتر کام لینے والا ہدایت کار کامیاب ہوتا ہے اور جسے بہتر کام لینے کا ہنر نہیں آتا وہ ناکام ہوتا ہے اس تناظر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ظفر شباب فلم سازی کی تمام سہولتوں سے فیض یاب ہونے کے باوجود اس لیے متوقع کامیابی حاصل نہ کر سکے کہ وہ ذہنی اور سوجھ بوجھ سے کام لینے کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ ان کی ہدایت کاری میں بنائی گئی فلمیں درج ذیل ہیں۔

''سنگدل'' پہلی فلم (گولڈن جوبلی کی) ''درد'' (چار ہفتے چلی) ''آنسو بہائے پتھروں نے'' (ناکام فلم) ''میں بھی تو انسان ہوں'' (سلور جوبلی) ''نیا راستہ'' (سلور جوبلی) ''مسیحا جھوٹا'' (17 ہفتے چلی) ''قسمت'' (45 ہفتے چلی) ''شکوہ'' (23 ہفتے چلی) ''دامن کی آگ'' (سلور جوبلی) ''بیٹی'' (22 ہفتے چلی) ''بھروسا'' (72 ہفتے چلی) ''ایک چہرہ دو روپ'' (22 ہفتے چلی) ''آواز'' (91 ہفتے چلی) ''ترانہ'' (47 ہفتے چلی) ''آپ سے کیا پردہ'' (49 ہفتے چلی) ''آزمائش'' (25 ہفتے چلی) ''فاصلے'' (سلور جوبلی) ''آئینہ اور زندگی'' (28 ہفتے چلی) ''دیوانگی'' (66 ہفتے چلی) ''شادی مگر آدھی'' (56 ہفتے چلی) ''تیرے گھر کے سامنے'' (40 ہفتے چلی) ''مہک'' (27 ہفتے چلی) ''وائٹ گولڈ'' (22 ہفتے چلی) ''ساس میری سہیلی'' (27 ہفتے چلی)۔

ظفر شباب نے دو پنجابی فلموں ''رب دی شان'' اور ''کوچوان'' کی بھی ہدایت کاری کی۔ ظفر شباب کی چند فلموں کے کچھ مقبول گیت

☆ او سن لے او جان وفا (فلم سنگدل)

☆ مجھے کر دے نہ دیوانہ۔ ترے انداز مستانہ (فلم: نیا راستہ)

☆ خط پڑھ کے تیرا آدھی ملاقات ہو گئی (فلم: نیا راستہ)

UUNOVELS.COM

☆ دل توڑ کے مت جیو برسات کا موسم ہے (فلم: وقت)
☆ گرم گلابی شام ہے (فلم: بھروسا)
☆ تو میرے پیار کا گیت ہے (فلم: آواز)
☆ تیرے سنگ رہنے کی (فلم: ایک چہرہ دو روپ)
☆ کس کس کی نظر دیکھوں (فلم: جھک)

ظفر شباب کی آخری فلم ''ساس میری سہیلی'' 1987ء میں ریلیز ہوئی تھی جب کہ وہ عین عالم شباب میں 8 اگست 1994ء میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ انہیں بھی ان کے والد مرحوم شباب کیرانوی کے پہلو میں ان کے نگار خانے شباب اسٹوڈیو میں آسودۂ خاک کر دیا گیا۔

☆.....☆

اللہ کے حکم اور اس کی رضا سے شباب صاحب نے جو جدوجہد کی، آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے جو محنت کی ان کے فرزندوں کو ان دشوار گزار حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ محنت اور جدوجہد نہیں کرنی پڑی۔ ساری سہولتیں موجود تھیں۔ ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی وہ فلم اور فلم والوں سے واقف ہوتے رہے۔ فلم سازی کس طرح ہوتی ہے، فلم کس طرح بنائی جاتی ہے اور اس کے بعد کے مرحلے کس طرح طے کیے جاتے ہیں یہ سب کچھ انہوں نے بچپن اور لڑکپن سے دیکھا اور سیکھا۔ جوان ہوئے تو باپ کی سرپرستی میں باپ کا پیشہ اختیار کرنے میں کسی طرح کی دشواری پیش نہیں آئی۔ دونوں بیٹوں میں جس کی جتنی محنت، لگن اور دلچسپی تھی اس کو اتنا ہی ملا۔ ظفر شباب نے بھی مجموعی طور پر 25 فلمیں بنائیں اور نذر شباب نے بھی 25 فلمیں ہی تخلیق کیں مگر نذر شباب کا پلڑا بڑے بھائی سے زیادہ بھاری رہا۔ نذر شباب نے کامیاب فلمیں زیادہ بنائیں۔ ان کی فلموں میں پلاٹینیم اور ڈائمنڈ جوبلی فلمیں بھی شامل ہیں اور ناکام ہونے والی فلموں کی تعداد بہت کم ہے۔ جب کہ ظفر شباب کی چند ایک فلموں نے ہی گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کیا ناکام فلموں کی تعداد زیادہ ہے۔

نذر شباب نے ڈائریکشن شروع کرنے سے پہلے ایک فلم ''الف لیلیٰ'' کی کہانی لکھی تھی۔ یہ فلم یکم مارچ 1968ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اسے ظفر آرٹ پروڈکشنز کے بینر تلے ظفر شباب نے پروڈیوس کی تھی جب کہ اس کے ہدایت کار حیدر چودھری تھے۔ اس فلم کی موسیقی تصدق حسین نے مرتب کی تھی۔ ان کی بنائی ہوئی دھنوں پر کئی گانے مقبول ہوئے تھے۔

☆ اے دل نشیں مسافر ہم سے نظر ملا لے۔ جو تیرے ہو چکے ہیں اپنا انہیں بنا لے۔ اے دل نشیں مسافر (آواز: آئرن پروین۔ بول: مشیر کاظمی)

☆ ہم تجھے پیار کا افسانہ سنانے آئے۔ اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنانے آئے (آوازیں: آئرن پروین، احمد رشدی۔ بول: شباب کیرانوی)

''الف لیلیٰ'' کی کاسٹ میں کمال، غزالہ، زینت بیگم، حیدر چودھری، مشیر کاظمی اور نذر شباب شامل تھے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ اس فلم کے ہدایت کار، نغمہ نگار اور کہانی نویس نے بھی اس فلم میں بطور اداکار کام کیا تھا۔ اس تناظر میں نذر شباب کی فلموں میں انٹری خوشگوار کہی جا سکتی ہے۔

نذر شباب نے ڈائریکشن کی ابتداء پنجابی فلم سے کی۔ فلم کا نام تھا ''سجن بیلی''۔ اس کی کہانی عشرت رحمانی کی تحریر کردہ تھی جب کہ اس کے فلم ساز شباب کیرانوی تھے۔ موسیقار تصدق حسین کی کمپوز کی ہوئی دھنوں پر خواجہ پرویز، افتخار شاہد، اقبال چودھری نے گیت نگاری کی تھی اس کی کاسٹ میں رانی، عنایت حسین بھٹی، کیفی اور رخسانہ شامل تھے۔ یہ فلم 17 فروری 1970ء کو عیدالاضحیٰ کے دن لاہور سرکٹ میں نمائش پذیر ہوئی تھی اور اس نے درمیانے درجے کا بزنس کیا تھا۔ یعنی پہلی فلم ہونے کے باوجود قابل قبول فلم تھی۔ ظفر شباب کی پہلی فلم ''سنگدل'' سے مقابلہ کیا جائے تو کمتر تھی کیونکہ اس نے (سنگدل نے) گولڈن جوبلی کی تھی مگر یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اس فلم کو کامیاب بنانے میں ظفر شباب کا حصہ کم تھا اور دیگر عوامل زیادہ کارفرما تھے۔ جن میں سب سے اہم ندیم کی انٹری تھی۔ یہ ان کی لاہور میں بننے والی پہلی فلم تھی۔

عنایت حسین بھٹی نے ''سجن بیلی'' افتخار شاہد کا لکھا ہوا یہ گیت بڑی خوب صورتی سے گایا تھا جو مقبول بھی بہت ہوا۔

''سدا نہ بالیں بلبل بولے
سدا نہ باغ بہاراں
سدا نہ موج بہاراں''

نذر شباب کی اگلی فلم ''گرہستی'' تھی اور یہ ان کی پہلی اردو فلم تھی۔ اس کی کہانی ایس جمشیدی نے لکھی تھی۔ مکالمے ہارون پاشا نے تحریر کیے تھے۔ منظر نامہ شباب کیرانوی نے لکھا تھا۔ طافو اس فلم کے موسیقار تھے۔ طافو کی بھی یہ پہلی اردو فلم تھی۔ طافو ''گرہستی'' سے پہلے 16 فروری

1970ء میں ریلیز ہونے والی سپرہٹ پنجابی فلم ''انوارا'' سے اپنے کیریئر کا شاندار آغاز کر چکے تھے۔ طافو نے ''انوارا'' میں نور جہاں سے خواجہ پرویز کا لکھا ہوا یہ گیت ''پیارا ماہی دے مینوں پیارا لگدا اے'' گوایا تھا اور اسی کی طرز پر طافو نے فلم ''گرہستی'' میں فیاض ہاشمی سے گیت لکھوا کر مادام نور جہاں ہی سے گوایا۔

''مجھے تم بھول نہ جانا۔ کبھی نظریں نہ چرانا۔ تمہیں روکے گا زمانہ۔ دنیا کی لاج نبھانا''

''گرہستی'' ہی میں طافو نے مسعود رانا سے شاعر حزیں صدیقی کا یہ گیت گوایا۔ ''ہو، نہ جا میرے دلبر باسن لے تو دل کی صدا''

معلومات میں اضافے کی غرض سے یہ بات بتاتا چلوں کہ طافو نے اسی گانے کی طرز پر اقبال یوسف کی فلم ''جاسوس'' میں اے نیر اور ناہید اختر سے فیاض ہاشمی کا یہ دلکش ڈوئٹ گوایا تھا۔

ہو ہو ساتھی مجھے مل گیا مل گیا مل گیا
رسموں کو توڑیں گے دنیا کو چھوڑیں گے
دل نے کیا فیصلہ ہو ہو ساتھی مجھے مل گیا

بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ''کاریگر'' لوگ کس کس طرح اپنے ایک کامیاب ''آئیٹم'' کو بار بار استعمال کرتے ہیں۔

''گرہستی'' میں لہری نے فضل لانڈری ورکس کے مالک فضل دین کے کردار میں بڑی لاجواب اداکاری کی تھی۔ اس فلم میں سنتوش کمار، صبیحہ خانم، جمال، سنگیتا، اسلم پرویز، عالیہ، شاکر اور دلراج نے دیگر اہم کردار ادا کیے تھے۔ اس کے مہمان اداکاروں میں سیما، ریحان، زرقا اور سلطان راہی شامل تھے۔ نذر آرٹ پروڈکشن کے بینر تلے بننے والی یہ فلم اصلاحی اور معاشرتی موضوع پر مبنی تھی۔ 1971ء کی یکم جنوری کو نمائش پذیر ہوئی اس فلم نے بھی کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔

نذر شباب کی بطور ہدایت کار تیسری فلم ''رنگیلا اور منور ظریف'' تھی۔ یہ پاکستانی فلمی صنعت کی فلمی تاریخ میں اس وقت تک کی وہ پہلی فلم تھی جس کا نام دو کامیڈینز رنگیلا اور منور ظریف سے موسوم کیا گیا تھا۔ اس فلم کے فلم ساز شباب کیرانوی، موسیقار ایم اشرف اور نغمہ نگار مسرور انور تھے۔ یہ مکمل کامیڈی فلم تھی اور رنگیلا و منور ظریف پر ہی بنائی گئی تھی اس کے گیتوں نے دھوم مچا دی تھی۔

☆ نیا جادو کر دیا مستانی آنکھوں والے نے۔ (آواز: نور جہاں)

☆ کھڑکی سے دروازے سے۔ چلمن سے چوباروں سے۔ جھانکا نہ کرو (آواز: احمد رشدی)

☆ سا...... سانولا چہرہ۔ رے...... ریشم سی بانہیں۔ گا...... گاتی جوانی (آوازیں: احمد رشدی، رونا لیلیٰ)

☆ بارہ مہینوں کے بارہ ہیں رنگ۔ لوٹیں گے ان کا مزا سنگ سنگ (آوازیں: احمد رشدی، نیرہ نور)

یہ فلم لاہور سرکٹ میں 30 نومبر 1973ء کو ریلیز ہوئی جب کہ کراچی میں اسے 5 جنوری 1974ء بروز ہفتہ عیدالاضحیٰ کے دن ریلیز کیا گیا یہاں اس نے 37 ہفتے چل کر سلور جوبلی کیا۔ کراچی میں ''رنگیلا اور منور ظریف'' کے مقابلے میں اردو فلم ''دو بدن'' دکھائی جا رہی تھی جس کے مرکزی کردار ندیم اور شبنم تھے۔ اس کے باوجود ''رنگیلا اور منور ظریف'' نے ''دو بدن'' سے زیادہ اچھا بزنس کیا۔ اس فلم میں منور ظریف نے ڈبل رول کیا تھا۔ دوسرا کردار مختصر تھا۔ منور ظریف کی ہیروئن شائستہ قیصر تھیں، رنگیلا کی ہیروئن صاعقہ تھیں۔ علاؤ الدین اولڈ رول میں تھے۔ اسلم پرویز ولن تھے جب کہ ممتاز نے کلب ڈانسر کا یادگار کردار کیا تھا۔ اداکار نذر نے بھی ایک مختصر رول کیا تھا۔ بہت سے تماشائیوں کا خیال ہے کہ اس فلم کے اصل ہیرو منور ظریف تھے۔ وہی علاؤ الدین کے پہلے بیٹے بنے تھے اور علاؤ الدین پوری فلم میں ان کو تلاش کرتے رہے۔ آشا پوسلے نے بھی اس فلم میں ایک خاص کردار ادا کیا تھا۔ ''رنگیلا اور منور ظریف'' کا تقسیم کار ادارہ ایورریڈی پکچرز تھا۔ اس ادارے کا یہ اصول تھا کہ کوئی سینما ان کی کوئی نئی فلم لگاتا تو اس کو اس ادارے کی کوئی پرانی فلم بھی چلانا پڑتی تھی۔ اس طرح ''رنگیلا اور منور ظریف'' بار بار چلی۔

نذر شباب کی بطور ہدایت کار چوتھی فلم ''شمع'' 25 دسمبر 1974ء کو عیدالاضحیٰ کے دن ملک بھر کے تمام سرکٹوں میں ایک ساتھ ریلیز کی گئی۔ ''شمع'' کی کہانی کار شباب کیرانوی فلم ساز اے حمید، موسیقار ایم اشرف، نغمہ نگار تسلیم فاضلی تھے۔ یہ سوشل اور میوزیکل فلم شباب صاحب کی کامیاب فلم ''مہتاب'' کا ری میک تھی۔ ''مہتاب'' میں جو کردار علاؤ الدین، حبیب اور اسد بخاری نے کیے تھے۔ ''شمع'' میں محمد علی، وحید مراد اور ندیم نے ادا کیے جب کہ ''مہتاب'' میں جو کردار نیر سلطانہ، رخسانہ اور نغمہ نے ادا کیے تھے۔ ''شمع'' میں دیبا، بابرہ شریف اور زیبا نے پرفارم

کیے۔ ''شمع'' نے ملک گیر طور پر کامیابی حاصل کی۔ 65 ہفتے چل کر گولڈن جوبلی سے کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ناہید اختر کو اس فلم کے لیے یہ گیت گانے پر بہترین گلوکارہ کا نگار ایوارڈ ملا۔

کسی مہرباں نے آ کر میری زندگی سجا دی
میرے دل کی دھڑکنوں میں نئی آرزو جگا دی

اس فلم کے ان گیتوں نے بھی عوامی پذیرائی حاصل کی۔

☆ او میری سانولی سلونی محبوبہ۔ تیری جھیل جیسی آنکھوں میں میرا دل ڈوبا (آواز: مہدی حسن)

☆ ایسے موسم میں چپ کیوں ہو کانوں میں رس گھولو (آواز: ناہید اختر)

☆ نہ گھر سے نکلنا یوں زلفیں بکھیرے۔ اندھیروں میں چھپنے لگے ہیں سویرے (آواز: مہدی حسن)

☆ یہ تیرا آنا بھیگی راتوں میں چپکے چپکے (آواز: مہدی حسن)

نذر شباب کی ہدایات میں بننے والی پانچویں فلم ''نہ چھڑا سکو گے دامن'' تھی جو مکمل کامیڈی فلم تھی۔ یاد رہے کہ ہدایت کار قدیر غوری کی گولڈن جوبلی ہٹ فلم ''دامن'' کا سپرہٹ گانا تھا ''نہ چھڑا سکو گے دامن نہ نظر بچا سکو گے''

اس فلم ''نہ چھڑا سکو گے دامن'' کے کہانی نویس شباب کیرانوی نے قدیر غوری کی فلم کے سپرہٹ گیت سے اپنی فلم کا نام اخذ کیا تھا۔ اس فلم میں رنگیلا تو تھے مگر ان کے ساتھ منور ظریف کی جوڑی نہیں تھی۔ اس کے باوجود یہ فلم اچھی خاصی تھی مگر 14 مارچ 1975ء کو جب یہ فلم ریلیز ہوئی تھی تو اس کے مقابل جیمس بانڈ کی فلم کے علاوہ ''بن بادل برسات'' اور پنجابی فلم ''جادو'' نے دھوم مچا رکھی تھی، اس لیے تماشائیوں کی پذیرائی کا ہاتھ نذر شباب کے دامن تک نہ پہنچ سکا۔ دامن چھوٹنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جن دنوں یہ فلم ریلیز ہوئی تھی ان دنوں رنگیلا کے زوال کا دور شروع ہو رہا تھا۔ نذر آرٹ پروڈکشن کے بینر تلے بننے والی اس فلم کے فلم ساز اے حمید، موسیقار ایم اشرف اور نغمہ نگار تسلیم فاضلی تھے۔ اس فلم کے چند گانے مقبول بھی ہوئے تھے۔

☆ ونس اپان اے ٹائم ایک تھی جانِ غزل۔ جو ہو بہو آپ کی تھی ہم شکل (آواز: احمد رشدی)

☆ گلیوں میں بازاروں میں۔ باتیں تیرے میرے پیار کی (آواز: احمد رشدی)

☆ میرا دل تو ہو گیا تیرے حسن کا دیوانہ (آواز: تصور خانم)

اس کی کاسٹ میں رنگیلا، صاعقہ، زرقا، فرح جلال، نرالا، ساقی، فراز، ادیب، کمال ایرانی، چکرم اور علاؤالدین شامل تھے جب کہ مہمان اداکار کی حیثیت سے شاہد اور ریشماں نے بھی شرکت کی تھی۔ سپرہٹ فلم ''دامن'' کے سپرہٹ گیت کے نام پر بنائی گئی یہ فلم سپر فلاپ ثابت ہوئی۔ اس نے کراچی جیسے سرکٹ میں مجموعی طور پر صرف 19 ہفتے ہی مکمل کیے۔

عجیب اتفاق ہے کہ شباب کیرانوی کی نگرانی کے باوجود نذر شباب کی اس فلم نے مایوس کیا۔ اس سے پہلے ''شمع'' کے علاوہ نذر شباب کاروبار کے تناظر میں کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکے تھے۔ اگر نذر شباب کے سر پر شباب کیرانوی کا سایہ نہ ہوتا اور وہ عام ہدایت کار ہوتے تو وہ انڈسٹری سے مسترد کر دیے جاتے لیکن شباب کیرانوی کے فرزند ارجمند ہونے اور تمام تر سہولتیں موجود ہونے کی بنا پر ان کی سرپرستی اور تربیت جاری رہی اور انہیں اگلی فلم بنانے کا موقع دیا گیا۔ ان کی یہ فلم ''نوکر'' جو ان کی ڈائریکشن میں بننے والی چھٹی فلم تھی۔ نذر آرٹ پروڈکشن کے بینر تلے بننے والی اس فلم کے فلم ساز بھی اے حمید۔ موسیقار، ایم اشرف اور نغمہ نگار تسلیم فاضلی تھے۔ یہ بھی فل کامیڈی فلم تھی لیکن اس فلم کے لیے کسی سکہ بند کامیڈین کا سہارا نہیں لیا گیا تھا بلکہ ورسٹائل اداکار محمد علی کو تماشائیوں کے پیٹ میں بل ڈالنے کا ٹاسک دیا گیا تھا اور آفرین ہے اس فنکار پر کہ اس نے ایسی کامیڈی کی کہ نامور کامیڈینوں کے کان کتر دیے۔

دوستو! اس موقع پر یہ بتانا مقصود ہے کہ اچھے فلم ساز و ہدایت کار کا وژن اتنا دور بین ہوتا ہے کہ وہ اپنے مطلب کا ہر فنکار تلاش کر لیتا ہے۔ اس موقع پر شباب کیرانوی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ''نوکر'' کی کامیڈی کے لیے محمد علی کا انتخاب کرنا انہی کا کارنامہ ہے۔ نذر شباب کی نظر اس وقت اتنی بالغ نہیں ہوئی تھی کہ وہ ایسا اقدام اٹھاتے۔

اب ایک پس پردہ بات سے بھی اپنی معلومات میں اضافہ کیجیے کہ محمد علی کا یہ کردار ایک بھارتی فلم ''باورچی'' سے متاثر ہو کر تخلیق کیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ ''باورچی'' کے کچھ مناظر اس سے قبل فلم ''احساس'' میں بھی شامل کیے گئے تھے جب کہ ''امبر'' میں بھی ''باورچی'' کی جھلک موجود ہے۔

''نوکر'' کی کاسٹ میں محمد علی کے علاوہ زیبا، بابرہ

UUNOVELS.COM

شریف، صاعقہ، علی رضا، شاہ نواز کمسن، ننھا اور تمنا شامل تھے۔ ''نوکر'' عید قرباں کے دن 1975ء میں جب نمائش پذیر ہوئی تو اس کے مقابل ایس سلیمان کی فلم ''زنجیر'' بھی ریلیز کی گئی تھی جس میں ندیم اور شبنم نے لیڈنگ رول کیے تھے۔ اس لیے ''نوکر'' کو زبردست خطرہ تھا لیکن محمد علی کی شاندار اور جاندار کامیڈی سے بھرپور اداکاری نے ''نوکر'' کی کامیابی کا گراف بلند کر دیا اور اس نے حیرت انگیز طور پر سپرہٹ کامیابی حاصل کی اور ''زنجیر'' دوسرے نمبر پر رہی اور اپنی نمائش کے 68 ہفتے مکمل کر کے گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ اس موقع پر محمد علی کے پرستاروں کو سخت شکایت ہوئی تھی کہ اس کے تقسیم کار نے اسے پلاٹینیم جوبلی کرنے کا موقع نہیں دیا اور ''نوکر'' کو اتار کر دوسری فلم لگا دی۔ بہرحال ''نوکر'' نہ صرف اپنے فرسٹ رن میں کامیاب ہوئی بلکہ بعد میں بھی بار بار لگی اور ہر بار کامیاب رہی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ''نوکر'' نے حیدرآباد کے فردوس سینما میں اس دور میں عید ویک میں ڈیڑھ لاکھ کا بزنس کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔

یہ وہ دور تھا جب آج کی طرح سینما ٹکٹ پانچ سو اور ہزار روپے کے نہیں ہوتے تھے۔ فلم بینی صحیح معنوں میں سستی تفریح تھی۔ زیادہ سے زیادہ ٹکٹ کی قیمت پانچ سات روپے ہوتی تھی۔

تسلیم فاضلی نے ''نوکر'' کے لیے بھی عمدہ گیت نگاری کی تھی۔ مثلاً

☆ چاہے دنیا ہو خفا سنگ چھوڑوں نہ تیرا۔ یہ ہے میرا فیصلہ (آوازیں: مہدی حسن، ناہید اختر)

☆ اپنا جیون شیشے کا کھلونا ہی تو ہے۔ ہم کیوں نہ گائیں کیوں نہ مسکرائیں (آواز: مہدی حسن)

☆ یہ آج مجھ کو کیا ہوا لا لا لا۔ عجیب سا سرور ہے بدن نشے میں چور ہے (آواز: ناہید اختر)

☆ دل وہ بھی لڑکی کا۔ جس پر چاہے آجائے (آواز: ناہید اختر)

☆ چہرے پہ نہ زلفیں لہرانا۔ سورج کو گہن لگ جائے گا (آواز: مہدی حسن)

☆ لاکھ کرو انکار سسر جی رنگ لائے گا پیار۔ دلہن میں لے کے جاؤں گا (آواز: مہدی حسن)

یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ نذر شباب میں اپنے بڑے بھائی ظفر شباب کے مقابلے میں فنی صلاحیتیں زیادہ موجود تھیں اور انہیں سیکھنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ بھی زیادہ تھا۔ ان کے تجربے میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا ان کی کارکردگی نکھر کر سامنے آنے لگی۔ ''نوکر'' کی گولڈن جوبلی کامیابی نے ان کے حوصلے بڑھائے تو اپنی اگلی فلم ''شبانہ'' کو مزید کامیاب بنانے کے لیے اور زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ یہ ان کی ڈائریکشن میں بننے والی ساتویں فلم تھی جو نذر آرٹ پروڈکشن کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس کے فلم ساز اے حمید تھے۔ کہانی شباب کیرانوی نے تحریر کی تھی اور مکالمے ریاض الرحمان ساغر نے لکھے تھے۔ نغمہ نگار تسلیم فاضلی اور عکاس اظہر زیدی تھے۔ ''شبانہ'' کی کاسٹ میں وحید مراد، بابرہ شریف، شاہد، مسعود اختر، زرقا، ناظم، سیما، تمنا، کمال ایرانی اور ننھا شامل تھے۔ یہ فلم بیک وقت پورے پاکستان میں 12 نومبر 1976ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اس نے کراچی میں ایک سو ایک ہفتے چل کر ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ یہ فلم پنجاب سرکٹ میں بھی پسند کی گئی تھی۔ اس خوب صورت فلم کو پانچ نگار ایوارڈ ملے تھے۔

1۔ بہترین اداکارہ کا ایوارڈ بابرہ شریف کو ملا تھا۔
2۔ بہترین اداکار کا ایوارڈ شاہد کو ملا تھا۔
3۔ بہترین موسیقار کا ایوارڈ ایم اشرف کو ملا تھا۔
4۔ بہترین نغمہ نگار کا ایوارڈ تسلیم فاضلی کو ملا تھا۔
5۔ بہترین گلوکارہ کا ایوارڈ مہدی حسن کو ملا تھا۔

نذر شباب کی اس ڈائمنڈ جوبلی فلم کے گیت اپنے دور کے مقبول ترین گیت ثابت ہوئے جو اب بھی شوق سے سنے جاتے ہیں جن میں چند درج ذیل ہیں۔

☆ تیرے سوا دنیا میں کچھ بھی نہیں میرے صنم (مہدی حسن اور ناہید اختر نے الگ الگ گایا)

☆ جو درد ملا اپنوں سے ملا۔ غیروں سے شکایت کون کرے (آواز: مہدی حسن)

☆ بے وفا کون ہے کون ہرجائی ہے۔ فیصلہ آج محفل میں ہو جائے گا (آواز: مہدی حسن)

☆ یہ تیرا نازک بدن ہے یا کوئی مہکا گلاب (آواز: مہدی حسن)

''شبانہ'' کے بعد نذر شباب کی ایک اور کامیاب فلم ''سسرال'' بھی مگر اس نے ''شبانہ'' جیسی سپر کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔ بس گولڈن جوبلی تک ہی رہی تھی۔ یہ فلم بھی کامیڈی فلم کے زمرے میں شمار کی گئی تھی۔ اس فلم کا مرکزی کردار شاہد تھا جس پر پانچ گانے پکچرائز ہوئے تھے اور

UUNOVELS.COM

پانچوں مہدی حسن کی آواز میں تھے۔ اس کے دیگر آرٹسٹوں میں سنگیتا، کویتا، عثمان پیرزادہ، نیر سلطانہ، ننھا، نجمہ محبوب، ابراہیم نفیس، خالد سلیم موٹا اور مسعود اختر شامل تھے۔ نذر آرٹ پروڈکشن کے بینر تلے بنائی جانے والی اس فلم کے پروڈیوسر اے حمید، کہانی نویس شباب کیرانوی، نغمہ اور مکالمہ نگار ریاض الرحمن ساغر، عکاس اظہر زیدی تھے۔ اس فلم کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس فلم کا ایک گانا خود نذر شباب نے بھی تحریر کیا تھا جس کے بول تھے۔ ''ہم میں تم اور تم میں ہم کھو گئے''

اس فلم کے دیگر گیت جو ریاض الرحمن ساغر نے لکھے تھے ان میں چند یہ تھے اور یہ سارے شاہد پر عکسبند ہوئے تھے۔

☆ سہو بھانڈے قلعی کرالو۔ پرانے نوے کرالو۔ آ گیا شیدا قلعی گر (آواز: مہدی حسن)

☆ ارے میں کہتا ہوں دنیا میں پیار بڑی چیز ہے (آواز: مہدی حسن)

☆ دھما دھما دھو تڑک ہائے۔ سوہنے تیرے کالے کالے بال (آوازیں: مہدی حسن، رجب علی)

☆ چندہ میرے نی صوفیاں تے جوس چین والیے (آواز: مہدی حسن)

☆ پیار پیار پیار۔ ہو گیا ہے مجھے پہلی بار (آواز: ناہید اختر)

اس کے علاوہ نذر شباب کا تحریر کردہ گیت

☆ ہم میں تم اور تم میں ہم گم ہو گئے۔ ہوتے ہوتے ایک ہم تم ہو گئے (آواز: مہدی حسن ہمراہ ناہید اختر)

''سسرال'' گھریلو کامیڈی فلم تھی۔ اس کی کہانی شباب کیرانوی نے لکھی تھی اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شباب صاحب نے اپنی کامیاب فلم ''مہتاب'' کے کچھ مکالمے اس فلم میں بھی ڈالے ہیں۔ بہر حال یہ فلم کامیاب تو ہوئی مگر ''شمع'' یا ''شبانہ'' کی طرح کامیاب نہ ہو سکی اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ 28 اکتوبر 1977ء کو جب اسے سینما گھروں کی زینت بنایا گیا تو اسے اقبال کاشمیری کی نئی ایکشن فلم ''شاہین'' اور پرویز ملک کی کامیابی کا جھنڈا لہرانے والی فلم ''مہمان'' کا مقابلہ کرنا پڑا۔ وجہ کچھ بھی ہو ''سسرال'' اچھی فلم ہونے کے باوجود زیادہ اچھی فلم ثابت نہ ہو سکی اور کھینچ تان کر گولڈن جوبلی ہی کر سکی۔

نذر آرٹ پروڈکشن کی اگلی فلم ''نذرانہ'' تھی جسے شباب کیرانوی نے احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''فیشن'' سے ماخوذ کیا تھا۔ اس کے مکالمے ریاض الرحمن ساغر سے لکھوائے گئے تھے۔ نغمہ نگاری کی ذمے داری قتیل شفائی کو سونپی گئی تھی۔ موسیقی کی دھنیں ایم اشرف نے کمپوز کی تھی۔ کاسٹ میں رانی، وحید مراد، غلام محی الدین، نیلو، بندیا، علی اعجاز، رومانہ، ننھا، تمنا، سیما، مینا داؤد، حنیف، چکرم، مسعود اختر اور نیر سلطانہ شامل تھے۔

ایم اشرف نے اس فلم کے لیے بھی خوب صورت دھنیں بنائی تھیں۔ جن پر قتیل شفائی نے گیت بھی بڑے پیارے لکھے تھے۔

☆ بانٹ رہا تھا جب خدا۔ سارے جہاں کی نعمتیں (آوازیں: ناہید اختر، مہدی حسن)

☆ بھیگی بھیگی راتوں میں۔ یوں ہی باتوں باتوں میں (آواز: مہدی حسن)

☆ بے وفاؤں سے وفا نہ مانگیے۔ ان سے درد کی دوا نہ مانگیے (آواز: ناہید اختر)

''نذرانہ'' 9 جون 1978ء آل پاکستان ریلیز ہوئی تھی۔ اس نے کراچی میں فرسٹ رن میں مجموعی طور پر 33 ہفتے چل کر سلور جوبلی کامیابی حاصل کی تھی۔ دیگر سرکٹوں میں بھی اس نے درمیانے درجے کا کاروبار کیا تھا۔ مجموعی طور پر یہ فلم ناکام تو نہیں ہوئی تھی مگر خاصے بڑے اور مستند آرٹسٹوں کی موجودگی کے باوجود اس نے ''سسرال'' سے بھی کم عوامی پذیرائی حاصل کی تھی۔ اس موقع پر کچھ فلمی پنڈتوں نے کہا تھا۔ ادبی کہانیوں کو اپنانے کی بجائے فلم کے لیے خصوصی کہانیاں لکھی یا لکھوائی جائیں۔ ادبی کہانیوں میں فلمی مصالحے موجود نہیں ہوتے۔ ان میں جب فلمی مصالحے ڈالے جاتے ہیں تو کامیاب نہیں ہوتے۔ اس خیال میں کسی قدر سچائی بھی ہے۔ شباب صاحب کی یا ان کے صاحبزادوں کی جو فلمیں زیادہ کامیاب ہوئیں ان میں اکثریت ان کی ہے جن کی کہانیاں شباب صاحب نے خود لکھیں اور تمام تر کامیاب لوازمات کو پیش نظر رکھ کر لکھیں۔

نذر آرٹ پروڈکشن کی اگلی فلم ''خاموشی'' کے نام سے شروع کی گئی مگر یہ نام فلم کے ڈائریکٹر نذر شباب کو کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''بھئی! یہ نام تو مجھے کچھ جچ نہیں رہا ہے۔ بڑا روکھا سوکھا سا ہے۔''

''تو پھر تم ہی دسو، کیسا نام ہو۔''

''کہانی کے لحاظ سے تو......''

''ہاں ہاں...... بولو...... رک کیوں گئے۔''

UUNOVELS.COM

''چونکہ ایک بہن اور ایک بھائی کے گرد ساری کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔اس تناظر میں تو......''

''بہن بھائی ہی اس کا نام ہونا چاہیے۔''

''جی ہاں...... جی ہاں......بہن بھائی کتنا مناسب نام ہے اس کہانی کے لحاظ سے۔''

''چلو...... تمہیں پسند ہے تو ''بہن بھائی'' ہی رکھ لو اس کا نام۔''

اور ''خاموشی'' کی تکمیل کے ابتدائی دور میں ہی اس کا نام بدل کر ''بہن بھائی'' رکھ دیا گیا۔اس فلم میں رانی نے بہن اور محمد علی نے بھائی کا ٹائٹل رول کیا تھا۔ان کے ہمراہ وحید مراد، بندیا، ننھا اور تمنا نے دیگر اہم کردار کیے تھے۔اے حمید اس فلم کے پروڈیوسر اور کمال احمد موسیقار تھے۔کمال احمد کی موسیقی میں چند گیت مقبول بھی ہوئے تھے۔

☆ دو ساتھی جیون کے اک دوجے کا ساتھ نبھائیں گے (آوازیں: مہدی حسن، مہناز۔بول: سعید گیلانی)

☆ اس دنیا میں یار ہم تو رہے اناڑی۔قسم سے رہے اناڑی (آوازیں: غلام عباس، مہدی حسن)

☆ تیرا میرا پیار ذرا بھی ہوا کم۔دے دوں گی میں جان تیری قسم (آواز: ناہید اختر۔بول: قتیل شفائی)

☆ ہنستے ہنستے جینا، آنسو آنکھ میں نہ رکھنا۔تو سدا مسکرائے میری لاڈلی بہنا (آواز: مہدی حسن۔بول: قتیل شفائی)

یہ فلم 19 جنوری 1979ء کو پورے پاکستان میں ایک ساتھ ریلیز کی گئی تھی۔کراچی میں اس نے گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے مجموعی طور پر 51 ہفتے مکمل کیے تھے اور بہن بھائی کے کرداروں میں رانی اور محمد علی کو تماشائیوں نے پسند کیا تھا۔یہ بطور ہدایت کار نذر شباب کی دسویں فلم تھی۔

سات مہینے بعد نذر شباب کی گیارہویں فلم ''خوشبو'' عیدالفطر کے دن کراچی میں نمائش پذیر ہوئی۔اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ اس کی کہانی نذر شباب نے خود لکھی تھی۔آپ کو یاد ہوگا نذر شباب نے ''الف لیلیٰ'' کے نام سے ایک کہانی لکھ کر فلم انڈسٹری میں انٹری دی تھی اور اب خود اپنی فلم کے لیے کہانی لکھ کر اپنے والد کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی۔اس سے پہلے وہ ایک فلمی گیت لکھ کر فلمی نغمہ نگاروں کی صف میں بھی شامل ہو چکے تھے۔

نذر آرٹ پروڈکشن کے بینر تلے بننے والی فلم ''خوشبو'' کے فلم ساز اے حمید، موسیقار ایم اشرف اور نغمہ نگار مسرور انور تھے۔کاسٹ میں رانی، شاہد، ممتاز، رنگیلا اور ابراہیم نفیس کے نام نمایاں تھے۔کراچی میں ''خوشبو'' مجموعی طور پر 60 ہفتے چلی اور اس نے شاندار گولڈن جوبلی کامیابی حاصل کی۔

اگلے برس 1980ء کے 9 مئی کے دن نذر شباب کی بطور ہدایت کار بارہویں فلم ''ساتھی'' پاکستان کے تمام سرکٹوں میں ایک ساتھ ریلیز کی گئی۔''ساتھی'' کی کہانی اور اس کے مکالمے ریاض الرحمٰن ساغر نے لکھے تھے جب کہ نغمہ نگاری تسلیم فاضلی نے کی تھی۔فلم ساز اے حمید اور موسیقار ایم اشرف تھے۔اس فلم کی طویل کاسٹ میں بابرہ شریف، آصف رضا میر، بندیا، شاہد، شہلا گل، افشاں قریشی، سیما، تمنا، ابراہیم نفیس، حنیف، ساقی، شاہ نواز محسن، عابد علی، رنگیلا، نیر سلطانہ، صبیحہ خانم، ننھا اور علی اعجاز شامل تھے۔اس فلم کے چند مقبول گیت یہ ہیں۔

☆ او ہمدم او ساتھی مجھے تیری دوستی پر ناز ہے (یہ گیت اے نیر اور رجب علی نے الگ الگ گایا تھا)

☆ خواب سارے توڑ ڈالے۔بے وفا اچھا کیا (آواز: غلام عباس)

☆ چاند تارے گھٹا پھول شبنم۔حیا چاندنی رات کلیاں۔دھنک روشنی (آواز: اے نیر)

''ساتھی'' کو متوقع طور پر عوامی پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ساتھی کا ساتھ کم لوگوں نے دیا اس لیے کراچی میں چوتھے ہفتے بعد ہی سینماؤں سے اتار دی گئی۔ان چار ہفتوں میں وہ 25 ہفتے ہی مکمل کر سکی تھی۔

نذر شباب کی ڈائریکشن میں بنائی گئی تیرہویں فلم ''بدلتے موسم'' تھی۔اس موقع پر جو بدلاؤ تھی وہ کچھ یوں تھی کہ یہ ان کے ذاتی پروڈکشن کی فلم نہیں تھی۔یہ عوامی پکچرز کے بینر تلے بنائی گئی تھی اور اس کے فلم ساز ملک فیروز دین تھے اور مصنف اور مکالمہ نگار بشیر نیاز تھے۔موسیقی بدستور ایم اشرف کی تھی جب کہ نغمہ نگار تسلیم فاضلی بھی ان کے اپنے حلقے کے تھے۔''بدلتے موسم'' بھی تمام پاکستانی سرکٹوں میں ایک ساتھ ریلیز کی گئی تھی۔یہ فلم بھی 1980ء کو عیدالفطر کے موقع پر سینما گھروں کی زینت بنائی گئی تھی لیکن یہ تماشائیوں کی عید کی خوشیاں کچھ زیادہ دوبالا نہ کر سکی تھی۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کراچی جو فلموں کا سرکٹ سمجھا جاتا ہے وہاں بھی یہ مجموعی طور پر 34 ہفتے ہی مکمل کر سکی۔اگرچہ اس کی کاسٹ میں ندیم اور شبنم لیڈنگ

UUNOVELS.COM

رول میں تھے جب کہ شاہد، آصف رضا میر، طاہرہ نقوی، ابراہیم نفیس، تمنا، ننھا، رنگیلا، رخسانہ ملتانی، انشاں قریشی، ساقی اور اختر شاد سب ہی منجھے ہوئے فنکار تھے اس کے بھی کچھ گیت اچھے تھے۔

☆وہ دیکھو ایک پیڑ پہ۔ طوطا مینا ہے کچھ کہتا ہے (آوازیں: مہناز، مہدی حسن)

☆تیرا میرا تیرا ساتھ رہے۔ موت بھی آئے تو میرے ہاتھ میں تیرا ہاتھ رہے (آوازیں: غلام عباس، مہناز)

☆گڑیا رانی کی سالگرہ ہے۔ آؤ کریں قوالی (آواز: اے نیر)

ان تمام باتوں کے باوجود نذر شباب کی یہ فلم محض سلور جوبلی ہی کر سکی۔

نذر آرٹ پروڈکشن کے بینر تلے نذر شباب کی ڈائریکشن میں بننے والی چودھویں فلم ''خوبصورت'' تھی۔ اس خوب صورت فلم کے فلم ساز بھی نذر شباب ہی تھے۔ غالباً نذر شباب اپنی پچھلی فلم میں بشیر نیاز کے کام سے متاثر ہوئے تھے۔ شاید اسی لیے اپنی اس ذاتی فلم میں بھی انہوں نے بشیر نیاز سے کہانی اور اس کے مکالمے لکھوائے۔ اس بار ایم اشرف نے مسرور انور سے گیت لکھوائے تھے۔ عکاسی کے لیے ریاض بخاری کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ کاسٹ میں ندیم، شبنم، شجاعت ہاشمی، ہما ڈار، بازغہ، انجم، ننھا، سیما اور منور سعید شامل تھے۔

ایم اشرف اور مسرور انور کے اشتراک سے تخلیق ہونے والے نغموں میں کچھ مقبول بھی ہوئے تھے۔

☆پردہ چہرے سے ہٹا دوں تو کیا ہوگا (آواز: مہدی حسن)

☆غم نہ کر میری ماں۔ میں تیرے ساتھ ہوں (آواز: اخلاق احمد)

☆ایک پل تیرے بن اب رہا نہ جائے (آوازیں: مہدی حسن، ناہید اختر)

''خوب صورت'' بڑی خوب صورتی کے ساتھ کراچی کے سینماؤں میں 57 ہفتے چلی اور اس نے گولڈن جوبلی کامیابی حاصل کر کے نذر شباب کی کامرانی کے گراف کو قدرے بلند کیا۔ یہ گولڈن جوبلی فلم جو 15 جنوری 1982ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی اسے تماشائیوں نے ایک خوب صورت فلم قرار دیا تھا۔

نذر شباب کی ''ذرا سی بات'' محض ذرا سی بات نہیں تھی۔ اس کی بات (نمائش) 31 دسمبر 1982ء میں شروع ہوئی تو 13 مئی 1983ء تک جاری (نمائش) رہی۔ جی ہاں اس ''ذرا سی بات'' نے کراچی میں شاندار 55 ہفتے مشترکہ طور پر پورے کیے اور نذر شباب کو ایک بار پھر گولڈن جوبلی کا سنہری تحفہ دیا۔ یہ فلم بھی پورے پاکستان میں ایک ساتھ ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے فلم ساز بھی نذر شباب خود ہی تھے اور یہ ہدایت کار کی حیثیت سے ان کی پندرہویں فلم تھی جو نذر آرٹ پروڈکشن کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ موسیقار ایم ارشد کی یہ پہلی فلم تھی۔ اس کی کاسٹ میں شبنم، محمد علی، وسیم عباس، گوری، ساقی اور ننھا قابل ذکر ستارے تھے۔ اس کے گیت بھی پسند کیے گئے تھے۔

☆تیرے دو شرمیلے نین تھاں مار گئے (آواز: مہدی حسن)

☆ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں بلو نہائے گا (آوازیں: مہدی حسن، شمسہ کنول)

نذر شباب میں اب خاصہ اعتماد پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنی اس خود اعتمادی کا فائدہ خود اٹھانے لگے تھے جس کی مثال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اگلی فلم کی کہانی بھی خود ہی تحریر کی۔ ایک انگریزی ناول Man woman and child سے متاثر ہو کر متذکرہ کہانی لکھی اور اس کو ''کبھی الوداع نہ کہنا'' کے نام سے اپنی سولہویں فلم کی حیثیت سے پیش کیا۔ ان کے اعتماد کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس وقت سے نو برس پہلے کی ایک ناکام فلم ''دھماکا'' کے ہیرو کو اپنی اس نئی فلم میں لیڈنگ رول میں پیش کیا۔ ''دھماکا'' مولانا ہی کی فلم تھی۔ انہوں نے ضد کر کے ابن صفی سے کہانی لکھوائی تھی اور شبنم کے ساتھ ایک نئے لڑکے جاوید اقبال کو مرکزی کردار کے طور پر پیش کیا تھا۔ فلم بری طرح فلاپ ہوگئی اور جاوید اقبال پر بھی ناکام ہیرو کا لیبل لگ گیا اور وہ منظر سے پس منظر میں چلا گیا۔ بعد میں ٹی وی ڈراموں میں جاوید شیخ کے نام سے اداکاری کرنے لگا۔ شباب کیرانوی مرحوم کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی فلموں میں اکثر نئے چہرے متعارف کراتے تھے۔ نذر شباب نے شاید باپ کی روایت پر عمل کرتے ہوئے جاوید اقبال (جاوید شیخ) کو اپنی اس فلم میں اسی اداکارہ شبنم کے ساتھ پیش کیا جس نے ''دھماکے'' میں بھی اس کی ہیروئن کا کردار کیا تھا۔ ''کبھی الوداع نہ کہنا'' کے دیگر ستارے بیتا، ننھا، تمنا اور ماسٹر شہباز تھے۔ اس بچے نے اپنی فطری اداکاری سے

UUNOVELS.COM

فلم بینوں کو رلا دیا تھا۔ اس کے موسیقار امجد بوبی تھے۔ امجد بوبی کی انٹری نذر شباب کے یونٹ میں پہلی بار ہوئی تھی۔ یہ بھی نذر شباب کی ایک نئی سوچ تھی کہ انہوں نے ایک نسبتاً نئے اور کم معروف موسیقار کو اپنی فلم کی موسیقی ترتیب دینے کا موقع فراہم کیا۔ امجد بوبی نے بھی ایسی دلکش دھنیں کمپوز کیں کہ فلم کا ہر گانا ہٹ ہوا۔ پسند کیا گیا اور فلم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔

☆ میرا پیار بھی تو زندگی بھی ہے تو (اسے غلام عباس اور مہناز نے الگ الگ گایا جب کہ نور جہاں اور عارفہ صدیقی نے ایک ساتھ گایا)

☆ اپنی سانسوں میں تجھ کو چھپالوں۔ تجھ سے میں تجھ ہی کو چرالوں (آواز: نور جہاں)

''کبھی الوداع نہ کہنا'' نے اپنی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے پانچ نگار ایوارڈ حاصل کیے تھے۔

بہترین مکالمہ نگار کا ایوارڈ علی سفیان آفاقی نے حاصل کیا تھا۔ بہترین اداکارہ کا ایوارڈ شبنم کو دیا گیا تھا۔ بہترین موسیقار کا ایوارڈ امجد بوبی کے حصے میں آیا تھا۔ بہترین نغمہ نگار کا ایوارڈ سعید گیلانی کو ملا تھا۔ بہترین گلوکارہ کا ایوارڈ مہناز نے حاصل کیا تھا۔ خصوصی ایوارڈ ماسٹر شہباز کو دیا گیا تھا۔

''کبھی الوداع نہ کہنا'' 18 ستمبر 1983ء کو عیدالاضحیٰ کے دن پورے پاکستان میں ایک ساتھ پیش کی گئی تھی۔ یہ نذر شباب کی پانچویں فلم تھی جو عیدالاضحیٰ کے روز نمائش پذیر ہوئی تھی۔ نذر آرٹ پروڈکشن کے بینر تلے بننے والی اس فلم نے کراچی میں اجتماعی طور پر 66 ہفتے چل کر گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس فلم کی نمائش سے پہلے 5 نومبر 1982ء میں شباب کیرانوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ فلم دس مہینوں کے بعد ریلیز ہوئی تھی اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ باپ کو الوداع کہنے کے بعد ان کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

نذر شباب کی اگلی فلم اردو کی بجائے پنجابی زبان کی تھی۔ فلم کا نام تھا۔ ''تیری میری اک مرضی''۔ یہ ''سجن بیلی'' کے بعد ان کی دوسری پنجابی فلم تھی جو مونا پکچرز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس کی کہانی مطلوب احمد نے لکھی تھی اور نغمہ نگار حزیں قادری اور خواجہ پرویز تھے۔ موسیقی ایم اشرف کی تھی اور فلم ساز و ہدایت کار نذر شباب تھے۔

اس فلم کا ایک گانا جسے خواجہ پرویز نے تحریر کیا تھا۔ اس لحاظ سے اس کا ذکر یہاں لازمی ہو جاتا ہے کہ یہی گانا 1981ء میں فلم ''سالا صاحب'' میں موسیقار وجاہت عطرے نے میڈم نور جہاں سے گوایا تھا اور اس نے زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ یہ گانا تھا۔

دے اک تیرا پیار مینوں ملیا
میں دنیا توں اور کی لیناں

''تیری میری اک مرضی'' 30 جولائی 1984ء کو صرف لاہور سرکٹ میں ریلیز ہوئی جب کہ کراچی میں 27 ستمبر 1984ء کو ریلیز ہوئی اور دونوں سرکٹوں میں سپر فلاپ ثابت ہوئی۔ اس فلم کی کاسٹ میں علی اعجاز، ننھا، دردانہ رحمٰن، نازلی اور فخری احمد شامل تھے۔ نذر شباب کی ہدایات میں بننے والی یہ سترہویں فلم تھی جو سپر فلاپ ثابت ہوئی تھی۔

نذر شباب ان دنوں اس اسٹیج پر تھے جہاں چند ایک فلموں کی ناکامی ان کی ساکھ کو متاثر نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے اگلی سپر ہٹ فلم بنا کر اس ناکامی کا ازالہ کر دیا۔ یہ فلم ''بوبی'' تھی۔ یہ اسی سال 1984ء کے 7 ستمبر کو عیدالاضحیٰ کے دن ریلیز ہوئی۔ اس طرح عید قرباں پر ریلیز ہونے والی چھٹی اور ان کے کیریئر کی اٹھارہویں فلم تھی۔ یہ غیر معمولی کامیابی حاصل کرنے والی فلم 7 ستمبر 1984ء سے 19 ستمبر 1985ء تک مسلسل چلتی رہی اور اس نے کمبائنڈ 140 ہفتے چل کر ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ اس نے کراچی کے مین سینما میں 54 ہفتے مسلسل چل کر گولڈن جوبلی کیا۔ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے کہ کسی فلم نے اپنے مین سینما میں اتنے ہفتے مکمل کیے۔ نذر آرٹ پروڈکشن کے بینر تلے بنائی جانے والی اس فلم کے فلم ساز و ہدایت کار نذر شباب خود تھے۔ موسیقار امجد بوبی نے اس فلم میں اپنی سپر کلاس دھنوں سے اس کے گیتوں کو ایسی زندگی بخشی تھی کہ وہ امر سنگیت کے درجے کو پہنچ گئے۔ مسرور انور نے بھی اپنی شاعری کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

☆ اک بار ملو ہم سے تو سو بار ملیں گے۔ ہم جیسے کہاں تم کو طلب گار ملیں گے (اسے سلمیٰ آغا اور غلام عباس نے الگ الگ گایا)

☆ جب شام کے سائے ڈھلتے ہیں۔ اور چلتی ہے پاگل پروائی (آواز: سلمیٰ آغا)

☆ آج تمہارے ظلم و ستم کا ہم کو قرض چکانا ہے (آواز: ناہید اختر)

سری لنکا کی اداکارہ ہیتا کے ٹائٹل رول پر مبنی فلم

UUNOVELS.COM

''بوبی'' کو دو نگار ایوارڈز سے نوازا گیا۔ ایک ایوارڈ مسرور انور کو سال کے بہترین نغمہ نگار کا دیا گیا۔ دوسرا لیجنڈ محمد علی کو ان کی سوپر پرفارمنس ایوارڈ تفویض کر کے نگار ایوارڈ سے بالاتر قرار دیا گیا۔

اس ڈائمنڈ جوبلی فلم کو اپنی اعلیٰ اداکاری سے جن فنکاروں نے سجایا اور کامیاب بنایا وہ یہ ہیں۔ محمد علی، جاوید شیخ، بیتا، سکندر شاہین، رنگیلا اور فیصل قریشی۔ فیصل قریشی بطور چائلڈ اسٹار شامل تھے۔ انہوں نے فردوس جمال کے بچپن کا کردار ادا کیا تھا۔ فردوس جمال نے بھی ''بوبی'' میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

نذر شباب کی ہدایت میں بننے والی انیسویں فلم ''نادیہ'' تھی جو نذر آرٹ پروڈکشن کے بینر تلے بنائی گئی تھی اور اس کے فلم ساز بھی نذر شباب ہی تھے۔ اس فلم میں ٹائٹل رول بے بی شفیقہ نے ادا کیا تھا اور اس عمدگی سے ادا کیا تھا کہ بڑے فنکاروں نے بھی داد دی تھی۔ دیگر کاسٹ میں جاوید شیخ، بیتا، شاہد، سیماب اور ہمایوں قریشی شامل تھے۔ موسیقی کا شعبہ امجد بوبی کے پاس تھا۔ انہوں نے اس فلم میں ایک گیت بھی گایا تھا جو یہ تھا۔

☆ آنکھوں کا چین ہے تو۔ دل کا قرار ہے تو (یہ گیت امجد بوبی نے مہناز کے ساتھ گایا تھا اور عارفہ صدیقی نے الگ سے بھی گایا تھا)

☆ میں پتر پاکستان دا۔ جگ سارا مینوں جان دا
(آواز: انور رفیع)

☆ جب سے تو زندگی میں آیا۔ سانسوں کو تو نے جگایا
(آواز: مہناز)

یہ فلم 14 اکتوبر 1985ء کو پاکستان کے تمام سرکٹوں میں ایک ساتھ ریلیز ہوئی۔ کراچی میں اس نے مشترکہ چالیس ہفتے زیر نمائش رہ کر سلور جوبلی حاصل کی۔ دیگر سرکٹوں میں درمیانے درجے کا بزنس کیا۔

''روبی'' نذر شباب کی ہدایات میں بننے والی بیسویں فلم تھی۔ اس کے فلم ساز بھی وہی تھے۔ ''بوبی'' کی شاندار کہانی کار سید نور کی ایک بار اور خدمات حاصل کر کے ''روبی'' کی کہانی بھی ان ہی سے لکھوائی گئی تھی۔ اس کی کاسٹ میں اظہار قاضی، بیتا، گیتا کماری، مصطفیٰ قریشی، رنگیلا، شفیع محمد شاہ، اور ٹی وی ڈراموں کی اداکارہ سکینہ سموں شامل تھیں۔ نذر شباب نے اظہار قاضی کو اس فلم ''روبی'' سے متعارف کرایا تھا جب کہ سکینہ سموں کی بھی یہ پہلی فلم تھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اپنے والد گرامی کی روایت پر عمل پیرا تھے۔ یہ فلم بھی آل پاکستان ریلیز ہوئی تھی۔ اس نے کراچی میں مجموعی طور پر 59 ہفتے چل کر گولڈن جوبلی کامیابی حاصل کی تھی۔ کراچی میں ''روبی'' کی نمائش 18 اپریل 1986ء میں ہوئی تھی۔

نذر شباب آرٹ پروڈکشن کے بینر تلے بننے والی اگلی فلم ''ایک سے بڑھ کر ایک'' تھی۔ اس کے فلم ساز اور ہدایت کار نذر شباب تھے اور یہ ان کی 21 ویں فلم تھی۔ اس کی کاسٹ میں سلمیٰ آغا، جاوید شیخ، بیتا، اسماعیل شاہ، نغمہ اور رنگیلا شامل تھے۔ امجد بوبی اس فلم کے بھی موسیقار تھے۔ یہ فلم 10 جولائی 1987ء کو ریلیز ہوئی تھی مگر اس نے پہلی فلموں سے بڑھ کر کامیابی حاصل نہیں کی۔ یہ بس نام کی ہی ایک سے بڑھ کر ایک رہی۔ اس نے کراچی میں اجتماعی طور پر 35 ہفتے چل کر محض سلور جوبلی کی۔

نذر آرٹ پروڈکشن کے بینر تلے بنائی جانے والی ہدایت کار نذر شباب کی اگلی فلم ''باغی حسینہ'' تھی جو نذر شباب کی 22 ویں فلم تھی۔ یہ فلم 25 جولائی 1988ء کو عیدالاضحیٰ کے دن ریلیز کی گئی تھی۔ اس کی کاسٹ میں بابرہ شریف، کویتا، بیتا، اظہار قاضی اور اسماعیل شاہ شامل تھے۔ موسیقی ایم اشرف کی تھی۔ ''باغی حسینہ'' نے کراچی میں بس 26 ہفتے ہی اپنی بغاوت کا علم بلند رکھا اور نذر شباب کو محض سلور جوبلی کامیابی سے ہمکنار کیا۔

نذر شباب کی 23 ویں فلم ''طوفانی بجلیاں'' ان کی ڈائریکشن میں تو بنی تھی مگر یہ شمع پروانہ پکچرز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس کے موسیقار امجد بوبی تھے اور اس فلم میں نیلی، جاوید شیخ، نازاں سانجی اور اسماعیل شاہ نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ یہ فلم 3 نومبر 1989ء کو سینما گھروں کی زینت بنی تھی اور اس نے کراچی میں مسلسل 27 ہفتے چل کر سلور جوبلی کامیابی حاصل کی تھی۔

''قیامت کے بعد'' نذر شباب کی ہدایات میں بننے والی 24 ویں فلم تھی جو ڈبل ورژن میں بنائی گئی تھی۔ یہ ان کے اپنے پروڈکشن ہاؤس کی فلم تھی اور 10 مئی 1991ء کو ریلیز کی گئی تھی۔ اس کی کاسٹ میں صنم، اسد، عامر ملک، نین تارا اور توقیر ناصر شامل تھے۔ موسیقی کی دھنیں ایم ارشد نے ترتیب دی تھیں۔ یہ فلم کراچی کے سینماؤں میں 19 ہفتے سے زیادہ نہ چل سکی۔

اس فلم کی کاسٹ اور کریڈٹ سے اندازہ ہو جاتا ہے

URDUNOVELS.COM

کہ اس پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ زیادہ دلچسپی کے ساتھ اسے پروڈیوس نہیں کیا گیا۔ ایسا کیوں کیا گیا؟ یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ نذر شباب تھک گئے تھے کام کرتے کرتے۔ کیونکہ اب وہ اس فلم ساز فیکٹری کو چلانے والے واحد شخص تھے جسے شباب کیرانوی نے قائم کیا تھا اور تینوں باپ بیٹے مل کر یہ فیکٹری چلاتے تھے پھر والد کا سایہ اور ساتھ چھوٹنے کے بعد وہ گویا بالکل تنہا رہ گئے۔ بڑے بھائی ظفر شباب کہنے کو تو 1987ء تک فلمیں بناتے رہے مگر ان کا کام خود ان سے ہی ٹھیک سے نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی وجہ سے اس فیکٹری کو نقصان زیادہ پہنچتا تھا۔ فائدہ کم ہوتا تھا۔ چھوٹے ہونے کے ناتے نذر شباب بڑے بھائی کو انگلی پکڑ کر سیدھے راستے پر چلا بھی نہیں سکتے تھے۔ نذر شباب جتنا کر سکتے تھے کیا۔ انہوں نے بھی 25 فلمیں ہی بنائیں مگر اچھی اور کامیاب فلمیں بنائیں۔

نذر شباب کی آخری فلم ''دل سے نہ بھلانا'' جو ان کی ڈائریکشن میں بنائی گئی تھی پانچ مئی 2000ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اس فلم کے فلم ساز ارشد عباس بخاری تھے جنہوں نے اس فلم میں ارشد بخاری کے نام سے اداکاری بھی کی تھی۔ اس کی کہانی اور مکالمے پرویز کلیم نے لکھے تھے۔ موسیقار ایم ارشد اور نغمہ نگار سعید گیلانی اور ریاض الرحمٰن ساغر تھے۔ اس کی کاسٹ میں مسعود، میرا، جان ریمبو، صاحبہ، ''لیلیٰ'' نازو، راشد محمود، عرفان کھوسٹ، تمنا، افشاں قریشی، سیما، بہار، شفقت چیمہ، رنگیلا اور طلعت حسین شامل تھے۔

اس فلم کا نام اس فلم کے ایک گیت کے ایک ٹکڑے سے لیا گیا تھا۔ گیت تھا۔

دنیا میں چاہے کہیں چلے جاؤ
تم میرا پیار دل سے نہ بھلانا

اس گیت کے بول ریاض الرحمٰن ساغر نے لکھے تھے جب کہ اسے انور رفیع اور سائرہ نسیم نے گایا تھا۔ اس نام میں یہ معنویت بھی پوشیدہ ہے کہ نذر شباب اپنی اس آخری فلم سے یہ پیغام دیتے ہیں مجھے میرے چاہنے والو! دل سے نہ بھلانا۔

نذر شباب اپنے والد گرامی کی طرح ایک تخلیقی فنکار تھے۔ انہوں نے اپنے کیریئر میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ بھلا وہ کیسے بھلائے جا سکتے ہیں؟ لوگ اپنے نام اور چام (چمڑی) سے پہچانے اور یاد نہیں رکھے جاتے، اپنے کام سے یاد رکھے جاتے ہیں۔ نذر شباب نے اپنے 32 سالہ فلمی کیریئر میں جو کچھ کیا، قابل تعریف کیا۔ ان کی ابتدائی کچھ فلمیں کامیاب نہ ہو سکیں لیکن بعد کی فلمیں سلور، گولڈن، پلاٹینم اور ڈائمنڈ جوبلی جیسی کامیابیوں سے ہمکنار ہوئیں۔ وہ بلاشبہ ایک باصلاحیت ہدایت کار تھے۔ ان کی تخلیقی اہلیت بھی اپنے بڑے بھائی ظفر شباب سے بہتر تھی۔ انہیں پڑھنے اور لکھنے سے بھی دلچسپی تھی۔ انہوں نے تین فلموں کی کہانیاں بھی لکھیں اور ایک فلم کا ایک گیت بھی تحریر کیا۔ انہوں نے اپنے شفیق والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہر طرح کی فلمیں بنائیں اور نئے چہروں کو بھی روشناس کروایا۔

وہ مسلسل کام کام اور کام کرتے رہے اور اس کام کے پریشر سے آخر تھک گئے اور پھر بیمار ہو گئے اور کافی عرصے تک بیماری جھیلتے رہے اور آخر کار ان کی بیماری جیت گئی اور وہ ہار گئے۔ یہ افسوسناک سانحہ عین عیدالفطر کے دن رونما ہوا۔ وہ جو عیدین کی خوشیاں دوبالا کرنے کے لیے اکثر اپنی فلمیں عید بقرعید کے مواقع پر پیش کیا کرتے تھے خود عید کے دن زندگی کی سلور اسکرین سے اتار دیئے گئے۔ یہ 26 جون 2017ء کا غم نصیب دن تھا۔ ساری دنیا اس دن عید کی خوشیاں منا رہی تھی اور ان کے گھر میں ماتم ہو رہا تھا۔ اسی کا نام دنیا ہے۔ انہیں بھی باپ بھائی اور دادی کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

2000ء میں ان کی آخری اور 25 ویں فلم ریلیز ہوئی تھی اور ان کا انتقال پُرملال 17 برس بعد 2017ء کو ہوا۔ یعنی اس عرصہ وہ بے کار رہے۔ بیمار رہے۔ اس مدت میں ان کے یا ان کے گھر والوں کے پاس صرف شباب اسٹوڈیو ہی تھا جس کی آمدنی سے گزر بسر ہو سکتی تھی۔ ان کی آنکھ بند ہونے کے کچھ دن بعد شباب اسٹوڈیو بھی بک گیا اور سید نور نے اس کی باگ ڈور سنبھال لی۔ وہ آشیانہ جو شباب کیرانوی نے تنکا تنکا چن کر بنایا تھا، حالات و واقعات کے تیز و تند جھونکوں نے اسے اجاڑ کر ایک بار پھر تنکا تنکا بنا کر بکھیر دیا تھا۔

شباب صاحب نے تو جاتے وقت اپنے پیچھے دو بیٹے چھوڑے تھے جنہوں نے اس آشیانے کو فلم سازی کے کارخانے کو سلامت رکھا مگر ان کے دو بیٹے تو ایسے گئے کہ ان کے کسی وائی وارث نے اس آشیانے کو بچانے اور فلم سازی کی شمع جلانے پر کوئی توجہ نہیں دی اور شباب صاحب کی عمر بھر کی جدوجہد کا باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

++

UIUNOVELS.COM

گلے کی ہڈی

عباس ثاقب

فتنہ ساز حسینہ کو پا لینے کے لیے لوگ کیا کیا نہیں کرتے۔ اس نے بھی ایک چال چلی اور وہی چال اس کے لیے وبالِ جان بن گئی، گلے کی ہڈی بن گئی کہ اپنی زندگی بچانے کے لیے وہ مسلسل بھاگ رہا ہے۔ اسے سزا دینے کی کوشش میں سرگرداں شخص بھی کم درجہ چالاک نہیں تبھی تو اس نے ایسے راستے کا انتخاب کیا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

ایسے واقعات مغرب میں ہی جنم لیتے ہیں

اطلاعی گھنٹی کی کرخت آواز نے مجھے نہ صرف بیدار کردیا بلکہ میں ایک جھٹکے سے بستر پر اٹھ بیٹھا۔ پھر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے کھڑکی سے اندر آتی تیز دھوپ سے خود کو بچاتے ہوئے ڈریسر پر رکھے کلاک پر نظر دوڑائی۔ تین بج کے دس منٹ ہوئے تھے۔

میں نے نیم غنودگی میں لبادہ جسم پر چڑھایا۔ ڈریسر سے کنگھا اٹھا کے اپنے چھدرے بالوں میں پھیرا، پھر دھیرے سے مڑا اور جھجکتے قدموں سے اپنے خستہ حال اپارٹمنٹ کی نشست گاہ میں داخل ہوا۔ اس اثناء میں گھنٹی ایک بار پھر چیخ اٹھی۔

میں نے سست رفتاری سے اپنا ہاتھ دروازے کی کنڈی کی طرف بڑھایا۔ اس وقت میرے ذہن میں کئی خیالات ٹکرا رہے تھے اور میں گومگوں کی کیفیت کا شکار تھا۔

پہلا امکان یہ تھا کہ دروازے پر موجود شخص ڈلٹن ہوگا۔ ڈلٹن روزگار فراہم کرنے والے محکمے کا اہلکار تھا۔ میں اگرچہ کام کے تصور سے بھی گھبراتا تھا تاہم خانہ پری کے لیے کئی بار وہاں جاچکا تھا اور میں نے ہر طرح کے کام کے لیے خود کو آمادہ ظاہر کیا تھا لیکن فوراً ہی دماغ نے تردید کی کہ یہ ڈلٹن نہیں ہوسکتا۔ وہ رابطے کے لیے فون استعمال کرتا۔

دوسرا امکان، مالکِ مکان! میں نے اس موٹے بے وقوف کو کہہ دیا تھا کہ میں چند دن میں کرایہ ادا کردوں گا لیکن اسے شاید صبر نہیں آیا۔ مجبوروں کا خون چوسنے والی ان جونکوں کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔ انہیں تو صرف ڈالر کی شکل دیکھ کے چین آتا ہے۔

اطلاعی گھنٹی ابھی تک بج رہی تھی۔

”ہوسکتا ہے یہ بیرٹ ہوا“ میں نے لرزتی انگلی سے اپنا بھیگا ہوا ماتھا چھو کے ان اذیت ناک یادوں کو زائل کرنے کی کوشش کی۔ بیرٹ کے ساتھ کپڑے کے اسٹور کا سودا، بدھ کا طلائی مجسمہ اور بحرالکاہل کی تہ میں موجود عورت کی یادیں۔

تبھی دماغ نے پھر تردید کردی یہ بیرٹ نہیں ہوسکتا۔ وہ تو ابھی تک ہونولولو میں ہے۔

میں نے احتیاط سے کنڈی ہٹائی اور دروازہ کھول دیا۔

وہ بیرٹ ہی تھا۔

اسے دیکھتے ہی میں سکڑ کے رہ گیا۔ مجھے توقع تھی کہ اگلے ہی لمحے بیرٹ کے پستول سے نکلنے والی گولیاں مجھے چھلنی کردیں گی لیکن ایسا کوئی ہلاکت خیز واقعہ رونما نہ ہوا۔ البتہ جو وہاں ہو رہا تھا اس نے مجھے شدید الجھن میں مبتلا کردیا۔ دروازے میں کھڑے بیرٹ کے وجیہہ چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ تھی۔ اس کے چھ فٹ طویل جسم پر مہنگا سوٹ خوب بج رہا تھا اور اس کی بغل میں ٹین کا ایک بکس دبا ہوا تھا۔

”کیا تم مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گے؟“ بیرٹ نے پوچھا۔

میں شدید غصے کا شکار تھا۔ جلدی سے ایک قدم پیچھے ہٹا ”ہاں، ہاں“ میں نے کہا۔ ”ضرور۔ بہت طویل عرصے بعد ملاقات ہو رہی ہے بیرٹ۔“

”اتنا طویل بھی نہیں۔ صرف ایک سال پہلے کی بات ہے۔“ بیرٹ نے کمرے کی حالت پر بے نیازی سے نظریں دوڑائیں۔

میں نے سینے پر لبادہ کستے ہوئے خستہ حال فرنیچر، غلیظ

UUNOVELS.COM

راکھدان اور ادھڑے ہوئے فرش کو کوسا۔ پھر ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''تت...... تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اسمارٹ دکھائی دے رہے ہو۔''

''شکریہ!'' بیرٹ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اچانک مجھے اپنے ہاتھ میں عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ کو جھٹکا اور پیچھے ہٹ گیا۔

بیرٹ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ بالآخر اس نے اپنی ہتھیلی سے ایک چھوٹا سا آلہ علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس نے تمہیں جھٹکا دیا۔ تمہارے تو اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے درست کہا ناں؟''

میں نے شرمندگی محسوس کی۔ ''تم اور تمہارے یہ لعنتی مذاق۔ تم کبھی ان بچکانہ حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔ اچھا، ایک جام کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کیوں نہیں، پرانے دنوں کی یادیں تازہ کرنے کے لیے۔''

میں نے دیوار کے ساتھ کھڑی الماری کھولی اور یکے بعد دیگرے کئی بوتلیں باہر نکالیں۔ وہ سب کی سب خالی تھیں۔

''تم گزشتہ دنوں بہت پیتے رہے ہو کیا؟'' بیرٹ نے پوچھا۔

''نہیں، اتنی بھی نہیں۔ میرا خیال ہے خواب گاہ میں ایک بوتل موجود ہے۔ میں لے کر آتا ہوں۔''

میں خواب گاہ میں پہنچا اور سیدھا ڈریسر کی طرف بڑھا۔ اوپر کی دراز کھولی اور اعشاریہ تین دو کا ایک ریوالور نکال کر لبادے کی جیب میں ڈال لیا۔ ریوالور جیب میں آتے ہی تنے ہوئے اعصاب پُرسکون ہوتے محسوس ہوئے۔

دیوار گیر الماری سے پانچویں بوتل اٹھا کے میں نشست گاہ میں آ گیا۔ ''تم کب تک یہاں رکنے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' میں نے جام میں شراب انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔ میں دو ہفتے پہلے میلسونیا سے یہاں پہنچا ہوں اور اسٹینٹن کے ساحلی نشیب کے پاس اپنے دوستوں کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں۔ بہت پیاری جگہ ہے میں تقریباً روزانہ وہاں جاتا ہوں۔ سینکڑوں فٹ اونچائی سے بحرالکاہل کو دیکھتا ہوں اور ملڈریڈ کی آواز سنتا ہوں۔ بہت درد ہے اس کی پکار میں۔''

میں نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟''

بیرٹ مسکرایا۔ ''مجھے ملڈریڈ نے بتایا تھا۔ تم سمجھ رہے تھے کہ میں تمہیں قتل کر ڈالوں گا۔ میں نے درست کہا ناں؟''

UUNOVELS.COM

مجھے حلق خشک ہوتا محسوس ہوا۔ میں جام رکھ کے بیرٹ کی طرف مڑا۔ میرا ہاتھ لبادے کی جیب میں تھا اور آنکھیں سکڑ گئی تھیں۔

بیرٹ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”کیا میرے پاس تمہیں قتل کرنے کا معقول جواز نہیں ہے؟ تمہاری یادداشت کچھ زنگ آلود ہوگئی ہو، لہٰذا مجھے سودے کی شرائط دہرانے کا موقع دو۔ کیونکہ ایک سال پہلے تم نے ہونولولو میں ہمارے کپڑے کے اسٹور میں سے اپنا نصف حصہ مجھے فروخت کردیا تھا۔ میں نے اس معاہدے کے ساتھ اس وقت تمہیں پانچ ہزار ڈالر ادا کیے کہ مزید پانچ ہزار ڈالر ایک سال بعد ادا کروں گا لیکن تم امریکا روانہ ہوتے ہوئے رقم کے علاوہ بھی ایک شے وہاں سے ساتھ لے آئے۔ وہ انمول خزانہ میری بیوی تھی لیکن ملڈریڈ بھی یہاں نہیں پہنچی۔ وہ راستے میں ہی زندگی کی بازی ہار گئی۔“

”اس کی موت سے میرا کوئی لینا دینا نہیں ہے!“ میں نے احتجاج کیا۔ ”اس نے میرا پیچھا کیا۔ مجھے سمندر کے درمیان میں پہنچنے کے بعد پتا چلا کہ وہ جہاز پر موجود ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ ایک نہایت سنگین غلطی کا ارتکاب کر بیٹھی ہے اور یہ کہ اسے واپس چلے جانا چاہیے۔ میں سمجھا کہ معاملہ طے ہوگیا۔ تبھی وہ لاپتا ہوگئی۔“ میں نے اپنا جام اٹھایا اور تمام شراب حلق میں انڈیل لی اور مزید کہا۔ ”جہاز کے روزنامچے کے مطابق اس نے جہاز سے چھلانگ لگا کے خودکشی کی تھی۔“

”یہ جھوٹ ہے۔ اسے تم نے قتل کیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مجھے تمہیں قتل کردینا چاہیے۔“ بیرٹ نے ہنس کر کہا۔

”وہ ایک خودکشی تھی اور اسے تم نے اس حد تک جانے پر مجبور کیا تھا۔ وہ تمہیں اور تمہارے گھٹیا عملی مذاقوں کو مزید برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ تم ہمیشہ اسے اور اس کے دوستوں کو شرمندہ کرتے رہتے تھے۔ وہ تم سے پیچھا چھڑانے کے لیے کسی کے ساتھ بھی جاسکتی تھی۔“

بیرٹ نے شانے اچکائے۔ ”جوش میں آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”ماضی کی باتوں پر بحث مباحثے سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اس کے علاوہ میں یہاں تمہارا قرض چکانے آیا ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے تم وہ پانچ ہزار ڈالر ساتھ لائے ہو جو تم پر واجب الادا ہیں؟“

بیرٹ نے کہا۔ ”میں ہونولولو میں کاروباری طور پر ناکام رہا، حتیٰ کہ کنگال ہوگیا۔ نہ جانے کیوں میں اسٹور پر توجہ مرکوز نہیں رکھ پایا۔ اب میرے پاس ایک ہی بیش قیمت چیز باقی بچی ہے۔ ایسی چیز جسے پانے کی تمہیں ہمیشہ خواہش رہی ہے اور تم نے اسے ہتھیانے کی کئی بار کوشش کی ہے۔ اس کی مالیت بہ آسانی پانچ ہزار ڈالر کے مساوی ہے۔ اس بکس میں، جسے میں اپنے ساتھ لایا ہوں، وہ چیز ہے جو تمہارا مقدر بننے والی ہے۔“

”تمہارا مطلب بدھ کا طلائی مجسمہ تو نہیں ہے؟“

”میرے جانے کے بعد تم کھول کر دیکھ سکتے ہو۔“

”کیا یہ بدھ کا مجسمہ ہے؟“ میں اپنے لہجے میں لالچ کی پکار نہ چھپا پایا۔ وہ مجسمہ اتنی دولت ساتھ لاتا کہ سارے دلدر دور ہوجاتے۔ میں اس چوہے دان سے نکل کر کسی چھوٹے سے قصبے میں نئی زندگی کا آغاز کرسکتا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کہا کہ اس بکس کے اندر کیا ہے۔“ بیرٹ نے جواب دیا۔ ”یہ پتا لگانا تمہارا کام ہے۔“

”تم...... احمق کہیں کے!“

میں نے وہ بکس بیرٹ سے چھین لیا اور اسے کھولنے لگا۔

”نہیں!“ بیرٹ چیخ اٹھا۔

اس کے ہیجانی انتباہ نے مجھے لمحہ بھر کے لیے مفلوج کردیا۔ میں نے بکس کو احتیاط سے میز پر رکھ دیا اور شک بھری نظروں سے بیرٹ کی طرف دیکھا جو الٹے پاؤں دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”بکس میں کیا ہے؟“ میں نے تقاضا کیا پھر جھٹکے سے ریوالور نکالا اور اس کا رخ بیرٹ کی طرف کردیا۔ ”بتاؤ مجھے!“

بیرٹ نے دروازے کا لٹو گرفت میں لے لیا۔ ”تم مجھے گولی نہیں مارو گے۔“ اس نے کہا۔ ”ویسے بھی تمہارا ہاتھ جس بری طرح لرز رہا ہے، مجھے یقین ہے تم نے گھوڑا دبا بھی دیا تو تمہارا نشانہ خطا ہوجائے گا۔ ویسے بھی تم میں اتنا خطرناک قدم اٹھانے کی جرأت نہیں ہے۔“

”لعنت ہو تم پر۔ مجھے بتاؤ کہ بکس میں کیا ہے؟“ لیکن ریوالور کا رخ خلا کی طرف تھا۔ بیرٹ دروازے سے نکل کر اندھیروں میں گم ہوچکا تھا۔ میرا ریوالور بردار بازو جھکتا چلا گیا۔ میری مضطرب نظریں کمرے میں واپس لوٹ آئیں اور بکس پر مرکوز ہوگئیں۔

میں کئی لمحوں تک ساکت کھڑا سوچتا رہا۔ اگر بیرٹ سے خوب اچھی طرح واقف نہ ہوتا تو ابھی آگے بڑھ کے بکس کھول دیتا لیکن بیرٹ بے حد چالاک شخص تھا۔ اس پورے معاملے کو ایک بھیانک مذاق میں تبدیل کردینا اس کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ بیرٹ بہ آسانی اس بکس میں بم نصب کرسکتا تھا۔ یا کوئی بھی ایسی کارروائی جس سے اسے ذہنی تسکین حاصل

UUNOVELS.COM

ہو سکے۔ وہ ہونولولو سے یہاں تک اپنے بدترین دشمن کو بدھ کا طلائی مجسمہ دینے نہیں آ سکتا تھا۔

جتنا سوچتا گیا، میرا یقین پختہ ہوتا گیا کہ ہیرٹ نے کوئی جال بچھایا ہے۔ میں نے احتیاط سے چھوٹا سا لیکن بھاری بکس اٹھایا اور اسے غسل خانے میں لے گیا اور نہانے کا ٹب بھرنے کے لیے ٹونٹی کھول دی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جیسے ہی ٹب بھرے گا، یہ بکس پانی میں ڈبو دوں گا۔ اگر اس میں بم ہوا تو پانی میں بھیگنے سے ناکارہ ہو جائے گا۔ اگر اس میں بدھ کا مجسمہ ہوا تو غسل سے اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔

ٹب پورا بھرنے ہی والا تھا کہ ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ اگر اس بم کو پھٹنے کے لیے پانی ہی درکار ہو تو کیا بنے گا؟ ادھر میں اس بکس کو غوطہ کھلا رہا ہوں گا اور ادھر وہ عین میرے منہ پر پھٹ پڑے گا۔

نہیں، میں بکس پر پانی استعمال نہیں کروں گا۔

بے بسی کے احساس نے مجھے مضمحل کر ڈالا۔ میں بکس اٹھائے دوبارہ نشست گاہ میں آ گیا۔ میری نظریں کھڑکی کی طرف اٹھیں اور چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا ایک آسان طریقہ موجود تھا۔ کیوں نہ اس لعنتی بکس کو کھڑکی سے باہر اچھال کر اس سے جان چھڑالی جائے؟

میں تیز قدموں سے کھڑکی کی طرف بڑھا اور بکس کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر باہر پھینکنے لگا۔ میں اپنے ذہن کی آنکھ سے بکس کو نیچے فٹ پاتھ پر دھماکے سے پھٹتے دیکھ رہا تھا۔

لیکن میں یہاں کوئی دھماکا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہی پولیس کی تحقیقات کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ میں ان کی شکلیں دیکھنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔

میں نے ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کی تو پیشانی سے پسینا پھوٹ پڑا۔ ہو سکتا ہے میں خواہ مخواہ دور افتادہ نتائج پر چھلانگ لگا رہا ہوں لیکن اس معاملے میں پُر یقین ہونا بھی ضروری تھا لیکن ایسا کیوں کر ہو؟

اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میرے وجود میں سرد لہر دوڑ گئی۔ میں نے بکس احتیاط سے میز پر رکھا اور فون کی طرف بڑھا۔ ریسیور اٹھا کر بڑبڑایا۔ ”ہاں!“

وہ آواز ہیرٹ ہی کی تھی۔ اس نے کہا۔ ”کیا یہ تم ہو ملنسن؟“

”ہاں، تم کہاں ہو؟“

”تم سے دو بلاک کے فاصلے پر ایک شراب خانے میں۔“

وہ ہنسا اور بات آگے بڑھائی۔ ”تو تم نے ابھی تک بکس نہیں کھولا! میں نے درست کہا نا؟“

”نہیں لیکن تم یہ کیسے جانتے ہو؟“

”جتنا چاہے وقت لگاؤ ملنسن۔ اس پر نہایت احتیاط سے سوچو۔ ہر پہلو پر غور کرو۔ ہر زاویے پر!“

”ہیرٹ، نہیں تمہیں مجھے بتانا پڑے گا! ہیرٹ! ہیرٹ!“

میری چیخ و پکار بے سود رہی۔ فون لائن بے جان ہو چکی تھی۔

میں نے فون ڈائریکٹری اٹھائی اور تیزی سے ورق الٹنے لگا۔ قرب و جوار میں صرف ایک ہی شراب خانہ تھا، بلیک کیٹ۔ میں نے فون نمبر ڈھونڈ کر ملایا۔ ایک بھرائی ہوئی آواز نے جواب دیا۔ ”بلیک کیٹ۔ میں بارٹینڈر بات کر رہا ہوں۔“

ملنسن نے کہا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے ایک شخص نے یہ فون استعمال کیا تھا۔ کیا وہ اب بھی وہاں موجود ہے؟“

”نہیں۔ وہ چند لمحے پہلے یہاں سے چلا گیا ہے۔“

”کیا تم اسے ڈھونڈ کے فون پر لا سکتے ہو؟ بہت اہم کام ہے۔“

”دیکھیں محترم، میں یہاں تنہا ہوں۔ میں اپنی جگہ چھوڑ کے نہیں جا سکتا۔“

”کیا اس نے بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟“ میں نے انتہائی احمقانہ سوال پوچھا۔

”لوگ مجھے اپنے معاملات نہیں بتاتے جناب۔“ بارٹینڈر نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

میں نے فون کا ریسیور رکھ دیا۔ ہیرٹ کہاں گیا ہو گا؟ کہاں؟ آخر کہاں؟

اسٹکٹن کا ساحلی نشیب! بلاشبہ وہ وہیں گیا ہو گا۔ میں نے بتایا تھا کہ وہ وہیں قریب ہی اپنے دوستوں کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے اور تقریباً روزانہ ساحلی نشیب کی سیر کو جاتا ہے لیکن ہو سکتا ہے ہیرٹ نے جان بوجھ کر یہ معلومات مجھے فراہم کی ہوں۔ عین ممکن ہے یہ ایک جال ہو اور ہیرٹ اس ہلاکت خیز بکس کے ناکام ہونے کی صورت میں مجھے قتل کرنے کے لیے وہاں گھیر کے لانا چاہتا ہو۔

میری گرفت جیب میں موجود ریوالور پر مضبوط ہو گئی۔ نہیں، اگر یہ کوئی جال بھی ہے تو مرنے والا میں نہیں، کوئی اور ہو گا۔

میں نے برق رفتاری سے ایک منصوبہ بنایا۔ بکس کو گاڑی میں اپنے ساتھ ساحلی نشیب تک لے جاؤں گا اگر ہیرٹ وہاں موجود ہوا تو میں اسے بکس کے بارے میں زبان کھولنے پر مجبور کر دوں گا۔ تاہم اگر تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو میں بکس کو

UUNOVELS.COM

پہاڑی کگر سے سمندر میں اچھال دوں گا۔ یہ ایک موزوں ترین جگہ تھی۔ ساحلی نشیب سمندر کے ساتھ الگ تھلگ مقام پر واقع تھا۔ اگر بکس میں بم ہوا اور وہ پھٹ گیا تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔

ایک گھنٹے بعد میں نے اپنی نیلی کوپے گاڑی ساحلی نشیب کے کنارے روک دی۔ یہ ایک بنجر، غیر آباد جگہ تھی جہاں زمین اچانک سینکڑوں فٹ پستی اختیار کر کے ایک عمودی دیوار میں ڈھل گئی تھی جس کے نچلے حصے سے بحرالکاہل کی موجیں سر ٹکراتی تھیں۔ وہ لگ بھگ تین سو گز دور شاہراہ پر دوڑتی گاڑیاں دیکھ سکتا تھا۔ اس لمحے وہ وہاں اکیلا تھا۔

میں خود کو نہایت مضمحل محسوس کر رہا تھا کیوں کہ میں بیرٹ کی اگلی چال بھانپنے میں ناکام رہا تھا۔ شدید غصے میں گرفتار تھا۔ بالآخر میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس لعنتی بکس سے جان چھڑا کے اپنے ذہن کو بوجھ سے آزاد کرلوں گا۔

میں نے گاڑی کی عقبی نشست پر نرم گدیوں کے درمیان رکھا بکس احتیاط سے اٹھایا اور عمودی نشیب کے کنارے کی طرف بڑھا۔ سر چکرا دینے والی پستی میں جھانکا۔ وہ سنگلاخ چٹانوں کی دو سو فٹ بلند عمودی دیوار کے نچلے حصے سے ٹکراتی منہ زور موجیں بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ یہ انتہائی طویل ڈھلان تھی جو تنگ، سرمئی ساحل پر ختم ہوتی تھی۔

میں نے بکس کگر سے نیچے اچھال دیا اور اپنی گاڑی کی طرف دوڑ پڑا۔ بکس کے پتھروں سے ٹکرانے کی آواز سنی۔ پتھروں سے ٹکرا کر اچھلنے کے نتیجے میں کئی دھاتی آوازیں بلند ہوئیں لیکن کوئی دھماکا نہیں ہوا!

میری بھنویں تن گئیں۔ میں چل کر نشیب کے کنارے پر پہنچا اور احتیاط سے نیچے جھانکا۔ نیچے چٹانوں اور ریت کی تنگ پٹی پر کوئی چھوٹی سی، سنہری چیز چمکتی دکھائی دی۔ وہ یقیناً بدھ کا طلائی مجسمہ تھا۔

ہیجان کے مارے دھڑکنیں بے قابو ہونے لگیں۔ میں نے اپنے ہاتھوں اپنا سب سے قیمتی خزانہ پھینک دیا تھا۔ میں بلا سوچے سمجھے کنارے سے نیچے جھکا اور خطرناک ڈھلان اترنے لگا۔ میرا ذہن نادر مجسمے کے علاوہ کچھ نہیں سوچ پا رہا تھا۔ وہ میرا انعام میرا اثاثہ تھا۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہیے تھا۔

میں نے نصف فاصلہ طے کیا تھا کہ تھکن کا غلبہ ہونے لگا۔ ہاتھ پسینے کی وجہ سے پھسل رہے تھے۔ دُکھتے پاؤں سنگلاخ چٹانوں میں مزید کھانچے نہیں ڈھونڈ پا رہے تھے۔ میں یہاں سے اوپر جا سکتا تھا نہ ہی نیچے۔ اب میں حواس باختہ ہونے لگا۔

تبھی میں نے کسی قریب آتی گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ میں نے مدد کے لیے ہانک لگائی۔ پوری قوت سے چیخے جا رہا تھا۔

بالآخر کگر کے کنارے ایک شخص کا دھندلا سا وجود نمودار ہوا۔ وہ دلچسپی سے خالی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

وہ بیرٹ تھا۔

''میری مدد کرو۔'' میں بلبلایا۔

''لیکن کیوں؟'' بیرٹ نے پوچھا۔ اس کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

''میں اعتراف کرلوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ملڈ ریڈ کو میں نے قتل کیا ہے...... کیوں کہ وہ مجھے اپنانے کو تیار نہیں تھی۔ جب ہم جہاز پر ملے تو اس نے کہا کہ وہ صرف تم سے محبت کرتی ہے اور یہ کہ تمہیں چھوڑ کے آنا اس کا پاگل پن تھا۔ وہ جہاز لنگر انداز ہوتے ہی واپس ہونولولو جانے والی تھی۔ میں نے اسے قتل کر کے سمندر میں پھینک دیا۔ اب تو میری مدد کرو۔''

بیرٹ اپنی جگہ جم کے کھڑا رہا۔

''یہ سب مذاق ہے ناں؟'' میں نے جنونی لہجے میں پوچھا۔ ''یہ تمہارے مذاقوں میں سے ایک ہے۔ تم نے بکس کے بارے میں میرے شک کو ہوا دی۔ تم جانتے تھے میں اس سے جان چھڑانے کی کوشش کروں گا۔ تم اپنی چال کامیاب ہونے پر اب جی بھر کے ہنس سکتے ہو لیکن خدا کے لیے!''

بیرٹ کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔

میں چلایا۔ ''میں زیادہ دیر اپنا وزن نہیں سنبھال سکتا۔ کچھ کرو۔''

''مجھے جو کرنا تھا، پہلے ہی کر چکا ہوں۔'' بیرٹ نے جواب دیا۔ ''میں نے تمہارا قرض بے باق کر دیا ہے۔ صرف اتنا سا فرق ہے کہ نیچے موجود بدھا کا مجسمہ اصل نہیں ہے۔ ایک گھٹیا نمونہ ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔''

اس کے ساتھ ہی بیرٹ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

ادھر میری انگلیاں جواب دے گئی تھیں۔ میں اتھاہ گہرائیوں کی طرف پھسل رہا تھا۔ جہاں شاید ملڈریڈ ابھی تک میری منتظر تھی۔

مجھے جب ہوش آیا تو میں ایک کشتی پر تھا۔ شاید ڈھلان سے سیدھا پانی میں گرا تھا۔ اس مچھیرے نے مجھے بچا لیا تھا لیکن اسے میں نے بتایا کہ پاؤں پھسلنے سے سمندر میں گرا تھا۔ اسے نام پتا بھی غلط بتایا تھا۔ اب تک میں فرضی نام سے بھاگ رہا ہوں تاکہ بیرٹ مجھے تلاش نہ کر لے۔

++

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

سفر پہلا پہلا

ندیم اقبال

احساسات، جذبات، فہم و فراست، حکمت و تدبر اور مشاہدے کو الفاظ کا پیرہن دینا۔ اندازِ بیان کے مختلف قرینوں، سلیقوں سے ناسٹلجیائی کیفیات اور عصری صورتِ حال کو اپنی اظہاری صلاحیت کے ذریعے قارئین کی نذر کرنا، اس طرح پیش کرنا کہ پہلی سطر سے آخری سطر تک قاری اسیر رہے۔ یہ کمال ہے ندیم اقبال کا۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' اور ''شمشال سے ٹورنٹو'' کے بعد ان کا یہ تیسرا سفر نامہ جو جوانی کے ابتدائی ایام کا احوال ہے اور ایک نئے انداز سے لکھا گیا ہے، قارئین کو پسند آئے گا۔

ایک نوجوان کے احساسات وجذبات میں گندھی سفر کہانی

میں آنکھیں پھاڑے کھڑا بے یقینی کے عالم میں دیکھے جا رہا تھا۔ اسے سلام کا جواب کیا دیتا، میں تو پلکیں جھپکانا بھی بھول گیا تھا۔ طارق اور سائیں کے ہاتھوں میں گیلی قمیصیں تھیں جس کی وجہ سے وہ شرمندہ شرمندہ تھے کیونکہ میرے سامنے کشمیرن کھڑی تھی اور ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ساتھ امتیاز اپنی دریافت لیے تفاخر سے کھڑا تھا۔

ہمارا یہ ٹرپ اتفاقات سے بھرا تھا۔ ایسے ایسے واقعات پیش آرہے تھے کہ عقل ماننے سے انکار کر دیتی۔ کشمیرن کا ذکر ہم تواتر سے کرتے آرہے تھے۔ طارق کو تنگ کر رہے تھے کہ اللہ کرے کشمیرن یہیں ہمیں ایبٹ آباد میں

مل جائے۔ وہ ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ ابھی وہ اپنا نام سن کر سامنے والے درخت سے کودی ہے۔

میں نے اس سفرنامے میں اس کھائی کا ذکر کیا تھا جہاں میں نے چیتے کی آواز سنی تھی اور دو لڑکیوں کو دیکھا تھا جو دیکھتے دیکھتے غائب ہو گئی تھیں۔ یہ پڑھ کر میرے ایک دوست نے رابطہ کر کے مجھے خوب سنائیں کہ یہ کیا بکواس لکھی ہے۔ ایسا بھی حقیقت میں ہوتا ہے؟ جب اس کے طعنوں سے زیادہ زچ ہوا تو میں نے اللہ کی قسم اٹھائی کہ یہ حقیقت ہے۔ میرے بارے میں وہ جانتا تھا کہ میں کبھی قسم نہیں کھاتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے قسم اٹھائی تو اسے ایکدم چپ لگ گئی۔ امتیاز نے اسے کنفرم کیا اور... دوبارہ سے فون کر کے کہا کہ یار اس واقعے کو اتنا مختصر کیوں لکھا ہے۔ اس پر ناول لکھتے۔ اس سفر میں ایسے انوکھے واقعات ہوتے رہے کہ ذہن کو سوچنے کا موقع بھی نہ مل سکا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں غزالہ کی یاد میں کھویا ہوتا تو کنول مل جاتی۔ کنول کے بچھڑنے کی اداسی ابھی ختم بھی نہ ہوتی تو اگلے مقام پر وہ پھر موجود ہوتی۔ ادھر ہم کشمیرن کا ذکر کر کے طارق سے کھیل رہے تھے کہ اچانک وہ سامنے آ کھڑی ہوئی۔

طارق کبھی اپنی گیلی شرٹ کو دیکھتا اور کبھی اسے دیکھتا۔ سائیں تو کہیں کھسک گیا تھا۔ میں تو اسے دیکھ کر سوچنے سمجھنے سے بھی معذور ہو گیا تھا۔ امتیاز بتا رہا تھا کہ وہ کینٹین میں کچھ آرڈر کرنے گیا تو یہ وہاں کھڑی تھی۔ جب میں نے سب کا بتایا تو ملنے چلی آئی۔ آہستہ آہستہ میرے ذہن نے اس کی موجودگی کو قبول کیا۔ پہلے تو میں سلام کا جواب دیتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا کہ میں جواب دوں اور وہ اچانک اپنے آنے کی طرح اچانک غائب ہو جائے۔

اتنے میں دوسرے لڑکے بھی خبر پا کر اکٹھے ہو گئے۔ ہم نے باری باری سلام کیا اور احترام میں لائن بنا کر کھڑے ہو گئے۔ طارق جب اس شناختی پریڈ سے گزرا تو وہ مسکرا دی۔ "یہاں کوئی ڈیرہ کی گرمی تو نہیں کہ صرف بنیان میں کھڑے ہیں؟"

طارق فوراً خیمے کے پیچھے گیا اور تنافٹ شرٹ چڑھا کر دوبارہ لائن میں اپنی جگہ آ کھڑا ہوا۔

وہ خوب صورت تو مجھے بھی لگتی تھی مگر جب یونیورسٹی کے لٹے لپٹائے ماحول سے نکل کر باہر کے رنگین ماحول میں دیکھا تو ادراک ہوا کہ وہ خوب صورت نہیں بلکہ بے حد حسین ہے۔ لطیف نے میرے کان میں پوچھا۔ "خوب صورت سے اوپر والا درجہ کون سا ہے۔" تو اسے بتایا کہ "حسین ہے۔" پھر پوچھا۔ "اس سے اوپر والا درجہ؟" تو پھر بتایا۔ "بے حد حسین۔"

"اس سے اوپر......"

"اس سے اوپر دنیا میں اپنے محبوب کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔"

یہ سن کر بولا۔ "آج مجھے یہ بے حد حسین سے بھی اوپر والے درجے پر نظر آ رہی ہے۔"

اتنے میں کینٹین سے تین لڑکیاں ایک ساتھ کسی کو ڈھونڈتے ہوئے نکلیں۔ کشمیرن کو دیکھا اور قریب آ کر اس کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ پھر ہم کو عجیب و غریب نظروں سے دیکھنے لگیں۔

کشمیرن نے بتایا۔ "یہ تینوں کراچی میں میری کلاس فیلوز تھیں۔ چند دن پہلے ہی میرے پاس گھومنے پھرنے ایبٹ آباد آئی ہیں۔"

فرید زیر لب بولا۔ "بڑی ظالم ہے کشمیرن بھابی! اتنا سارا حسن اکیلے لیے پھر رہی ہے۔"

ستار نے حیرت سے کہا۔ "آپ ادھر ہوٹل میں رکی ہوئی ہیں؟"

"ہوٹل میں کیوں؟ اپنا گھر ہے یہاں پر......"

"گھر تو آپ کا کشمیر میں ہے۔"

"وہاں ہے تو یہاں نہیں ہو سکتا۔" اس نے بھی حیرت سے پوچھا۔

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "دو دو گھر ہیں، یہاں بھی اور وہاں بھی۔"

اس کی ایک سہیلی نے ہمیں مزید حیرت میں ڈالتے ہوئے بتایا۔ "ایک گھر کراچی میں بھی ہے۔"

اب بہت سے لڑکے حیرت میں ڈوب کر بولے۔ "تین گھر ہیں؟"

اب کشمیرن حیرت زدہ کھڑی ہمیں دیکھنے لگی۔

شہزاد نے کشمیرن سے پوچھا۔ "آپ راولاکوٹ میں رہتی ہیں؟"

"نہیں ہم میرپور میں رہتے ہیں۔"

"طارق تو کہتا ہے کہ آپ راولاکوٹ کی ہیں۔"

اب کشمیرن نے گھور کر طارق کو دیکھا۔ "آپ کو کس نے کہا کہ میں راولاکوٹ کی ہوں؟"

طارق نے گھور کر شہزاد کو دیکھا۔ "میں نے تم کو کب

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

کہا یہ راولا کوٹ کی ہیں؟"

شہزاد نے گھور کر فرید کو دیکھا۔ "تو تم نے کہا تھا یہ راولا کوٹ کی ہیں؟"

فرید نے بے پروائی سے کہا۔ "ہاں میں نے کہا تھا۔"

امتیاز نے فرید سے پوچھا۔ "تم کو کس نے بتایا تھا یہ راولا کوٹ کی ہیں؟"

فرید بے نیازی سے بولا۔ "کسی نے بھی نہیں۔"

"تو تم نے شہزاد کو کیوں بولا کہ یہ راولا کوٹ کی ہیں۔"

"میں نے شہزاد کو بھی نہیں بولا کہ یہ راولا کوٹ کی ہیں۔"

"ابھی تو بولا تھا۔"

"وہ تو اس نے بولا تھا، کوئی بھی نہیں مان رہا تھا کہ اس نے کہا ہے یہ راولا کوٹ میں رہتی ہیں۔"

اب ہم سب فرید کو ایک ساتھ گھور رہے تھے اور فرید بے پروائی سے کھڑا دانت میں خلال کر رہا تھا اور لڑکیاں حیران کھڑی تھیں۔ اتنے میں تمام لڑکوں نے بیٹھنے کے لیے بھاگ بھاگ کر کرسیاں جمع کیں۔ دائرے میں انہیں قریب قریب رکھا اور ہر ایک اپنے ہمراہ انہیں بٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ انہوں نے بھی اپنی اپنی کرسیاں ذرا پیچھے گھسیٹیں اور ان پر براجمان ہو گئیں۔ پھر ہم سب میوزیکل چیئرز کے کھیل کی طرح ان سے قریب ترین کرسیوں کی جانب لپکے اور پھر جو بھی ہاتھ لگی اس پر بیٹھ گئے۔ طارق ایک کونے میں شرمایا لجایا سر جھکائے کسی دولہا کی طرح بیٹھا تھا۔ انہوں نے گرم شالیں اوڑھ رکھی تھیں۔ ہم نے بھی دیکھا دیکھی اپنی جیکٹیں چڑھالیں۔

شمیرن کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "یہاں کا چکن کارن سوپ بہت اچھا ہوتا ہے۔" پھر اپنی بھنویں اچکا کر اپنی بات جاری رکھی۔ "اور اس سردی میں تو ذائقہ اور بھی لاجواب ہوتا ہے۔"

میں نے سب دوستوں کو دیکھا تو وہ بھی بھنویں اچکائے تائیدی انداز میں سر ہلا رہے تھے۔ ان کی طرح میں نے بھی اپنی بھنویں اچکالیں۔

وہ مڑ کر جانے لگی تو فرید تیزی سے اٹھ کر اس کا راستہ روک کے کھڑا ہو گیا۔ "نہیں یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔"

وہ تھوڑی سی سہم گئی۔ "زیادتی کیوں ہے؟"

"طارق کے ہوتے ہوئے پیسے آپ دیں؟ نہیں پلیز نہیں۔"

وہ حیران پریشان کھڑی فرید کا چہرہ دیکھنے لگی۔ "کیا مطلب طارق کے ہوتے ہوئے؟"

"کیونکہ یہ ہمارا خزانچی ہے۔ پیسے وہی دے گا۔"

وہ ایک گہرا سانس لے کر مسکرائی۔ "یہاں میرا گھر ہے۔ آپ یہاں میرے مہمان ہیں۔ اس ناتے تو میرا بھی فرض بنتا ہے۔"

پھر فرید کو اشارہ کیا کہ راستے سے ہٹ جائے۔ جب فرید ایک سائیڈ پر ہوا تو وہ کینٹین کی جانب بڑھ گئی۔

وہ گئی تو ہم نے دوسری لڑکیوں کی جانب توجہ دی جو ابھی تک ہمیں ایسی عجیب و غریب نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

ستار نے انہیں دھمکاتے ہوئے پوچھا۔ "آخر آپ کیا سوچ کر ایبٹ آباد آئی ہیں؟"

ان تینوں میں ایک لڑکی عینک والی تھی۔ اسی لہجے میں اس نے جواب دیا۔ "کچھ خاص سوچ کر ایبٹ آباد آنا پڑتا ہے؟"

ستار نے اپنا لہجہ ایک دم نرم کر لیا۔ "میں نے تو صرف اس لیے پوچھا ہے کہ مجھے بقراط کا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔"

فرید نے کہا۔ "واقعہ کیا تھا؟"

ہم سب متوجہ ہو کر بیٹھ گئے۔

"بقراط نے ایک بار سقراط سے کہا تھا کہ کہیں بھی جانے سے پہلے ایک دو بار مجھ سے مشورہ ضرور کر لینا۔" یہ واقعہ بتا کر ستار آسمان کی طرف دیکھنے لگا اور ہم سب نے اپنی ہنسی دبانے کے لیے سر جھکا لیا۔

وہ بولی۔ "آئندہ کہیں جانے سے پہلے ہم بقراط سے تین بار مشورہ کریں گے۔"

شہزاد بولا۔ "یونیورسٹی میں سب مجھے شہزاد کہتے ہیں مگر اصل نام بقراط ہے۔"

وہ تینوں پھر سے ہمیں عجیب نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"ٹھنڈیانی آکر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟" فرید نے پوچھا۔

گلو اب فرید پر بھڑک اٹھا۔ "تم بتاؤ بنوں سے یہاں آکر تم کو کیسا لگ رہا ہے؟"

"ابھی تو مجھے بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔" فرید نے بہت ہی پر بہت زور دیا۔

اب شہزاد نے فرید پر اپنی بھڑاس نکالی۔ "تم کو اتنا اچھا لگ رہا ہے تو ان خوب صورت اور اسمارٹ لڑکیوں کو کراچی جیسے آلودہ شہر سے یہاں آکر اچھا نہیں لگے گا؟"

UUNOVELS.COM

امتیاز نے بھی فرید کو ڈانٹا۔ ''ان خوب صورت، اسمارٹ اور ذہین لڑکیوں سے یہ سوال پوچھنے کا تھا؟''

فرید نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''خود ہی تو کہا تھا کہ اصل بات سے پہلے ایسی رسمی باتیں پوچھی جاتی ہیں۔''

شہزاد نے فرید سے کہا۔ ''تمہارے سامنے پینڈو نہیں بلکہ کراچی کی خوب صورت، اسمارٹ، ذہین اور پڑھی لکھی لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ یہ فوراً سمجھ جاتی ہیں کہ رسمی بات کے بعد اصل بات بھی ہونے والی ہے۔''

''تو میں کیا کروں؟''

''سیدھا اصل بات کی طرف آؤ۔'' شہزاد بولا۔

وہ لڑکیاں بزبردستی مسکرا تو رہی تھیں مگر بجھی بجھی سی تھیں۔

اتنے میں کشمیرن سوپ کا آرڈر دے کر واپس کرسی پر آبیٹھی۔ ہم نے اپنی باتیں جاری رکھیں۔

عینک والی لڑکی کے ساتھ دو بغیر عینک والی لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ دونوں کی دلکشی میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ بس ایک قدرے صحت مند تھی اور دوسری قدرے کمزور۔ قدرے صحت مند لڑکی قدرے خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی جانب غیر ضروری مسکراہٹ پھینک کر سوال پوچھا۔

''ان دنوں کراچی کا موسم کیسا ہے؟''

اس نے احتیاط سے جواب دیا۔ ''معلوم نہیں دو دن سے خبرنامہ نہیں سنا۔''

''میں اپنے سوال کو قدرے تبدیل کر دیتا ہوں۔'' میں کرسی پر قدرے آگے کھسکتے ہوئے بولا۔ ''آپ کے خیال میں ان دنوں وہاں کا موسم کیسا ہونا چاہیے؟''

اس نے احتیاط کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا اور جواب دیا۔ ''میرے خیال میں گرمی کے ساتھ ساتھ حبس بھی ہونا چاہیے۔''

''اچھا؟'' مجھے مصنوعی حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ''پھر تو آپ کو بہت پسینا آتا ہوگا۔''

''اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ کیا آپ کو پسینا نہیں آتا۔''

''حبس نہ بھی ہو تو مجھے بڑا پسینا آتا ہے۔''

''تو پھر......؟'' وہ تنک کر بولی۔

''میں تو سیدھا دریا پر نہانے چلا جاتا ہوں۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے پھر اس سے پوچھا۔ ''جب آپ کو پسینا آتا ہے تو آپ کیا کرتی ہیں؟''

وہ خاموش تو پہلے ہی تھی مگر اب گھورنے بھی لگی تھی۔

فرید بتانے لگا۔ ''میرا بڑا بھائی ایک بار کراچی حاجیوں کو چھوڑنے گیا تھا۔ واپس آکر اس نے بتایا تھا کہ اتنا حبس وہاں ہوتا ہے کہ نہاتے وقت بھی پسینا آتا ہے۔''

اس بات پر کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''ہوا چلتی ہے؟'' گلو نے تینوں لڑکیوں سے مشترکہ سوال کیا۔

جواب بغیر عینک والی لڑکی نے دیا۔ ''سمندر سے سی بریز چلتی ہے؟''

''ہمارے ہاں دریا سے ریور بریز چلتی ہے۔'' میں نے کہا۔

شہزاد نے بغیر عینک والی دوسری لڑکی سے پوچھا۔ ''سی بریز روزانہ چلتی ہے؟''

''ہاں تقریباً ہر روز چلتی ہے۔''

حیرت سے اس لڑکی کو دیکھ کر شہزاد بولا۔ ''سمندر سے ہوا بھی ہر روز چلتی ہے اور آپ کو پھر بھی پسینا آتا ہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔''

امتیاز نے کہا۔ ''سمندری ہوا کا حکومت ٹھیک طریقے سے فائدہ اٹھالے تو بڑا فائدہ ہوگا۔ اس سے بجلی بھی بن سکتی ہے اور دیکھنا کراچی میں کسی کو پسینا بھی نہیں آئے گا۔''

وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں کہ کتنے احمق ہیں۔ پسینے کی جان ہی نہیں چھوڑ رہے۔ کشمیرن واپس آکر بیٹھ چکی تھی اور مسلسل مسکرا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ہماری کلاس ایسی الٹی سیدھی باتوں سے دوسروں کو زچ کرنے کی کوشش میں رہتی ہے۔

''کراچی کتنا بڑا شہر ہے؟'' امتیاز نے معلومات لینے کی غرض سے پوچھا۔

عینک والی نے جواب دیا۔ ''بہت بڑا شہر ہے۔''

''کچھ تو بتائیں کتنا بڑا؟''

تنگ آکر بازو پھیلاتے۔ ''اتنا بڑا۔''

فرید حیرت سے بول پڑا۔ ''اتنا بڑا شہر؟'' پھر شہزاد کی جانب گھوما۔ ''اب کراچی دیکھنے جانا پڑے گا۔''

شہزاد نے فرید کی جانب تو کوئی توجہ نہ دی مگر عینک والی کو کہا۔ ''اتنا بڑا شہر تو ہم نے ٹی وی پر بھی نہیں دیکھا۔''

لطیف نے شہزاد سے کہا۔ ''میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔ اب کراچی نہیں اسلام آباد شفٹ ہوں گا۔''

کشمیرن بولی۔ ''شہر اگر بڑا ہے تو اس میں پریشانی کی

کون سی بات ہے؟''

لطیف بولا۔ ''میں اکثر بڑے شہر میں گم ہو جاتا ہوں۔''

وہ مسکرانے لگی۔ ''بے فکر ہو جائیں آپ گم نہیں ہوں گے۔''

''آپ نہیں۔ ان تینوں میں سے کوئی ایک تسلی دے تو رضا مند ہوں گا۔'' یہ کہہ کر شرمانے لگا۔

بغیر عینک والی قدرے کمزور لڑکی مسکرا کر بولی۔ ''میری بات پر اعتماد کریں آپ گم نہیں ہوں گے۔''

فرید اس لڑکی کو بتانے لگا۔ ''دو بار اور کہیں تو یہ تب ہاں کرے گا۔''

وہ سب خاموش ہو کر مسکرانے لگیں۔

خاموشی توڑنے کی غرض سے کسی نے سوال پوچھا۔ ''اگر آپ کا رشتے دار کراچی کے دوسرے کونے میں رہتا ہو تو کیا آپ وہاں اگلے دن پہنچتی ہیں؟''

ایک لڑکی نے کہا۔ ''اگلے دن کیوں پہنچیں گے؟''

''مگر واپسی تو اگلے دن ہوتی ہو گی؟''

''نہیں اسی دن واپسی ہو جاتی ہے۔''

ستار نے بتایا۔ ''یہ پھر ملنے جاتے بھی نہیں ہوں گے۔ راستے میں بریانی، نہاری کھا کر واپس آجاتے ہوں گے اور محلے میں کہتے ہوں گے کہ ماموں کے گھر گئے تھے۔''

''ستار بھائی کیسی بات کر رہے ہیں؟ کبھی ایسا بھی ہوا ہے؟'' کشمیرن بولی۔

''ہوا ہے۔ جیسے ہمارے ڈیرہ میں کراچی کے حاجی ہوتے ہیں۔ چار چار ماہ کراچی میں پڑے رہتے ہیں مگر سمندری جہاز پر جگہ نہیں ملتی! پھر خود ہی ہار ڈالے واپس آجاتے ہیں کہ حج کر آئے۔ وہاں ٹاور کے علاقے سے ٹوپیاں اور تسبیحاں بھی لے آتے ہیں۔''

فرید نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ کے نام بھی آپ لوگوں کی طرح بہت خوب صورت ہوں گے۔ ویسے نام ہیں کیا آپ کے؟''

وہ ہنسنے لگیں۔ چشمے والی لڑکی نے اپنا نام طاہرہ بتایا۔ بغیر چشمے والی اسمارٹ لڑکی نے ثروت بتایا۔ صحت مند اور بہت سنجیدہ لڑکی خالدہ تھی۔

اس کے بعد فرید خود سے شروع ہو کر سب کے نام بتانے لگا۔ ''فرید، طارق، لطیف، فرید، امتیاز، فرید، سائیں، شہزاد ندیم اور آخر میں بھی فرید۔''

یہ سن کر وہ پہلی بار ہلکا سا مسکرائی۔

کسی نے پوچھا۔ ''آپ یونیورسٹی میں کیا پڑھتی ہیں؟''

سائیں پہلی بار بولے۔ ''بچیاں ہیں۔ ابھی تو اسکول جاتی ہوں گی۔''

یہ سن کر وہ دل کھول کے مسکرائیں۔ ایک بولی۔ ''ہم تینوں یونیورسٹی میں مختلف کورس کر رہی ہیں۔''

شہزاد کو بھی مصنوعی حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا۔ ''مختلف کورس؟ مجھے بھی مختلف کورس میں ماسٹر کرنے کا بہت شوق تھا۔ داخلہ ہی نہیں ملا اور تو اور کابل یونیورسٹی میں بھی فارم بھیجے آخر کار فارمیسی میں داخلہ لے لیا۔ مختلف کورسز کا میرٹ بہت ہائی ہوتا ہے۔''

سب لڑکیاں اب تھوڑا سا کھل کر ہنس رہی تھیں۔

کشمیرن ہنس کر کہنے لگی۔ ''آپ لوگ آپس میں بہت مذاق کرتے ہیں۔ ٹرپ کو تو بہت انجوائے کیا ہو گا۔''

میں بولا۔ ''ہاں بہت انجوائے کیا ہے اور طارق نے تو بہت زیادہ انجوائے کیا ہے۔''

اب طارق بیٹھا مجھے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ طارق کی جانب متوجہ ہوئی۔ ''آپ اتنے شرمائے ہوئے کیوں بیٹھے ہیں۔ بھیگنے سے سردی تو نہیں لگ رہی۔''

جواب گلو نے دیا۔ ''یہ پانی سے نہیں کسی کے پیار میں بھیگا بیٹھا ہے۔''

''بہت خوب۔ لگتا ہے اسے پہاڑوں پر کوئی پسند آگئی ہے؟'' کشمیرن ہنس کر بولی۔

اس سوال کا جواب میں نے دینا مناسب سمجھا۔

''بھابی! اوہ سوری باجی۔ پسند تو میدانوں میں آئی تھی مگر ملی اب پہاڑوں پر ہے۔''

''ندیم شرم کرو۔ تم سے چھوٹی نہیں تو بڑی بھی نہیں ہوں گی اور تم مجھے باجی کہہ رہے ہو؟''

''باجی اس لیے نہیں کہہ رہا کہ خدانخواستہ آپ مجھ سے بڑی ہیں۔ میرے اندر سے آواز اٹھ رہی ہے کہ آپ کو بھابی بھابی سوری...... یعنی باجی باجی کہوں۔''

وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے مجھے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

''بتاؤ تم کو بھی پہاڑوں پر کوئی پسند آئی۔''

''ہاں ایک تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ ٹرپ پر ہے۔ جہاں وہ لوگ جاتے تھے ہم بھی وہیں ہوتے تھے۔ ہر نئی جگہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم حیران رہ جاتے۔ یہی حیرت ایک رابطہ بن گئی۔ کل ہم شملہ پہاڑی پر بیٹھے تھے اور وہ وہاں بھی مل گئی تھی۔''

''کیا معلوم وہ ناران میں بھی ہو؟'' کشمیرن نے کہا۔ /

UUNOVELS.COM

"تاران میں نظر آئی تو مجھے کوئی حیرت نہ ہوگی۔"

"مطلب یہ کہ چند دن کے ٹرپ پر تم نے بھی طارق کی طرح کوئی لڑکی پسند کرلی۔"

"طارق اور میرا کیس مختلف ہے بھابی۔" سر جھکاتے ہوئے فوراً کہا۔ "آئی ایم سوری باجی۔ معلوم نہیں میرے منہ سے یہ بھابی لفظ کیوں نکل رہا ہے؟"

وہ بولی۔ "کوئی بات نہیں تم کچھ بتا رہے تھے۔"

"مجھے یہ پتا نہیں؟" میں کشمیرن سے براہِ راست مخاطب ہوا۔ "اگر کسی کو ایک لڑکی پسند آجائے تو کیا اسے شرماتے رہنا چاہیے یا وہ لڑکی تک اپنے دل کی بات پہنچا دے۔"

"بالکل بتا دینا چاہیے جیسے کئی بار تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکی خواہش کر رہی ہوتی ہے کہ وہ مجھ سے کچھ کہے۔"

میں نے طارق کی جانب اشارہ کر کے اس سے کہا۔ "سن رہے ہو بھابی..... یعنی باجی کیا کہہ رہی ہے۔ اب بھی چپ رہے تو ہم میں سے کوئی اپنی بات اس سے کرے گا۔ پھر نہ کہنا خبر نہ ہوئی۔"

پھر میں نے تائیدی انداز سے سب کی جانب دیکھا۔ سب ہنسی دبائے بیٹھے تھے۔

میں نے کشمیرن سے کہا۔ "اب بھی اگر یہ اس سے بات نہیں کرتا تو میں لطیف سے کہوں گا وہ اپنی بات تو چلائے۔ پسند تو اسے بھی وہ بہت ہے۔"

کشمیرن ہنس کر بولی۔ "یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اس کو چپ رہنے کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔"

فرید نے پوچھا۔ "پھر طارق کا کیا ہوگا۔"

کشمیرن نے پتے کی بات کی۔ "یہ پھر لطیف کے ساتھ اپنی محبت کو دیکھ کر جلتا بھنتا رہے گا۔"

لطیف جھٹ سے بولا۔ "میری تو بیٹھے بٹھائے لاٹری نکل آئی۔"

وہ لطیف سے بولی۔ "یہ لاٹری نہیں بلکہ یہ تمہارا حق ہے اور دھیان سے۔ تم چپ رہ کر اس کو گنوا مت دینا۔"

"میرا بس چلے تو ابھی کے ابھی اظہار کیا بلکہ انگوٹھی بھی پیش کر دوں۔ میں اظہار میں نہیں گھبرانے والا۔"

وہ چٹکی بجا کر بولی۔ "یہ ہوئی ناں بات۔ ایسے لڑکوں کو لڑکیاں بہت پسند کرتی ہیں۔"

طارق قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

اتنے میں بڑے بڑے پیالوں میں گرم بھاپ اڑاتا سوپ میزوں پر رکھا گیا۔ ہر طرف پھیلی خنکی اور ٹھنڈی ہواؤں میں سوپ کی حدت سینے میں گزرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اردگرد کے درخت اندھیرے میں ڈوبے کھڑے تھے۔ دو بلبوں کی مدھم روشنی میں ایک یادگار محفل سجی تھی۔ لڑکیوں کے ملنے سے ہمارے ٹرپ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جس مقصد کے لیے ہم اپنی کلاس فیلوز لڑکیوں کو ٹرپ پر ساتھ لے آنا چاہتے تھے وہ مقصد ان لڑکیوں نے پورا کر دیا تھا۔ ہماری شرمائی اور لجائی لڑکیوں سے یہ بہتر تھیں کہ زندہ دلی سے ہم باتیں کر رہے تھے۔

سوپ کا بھرا چمچ حلق سے اتارنے کے فوراً بعد انکشاف کیا۔ "اگر سوپ گرم ہو تو ذائقہ کچھ اور ہوتا ہے۔"

طاہرہ نے اپنی چمکتی عینک درست کرنے کے بعد کہا۔ "تو آپ ٹھنڈا سوپ نہ پیا کریں۔"

گلو بولا۔ "میں رات دیر تک دوستوں میں رہتا ہوں۔ گھر آتا ہوں تو سوپ ٹھنڈا ہو چکا ہوتا ہے۔"

وہ بولی۔ "تو گرم کرلیا کریں۔"

"مجھے نہیں آتا سوپ گرم کرنا۔"

"اس میں کون سی بڑی بات ہے؟"

فرید نے کہا۔ "اس کی ماں کہتی ہے کہ میں اس کے لیے ایسی دلہن تلاش کروں گی جس میں تین خوبیاں ہوں۔ سوپ گرم کرنا جانتی ہو اور خوب صورت بھی ہو۔"

"اور تیسری خوبی؟" کسی نے پوچھا۔

وہ طاہرہ کی جانب اشارہ کر کے بولا۔ "یہی والی عینک بھی لگاتی ہو۔"

ستار نے کہا۔ "میں چاچی کو جا کر بتاتا ہوں کہ آپ کی بہو ہم نے ڈھونڈ لی ہے۔"

ہم سب گلو کو مبارک باد دینے لگے۔ طاہرہ ہمیں حیرت سے دیکھے جا رہی تھی۔

کشمیرن ہم سے مخاطب ہوئی۔ "اگر تم لوگوں کا اشارہ طاہرہ کی جانب ہے تو بھول جائیں۔ ویسے بھی یہ ٹھنڈا سوپ پیتی ہے۔"

ستار کہنے لگا۔ "ٹھنڈا سوپ پینے والی لڑکی کی تلاش میں تو میری امی ہیں۔ کہتی ہیں ٹھنڈا سوپ پیتی ہو، خوب صورت ہو اور بالکل یہی والی عینک بھی لگاتی ہو۔"

امتیاز نے اعتراض کیا۔ "شادی زندگی بھر کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہ بھی دیکھا جائے کہ ان کی عادتیں اور پسند بھی آپس میں ملتی ہیں کہ نہیں؟"

UUNOVELS.COM

سائیں نے نہایت مدبرانہ انداز سے کہا۔ ''نہیں نہیں، یہ تو بہت ضروری ہے۔ بچوں کا ذہنی ملاپ ہونا بہت ضروری ہے۔''

امتیاز نے طاہرہ سے پوچھا۔ ''آپ کو کرکٹ کا شوق ہے؟''

اس نے بتایا۔ ''بالکل نہیں ہے۔''

''زبردست، ستار کو بھی نہیں ہے۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''شاعری سے لگاؤ؟''

کچھ دیر سوچتی رہی۔ ''ہاں ہے۔''

''چلو دوسری عادت بھی ایک جیسی ہے۔ اس کو بھی شاعری پسند ہے۔''

''اب یہ بتائیں کیا آپ اداس اداس رہتی ہیں۔''

''میں نہیں بتاتی۔'' اس نے جواب دینے سے انکار کر دیا۔

''کیا بات ہے۔ ہو بہو اس کی یہی عادت ہے۔ اپنی اداسی یہ بھی نہیں بتاتا۔ طاہرہ اب پریشان بیٹھی تھی۔''

''آخری سوال۔'' امتیاز نے منت سماجت کرتے ہوئے پوچھا۔ ''گانے کس قسم کے پسند ہیں۔''

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ امتیاز نے سوال دہرایا اور تلخ لہجے میں بولی۔ ''میں کسی سے غیر ضروری بات نہیں کرتی۔''

''بالکل نہیں کرتیں؟'' حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بالکل نہیں کرتی۔''

امتیاز نے اعلان کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ عادت ستار کی امی کو پسند ہے۔ وہ بھی چاہتی ہیں میری چاند سی بہو غیر ضروری باتیں کسی سے نہ کرے۔'' اس نے طاہرہ سے کہا۔ ''آپ سو فیصد ستار اور اس کی امی کی پسند پر پوری اتر رہی ہیں۔''

پھر ہم سب اٹھ اٹھ کر ستار سے مصافحہ کرنے لگے۔ ہاتھ ملا کر اس کو مبارک باد دے رہے تھے۔ وہ بھی بڑی عاجزی سے ''خیر مبارک، خیر مبارک'' کہے جا رہا تھا۔

میں نے طاہرہ سے کہا۔ ''آپ کو شرعی حق حاصل ہے کہ آپ اس رشتے سے انکار کر سکتی ہیں۔''

وہ گھور کے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے پھر پوچھا اور وہ چپ بیٹھی رہی۔ میں سب سے بولا۔ ''بچی رضا مند ہے۔ شرما گئی ہے۔''

اب طاہرہ کے علاوہ سب لڑکیاں ہنس رہی تھیں مگر طاہرہ کی بھری آنکھیں دیکھیں تو ہم سب خاموش ہو گئے۔

لڑکوں نے بار بار اس کو سمجھایا کہ ہم صرف مذاق کر رہے تھے۔ تب کہیں جا کر وہ مطمئن ہوئی۔

مائیک گود میں واک مین رکھے بیٹھا بولنے کے لیے ہمت جمع کر رہا تھا کہ کشمیرن نے پوچھا۔ ''آپ کیسے ہیں؟''

دونوں انگوٹھے بلند کر کے بولا۔ ''فائن......''

''آپ نے اس ٹرپ کو انجوائے کیا؟''

کندھے اچکا کر بولا۔ ''ہاں ٹھیک رہا۔''

''تو آپ نے انجوائے نہیں کیا؟''

''آپ کو تو معلوم ہے میرا Life style ذرا Different ہے۔ میں Common People کی طرح ہر چیز کو انجوائے نہیں کرتا۔ یہ نہیں مون (چاند) کو شائن ہوتا دیکھوں اور خوش ہو جاؤں۔ فائر جلا کر اس کے around ڈانس کرنے لگوں۔ Monkeys دیکھوں تو ان کو گالیاں دینا شروع کر دوں۔ ایک سیدھا راستہ اوپر کو جا رہا ہے اور میں مشکل راستہ چن کر خود کو تھکا لوں۔ جہاں کولڈ واٹر بہتا دیکھوں اسی میں سر دے کر بیٹھ جاؤں۔ بے ایمانی کر کے اساتذہ کو تاش میں ہرا دوں۔ میری انجوائے منٹ تو یہ ہے کہ کوئی اچھی کتاب پڑھ کر اس سے Lesson حاصل کروں۔ ٹرپ کے دوران میں نے ٹائم بالکل Waste نہیں کیا۔ آپ تو میری روٹین جانتی ہیں۔ وہی بک ریڈنگ، میوزک سننا اور رات کے وقت deep sleeping & dreaming۔''

گلو پھٹ کر بولا۔ ''اس کے علاوہ ہر روز شرٹ واشنگ، No Bathing، No Talking، Never Laughing، Burger eating only اور Always weeping۔''

شکر تھا کہ سب کے ساتھ طاہرہ بھی ہنس پڑی۔ ورنہ اس کے رونے پر میں دل مسوس کیے بیٹھا تھا۔

میں نے کشمیرن سے کہا۔ ''ہم پرسوں ناران جا رہے ہیں آپ بھی ساتھ چلیں۔''

''نہیں ہم ایک دو دن میں خود جا رہے ہیں۔ میری دوست ناران دیکھنے ہی تو آئی ہیں۔''

''اکٹھے چلیں گے تو انجوائے کریں گے۔ آپ کہیں تو ہم ایک دن آپ لوگوں کے لیے رک جاتے ہیں۔''

''نہیں بہت شکریہ۔ ہم اپنے بھائی کے ساتھ جا رہے ہیں۔'' وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اب ہم کو شاید چلنا چاہیے۔''

''ابھی تو بہت ٹائم پڑا ہے کھانا یہیں اکٹھے کھا لیتے ہیں۔''

UUNOVELS.COM

"یہاں نہیں۔ ڈنر گھر پر تیار ہوگا۔"

"وہ کل کھالیں گے۔ ڈنر آج یہیں کر لیتے ہیں۔" فرید نے کہا۔

کشمیرن خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

کچھ لمحوں بعد امتیاز نے کشمیرن سے پوچھا۔ "آپ یہاں کیسے آئی ہیں؟"

"گاڑی پر......"

"اسے واپس بھیج دیں۔ ہم سوزوکی پر آپ لوگوں کو گھر ڈراپ کر دیں گے۔"

"کیسے واپس کر دوں؟ میں خود ہی تو ڈرائیو کر کے یہاں لائی ہوں۔"

"آپ کو جانے کی بہت جلدی ہے؟ ان تین معصوم لڑکیوں کو تو بیٹھنے دیں۔ ہم ان کو ڈراپ کر دیں گے۔" فرید نے خفگی سے کہا۔

وہ سب مسکرانے لگیں۔ ہم آپس میں آہستہ آہستہ بے تکلف ہوتے جا رہے تھے۔

کشمیرن سائیں سے پوچھنے لگی جو ٹانگ پر ٹانگ رکھے نظریں زمین پر گاڑے خاموش بیٹھا تھا۔

"سائیں بھائی آپ کیسے ہیں۔ بڑے خاموش بیٹھے ہیں؟"

سائیں سے پہلے فرید فٹ سے بولا۔ "مری میں انہوں نے دست شناسی کے ایسے جوہر دکھائے کہ ہمارا وہاں سے نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔"

وہ حیرت سے بولی۔ "یہ ہاتھ بھی دیکھتے ہیں؟"

"ایسا ویسا، یہ تو مذاق مذاق میں بات مال روڈ پر پھیل گئی۔ جب لوگوں کو ان کی خفیہ باتیں بتانے لگے تو رش پڑ گیا۔"

واپس جانے والی کشمیرن کرسی پر دوبارہ جم کر بیٹھ گئی۔ ہاتھ کی لکیریں دکھا کر اپنے بارے میں خوشخبریاں سننا ہر ایک کو اچھا لگتا ہے۔ فرید نے بھی یہ حربہ استعمال کیا اور کامیاب نظر آ رہا تھا۔ لڑکیاں اب دلچسپی سے سائیں کو دیکھتی ہوئی بیٹھی تھیں۔ فرید کی بات سن کر ہمارے علاوہ خود پیر سائیں بھی دلچسپی لینے لگے۔

"فرید بھائی بتائیں۔ کیا ہوا تھا مری میں؟"

فرید کے کان میں پیر سائیں نے کوئی بات کی۔ سننے کے بعد فرید بولا۔ "منع کر رہے ہیں کچھ نہیں بتاؤ۔ کہتے ہیں میں پہلے بھی ہاتھ دیکھ دیکھ کر تھک گیا ہوں۔"

ثروت نے دلچسپی لیتے ہوئے فرید سے پوچھا۔

"سائیں جی کو یہ علم آتا ہے؟"

"کیا مطلب آتا ہے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ خوابوں کی تعبیر بتاتے ہیں۔ زائچہ ایسا بناتے ہیں کہ سامنے والے کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ قبضے میں کئی عامل اور جنات ہیں۔ پہلے تو ہمیں بھی معلوم نہ تھا مگر ٹرپ میں ایسے واقعات ہوئے کہ انہیں اپنا راز خود فاش کرنا پڑ گیا۔"

وہ تعظیمی انداز سے سائیں کو دیکھ رہی تھیں اور سائیں آسمانوں کے بیچ ستاروں کے آس پاس کہیں پہنچے ہوئے تھے۔

کشمیرن نے فرید سے پوچھا۔ "جب اتنے بڑے عامل ہیں تو فارسی میں داخلہ کیوں لیا۔"

"مرشد کا حکم تھا۔ اسے کیسے ٹال سکتے تھے۔"

"اچھا مرشد بھی ان کے ہیں؟"

فرید طنزیہ لہجے میں بولا۔ "آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ بغیر مرشد کے یہ سارے علوم کس کو مل سکتے ہیں؟"

"اور ان کے مرشد کا مزار سندھ میں ہے۔" میں نے بتایا تو وہ حیران بیٹھی ہمیں تک رہی تھیں۔

خالدہ نے پوچھا۔ "مطلب کہ مرشد زندہ نہیں ہیں۔"

"بزرگوں کے بارے میں ایسے نہیں بولا کرتے۔ بزرگان دین دنیا کے لیے زندہ نہیں ہوتے مگر سائیں جیسے خاص خاص لوگوں کو ملاقات کا شرف دیتے ہیں۔ گو ان کے مرشد میرے آپ کے لیے پانچ سو سال پہلے رحلت فرما گئے مگر سائیں بیٹھے بیٹھے ان سے ملاقات کر آتے ہیں۔"

اب لڑکیاں ہماری توقع سے زیادہ متوجہ ہو چکی تھیں۔

طاہرہ فرید سے کہنے لگی۔ "آپ سائیں جی کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔"

فرید نے لاچاری سے کہا۔ "مگر آپ لوگوں کو دیر ہو رہی ہے۔"

طاہرہ کشمیرن کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "کچھ دیر ہم رک جائیں گے۔"

کشمیرن فٹافٹ کہنے لگی۔ "ہاں ہاں کچھ دیر ہم بیٹھے ہیں۔"

فرید کہانی بکنے لگا۔ "ہم سب دوست مری مال روڈ کی سائیڈ پر بیٹھے تھے۔ شام کا وقت تھا اور سیاحوں کا ہجوم تھا۔ ہمارے بے حد اصرار پر سائیں ہمارے ہاتھوں کی لکیریں دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے سمجھا یہ جوتشی ہیں۔ ایک فیملی ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ خاتون نے پوچھا۔ "یہ ہاتھ کی لکیریں

UUNOVELS.COM

دیکھتے ہیں؟" میں بولا۔ "دیکھتے ہیں مگر ایک روپیا بھی کسی سے نہیں لیتے۔ کوئی دینا بھی چاہے تو روٹھ جاتے ہیں۔ یعنی ناراض ہو جاتے ہیں۔" اس خاتون نے منت سماجت کی کہ میں نے لڑکیوں کے ہاتھ دکھانے ہیں۔ میں نے سائیں سے درخواست کی اور یہ بمشکل راضی ہوئے۔ ایک لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر بولے۔ گڑیا تو ابھی فرسٹ ایئر میں ہے اور وہ لڑکا تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ وہ لالچی ہے۔ تمہارے والد کی نوکری میں جو اوپر کی کمائی ہے اس لڑکے کی نظر اسی پر ہے۔ یہ سن کر اس خاتون نے پہلے تو اپنے مریل سے خاوند کو ڈانٹ کر دور کھڑا کر دیا اور سائیں سے بولی کہ آپ کو ان ساری باتوں کا کیسے پتا چلا؟ سائیں نے اس کو بولا کہ تو سائیں کے سامنے کھڑی ہے کسی سنارے کے سامنے نہیں۔

وہ خاتون تو ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ بولیں کہ مہربانی فرما کر میری لڑکی کی باتیں مجمع کے سامنے مت کریں اور آپ مدد کریں کہ لڑکی کا دھیان اس کمینے آوارہ لڑکے سے ہٹے۔ سائیں نے قلم کاغذ جیب سے نکال کر اس پر کچھ لکھا۔ کاغذ لپیٹ کر خاتون کے ہاتھ پر رکھ دیا تو وہ بولیں کہ اسے صبح گھول کر پلانا ہے؟ سائیں نے جواب دیا کہ خالہ یہ میرا ایڈریس ہے کوئی تعویذ نہیں۔ خط لکھ کر احوال لکھیں انشاء اللہ تعویذ کے ساتھ زائچہ بھی بنا کر خود حاضر ہو جاؤں گا۔

وہ خاتون بہ آواز بلند چادر اٹھا کر دعائیں دے رہی تھیں۔ پہلے تو لوگ سمجھے کہ سائیں کو بددعائیں دے رہی ہے۔ ایک دو لوگ غضب ناک ہو کر سائیں کی جانب بڑھے مگر وہ خاتون لوگوں اور سائیں کے بیچ میں آہنی دیوار بن کر کھڑی ہو گئیں۔ ان سے بولیں۔ کمینو اتنے بڑے عامل پر جوتے اٹھائے کھڑے ہو۔ جب لوگوں کو حقیقت کا ادراک ہوا تو سب پاؤں پڑ گئے۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ یہ اب خطرے سے باہر ہیں تو ہم دوست گھومنے پھرنے نکل گئے اور سائیں ان کے ہاتھ دیکھنے لگے۔ دو گھنٹے بعد واپسی ہوئی تو دیکھا سائیں کے گرد مجمع ویسے کا ویسے ہی لگا ہوا ہے۔ ان کے سامنے سڑک پر متعدد سکے، روپے اور دو دو روپے کے نوٹ پڑے ہیں۔ ایک لڑکے کا ہاتھ دیکھ کر اس سے کہہ رہے تھے اپنی ماں کی کمیٹی کے پیسے چرا کر مری گھومنے آئے ہو۔ وہ بے چاری دو دن سے بیٹھی رو رہی ہے۔ لڑکا بھی رونے لگا اور پھر اگلی صبح وہ پہلی بس پکڑ کر گھر نکل گیا۔

ان کی شہرت کشمیر پوائنٹ سے لے کر پنڈی پوائنٹ تک پھیل چکی تھی۔ بڑی مشکل سے ہم انہیں لوگوں سے چھڑوا کر واپس لے گئے۔

اگلی صبح ہم ناشتا کرنے مال روڈ گئے تو کہیں سے آواز آئی۔ "یہی ہے۔" پھر لوگ ہماری جانب تقریباً دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ ہم نے سمجھا کہ یہ آج ہمیں بہت ماریں گے۔ ان کے چہروں سے لگ رہا تھا کہ وہ جوش میں بھرے ہیں مگر وہ تو ان کو ہاتھ کی لکیریں دکھانے آ رہے تھے۔ پیسے تو یہ کسی سے نہیں لیتے ہیں لہٰذا کوئی نسوار، کوئی سگریٹ اور کوئی پان لیے چلا آ رہا ہے۔ رات والے پیسے بھی انہوں نے ہم میں بانٹ دیئے تھے۔

ایک خاتون ان کو دیکھ کر رونے لگیں کہ اس کی شکل میرے بیٹے سے بہت ملتی ہے۔ میں بولا۔ اماں انہیں بھی اپنا بیٹا سمجھو۔ مگر یہ تو بتا کہ وہ کب کھویا تھا۔ وہ روتے ہوئے بولیں وہ کھویا کہاں تھا۔ وہ تو مرا ہوا پیدا ہوا تھا۔

ایک بندہ سو روپے نکالے کھڑا تھا اور کہنے لگا کہ سو روپے لے لو مگر لاٹری کا نمبر بتا دو۔ اس سے پوچھا لاٹری کتنے کی نکلے گی تو بتایا بیس ہزار کی۔ سائیں بولے تجھے نمبر دینے سے بہتر نہیں کہ میں خود پانچ روپے کا ٹکٹ خرید لوں مگر سائیں تو لاٹری کو حرام سمجھتے ہیں۔ ٹکٹ نہ خود خریدی اور نہ اسے نمبر بتایا۔

امتیاز نے دخل دے کر ان سے پوچھا۔ "آپ لوگوں نے کیا ہاتھ دکھانا ہے؟"

وہ بولیں۔ "ہم نہیں دکھاتے۔ یہ تو سچ سچ بول دیتے ہیں۔"

فرید انہیں بتانے لگا کہ اب آپ نتھیا گلی کا واقعہ سنیں اگر یقین نہ آئے تو کل میرے ہمراہ نتھیا گلی چلیں۔ کسی سے بھی وہاں پوچھ لیں کہ پچھلے منگل کو نیلی پارک کے ساتھ کھائی میں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ ہر ایک آپ کو بتا کر حیران کر دے گا۔

پھر فرید نے کئی ایک سے قسمیں اٹھوا کر ان کو پورا واقعہ بتایا۔ درمیان میں اپنی طرف سے مرچ مسالا بھی لگا دیا۔ جہاں بات کچی ہوئی وہاں میرے یا امتیاز کے سر کی قسمیں اٹھانا شروع کر دیتا۔ جب انہیں بتایا کہ لڑکیاں دیکھتے دیکھتے نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئی تھیں اور ایک چیتے کے چنگھاڑنے کی آواز اتنی ہولناک تھی کہ ہم نے اوپر کھڑے ہو کر بھی سنی تھی۔ یہ سن کر کشمیرن سمیت سب لڑکیاں خوف زدہ ہو گئیں۔

فرید نے ان سے کہا۔ "ڈر لگ رہا ہے تو ذرا قریب کرسیاں کر لیں۔" ان میں سے تو کسی نے نہ کیں مگر ہم

UJUNOVELS.COM

کرسیاں کھسکا کر ذرا قریب ہو گئے۔

شہزاد ان سے بولا۔ ''حیرت ناک بات یہ تھی کہ ان دونوں کے کھائی میں اترتے ہی سائیں ہم سے بولا تھا کہ لڑکیاں جنات ہیں اور کھائی میں مرشد کا بھیجا ہوا چیتا گھوم رہا ہے۔'' یہ بات وہاں کھڑے کچھ مقامیوں نے سن لی اور انہوں نے سارا ماجرا پورے علاقے میں پھیلا دیا۔ یہ اگلے دو دن تک مقامی لوگوں کو تعویذ دینے کے علاوہ دم کرتے رہے۔

لطیف بولا۔ ''یہ بھی بتاؤ کہ چیتا بازہ گلی تک پیچھے پیچھے آ گیا تھا۔ یہ بھی بتاؤ کہ جنات بندر بن کر ملنے آئے تھے۔''

''اتنا کچھ ہوتا رہا اور آپ لوگوں کو ڈر نہیں لگا؟'' ثروت جو خاصی خوف زدہ نظر آ رہی تھی وہ بولی۔

شہزاد نے اس کو بتایا۔ ''اگر سائیں ہمارے ہمراہ نہ ہوتے تو ہم بھی آپ لوگوں کی طرح خوف زدہ ہو جاتے مگر یہ ہر وقت اپنے اور ہمارے گرد حصار کھینچے رکھتے ہیں۔ ہر صبح دم پڑھ کر سب پر پھونکتے ہیں۔ اب تو اکثر اوقات چاچا محمد شفیع صبح کی نماز پر اٹھانے کے لیے ہماری چارپائیاں ہلاتا رہتا ہے۔''

''چاچا محمد شفیع کون صاحب ہیں؟'' طاہرہ نے پوچھا۔

''ایک بزرگ جن ہیں۔ ہر وقت سائیں کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ اب بھی ان کے دائیں جانب کھڑے ہوں گے۔''

پھر تو لڑکیوں کی دبی دبی چیخیں بلند ہوئیں۔ ستار نے کھڑے ہو کر انہیں یقین دلایا کہ چاچا محمد شفیع تو ہماری حفاظت کے لیے ساتھ رہتے ہیں۔ اکثر تو نماز پڑھتے ہوئے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ بھی پھیر جاتے ہیں۔''

طاہرہ خوف زدہ ہو گئی۔ ''قسم اٹھائیں آپ مذاق کر رہے ہیں، قسم اٹھائیں۔''

اتنے میں تیز ہوا کا جھونکا آیا تو ارد گرد درختوں کے پتے کپکپانے لگے۔ وہ اور زیادہ ڈر گئی۔

گلو نے سائیں سے کہا کہ اسے ذرا دم کر دے۔

سائیں اٹھے اور تین قدم آگے آ کر اس کے سر پر کھڑے ہو گئے اور کچھ پڑھتے جا رہے تھے۔ پھر سب لڑکیوں پر ایسی پھونکیں ماریں کہ سائیں کی سیٹی بھی بج اٹھی۔

گلو نے کہا۔ ''چاچا محمد شفیع سے کہو کہ ان کے سر پر ہاتھ پھیر دیں تاکہ ان کی تسلی ہو جائے۔''

وہ بے چاری اتنی سہم گئی تھی کہ کانوں پر دونوں ہاتھ رکھے چلانے لگی۔

''نائیں نائیں (نہیں، نہیں) پلیز اسے منع کریں۔''

فرید اٹھ کر اس کی ڈھارس بندھانے کے لیے قریب جانے لگا تو دور سے چلا کر اسے روک دیا۔

''پلیز میرے سر پر ہاتھ نہیں رکھنا۔'' اور اس نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کی ہوئی تھیں۔ وہ فرید کو چاچا شفیع سمجھ بیٹھی تھی۔

سائیں بولا۔ ''بچیو! ڈر کیوں رہی ہو۔ میں بیٹھا ہوں ناں۔ میں بیٹھا ہوں ناں۔ دم کر دیا ہے تو اب کوئی تم لوگوں کے قریب نہیں آ سکتا۔''

یہ کہہ کر سائیں اچانک کھڑا ہوا اور جنگل کے اندر ایسے جھانکنے لگا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ اس طرح سے دیکھنے پر تو ہم بھی ڈر گئے تھے۔ لڑکیاں سہمی ہرنیوں کی طرح چونکی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ سائیں تیزی سے ان کے قریب سے گزرتا ہوا جنگل کی جانب بھاگا۔ ''میرے پیچھے کوئی نہ آئے۔'' یہ کہا اور جنگل میں گھس گیا۔

ہم حیران تھے کہ ایسا کیا نظر آ گیا کہ ماتھے پر شکنیں سجائے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ پھر دیکھا کہ درختوں تلے ملگجے اندھیرے میں کھڑے ہیں۔ بائیں ہاتھ کو بلند کر کے کسی کو رکنے کا اشارہ کیا اور دائیں ہاتھ کو ہلا کر کسی کو پیچھے جانے کا حکم دے رہے ہیں۔ یہ حرکت دیکھ کر ہم سب مسکرانے لگے مگر لڑکیاں انہیں مڑ مڑ کر دیکھے جا رہی تھیں۔

سائیں کچھ لمحوں بعد غصے میں سر ہلاتا واپس آ گیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ''پوچھ رہے تھے ناں جوان کا، آ گیا ہے۔''

حیران ہو کر کہا۔ ''اچھا، اکیلا ہے؟''

''مزار سے دو مرید بھی آئے ہیں۔''

''نہیں استاد جی۔''

''ہاں جندڑی۔''

''ادھر ہیں کہ انہیں چلتا کر دیا؟''

''بول دیا ہے کہ کوئی قریب آیا تو ٹھنڈے پانی میں ان کا قبرستان بنا دوں گا۔ ایک میل سے فاصلہ کم نہ ہونے پائے۔ بچیاں بیٹھی ہیں۔ دوست گپ شپ کر رہے ہیں۔ دماغ خراب ہو گیا ہے کہ نہ بندے دیکھتے ہو نہ جگہ اور گھسے چلے آتے ہو۔'' لڑکیاں سوالیہ نظروں سے آنکھیں پھاڑے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ ان سے تو کوئی سوال بھی نہیں بن پا رہا تھا۔ میں نے خود ہی جواب بنا کر ان کو بتایا۔

''بڑے مرشد نے حفاظت کے لیے ایک تازہ دم چیتا

UUNOVELS.COM

بھیجا ہے اور اپنے دربار کے خاص اور قابل اعتبار دو عدد جن بھی بھیجے ہیں مگر سائیں نے سیل پرے انہیں رہنے کا حکم دیا ہے۔"

خالدہ نے پوچھا۔ "چیتا کس طرح سے حفاظت کرے گا؟"

"دوسرے جنگلی جانوروں کو قریب آنے سے روکتا ہے۔"

"اور جنات......؟"

"ان کی موجودگی میں کوئی غیر مرئی مخلوق آپ لوگوں کے قریب نہیں آسکتی۔ اس کے لیے اگر انسان آپ کے لیے خطرہ بن جائیں تو یہ کوئی بھی روپ بدل کر لڑائی کر کے انہیں مار بھگاتے ہیں۔"

"اب وہ ہمارے قریب نہیں آئیں گے۔"

"قطعاً نہیں۔ جب تک سائیں آرڈر نہ دیں اور یا وہ ہمیں خطرے میں گھرا نہ دیکھ لیں۔"

لطیف نے سائیں سے درخواست کی کہ ان لڑکیوں کو اپنا کوئی چھوٹا سا واقعہ تو سنائیں۔

میں نے کہا۔ "انہیں یار چلتے ہیں۔ انہیں بھی دیر ہو رہی ہوگی اور ہمیں بھی بھوک لگی ہے۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

کشمیرن بولی۔ "ندیم بھائی! تھوڑی دیر اور بیٹھ جائیں ابھی تو سوپ پیا ہے۔ بھوک کہاں سے لگ گئی۔"

"آپ تو ڈری ہوئی بیٹھی ہیں۔ یونیورسٹی کھلے گی تو وہیں سن لینا۔" میں بولا۔

خالدہ بولی۔ "سائیں بھائی آپ اس کی مت سنیں۔ ہمیں تو سنائیں۔ یہ تو ہمارے لیے تھرل ہے۔"

سائیں بولے۔ "کئی بندے تھرل تھرل میں بھی پھڑک جاتے ہیں۔"

ثروت نے کہا۔ "سائیں سر! آپ نے دم کر دیا تو ہمارا ڈر بھی ختم ہو گیا۔ آپ بسم اللہ کریں۔"

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "استاد جی اب بسم اللہ کر بھی لیں۔ بچیوں نے بھی ضد پکڑی ہے۔"

کچھ لمحے سوچنے کے بعد سائیں گویا ہوئے۔

"یہ ایک سال پہلے کی بات ہے کہ مرشد نے حکم دیا کہ دو رات مسلسل قبرستان میں پڑھائی کرنی ہے۔ جمعرات اور جمعہ کی رات مجھے ایک وظیفہ مکمل کرنا تھا۔ شرط یہ تھی کہ قبر چالیس دن سے پرانی نہ ہو۔"

لطیف نے سوال کیا۔ "قبر کے سرہانے بیٹھ کر وظیفہ کرنا پڑتا ہے؟"

"بچیاں نہ بیٹھی ہوتیں تو آج میرے منہ سے کچھ نہ کچھ ضرور سنتے۔" یہ کہہ کر سائیں نے اسے سمجھاتے ہوئے بتایا۔ "وظیفہ قبر کے اندر بیٹھ کر کرنا تھا۔ سرہانے بیٹھ کر تو صرف بخشش کی دعا کی جاتی ہے۔"

ثروت نے اپنے پاؤں کرسی پر رکھ لیے تھے۔ چادر لپیٹے وہ بغور سن رہی تھی۔ باقی لڑکیاں بھی پلکیں تک نہیں جھپکا رہی تھیں۔

"قبر کا انتظام ہو گیا تھا۔ جاننے والے کی قبر تھی۔ نام نہیں بتاتا کیونکہ پھر لوگ اس کا مزار بنا لیں گے۔ عشاء قبرستان کی جنازہ گاہ میں باجماعت ادا کی۔"

"استاد جی جنازہ گاہ میں عشاء کی باجماعت کیا ہوتی ہے؟"

نفی میں تادیر سر ہلاتے رہے۔ "نہیں ہوتی مگر جب میں بھی جاتا ہوں تو باجماعت پڑھواتا ہوں۔ مقتدی نظر نہ آنے والی مسلمان مخلوق ہوتی ہے۔"

لڑکیوں کے علاوہ ہم میں سے بھی کچھ سن کر کسمسائے اور پھر سمٹ کر بیٹھ گئے۔

"نماز کی ادائیگی کے بعد میں قبر کے اندر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ مردہ مجھے سفید کفن میں لپٹا نظر آ رہا تھا۔ اپنی تسلی کے لیے کفن ہٹا کر چہرہ دیکھا کہ بندہ موجود ہے کوئی لے تو نہیں گیا۔"

"سائیں یہ مردے بھی کوئی لے جاتا ہے؟"

"یہ حکیم لے جاتے ہیں۔ انسانی ہڈیوں کا سرمہ بنا کر خاص الخاص دوائی بناتے ہیں۔"

"کون سی دوائی؟" لطیف نے پوچھا۔

"اب زیادہ ٹرٹر نہ کر۔ ایسا نہ ہو تیرا ٹھنڈیانی پر رات کے وقت سرمہ بنا کر رکھ دوں۔ چخ چخ ہر وقت چخ چخ۔ دھیان خراب کر رہا ہے۔" سائیں نے بات آگے بڑھائی۔ "میرے بندوں نے قبر کے اوپر چٹائی بچھائی۔ پھر چٹائی کے کونوں پر اینٹیں رکھ دیں تاکہ باہر کی جانب میری توجہ نہ بٹے اور چلتے گزرتے جانور کہیں قبر میں نہ آ گریں۔"

"اندر تو بہت اندھیرا ہو گا؟" کسی لڑکی کی منمناتی ہوئی آواز آئی۔

"قبروں پر میٹر تو نہیں لگے ہوتے کہ اندر سو واٹ کا بلب لگا دیں؟"

UUNOVELS.COM

وہی آواز پھر آئی۔" سائیں سر پھر آپ کو نظر کیسے آتا ہے؟"

"ایک تو ہمیں اندھیرا ہی درکار ہوتا ہے۔ ویسے بھی انسانی آنکھ اندھیرے میں کچھ نہ کچھ دیکھنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ یہی اندھیرا ہمارے لیے جالا بنتا ہے اور ہمارا دل ماحول کو محسوس کرنے لگتا ہے۔"

پھر سائیں نے فرید کے کان میں کوئی کھسر پھسر کی۔ اب فرید سب سے مخاطب ہوا۔" سائیں کے کہنے کا مہذب ترجمہ یہ ہے کہ گفتگو کے دوران خاموشی اختیار کی جائے تو مہربانی ہوگی۔"

اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر لڑکیوں کو خاموش بیٹھے رہنے کی تلقین کر کے اپنی ذمے داری پوری کی۔ سائیں نظریں اپنے جوتوں پر رکھے بیٹھے تھے۔

"میں نے اب وظیفہ شروع کیا۔ کبھی کبھار مردے کا کفن چمک اٹھتا۔ قبر کے اندر ایک مہیب خاموشی ہوتی ہے گو اس قبر پر صرف چٹائی بچھی تھی مگر زمین پر کیڑا بھی رینگتا ہے تو آواز اندر تک آتی ہے۔ میں وظیفے میں مشغول تھا کہ لگا اوپر کسی نے چٹائی کھینچی ہے۔ ٹائم دیکھا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس رات شدید سردی کے علاوہ کہر بھی تھی۔ پہلی بار تو چٹائی کھسکنے کا میں نے نوٹس نہ لیا مگر جب دوسری بار یہ ہوا تو سائیں سوچ میں پڑ گیا کہ میرے بندے بھی نہیں ہو سکتے کیونکہ انہیں صبح تک قریب آنے کی اجازت نہیں۔ سوچا کون ہو سکتا ہے جس کو معلوم ہے سائیں اندر بیٹھا ہے۔ یہی سوچ رہا تھا کہ چٹائی کو دوبارہ کسی نے کھینچا۔ زور سے آواز دی کون ہے باہر۔ وہاں تو مکمل خاموشی تھی۔ دوبارہ پوچھا کوئی جواب نہ آیا۔ تیسری بار غصے سے چلا کر پوچھا مگر باہر بالکل چپ۔ باہر سے تو جواب نہ ملا پر مردہ بول پڑا کہ سائیں کیوں ٹر ٹر لگا رکھی ہے۔ باہر جا کر دیکھ لے کون ہے۔ اگر ڈر لگ رہا ہے تو میں ساتھ آؤں۔"

طاہرہ بے یقینی کے عالم میں بیٹھی تھی۔" سائیں سر! مردہ کیسے باتیں کرتا ہے۔"

"اسی طرح سے جس طرح سے آپ بات کر رہی ہیں۔"

"مگر میں تو زندہ ہوں۔"

"نیند میں ہم لوگ کس طرح سے بات کرتے ہیں؟ کیونکہ نیند کو بھی موت کی قسم کہا گیا ہے۔"

"مگر ہم میں روح تو ہوتی ہے۔"

"ہمارے وظیفے سے روح مردے کے جسم میں عارضی طور پر آ جاتی ہے۔"

طاہرہ بیٹھی سر ہلا رہی تھی جیسے بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ سائیں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔" میں نے مردے سے کہا جوان بہت ہلکا لے رہے ہو مجھے۔ میرے واپس آنے تک قبر کی مٹی نہ چھوڑنا۔ پہلے باہر کی خبر لے لوں پھر واپس آ کر تم سے بھی دو چار باتیں کروں گا۔ مردے نے جواب دیا۔ تو واپس تو آ۔ میں ادھر ہی ہوں۔ میں نے کون سا تو پانوالے گیٹ والے بڑے میاں کی قلفی کھانے جانا ہے۔"

"میں چٹائی ہٹا کر باہر نکلا۔ دیکھا کہ باہر ایک قبر کے ساتھ چھ فٹ کا جوان کھڑا ہے۔ رنگ تانبے کی طرح چمک رہا تھا۔ نیا بوسکی کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ کسی کا بھوت ہے جو بے چین پھر رہا ہے۔ اس سے پوچھا۔" تو کون ہے جندڑی؟ یہ پڑھائی کا وقت ہے میرا۔ کیوں تنگ کر رہا ہے۔"

وہ بولا۔" میں بھی تو لیٹا تھا۔ تمہاری ٹھک ٹھک نے مجھے اٹھا دیا۔ سوچا معلوم کروں کون جی دار ساتھ قبر میں بیٹھا وظیفہ کر رہا ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔" کیا ہوا تھا کہ جوانی میں تجھے قضا نے آ پکڑا۔"

وہ بولا۔" بس اپنے سالے کے ہاتھوں مارا گیا۔ بازار سے دہی لا رہا تھا کہ پیچھے سے کلہاڑی پیٹھ میں گھونپ دیا۔"

"مگر ہوا کیا تھا جندڑی۔"

"ڈبے والی گلی میں میرا گھر تھا۔ ساتھ تجارت گنج میں غزنی سے پونڈے آ اترے۔ پونڈے خانہ بدوش افغان ہوتے ہیں۔ سردیوں میں غزنی سے چل کر ڈیرہ سے ہوتے ہوئے بمبئی اونٹوں اور گھوڑوں پر جاتے ہیں۔ میں تجارت گنج پہنچا تو ان کا قافلہ کل شام آیا تھا۔ سوچا ان سے خراسانی گھی خرید لوں۔ دو سیر گھی ان سے تلوایا اور ساتھ ایک آنے کے بارہ پیڑے بک رہے تھے وہ بھی خرید لیے۔ تیری بھرجائی سے آ کر بولا کہ انہیں مسالا لگا کر بھون اور میں دہی لینے گلی میں آ گیا۔ پیچھے کم بخت سالا بہن سے ملنے گھر آیا۔ دیکھا بارہ پیڑے تھال میں پڑے ہیں۔ اس نے سوچا بہنوئی تو دوسرا مل جائے گا مگر بارہ پیڑے رکھے ہوئے کبھی نہیں ملیں گے۔ بہن کو کمرے کے اندر بند کر دیا اور میری کلہاڑی اٹھائی اور گلی میں نکل آیا۔ میں یہی بوسکی کا جوڑا پہن کر گھر آ رہا تھا اور یہ دکان کے پھٹے تلے نالی میں چھپا بیٹھا تھا۔ میں گزرا اور یہ نکلا۔ چپکے سے پیچھے آیا اور کلہاڑی سے مجھے چیر

UUNOVELS.COM

کررکھ دیا۔"

پلٹ کر پیٹھ دکھائی تو وہاں تازہ تازہ خون رِس رہا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "جندڑی تو کب کی بات کررہا ہے۔ پونڈے تو افغانستان سے انگریز دور میں آیا کرتے تھے۔"

وہ بولا۔ "میں بھی تو تین مارچ 1886ء کی بات کررہا ہوں۔"

پھر ہم خوب قہقہے لگا کر ہنسے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "پھر سالے کا کیا ہوا۔"

بتایا کہ انگریزوں نے پکڑ کر لٹکا دیا۔ پھر دور ایک قبر کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ وہ اس کی قبر ہے۔ کئی بار بہن کو بھیج کر معافی بھی مانگ چکا ہے۔ میں نے بھی کہا کہ معافی نہیں۔ اب حشر والے دن تجھ سے حساب کتاب ہوگا۔ قبر کے سخت عذاب سے گزر رہا ہے۔ اس نے پیٹروں کے پیچھے بہنوئی پھڑکا دیا۔ مانگ لیتا مجھ سے۔ چلو چھ چھ کھالیتے مگر کم بخت بارہ کے چکر میں خود پر عذاب لا بیٹھا۔"

ہم بستر پر بیٹھے تھے۔ باتیں ہورہی تھیں۔ اس سے پوچھا۔ "یہی تیری قبر ہے۔" تو بولا۔ "یہ میری قبر تھی۔ اب تو میرے اوپر دو اور دفن ہوکر پڑے ہیں۔ میں تو نیچے کی منزل میں رہتا ہوں۔" ہم پھر ہنسنے لگے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "جگر! قبر کا سنا کیسی ہوتی ہے؟ سنا ہے بڑی اندھیری اور ڈراؤنی ہوتی ہے۔"

وہ ہنس کر بولا۔ "موت انسان کا ایک ڈر ہے جو زندہ آدمی کے سامنے ہر لحظہ موجود ہوتا ہے۔ قبر بھی اسی طرح کا ایک خوف ہے۔ میری قبر بہت وسیع اور کھلی ہے۔ اندھیری نہیں بلکہ روشن ہے۔ ہر ایک کا اللہ کے نزدیک اپنا معاملہ ہے۔"

خالدہ نے پوچھا۔ "جندڑی بھائی! آپ ڈر نہیں رہے تھے جب ایک بھوت آپ سے بات کررہا تھا۔"

"ہم لوگ روحوں اور جنات سے اس طرح ہم کلام ہوتے ہیں جس طرح میں ابھی تم لوگوں سے بات کررہا ہوں۔ میرے مرشد کے مزار پر انسانوں سے زیادہ جنات آتے ہیں۔ ہماری دنیا بالکل علیحدہ دنیا ہے۔ اس میں کون زندہ ہے کون مردہ یہ نہیں دیکھا جاتا۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ اس کے دل کا آئینہ کتنا شفاف ہے۔ آئینہ جتنا صاف ہوگا اتنا ہی دوسری دنیا کا عکس اس پر واضح پڑے گا۔ یہ علم کی دنیا ہے جس کی کئی منزلیں ہیں۔"

میرے نزدیک یہ بات طے تھی کہ سائیں کے پاس کوئی روحانی علم نہیں۔ جن لوگوں کی محفل میں یہ بیٹھتا ہے۔ وہیں سے واقعات سن کر ہمیں بتاتا ہے۔

شہزاد نے لڑکیوں کو بتایا کہ ایوبیہ میں مائیک کو کالے ناگ نے کاٹ لیا تھا۔ یہ آدھے سے زیادہ مر چکا تھا۔ نبض اس کی ڈوب گئی تھی۔ پھر سائیں نے زخم اور مائیک کو اپنی تھوک چٹائی تو زخم غائب تھا اور مائیک کھڑا واک مین سن رہا تھا۔ آج اسے دیکھیں کہ لگتا نہیں اسے سانپ نے ڈسا تھا۔

لڑکیاں مائیک کو دیکھ رہی تھیں اور مائیک انہیں اپنا واک مین دکھا رہا تھا۔

میں سائیں سے بولا۔ "استاد جی! وظیفے والی بات مکمل کریں۔ کہیں قبر والا مردہ سو نہ جائے۔"

"بس جندڑی! مقتول مُردے سے اجازت مانگی اور قبر میں اتر گیا۔" وہ بولا۔ "بڑی دیر کردی۔ اتنی لمبی بیٹھک بھی کوئی لگاتا ہے۔" اس سے بولا۔ "اب تو وند کٹے جیلا دے۔ پڑھائی مکمل کرنی ہے اور ادھر صبح بھی ہورہی ہے۔ اذانوں تک وظیفہ پڑھتا رہا اور صبح کی جماعت پڑھوا کر واپس آیا۔"

"میں نے لڑکیوں سے کہا کہ سائیں کی زندگی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ پہلے ہم بھی بڑے شوق و تجسس سے سنتے تھے مگر اب کوئی چھوٹا موٹا واقعہ ہو بھی جائے تو لفٹ بھی نہیں کراتے۔"

شہزاد بولا۔ "بڑی بات یہ ہے کہ سائیں ساتھ ہوں تو ہم اپنے آپ کو محفوظ تصور کرتے ہیں۔ الاؤں بلاؤں سے بھی ڈر نہیں لگتا۔"

خالدہ نے درخواست کی۔ "جندڑی بھائی! ان شاء اللہ ناران میں آپ سے ملاقات ہوگی۔ وہیں امی کے لیے آپ سے تعویذ لوں گی۔"

لڑکیاں ڈری ڈری لگ رہی تھیں۔ کشمیرن نے کہا کہ ہم سوزوکی پر اس کی گاڑی کے پیچھے پیچھے آئیں۔ راستہ بھی اندھیرے میں ڈوبا اور خطرناک تھا۔ ہم نے انہیں ایبٹ آباد میں خدا حافظ کہا اور ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھا کر لیٹ گئے۔ ہمیں کل شوگران بھی جانا تھا۔ سائیں لیٹا چھت پر نظر گڑائے تھا۔ شاید کوئی نیا چکر چلانے کو پر تول رہا تھا۔

☆......☆

اگلی صبح ہم شوگران کے لیے بس اڈے پر کھڑے تھے۔ سامان ہم نے بس کی چھت پر چڑھا دیا تھا۔ اس بس

UUNOVELS.COM

نے کاغان جاتے ہوئے ہمیں کیوائی اتارنا تھا۔ کیوائی سے ایک بلند پہاڑ پر سیڑھی کی مانند الستارا راستہ آپ کو شوگران لے جاتا ہے۔ دو رات ہم نے شوگران میں گزار کر آگے پھر ناران جانا تھا۔ بس کی ٹکٹیں ہم نے خرید لی تھیں۔ سیٹوں پر کچھ سامان رکھ کر قبضہ بھی کر لیا تھا۔ بہت سے دوسرے مسافروں کی طرح میرے دوستوں کی آنکھوں میں کوئی خاص چمک نظر آتی تھی۔ کیونکہ ہم اس جانب جا رہے تھے جس طرف بہت کم لوگ ان دنوں جایا کرتے تھے۔ جہاں برف سے ڈھکے بلند پہاڑ تھے۔ گرتی آبشاریں بھی تھیں اور کہیں گنگناتا اور کہیں چنگھاڑتا دریائے کنہار تھا۔ وہاں ایک ایسی جھیل بھی تھی جس پر پورے چاند کی راتوں میں پریاں اترتی ہیں۔ ہم اس دنیا میں جا رہے تھے جہاں ہوائیں بلا کسی روک ٹوک کے چلتی ہیں، جہاں خوش الحان پرندے گنگناتے ہیں۔ جہاں پتھر، پہاڑ اور گلیشیرز ہیں۔ جہاں جان لیوا راستے اور خطرناک موڑ ہیں۔ جہاں لوگ کم اور تنہائی زیادہ ہوتی ہے۔

میں اپنے اندر کئی اقسام کے احساسات لیے کھڑا تھا۔ سرمئی پہاڑوں کے اندر جانے کی سنسنی تھی۔ میرے وجود میں کچھ ٹھنڈے چشمے پھوٹ رہے تھے اور کچھ جلتے انگارے لو دے رہے تھے۔ ہجر کا ملال بھی تھا اور وصل کی اُمید بھی۔

بس کے مسافر زیادہ تر سیاح تھے۔ ان دنوں کاغان اور ناران جانا آسان نہ تھا۔ یہ دل گردے کا کام تھا کیونکہ سڑکیں تنگ اور مسافتیں طویل تھیں۔ جی ٹی ایس کا سفر آسان تھا کیونکہ وہ پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کی طرح ہر مقام پر مسافروں کو اٹھانے کے لیے رکتی نہیں تھی۔

میں آج کا تازہ اخبار اسٹال سے خرید لایا تھا مگر ذہن سفر کے متوقع خوشگوار لمحوں میں گھرا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شوگران، کاغان اور ناران کیا خوب صورت نام ہیں جیسے کسی جنگجو قبائلی سردار کے بہادر بیٹوں کے نام ہوں۔ نام اتنے خوب صورت ہیں تو جگہیں کتنی حسین ہوں گی۔

میں آنکھوں میں کئی طرح کے خواب سجائے کھڑا تھا۔ میرا خواب تھا کہ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر پڑی برف دیکھوں۔ وہ گلیشیرز دیکھوں جو پہاڑوں سے اتر کر جھیلوں کا دامن بھرتے ہیں۔ میں ٹراؤٹ پکڑنے کے بہانے دریائے کنہار کے کنارے بیٹھنا چاہتا تھا۔ میں اس کے رواں دواں اور یخ بستہ پانی کی گونج سننا چاہتا تھا۔ میں وہ طلسمی جھیل دیکھنا چاہتا تھا جو تصویروں میں اتنی سحر انگیز ہے تو سامنے دیکھنے میں کیا ہوگی۔ ان مقامات کی شکلیں جو میں نے تراشی تھیں انہیں حقیقت کی نظروں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ خوابوں اور خیالوں میں جو مناظر دیکھے تھے انہیں خوابوں کو تعبیریں دینے کا وقت آگیا تھا۔ میں بس کی فرنٹ سیٹ پر کھڑکی سے جڑا بیٹھا تھا۔ میرے اور مناظر کے درمیان کوئی تیسرا نہ تھا۔ جوتے اتارے اور سیٹ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے لگ کر بیٹھنا مجھے بور نہیں ہونے دیتا۔ ہر پل بدلتے مناظر اچھے لگتے ہیں۔ پیچھے کی جانب دوڑتے درخت، قریب آتی منزلیں، نئے قصبے، نئے گاؤں اور نئے لوگ، مخالف جانب دوڑتے مناظر، آسمان اور بادل، پرندے، چاند، سورج اور اپنی تنہائی میں بیٹھا میں خود......!! یہ سب مجھے بور نہیں ہونے دے رہے تھے۔

☆......☆

بس ایبٹ آباد سے نکلی اور دماغ میرا فاصلہ طے کرنے لگا۔ ونڈ اسکرین کے پار نظر گاڑ کے میں نیلے آسمان کی وسعتوں میں کھو گیا۔ سوچوں میں کوئی کرب نہیں بلکہ کوئی میٹھی سی کسک تھی۔ کسی کو پا کر کھو دینے کا دکھ تھا اور کسی کو پا کر جیت لینے کی خوشی بھی تھی۔ سفر وہ ایسا تھا جہاں منزل پر پہنچ کر مسرتیں ملنے کی اُمیدیں تھیں۔ وقت کی نبض پر گرفت مضبوط تھی اور نیلے اجلے آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ سڑک پر بھی ٹریفک نظر آجاتی اور کبھی ہم بالکل تن تنہا ہوتے۔

رنجیت سنگھ کے جرنیل راجا ورا سنگھ کا بسایا گیا شہر مانسہرہ آیا۔ بس رکی اور ہم اترے۔ گو مانسہرہ ایبٹ آباد کی شمالی جانب ہے مگر سطح سمندر سے اونچائی 3500 فٹ ہے جو ایبٹ آباد سے پانچ سو فٹ کم ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ایبٹ آباد ایک بلند ٹیلے پر آباد کیا گیا ہے۔ منگول اور ترک درہ خیبر کے آسان راستے سے برصغیر پر حملہ آور ہوئے مگر چینی سیاح اور تاجر سلک روڈ سے آئے۔ بلندیوں سے اتر کر ان کو نیچے مانسہرہ کا پہلا پڑاؤ ملتا تھا۔ اس مقام کی تاریخی اہمیت گوتم بدھ کی وہ تاریخی تختیاں ہیں جو آس پاس کی چٹانوں پر کندہ ہیں۔

مانسہرہ کے بس اڈے پر کوئی مسافر نہ اترا۔ چند ایک سوار ہوئے۔ مجھ سمیت کچھ دوست اترے اور گرد دیکھا۔ کھلی ہوا میں سانس لیا اور دوبارہ بس میں سوار ہوگئے۔ میں اکیلا باہر کھڑا کچھ دیکھتا اور محسوس کر رہا تھا۔ بس روانہ ہونے لگی تو لپک کر اپنی سیٹ پر آبیٹھا۔ بس چل پڑی مگر لگتا تھا کہ میری روح وہیں مانسہرہ میں رہ گئی ہے۔

UUNOVELS.COM

☆☆......☆☆

میرے لبوں پر کچھ خوشگوار یادوں نے ایک مسکراہٹ بکھیر ڈالی۔ چند سال پہلے کے وہ تمام مناظر میرے دماغ کے پردے پر فلم کی طرح چلنے لگے جب میں ہری پور سے مانسہرہ اپنی بڑی بہن کو بغیر بتلائے چلا آیا تھا اور بہن تین دن تک میری گمشدگی پر شدید پریشان رہی۔ میں تو ہری پور ایف ایس سی کے امتحانوں کی تیاری کے سلسلے میں پڑھائی کرنے آیا تھا مگر کتابوں کی جانب میری دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔

میرے دوستوں کا بڑا بھائی مانسہرہ میں ڈسٹرکٹ فارسٹ آفیسر بن کر ٹرانسفر ہوا۔ چھٹیوں میں میرے دوست اپنے بھائی کے پاس آ گئے تھے۔ خط لکھ کر مجھے آنے کی دعوت دی جو بہن نے سختی سے رد کر دی پھر دوسرا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ شہر سے دور پہاڑوں کے بیچ ایک بہت بڑا گھر ہے۔ دور پرے کے پہاڑوں اور گھر کے درمیان جنگلات ہیں۔ موسم اچھا ہے اور ہوائیں چلتی ہیں۔ بارشیں خوب ہوتی ہیں۔ ڈرائیور سمیت جیپ ہر وقت موجود ہوتی ہے۔

جب پہاڑوں اور جنگلات میں گھرا اکیلا اور بڑا گھر ہو، ساتھ بارشیں، بادل اور ہوائیں چلتی ہوں تو ہری پور جیسے خشک شہر میں میرا رکنا نظریاتی طور پر بنتا نہیں تھا۔ ادھر بہن میری درخواست متواتر رد کرتی جا رہی تھی اور ادھر میرا ارادہ پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ بہنوئی نے بھی سختی سے منع کر دیا تھا۔ پھر میرے اندر کا باغی بیدار ہونے لگا اور اگلے دن تک میں مکمل باغی بن چکا تھا۔ اگلی صبح جب بہن باورچی خانے میں الجھی ہوئی تھی تو میں نے دو جوڑے کپڑے شاپر میں ڈالے، فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی کی خشک اور بور کتابوں کو چارپائی تلے چھپایا اور اردو کی کتاب حفظ ماتقدم کے طور پر شاپر میں رکھ لی۔ اڈے پر پہنچ کر بس پکڑی اور ایبٹ آباد سے ہوتے ہوئے مانسہرہ آ اترا۔ دوستوں کو پوسٹ کارڈ کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع دے چکا تھا۔ وہ ڈرائیور سمیت جیپ لیے موجود تھے۔ کچھ دیر بعد ہاتھ میں شاپر پکڑے فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ان کے گھر جا رہا تھا۔

گھر نیا اور بڑا تھا۔ اردگرد ویرانہ، جنگل اور تنہائیاں پھیلی تھیں۔ دور سکوت میں ڈوبے بنجر پہاڑ تھے۔ دوپہر کی تپتی دھوپ تھی اور مہیب خاموشیوں کا گھیرا تھا۔ میں نے گھر کے برآمدے میں کھڑے ہو کر آزادی بھرا ایک بھرپور سانس لیا اور میرے سامنے دور دور تک درختوں اور جھاڑیوں سے بھری ایک اجاڑ دنیا تھی۔

ماہ رمضان کے دن تھے جون کا مہینہ تھا۔ ڈیرہ کی گرمی سے بلبلاتے چند مہمان روزے رکھنے اس گھر میں مقیم تھے۔ بہت سے بزرگ اور بے شمار بچے تھے۔ خواتین پردے میں اندر مقیم تھیں۔ ڈرائنگ روم سمیت آس پاس کے کچھ کمروں میں چلتے پنکھوں تلے چارپائیاں پڑی تھیں۔

ان بزرگوں میں ایک بزرگ بہت زیادہ بزرگ تھے جن کی گھر کے دوسرے بزرگ بے انتہا عزت کرتے تھے۔ وہ بڑے بزرگ ہمیشہ چلا اور ڈانٹ کر بات کرتے تھے۔ باقی سب افراد سر جھکائے خاموشی سے حکم بجا لاتے۔

مجھے جاتے ہی کسی ایک چارپائی پر ایک نحیف سے بچے کے ساتھ سونے کا حکم ملا۔ اردگرد دیکھا تو دوست دوسری چارپائیوں پر متعدد بچوں کے درمیان لیٹے تھے۔ مجھے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش ہو جانے کے اشارے کرتے جا رہے تھے۔ اس گھر کے معمولات بہت دلچسپ تھے۔

سحری کے وقت بچوں کو بیدار کر دیا جاتا اور وہ مل کر دوسروں کو خود بیدار کر دیتے۔ پھر چند ملازم پراٹھے بنا بنا کر لاتے اور ڈرائنگ روم میں بچھی دری پر اس کے ڈھیر لگاتے جاتے۔ سالن کا ایک بڑا دیگچا درمیان میں رکھ دیا جاتا۔ بڑے بزرگ ڈھکن اٹھا کر اسے سونگھتے اور سالن کی سوندھی سوندھی مہک پورے ڈرائنگ روم میں پھیل جاتی۔ بہت سی اسٹیل کی پلیٹیں لا کر رکھی جاتیں اور ہر ایک کو لبالب بھرا جاتا۔ سحری روٹیوں کے حساب سے نہیں کھائی جاتی بلکہ جب تک سالن ختم نہ ہوتا یہ سلسلہ متواتر جاری رہتا۔ سحری کھانے کے بعد بیٹھے بیٹھے اونگھنے کا مرحلہ آتا اور اونگھ کے بیچ بڑے بزرگ ڈانٹ کر الرٹ کر دیتے۔ خالی دیگچا، پلیٹیں، ہڈیاں اور روٹی کے ٹکڑے سمیٹ کر غائب کر دیئے جاتے۔ ان کی جگہ ایک بڑا وسیع تھال لایا جاتا جس میں کئی درجن ٹھنڈے آم کاٹ کر بھرے ہوتے۔ آم کھانے سے پہلے میٹھا کھانے کی کوئی بڑی مختصر سی دعا بڑے بزرگ فٹافٹ پڑھتے، پھر کوئی نعرہ مستانہ بلند ہوتا اور سب آموں پر ٹوٹ پڑتے۔ آم ختم ہونے تک ہم سب پر شدید نقاہت طاری ہو چکی ہوتی۔ پھر تھال اٹھا لیا جاتا۔ چھلکے اور گٹھلیاں سمیٹ لی جاتیں۔ بعد ازیں اسی دری پر ایک ایک کلو کے تانبے کے بڑے بڑے نقش و نگار والے گلاس سجائے جاتے۔ دو بالٹیاں بھر کر دودھ کی نمکین لسی لائی جاتی اور سب پر لازم تھا کہ ایک ایک گلاس بھر کر پینا ہے۔ لسی پی کر سب ٹانگیں پھیلائے دری پر لمبے لمبے

UUNOVELS.COM

سانس لیتے۔ کوئی ہانپ رہا ہوتا، کوئی ڈکار اور کوئی الحمدللہ الحمدللہ کیے جا رہا ہوتا۔ ڈرائنگ روم کی تمام کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے جاتے تا کہ تازہ ہوا کی آمد ہو۔ اس ایک گھنٹے کی مشقت کے دوران سانس لینے کے علاوہ ہر حرکت پر ممانعت ہوتی۔

پھر کوئی دو اصحاب بڑبڑاتے ہوئے بمشکل کھڑے ہوتے، جنہیں بڑے بزرگ بری طرح سے گھور رہے ہوتے تھے۔ وہ دری پر سفید چادریں بچھا کر صفیں بناتے۔ اسی دوران بڑے بزرگ گھورنے کے علاوہ تیزی سے چلم چڑھا رہے ہوتے۔ ایک بچے کے سامنے ٹائم پیس رکھی ہوتی اور وہ ہر پانچ منٹ بعد ٹائم کا اعلان کرتا رہتا تھا۔ جب کوئی مخصوص ٹائم بزرگ کے کانوں میں پڑتا تو بہ آواز بلند نہایت ہی دلگیر آواز میں سحری کے اختتام کا اعلان کرتے۔ ان کے اعلان میں ایک درد، ایک کرب چھپا ہوتا۔ صبح کی نماز وہی بزرگ باجماعت پڑھاتے اور ہر رکعت میں ماشاء اللہ دو دو رکوع، قرآن پاک کے ضرور پڑھتے۔ اس دوران مجھ جیسے کمزور اور ناتواں مقتدی بے ہوش ہونے کے عین قریب پہنچ چکے ہوتے۔ نماز کے بعد پورا شجرہ نسب پڑھ کر سب کے لیے علیحدہ علیحدہ مغفرت کی دعا مانگی جاتی اور جو حیات ہوتے ان کے لیے دعائیں زیادہ ہوتیں۔ پھر سب کو سو جانے کی ہدایت ہوتی اور اکثر تو اسی دری پر ہی سو جاتے تھے۔

دوپہر میں سب کو بیدار کر کے ظہر کی نماز باجماعت ادا کی جاتی۔ نماز پڑھنے کے بعد ایک دائرے میں بیٹھ کر درس قرآن ہوتا جو کم از کم ایک گھنٹا جاری رہتا۔ اسی دوران ملازمین کو افطاری کے لیے ہدایات بھی جاری رہتیں۔ درس کے بعد بڑے بزرگ چلم کو بڑی حسرت سے پانچ دس منٹ تکتے اور پھر ہمیں بہت ساری نصیحتیں کر کے خاموش ہو کر لیٹ جاتے۔ ادھر وہ سوئے اور ادھر ہم دوسرے کمرے میں آ کر تاش کھیلتے، بچوں کو پیٹتے اور غسل خانے میں جا کر گرمی سے گھبرا کر نہاتے۔ عصر سے پہلے بڑے بزرگ اچانک بیدار ہو جاتے۔ اذان دیتے اور اللہ اکبر ایسے ادا کرتے جیسے خدانخواستہ انہیں شک ہو۔ نماز پڑھنے کے بعد ہمیں باہر نکلنے کی اجازت ہوتی۔

ہم جنگل میں پہاڑوں کی جانب چلنا شروع کر دیتے۔ ہر روز چلتے مگر پہنچ نہ پاتے۔ ہم ان کی جانب بڑھتے اور وہ شاید ڈر کر پیچھے کی جانب سرکنا شروع کر دیتے۔ دور دور تک ویرانہ تھا۔ ہم خاموش ہو کر خاموشیوں کی صدائیں سنتے۔ فلموں کی شوٹنگ کے لیے مناسب لوکیشن دیکھتے۔ خیالی کیمرے کسی درخت یا بلند ٹیلے پر رکھ کر فلم کے سین فلم بند کرتے۔ ہم سب اس بات پر متفق تھے کہ دلہن ایک رات کی اس فلم کی شوٹنگ ممتاز علی خان یہاں کرتا تو فلم زیادہ کامیاب جاتی۔

اس جنگل میں کبھی اکٹھے چلتے اور کبھی علیحدہ ہو جاتے۔ غزالہ سے بچھڑے مجھے ایک سال ہوا تھا۔ زخم تازہ تھا اور گھاؤ گہرا تھا۔ اکیلے میں جب یاد آجاتی تو ٹیسیں اٹھتیں۔ میں درختوں پر چاقو سے اس کا نام کھرچتا۔ کبھی NG لکھتا اور تادیر اسے دیکھتا رہتا۔ پھر اسی درخت سے ٹیک لگائے تصور میں اس کے پاس پہنچ جاتا۔ اس کی یادیں مجھے بہت تڑپاتی تھیں۔ میرا ہر دن اس سے بچھڑنے کا دن ہوتا۔ اس کی تصویر ہر وقت میرے پاس رہتی۔ اس تصویر کو دیکھ کر کبھی رو پڑتا اور کبھی مسکرا اٹھتا۔ میرے دوست مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے آتے اور ہمیشہ ڈھونڈ لیتے۔

جنگل سے واپس گھر پہنچتے اکثر شام ہو جاتی۔ سرزنش ہوتی، لعنتیں ہوتیں، کچھ ہدایات دی جاتیں۔ دنیا میں رہنے کے ڈھنگ بتائے جاتے۔ بزرگوں کی عزت کے طریقے بیان کیے جاتے۔ ہمیں نماز کی ٹوپیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر دوبارہ پہنائی جاتیں جو ہم نے کہیں چھپا دی ہوتیں۔ افطاری نہایت سادہ ہوتی جس میں صرف کھجور، پکوڑے، سموسے، جلیبیاں اور ٹھنڈا دودھ ہوتا۔ نماز خشوع و خضوع سے باجماعت ادا کی جاتی؛ پھر کھانے کا ایک نہایت طویل دور چلتا۔ ایک بار پھر دائرے میں بیٹھ کر آم کھائے جاتے...

بڑے بزرگ چائے پی کر چلم پیتے اور مسکراتے جاتے۔ ہمیں بار بار عشاء اور تراویح ادا کرنے کی ہدایات بھی جاری رہتیں۔ چوتھے روز میں واپس ہری پور جا رہا تھا۔ بڑے بزرگ نے چند روز اور رکنے کا مشورہ دیا جو میں نے نہایت ادب اور آہنی ارادے سے رد کر دیا۔ اس دوپہر جیپ مجھے اڈے پر لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی اور میں نے شاپر ہاتھ میں تھاما ہوا تھا۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر آزادی کے گہرے گہرے سانس لیے اور جیپ میں جا بیٹھا۔

☆......☆

ہماری بس خراماں خراماں ناران روڈ پر چلی جا رہی تھی۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے قصبے آئے مگر ہماری بس چلتی رہی، پھر بسائیاں نامی کوئی قصبہ آیا تو دریائے کنہار کو دائیں جانب بہتا دیکھا۔ اس کی لہروں میں تندی تھی۔

چترال ڈسٹرکٹ کی دور دراز برفانی گزرگاہ بروغل کے پاس سے اس دریا کا چشمہ پھوٹتا ہے۔ ہندوکش پہاڑوں کے گلیشیئرز اور برف گرمیوں میں پگھل کر اس کے پانیوں میں اپنا حصہ ڈالتی جاتی ہے۔ کنہار جا کر دریائے کابل میں گرتا ہے اور دریائے کابل سندھ کا حصہ نوشہرہ کے مقام پر بنتا ہے۔ یعنی یہ دریا پاکستان سے افغانستان جاتا ہے اور پھر واپس دریائے کابل سے مل کر پاکستان میں دریائے سندھ میں گرتا ہے۔

پھر پہاڑ بلند ہوئے اور لینڈ اسکیپ تبدیل ہوتی نظر آنے لگی۔ ہر بادل، بلند پہاڑ، دریا اور ماحول کی خنکی خبر دے رہی تھی کہ ہم بلندی کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

دریائے کنہار کے دونوں جانب بسا بالاکوٹ کا شہر آیا۔ دریا پر بنے پل سے ہم نے اس کو پار کیا۔ پل کے ساتھ دریا کے شور کے اوپر ہوٹل بنے تھے۔ اس دور میں اکثر لوگ بالاکوٹ سیر کے لیے جایا کرتے تھے۔ سامنے پہاڑوں پر درخت اور سبزہ تھا۔ موسم خوشگوار تھا اور آسمان پر کہیں کہیں بادل چھائے ہوئے تھے۔ پہاڑوں پر کہیں دھوپ پڑ رہی تھی اور کہیں چھایا تھی۔

پل کے پار آئے تو دریا کھسکتا ہوا ہمارے بائیں جانب آ گیا۔ ہماری بس آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ منظر یہ بنا کہ بائیں طرف گہرائی میں دریا بہنے لگا اور سامنے ایک پہاڑی سلسلہ آہستہ آہستہ منظر پر حاوی ہوتا گیا۔ دائیں جانب بلند پہاڑ جہاں پتھروں کی دنیا میں سبزے کی جھلک صاف دکھتی تھی۔ بس کی کھڑکی سے اندر آتی ہوا سیدھا روح میں اتر جاتی۔ سامنے پہاڑ راستہ روکے کھڑے نظر آ رہے تھے۔ مانسہرہ کے قدرے میدانی علاقے سے ہم بالاکوٹ اور پھر پہاڑوں کے بیچ کھو سے گئے۔

میں پہلی بار گھر سے نکل کر مری، نتھیا گلی اور یہاں کے پہاڑوں کے درمیان آیا تھا۔ پنڈی سے مری اور پھر گلیات سے آگے ایبٹ آباد اور پھر پرانے سلک روڈ کا سفر، یہ سب میرے لیے حیرت کدہ تھا۔ یہ میرے لیے ایک گیٹ وے تھا جو مجھ پر ان دیکھی دنیا کے راستے کھول رہا تھا۔ یہ ایسا سفر تھا جس کا ہر نیا دن میرے دل و دماغ کو پختہ کر رہا تھا۔ آزادی سے گھومنے پھرنے کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ نئی امنگیں میرے اندر جاگ اٹھیں۔ مجھے نئے راستوں کی خبر ملی۔ میں نے بلند پہاڑوں کے اوپر بیکراں آسمان کی وسعتیں دیکھیں۔ میرا ہر دن نئے رنگ لیے طلوع ہوتا اور اختتام ان گنت حیرتوں اور سوالوں پر ہوتا۔ غزالہ سے بچھڑنے کا زخم کنول نے بچھڑ کر بھی جس طرح سے بھرا وہ بھی میرے لیے ایک معما تھا۔

آج کا دن بالاکوٹ سے ہمیں آگے لے آیا تو پہلی بار بلند مٹی اور ہریالی سے بھرے پہاڑ دیکھے اور ان کی خوب صورتی دیکھی تو میرے حواس گم ہو گئے۔ دنیا کی نیرنگی میرے سامنے پہلی بار آئی تو میری سوچوں کو نئے راستے ملے۔ اس سفر سے میرے اندر دنیا دیکھنے کی خواہش جاگی۔

ہزاروں لوگ ہر سال ناران کا سفر اختیار کرتے ہیں اور ان کو میرا یہ سفرنامہ شاید عجیب لگے مگر یہ ان دنوں کی بات ہے جب بہت کم لوگ ناران جایا کرتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں بیس سال کا نوجوان تھا اور پہلی بار یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ یہ مناظر میرے ذہن کے خالی پردے پر پہلی بار چسپاں ہو رہے تھے۔ دنیا کی ہر نئی چیز مجھے اپنی جانب کرشمے سے کھینچتی ہے اور میں اپنی اس عادت کی وجہ سے ان مناظر کو دل و دماغ میں بسائے چلا جاتا تھا۔ ہر لمحہ ایک نیا فریم تھا اور ہر فریم کی اپنی تصویر تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ کوئی تصویر ابھی تک دھندلی نہیں ہوئی۔

میں اس سفرنامے میں ان مناظر کو اس دیکھتی آنکھ سے بیان کرنا چاہتا ہوں جب وہ بیس سال کی تھی۔ ان دنوں میرے اندر بہت سی کہانیاں پنپ رہی تھیں اور میری رگوں کا خون کسی طوفانی رفتار سے دوڑتا تھا۔ میرے اندر پہاڑوں کی چاہت شروع سے تھی۔ خوب صورت منظر کا میں شیدائی تھا۔ مجھے اپنی اس چاہت سے مکمل آگاہی اس سفر نے دی۔ میرا یہ پہلا پہلا سفر میری زندگی کا خاص سفر ہے کہ جب محبتوں اور چاہتوں کے نئے معنی مجھے معلوم ہوئے تھے۔ یہ سفرنامہ نہیں بلکہ میرے احساسات ہیں جو آج بھی مجھے گرماتے ہیں۔ اس سفر کی یادیں میرے لیے بہت زیادہ قیمتی ہیں اور میں نے ان کی بہت زیادہ حفاظت کی ہے۔ یہ یادیں اب بھی دنیا کی سرد ٹھٹھرتی ہواؤں میں میرا دل گرماتی ہیں۔

چپ چاپ چلی ہیں آئینہ دکھا کر تیری یادیں
سونے نہیں دیتی مجھے اکثر تیری یادیں

قدرت کی نیرنگیوں میں انصاف مجھے پہلی بار اس سفر میں نظر آیا۔ پہاڑ، زمین و آسمان، پرندے، دریا، گھاٹیاں اور بلندیاں سب ایک دوسرے سے گہری مناسبت رکھتے نظر آئے تھے۔ ہر چیز میں ایک خاص توازن دکھائی دے رہا تھا۔ نہ کوئی چیز اتنی کم تھی کہ حقیر دکھائی دے اور نہ اتنی محیط کہ عقل و منظر دونوں پر بھاری گزرے۔ قدرت کے یہ مظاہر مجھے پہاڑوں اور ان مقامات پر زیادہ نظر آئے ہیں جہاں

UUNOVELS.COM

تک انسانی تعمیر نہیں پہنچی۔ شہروں کی بناوٹ میں انصاف نہیں۔ رئیسوں کی آبادیوں کے پیچھے فقراء کی بستیاں نظر آئیں گی۔ کسی پر جھکائے سائیکل سوار کو تیزی سے گزرتی گاڑی چھو کر جاتی نظر آئے گی۔ بڑے بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹوروں کے قریب کچھ لوگ ریڑھی پر خریداری کرتے نظر آئیں گے۔ کائنات کا انصاف اس بات کا متمنی ہے کہ ہر چیز میں ایک نسبت ہو۔ ہوا چلے تو سب کو ملے۔ بادل برسیں تو سب پر برسیں۔

ناران کے سفر میں ذرا غور کیا تو پتا چلا کہ یہاں پہاڑ تھے تو سبزہ سب پر پھیلا تھا۔ جنگل پہاڑ تھے تو سب تھے۔ بادل تھے تو ان کا سائبان سب پر تنا ہوا تھا۔ پرندے ایک ہی آسمان تلے پرواز کرتے نظر آرہے تھے۔ خنک ہوا سب کے لیے یکساں تھی۔ دریا کے پانی منزل کی جانب ایک ہی راستے پر رواں دواں تھے۔ اونچے پہاڑ نچلے پہاڑوں کے نگران دکھتے تھے اور چھوٹے پہاڑ بلند پہاڑوں کا حصہ دکھائی دیتے تھے۔ اللہ کی ہر تخلیق حسین ہے کیونکہ وہ خود حسین ہے۔ انسان ہوں یا جانور، پہاڑ ہو یا صحرا، دریا ہوں یا سمندر، ان کو فرصت میں دیکھ کر غور کریں تو معلوم پڑے گا کہ کیا خوب ڈرائنگ بنائی گئی ہے۔ پہاڑوں میں کائنات ایک فطری شکل میں نظر آتی ہے۔ ہر چیز انفرادی سطح پر ایک مکمل تخلیق کی صورت نظر آتی ہے۔

جیسے جیسے سفر کٹتا گیا ویسے ویسے بلند پہاڑ منظر پر چھاتے چلے گئے۔ اتنے بلند کہ آنکھیں محو حیرت تھیں۔ ان کے سامنے مری اور نتھیا گلی کے پہاڑ بونے لگتے تھے۔ یہاں کی ہواؤں میں برف کا لمس تھا۔ ہوائیں چہرے سے ٹکراتیں تو محسوس ہوتا جیسے سخت گرمی کے موسم میں کسی نے چہرے پر ٹھنڈے پانی کا چھینٹا مارا ہو۔ تازگی سے بھرپور ہوا تھی۔ تنگ اور ویران سڑک پر کبھی کبھار ہی کوئی گاڑی نظر آتی۔ ہم ایک تنہا اور نئی دنیا میں داخل ہو رہے تھے۔ بائیں جانب ایک گہری کھائی میں دریا بہتا تھا۔ نیچے دیکھتا تو خوف کی لہر جسم میں دوڑتی چلی جاتی۔ یہ میرے خوابوں کی سرزمین تھی۔ اس کا تو میں نے شوق پالا تھا۔ یہ وہ جہاں تھا جہاں میرا ایک ایک خواب جڑا ہوا تھا۔ یہی محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنی دنیا کی جانب واپس جا رہا ہوں۔ میری تخلیق یہیں ہوئی تھی اور یہیں میرا ابدی ٹھکانا ہے۔ نظروں کے سامنے فصیل کی مانند کھڑے پہاڑ تھے۔ اوپر نیلا آسمان جہاں سورج اور بادل آنکھ مچولی کا کھیل کھیلتے نظر آرہے تھے۔ دریا پہاڑوں سے لڑھکتا اور گرتا چلا آرہا تھا۔ ہر منظر آخری خوب صورت منظر دکھتا تھا۔ پھر دونوں جانب کے پہاڑ ذرا قریب ہوئے تو معلوم ہوا کیوائی یعنی ہمارا اسٹاپ آگیا تھا۔

ہم سامان اتارے ایک ویران سڑک پر کھڑے تھے۔ بس کا شور کچھ دیر تو کانوں میں گونجتا رہا۔ سڑک پیچھے پہاڑوں سے نکل کر کچھ دیر ہمارے پاس رکتی ہوئی آگے کے پہاڑوں میں گم ہو رہی تھی۔ کچھ خنکی تھی، کچھ ہوا تھی اور باقی خاموشی کو چیرتی آبشار گرنے کی جھنکار تھی۔ دائیں جانب دو پہاڑوں کے بیچ پگھلی برف کا پانی آبشار کی صورت بلندی سے گر رہا تھا۔ گر کر وہیں جمع ہوتا اور پھر راستہ بناتا سڑک کے نیچے سے گزر کر دور بہتے دریا میں شامل ہو جاتا۔ دائیں جانب سیڑھی کی طرح اٹھتا راستہ شوگران جا رہا تھا۔ ہم شوگران نہیں بلکہ آبشار کی کشش میں اس کی جانب بڑھتے چلے گئے۔

دور دور تک کوئی نہ تھا۔ شوگران والے راستے پر ایک جیپ کھڑی تھی اور ڈرائیور شاید اندر سویا ہوا تھا۔ چند لوگوں نے جوتے اتارے اور لکڑی کے پل کے ساتھ پانی میں پاؤں رکھے بیٹھ گئے۔ سستی پاؤں کے تلوؤں سے نکل کر پانی کے ساتھ بہتی ہوئی کہیں دور چلی گئی۔ ٹھنڈا پانی گنگناتا ہوا بہتا چلا جا رہا تھا۔ اس سے اپنا چہرہ تر کیا تو معلوم ہوا کہ گلیشیئر پگھل بھی جائے تب بھی ٹھنڈا رہتا ہے۔ فضا نکھری اور خالص تھی۔ پانی کو ہمارے پاؤں آلودہ کر رہے تھے اور فضا کی تاثیر کو ہمارے قہقہے۔

سورج کی کرنیں پانیوں پر جھلمل کرتی پڑ رہی تھیں۔ تالاب کا پانی اتنا شفاف تھا کہ اندر پڑے کنکر صاف دکھ رہے تھے۔ ٹرپ میں پہلی بار ہم نے بہتا اور گرتا پانی دیکھا۔ اس کے قریب آکر ہم بے حد راضی تھے۔

ہماری ہر منزل ہر محفل سائیں کے بغیر پھیکی پھیکی ہوتی تھی۔ ان سے چھیڑ چھاڑ نہ ہو تو ماحول پر یکسانیت چھانے لگتی۔ سائیں چلو میں پانی بھرے اسے غور سے دیکھے جا رہے تھے اور میں نے سائیں کو نظروں میں رکھا ہوا تھا۔ سائیں نے اس کے بعد پانی کو چکھا، نظریں اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھ کر کچھ غور کیا اور دوبارہ چکھا۔ پھر وہ پانی احتیاط سے تالاب میں پھینک دیا۔ اس کے بعد اس پہاڑ کو دیکھتے رہے جہاں سے آبشار گر رہی تھی۔

''استاد جی! چوتھی میں پڑھا تھا کہ پانی بے ذائقہ ہوتا ہے۔ آپ پھر بھی چکھ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

UUNOVELS.COM

ساتھ بیٹھے لطیف نے گرہ لگائی۔ ''سائیں! لگتا ہے چوتھی نہیں پڑھی۔ سید صاحب سوئیں پاس کی ہے۔''

وہ بولے۔ ''جنڑی! بات ایسی ہے، اگر بتا دی تو پورے ملک میں خون خرابہ ہو جائے گا۔''

لطیف بولا۔ ''اللہ رحم! کہیں چیتا جن تو نہیں کھا گیا؟''

''اب تیری چر چر سنوں یا مسئلہ سلجھاؤں۔'' پھر مجھ کو حکم دیا۔ ''ذرا سب کو ادھر بلاؤ۔ ان سے کہو اپنی چخ چخ بند کریں اور ادھر آ کر مطلب کی بات سنیں۔''

پھر خود ہی سیٹی بجا کر انہیں بلا لیا۔ وہ سب ہنستے ہوئے چلے آئے۔

تب سائیں بولے۔ ''سونا منوں کے حساب سے دفن ہے۔ بات بتا تو رہا ہوں مگر خبر اپنے تک رکھنی ہے۔''

''کدھر ہے؟'' فرید نے اِدھر اُدھر سونگھ کر کہا۔

''جہاں سے پانی گر رہا ہے یہ سارا پہاڑ سونے کا ہے۔''

ستار نے پوچھا۔ ''تم کو کیسے معلوم ہوا؟''

''جگر! سونے کے کشتے کھائے ہوئے ہیں۔ پانی چکھا تو معلوم ہو گیا پورے بائیس کیرٹ کا سونا ہے۔''

''میں بھی سوچ رہا تھا کہ ماؤنٹین اتنا Shine کیوں کر رہا ہے۔'' مائیک نے بھی تصدیق کر دی۔

سائیں نے سب کو آہستگی سے سمجھایا۔ ''کوشش کرنی ہے بات پھیلے نہیں۔''

''سائیں یہ تو ہلچل مچا دینے والی خبر ہے۔ بات چھپی کیسے رہے گی؟'' فرید بولا۔

''جنڑی! یہ تو اب سب کی قومی ذمے داری ہے اور خاص خیال رہے کہ امریکا کو پتا نہ چلے۔''

شہزاد نے مشورہ دیا۔ ''میری تو صلاح ہے کسی کو بھی نہیں بتاتے۔ سارا سونا آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔''

سائیں نے ڈانٹ کر کہا۔ ''نہیں خبردار! قوم کی امانت ہے۔ مجھ پر تو ایک تولہ بھی حرام ہے۔''

سائیں دور تک پھیلی ویرانگی میں اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ ''جنڑی پتا کرو قریب میں کوئی فون ہے؟''

''فون کا کیا کرنا ہے؟''

''جنرل ضیاء کو تو خبر دینی پڑے گی۔''

''استاد جی! ادھر کہہ رہے ہو کسی کو خبر نہیں پڑے اب خود جنرل ضیاء کو فون کر کے بتا رہے ہو۔''

کچھ سوچ کر بولے۔ ''اعتبار کرنا مجبوری ہے جنڑی۔ اس کے علاوہ چارہ نہیں۔''

لطیف نے ساتھ والے پہاڑ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے یہ بھی سونے کا ہے۔''

غور سے اس پہاڑ کو دیکھتے رہے۔ پھر دھوپ میں جا کر دوسرے زاویے سے دیکھا..... سیاہ چشمہ اتار کر دیکھا؛ پھر خراماں خراماں چل کر واپس آئے۔ سر میں خارش کرتے ہوئے بولے۔

''اس میں سونا نہیں۔ ایٹم بم کا میٹریل بھرا ہے۔''

گلو نے حیرت سے پوچھا۔ ''مطلب ہے کہ یورینیم ہے؟''

''جنڑی! منہ سے یہ لفظ نکالنا ضروری ہے کیا۔ پہاڑوں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ پہلے ہی دشمن پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔''

''تو پھر کیا کریں؟''

''مجھے اس کی زیادہ فکر نہیں۔ جاتے ہی ڈاکٹر قدیر سے خود کہوٹہ جا کر بات کر لوں گا۔ فکر ہے مجھے تو صرف گولڈ کی ہے۔''

فرید نے کہا۔ ''سائیں! ذرا اپنے بیگ میں چیک کرو کوئی چھینی اور ہتھوڑی ہو تو۔''

''اس کا کیا کرنا ہے؟''

''تھوڑا تھوڑا گولڈ کھرچ لیتے ہیں۔ دیکھو نا سائیں۔ شادیاں کرنی ہیں۔ دس دس تولے سونا مل جائے تو قومی خزانے کا کیا جائے گا؟''

سائیں نے غصہ دکھایا۔ ''جوان ہے تو ذرا پہاڑ کو ہاتھ لگا کر دکھا۔ یہ قوم کی امانت ہے اور شادی اپنے خرچے پر۔''

''سائیں! جب قوم کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہوں تو قوم کی امانت سے دس تولے سونا بھی نہیں لے سکتا۔''

''بالکل نہیں لے سکتے۔''

فرید نے اپنی جیب سے سارا سامان نکال کر ایک پتھر کے ساتھ رکھ دیا۔ پھر سائیں سے فیصلہ کن لہجے میں مخاطب ہوا۔ ''آج فیصلہ ہو جائے گا یا تو... دس دس تولے سونا یا پھر اس پانی میں جمپ لگا......''

''یہ دو فٹ کا پانی میرا کیا بگاڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر جیب خالی کر اور جمپ لگا۔''

''اگر نہ لگاؤں تو؟''

''تو مل کر پھینک دیں گے۔'' یہ سن کر سائیں نے

UUNOVELS.COM

حفظ ماتقدم کے طور پر جیب کا سامان اسی پتھر کے ساتھ رکھ دیا اور پھر اکڑ کر بولے۔

"قدم بھی ہلا دیا میرا تو کہنا ہے سائیں تو نے کشتے نہیں بکریوں کا چارہ کھایا ہے۔"

پھر تین دوست گئے اور انہوں نے اٹھا کر سائیں کو بڑے آرام سے پانی میں ڈال دیا۔

اس کے بعد سائیں کی مونچھیں تربتر ہو گئیں۔ سر پانی سے جب نکالا تو آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ دو فٹ کے پانی میں جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ اٹھے اور دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر کر پانی نچوڑا۔

"جنڈری! یہ تو میں نے خود چھلانگ لگائی تھی۔ پانی سونا ملا ہو تو نہانے سے جوانی میں سال بڑھ جاتی ہے۔"

میں اور لطیف پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھے تھے۔ ہماری جانب پانی میں شڑاپ شڑاپ کرتے آئے۔ "تم دونوں کو بڑی ہنسی لگی ہے۔"

یہ کہہ کر دونوں کو ایک ایک ہاتھ سے پکڑا اور پانی میں کھینچ لیا۔

شہزاد سڑک پر دور پڑے بے یارومددگار سامان سے ٹیپ ریکارڈر اٹھا لایا۔ موسیقی بج رہی تھی اور سب نے ایک دوسرے کو پکڑ پکڑ کر پانی میں پٹخا۔ ایک شور گولڈ ماؤنٹین کے پہلو میں برپا تھا۔ پانی کے اندر سب نے سائیں کو گھیرے میں لے لیا۔ اس کے بعد ہاتھوں پیروں سے جکڑ کر غوطے اس طرح سے دیئے کہ ستار کو اس پر بٹھا دیا۔ اسے نکال کر سانس لینے کی مہلت دیتے اور پھر غڑاپ کر دیتے۔ ٹھنڈ کا احساس نہ تھا۔ پانی کے تالاب میں جگجیت کے گانے "کرتی ململ دی" پر ڈانس کر رہے تھے۔ مائیک بھاگ کر کہیں پتھروں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ فرید اور کلو نے سڑک پر آ کر سانپ سانپ کا شور مچایا تو خود ہی باہر نکل آیا۔ اس کو دور سے کندھے پر لاد کر آئے اور بلند کر کے پانی میں ڈاٹ دیا۔ ہنستے گاتے شور مچاتے ہم بھول گئے تھے کہ کہاں ہیں اور کہاں جانا ہے۔ اس دوپہر اپنی جوانیاں سب نے بیس بیس کیا چالیس چالیس سال بڑھا لیں۔

جب خیال آیا کہ بہت ہو چکی تو گیلے بٹیرے پانی سے باہر نکلے۔ بیگ کھولے گئے۔ دوسرے کپڑے نکال کر پہلے اپنے آپ کو خشک کیا گیا۔ وہیں سڑک پر ایک پتھر کے پیچھے کپڑے تبدیل کیے۔ اسی دوران ناران روڈ پر ایک بھی گاڑی گزرتی نظر نہ آئی۔

پھر ہم ہنستے گاتے سامان اٹھائے اس جیپ کی طرف بڑھے جس کا ڈرائیور باہر نکل کر ہمیں دور سے آتا دیکھ رہا تھا۔

☆......☆

شوگران کو جانے والا راستہ ایک دم اوپر اٹھ رہا تھا۔ جیپ موڑ مڑتی اور زور لگاتی اوپر چڑھ رہی تھی۔ ہم جیسے جیسے بلند ہوتے گئے تو ہوا میں خنکی بڑھتی چلی گئی۔ بلندی کی وجہ سے میرا سر دوبارہ چکرانے لگا۔ متلی والی کیفیت پیدا ہوئی تو سب بڑھ بڑھ کر مجھے قے کے لیے پلاسٹک کے بیگ پکڑانے لگے۔

ہم چوٹی کے قریب پہنچے تو لگا اوپر بادل اترے ہیں۔ پھر جیپ نے ایک لمبا موڑ کاٹا تو سامنے دیکھا دھند نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے تو کہہ دیا تھا کہ شوگران آگیا ہے مگر مجھے شوگران کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سامنے دھند اتنی گہری تھی کہ ہماری جیپ کی لائٹس بھی اسی کے اندر جذب ہو گئی۔ حدِ نگاہ چند فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ میں گھپ اندھیرے میں پھنس گیا ہوں۔ حیرت مجھے یہ بھی تھی کہ ذرا نیچے سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں اور یہاں میں چند قدم اٹھانے کے قابل بھی نہ تھا۔ دھند کے اندر چلتے ہوئے لوگ مجھے سایوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ کبھی وہ سائے نظر آتے اور کبھی کھو جاتے۔ میں سخت مایوسی کا شکار تھا کہ شوگران سامنے ہے مگر میں اسے دیکھنے سے قاصر ہوں۔ مجھے اس دن شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ جن انسانوں کی بینائی نہیں ہوتی وہ کتنی بڑی نعمت سے محروم ہوتے ہیں۔ میرے ساتھی بھی خاموش ہو کر یہ اندھی دنیا دیکھ رہے تھے۔ ہم نے ڈرائیور سے کہا۔

"یہ کیا ہے؟"

"کیا مطلب کیا ہے؟"

"شوگران کدھر ہے۔"

"انہی بادلوں میں ہے اور اس نے کہاں جانا ہے۔"

اس کا یہ انداز ہم میں سے کسی کو پسند نہ آیا۔

"ہمیں یہی بادل دکھانے اتنا اوپر لے آئے؟"

"تم خود اپنی مرضی سے آئے ہو۔ میں کہاں لایا ہوں۔"

میں بولا۔ "تم ہمیں کہہ دیتے کہ اوپر بادل ہیں کچھ نظر نہیں آئے گا۔"

"لوگ شوگران میں دھند دیکھنے ہی آتے ہیں۔ مجھے

UUNOVELS.COM

کیا معلوم تم لوگ کیا دیکھنے آئے ہو۔''

سائیں سب کو ہٹا کر آگے آ گیا۔ ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس سے بولا۔ ''نیچے سے ناران تک کا کتنا کرایہ لیتے ہو؟''

اس نے سائیں کا ہاتھ کندھے سے ہٹاتے ہوئے کرایہ بتایا۔ سائیں نے وہی ہاتھ اس کے کندھے پر دوبارہ رکھا اور کہا۔ ''نیچے سے اوپر اور پھر نیچے جانے کا ایک ٹکہ بھی نہیں دیں گے۔ نیچے کیوائی سے ناران تک کا جو کرایہ ہمیں بتایا ہے اس میں بھی کچھ رعایت کر کیونکہ ہم اسٹوڈنٹس ہیں۔''

ڈرائیور نے سائیں کا ہاتھ ایک بار پھر ہٹایا۔ ''جو اوپر لے کر آیا ہوں وہ کرایہ پہلے نکالو۔ بعد کی بات اس کے بعد کریں گے۔''

گلو غصے میں اس سے بولا۔ ''تو پھر ٹھیک ہے۔ آج ہم سے کرائے لے کر دکھا دے۔''

سائیں نے گلو کو ڈانٹ کر کہا۔ ''جب میں بات کر رہا ہوں تو بات کرنے دے۔'' پھر گلو کو کچھ دیر گھورتا رہا۔ اس کے بعد طنزیہ لہجے سے اس کو بولا۔ ''اجازت ہے تو بات کرلوں۔''

''ہاں ہاں کرلو۔''

سائیں نے طارق سے ماچس کی ڈبیا لی۔ ایک تیلی جلائی اور شعلے کو کچھ دیر نظر بھر کے دیکھنے کے بعد تیلی زمین پر پھینک دی اور ہاتھ ایک بار پھر ڈرائیور کے کندھے پر رکھا۔ ''انجن میں صرف ایک تیلی ڈالنے کی دیر ہے...... اور پھر رہے نام اللہ کا۔''

''جیپ جلانے کی دھمکی دے رہے ہو؟''

''نہیں نہیں قسم مرشد کی، دھمکی نہیں دے رہا صرف خبردار کر رہا ہوں۔''

ڈرائیور نے اپنے کندھے سے سائیں کا ہاتھ ایک بار پھر ہٹانا چاہا تو سائیں غصے میں آ گیا۔ آنکھیں نکال کر اس سے بولا۔ ''اب میرا ہاتھ ہٹایا تو تمہاری گردن یہیں دبا دوں گا۔ جس طرح کھڑا ہے ویسے کھڑا رہ۔''

ڈرائیور نرم پڑ گیا۔ ''پیر صاحب! یہ تو زیادتی والی بات ہے۔''

اس کو ڈھیلا پڑتے دیکھ کر سائیں نے اپنا لہجہ ہلکا کرلیا۔ ''زیادتی تو یہ تھی کہ اپنے کرائے کے لالچ میں ہمیں اس دھند میں لے آئے۔ تیرے پاس دو راستے ہیں یا تو ہمیں شوگران دکھا یا پھر ناران لے جا۔''

پھر ڈرائیور سے ناران تک کے کرائے کی بات سائیں نے پکی کرلی۔ اس نے وہی کرایہ مانگا جو کیوائی سے ناران تک کا تھا۔ جب بات طے ہوگئی تو سائیں نے اس کے کندھے سے اپنا ہاتھ اٹھایا اور ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔ ''جندڑی! ادھر آس پاس کوئی فون ہوگا؟''

''ساتھ ایک ہوٹل ہے۔ اس میں ہے۔''

مائیک کی جانب اشارہ کر کے سائیں ڈرائیور سے بولا۔ ''یہ اپنے گورنر فضلِ حق کا بھائی ہے۔ ماموں سے بات کرنی ہے۔''

ڈرائیور کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔

مائیک سے سائیں کہنے لگا۔ ''اب ہیلی کاپٹر منگوا کر کیا کرنا ہے۔ ایک تو دھند میں کیسے اترے گا اور دوسرا ڈرائیور سے بھی صلح ہوگئی ہے۔ رہنے دو۔ اب ناران سے فون کرلینا۔''

فرید بولا۔ ''مگر ماموں نے تو اسے کہا تھا کہ شوگران پہنچ کر مجھے فون کرنا۔''

''جندڑی! ماموں کو میں سمجھا دوں گا۔ ایک تو تم سب بہت ڈرتے ہو ان سے۔ اتنا سخت نہیں جتنا مشہور ہے۔''

''سائیں! وہ جتنا مشہور ہے سخت اس سے زیادہ ہے۔ یاد نہیں مائیک کو کھانے پر کس طرح سے ڈانٹ دیا تھا۔ اس بے چارے نے صرف یہ کہا تھا کہ ماموں یہ بھنا دنبہ سامنے سے ہٹوا کر میرے لیے برگر منگوا دیں۔''

''جندڑی! اس بات پر تو اسی کوڑے بنتے ہیں۔ سخت ہوتا تو پھانسی کا آرڈر بھی برگر کے ساتھ دے دیتا۔''

پھر سائیں اور فرید ہنسنے لگے۔ ادھر مائیک پریشان کھڑا تھا کہ یہ کس کے ماموں کی بات ہو رہی ہے اور ڈرائیور اچانک فق کیوں ہو گیا ہے اور جنرل فضل حق کیا واقعی میرا ماموں ہے۔''

میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ''ہمیں ایک گھنٹا دے دو۔ اس دھند میں جھانکتے ہیں شاید کوئی واقف کار نکل آئے۔''

وہ ہاتھ باندھے جیپ سے ٹیک لگائے خاموش کھڑا رہا۔

☆......☆

شوگران کے دھندلے موسم نے مجھے مایوس کر دیا تھا۔ یہ میرے بس سے باہر تھا کہ دھند کے اندر چھپے شوگران کو ڈھونڈ سکوں۔ دھند کی بجائے بارش ہو رہی ہوتی تو ہم کسی

UUNOVELS.COM

ہوٹل میں کمرے لے کر ان کی کھڑکیوں سے باہر پھیلے شوگران کے سبزہ زاروں کے مناظر دیکھتے۔ ٹپ ٹپ برستی بارش میں شوگران بھیگتے دیکھتے۔ مگر دھند کا کیا اعتبار ہے۔ دھند تو انسانی مزاج کی طرح ہے کہ آج چھٹے کہ کل۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ شوگران کے دن بھی ناران میں رہیں گے۔ اس فیصلے پر میرے ساتھ سارے دوست بھی مطمئن تھے۔

میں اور لطیف دھند میں بمشکل چل کر ایک چھوٹی سی دکان تک پہنچے۔ لطیف نے سگریٹ خریدی اور پھر ہم باہر اسٹولوں پر بیٹھ کر کولڈ ڈرنک پینے لگے۔ اس سے پہلے طارق سے کسی نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ کشمیرن یہاں آئی ہو۔ طارق لائٹر جلا کر دھند کے پار دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر کسی نے کہا کہ اس کے ساتھ سہیلیاں بھی ہوں گی تو تمام دوست لائٹر جلائے سہیلیاں ڈھونڈنے لگے۔ شوگران اونچائی میں تھیاگلی کے برابر اور خوب صورتی میں یکتا ہے۔ کسی دور میں یہ جانوروں کی چراگاہ ہوگی۔ پہاڑ اور میدان سب سبزے سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ ہائیکرز کو پہاڑوں میں اندر تک کھوج لگانے کے لیے کئی مقامات ملتے ہیں۔ سری اور پائے جیسے حسین مقامات یہاں پر ہیں۔ وہاں سے موسیٰ کا مصلی نامی برفانی چوٹی نظر آتی ہے۔

میں کسی بھی طرح چند فٹ بعد نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دھند نے مجھے کوفت میں مبتلا کر دیا۔ یہ کوفت چڑچڑے پن میں تو نہ بدلی بلکہ اداسی میں تبدیل ہونے لگی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے چاروں جانب اندھیرا ہے۔ میرے تمام راستے گم ہو چکے ہیں۔ سب ساتھی مجھ سے بچھڑ گئے ہیں اور میں بالکل تن وتنہا رہ گیا ہوں۔

لطیف نے پوچھا۔ ''ہوسکتا ہے کنول شوگران میں ہو؟''

لطیف سوال کر کے خاموش بیٹھا تھا۔ خاموش میں بھی تھا کیونکہ کوئی ڈھنگ کا جواب میرے پاس نہ تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کنول شاید یہاں موجود ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے شاید نہ ہو۔ اگر ہے بھی تو کہاں ہے؟ میرے چاروں جانب تو دھند چھائی ہے پھر کس طرح اسے دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ پوری کائنات اسی دھند کی لپیٹ میں ہے۔ بھولے بھٹکے، کوئی نہ کوئی میری راہ میں آ کر مجھ سے مل لیتا ہے اور لحظہ بھر ملنے کے بعد دوبارہ اسی دھند میں کھو جاتا ہے۔ یہ چھپن چھپائی کا کیسا کھیل ہے کہ جس کی مرضی آتی ہے مجھ سے کھیل کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ مگر مجھے ہرا کر دوبارہ دھند کی طرح دھند بن کر اس میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ میرے لیے ایسی زمین کیوں نہیں جہاں میں بھی دور دور تک دیکھ سکوں۔ یہ تو دیکھ سکوں کہ مجھے اکیلا چھوڑ کر کوئی آخر جاتا کہاں ہے۔ میں تو ہر بار صرف کسی کو دھند سے نکل کر اپنی جانب آتے یا پھر پلٹ کر واپس اس میں جاتے دیکھ پاتا ہوں۔ مجھے بھی ایسی بینائی ملے کچھ دیر تو اسی دھند میں چلوں۔ یہ تو دیکھ پاؤں کہ مجھ سے بچھڑ کر جانے والا گیا کہاں ہے مگر یہاں تو مجھ سے بچھڑنے والے چند قدم چل کر آئے اور چند لمحے مل کر پلٹے اور پھر چند قدم دور دھند کے سمندر میں ہمیشہ کے لیے اتر گئے اور میں دھند کے کنارے پر تنہا رہ گیا۔

کئی بار دھند کے سمندر میں اترا کہ جانے والے کو تلاش تو کر سکوں مگر ہر بار اندھوں کی طرح راستہ ٹٹولتا رہا اور ملا کوئی نہیں۔ لگتا ہے سب کو میں نظر آ رہا ہوتا ہوں اور کوئی مجھ کو نظر نہیں آتا۔ میری یہ بے بسی مجھے اداس کر گئی۔ میں شدید رنج میں ڈوب گیا۔ مجھے اپنی گلی کا مولا داد یاد آنے لگا۔ لمبا قد، مضبوط جسم اور سفید داڑھی میں کالے بال بھی جھانکتے تھے۔ پتا نہیں کون سی بیماری لگی کہ چند ماہ کے اندر نابینا ہو گیا تھا۔ اس کی ریڑھی جس پر سبزی بیچا کرتا تھا وہ گھر کے دروازے کے ساتھ گلی میں کھڑی رہتی تھی۔ وہ لمبی ڈانگ پکڑے گھر سے نکلتا اور سب سے پہلے ٹٹول ٹٹول کر اپنی ریڑھی پر ہاتھ رکھتا۔ تاریک آنکھوں سے آسمان کو تکتے ہوئے تا دیر کھڑا رہتا۔ اس کے چہرے پر کرب کی موجیں سر پٹخ رہی ہوتیں۔ میں پرائمری کلاسوں میں تھا جب اکثر اسے ریڑھی پر ہاتھ رکھے گم صم کھڑے دیکھا کرتا۔ محلے کے لڑکے اکثر گلی میں کھیل رہے ہوتے جب وہ لاٹھی ٹکاتا وہاں سے گزرتا۔ اس کے بھی چاروں جانب میری طرح دھند تھی۔ لڑکے اس کی ریڑھی بھگا کر لے جاتے اور وہ گرتا پڑتا لڑکوں کے پیچھے بھاگتا۔ اپنی ریڑھی کو بچھڑے محبوب کی طرح پکارا کرتا۔ ایک دن وہ بے بس اور لاچار اندھا بپھر گیا۔ لڑکوں پر ایسی لاٹھی برسائی کہ سب کونوں کھدروں میں دبک گئے۔

(جاری ہے)

حقائق گم گشتہ

فرزانہ نکہت

بائبل میں بیان کردہ بہت سے واقعات کو خود بائبل کے ماننے والے فرضی واقعات بتاتے ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت داؤد کو بھی فرضی کردار بتاتے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ قبل آثاریات کے ماہرین نے کھدائی کے دوران ایک ایسی تحریر دریافت کی جس نے پوری دنیا میں ہلچل مچا دیا ہے۔

آثار قدیمہ کی دریافت کردہ ایک اہم تحریر کا قصہ

چلچلاتی دھوپ اور جھلسا دینے والی گرمی میں بھی ماہرینِ آثار قدیمہ کی وہ ٹیم بالائی گیلیلی کے علاقے میں قدیم اسرائیلی شہر دان کے کھنڈرات کی کھدائی کرنے میں مصروف تھی۔ ٹیم کی نگراں گائیلا کک بڑی احتیاط سے ان پتھروں کی دیواروں اور فرشوں کا نقشہ بنا رہی تھیں جہاں کبھی شہر کا سب سے بڑا دروازہ ہوا کرتا تھا۔

پھر جب سہ پہر کے سورج کی آڑی کرنیں تازہ دریافت شدہ دیوار پر پڑیں تو میڈم کک کو اس میں جڑے

JUNOVELS.COM

بسالٹ کے پتھر پر کچھ عجیب سے حروف کھدے ہوئے دکھائی دیئے۔ انہوں نے ٹیم لیڈر عبرانی یونین کالج یروشلم کے پروفیسر آوراہم بیرن کو وہ دیکھنے کے لیے بلایا۔ اس ماہر آثاریات نے جب گھٹنوں کے بل جھک کر ان حروف کو غور سے دیکھا تو اس کی آنکھیں دفورِ حیرت سے کشادہ ہو گئیں۔

"میرے خدا! یہ تو ایک بے حد قدیم تحریر ہے!"

تحقیقات سے معلوم ہوا کہ وہ پتھر جس عمارت میں نصب تھا، وہ نویں صدی قبل مسیح میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس پر جو تحریر کندہ تھی وہ دمشق کے بادشاہ کی اپنے دشمنوں شاہ اسرائیل اور ایوانِ داؤد پر فتح کی خبر تھی۔

حضرت داؤدؑ کا حوالہ ایک تاریخی دھماکے سے کم نہ تھا کیونکہ اسرائیل کے اس قدیم بادشاہ کا نام عہد نامہ قدیم میں بھی مرکزی کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے، وہ حضرت عیسیٰ کے اجداد میں سے تھے۔

لادین اور ہر چیز میں تشکیک و ابہام کا پہلو دیکھنے کے عادی لوگ عرصہ دراز سے یہ کہتے چلے آ رہے تھے کہ داؤدؑ محض ایک خیالی کردار ہیں۔ ان کی باتوں کو نفی کرنے کا ثبوت پہلی بار سامنے آیا تھا۔ پتھر پر کھدی ہوئی یہ تحریر کسی یہودی کی تحریر نہیں تھی بلکہ اسرائیلیوں کے ایک دشمن کی تھی۔ جو داؤدؑ کے زمانے سے ایک صدی بعد نمودار ہوا تھا۔ دریافتیں حضرت داؤدؑ کے خانوادے کے وجود اور خود ان کے وجود کی تصدیق کرتی معلوم ہوتی ہیں۔

کھدی ہوئی تحاریر یا ہاتھ سے بنائے گئے ہتھیاروں کی دریافت بائبل کے بیان پر نئی روشنی ڈالتی ہے۔ غیر معمولی طریقے سے جدید علم آثاریات حقیقی بائبل کہانیوں کے ایک حصے کی تصدیق کرتا ہے۔

کتاب پیدائش میں بنی اسرائیل کا شجرۂ نسب حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوتا ہے جو ایک خانہ بدوش موحد تھے۔ بنی اسرائیل ان کے پوتے یعقوبؑ بن اسحاقؑ کی نسل سے ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز کیا اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ بے شمار اقوام کے مورثِ اعلیٰ ہوں گے۔ ان کی اولادیں کنعان پر قابض ہو جائیں گی اور وہاں خوب پھولیں پھلیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ان کے بیٹے اسحاق کے بیٹے یعقوب کے بارہ بیٹے تھے جن سے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے پیدا ہوئے۔

جدید ماہرینِ اثریات بائبلی بیان کی تصدیق کرتا ہوا کوئی ثبوت دریافت نہیں کر سکے تھے۔ تاہم ڈیئر فیلڈ الینوائی کے ٹرینٹی ایوینجیکل ڈیوائنٹی اسکول کے عہد عتیق اور سامی زبانوں کے پروفیسر ہیری بزل اس پر ہرگز حیرت زدہ نہیں۔ "یہ گمنام خانہ بدوشوں کے نسلاً بعد نسلاً چلے آنے والے خاندانی قصے ہیں۔ ایسے ہی طرز کی جیو پولیٹیکل تاریخ نہیں جو بادشاہوں کی لڑی سے منسلک چلی آتی ہو۔"

لیور پول یونیورسٹی برطانیہ کے ریٹائرڈ شدہ مصریات اور علوم شرقیہ کے ماہر پروفیسر کینیتھ کچن کا کہنا ہے کہ علم آثاریات اور بائبل کے تاریخی واقعات کے متن میں حیرت ناک مماثل موجود ہے۔ کتاب پیدائش 37.28 میں یعقوبؑ کے بیٹے یوسفؑ کو مصر میں بحیثیت غلام بیس چاندی کے سکوں (ٹیکل) کے عوض فروخت کیے جانے کے بیان کی تصدیق اب جدید شام و عراق سے ملنے والی دستاویزات سے بھی ہوتی ہے۔ کچن کے بیان کے مطابق بیس ٹیکل کی رقم انیسویں سے سترہویں صدی قبل مسیح میں غلاموں کی انتہائی قیمت ہوا کرتی تھی۔

دوسری دستاویزات یہ ثابت کرتی ہیں کہ غلاموں کی قیمت صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی تھیں۔ اگر یوسفؑ کی کہانی چھٹی صدی قبل مسیح کے یہودی کاتب کے کارخانہ دماغ کی پیداوار ہوتی جیسا کہ بعض شکوک و شبہات کے شکار لوگوں کا خیال تھا تو غلاموں کی قیمت اس زمانے کی قیمت سے مطابقت کیوں رکھتی تھی؟ "ہمارے لیے دانشمندانہ فعل ہوگا اگر ہم بائبل کے بیان کو درست تسلیم کر لیں۔" کچن کا کہنا تھا۔

حضرت موسیٰؑ کی سربراہی میں بنی اسرائیل کا فرعون کی غلامی سے نجات پانے کے لیے مصر سے فرار پھر ان کا ارض موعود کنعان پہنچنا، یہودی بائبل کا مرکزی اعلان عام ہے لیکن ماہرین آثاریات نے بائبل سے ہٹ کر اس کہانی کی کوئی تصدیقی شہادت نہیں پائی۔ نہ ہی اس بات کی کہ موسیٰؑ کا واقعی کوئی وجود رہا تھا۔

تاہم سرنا، والتھم میساچوسٹس کی برینڈیز یونیورسٹی کے پروفیسر کا کہنا ہے "بنی اسرائیل کی مصر سے ہجرت کی کہانی غلامی کے جوئے تلے دبی کچلی قوم کی کوئی جھوٹی کہانی یا افسانہ نہیں ہو سکتی۔ کوئی قوم اپنے لیے اس قسم کی مذموم روایت کے قیام کو پسند نہیں کر سکتی اگر اس کے پاس اس کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔ ایریزونا یونیورسٹی کے ماہر آثاریات ولیم ڈیور کا کہنا ہے کہ "غلام، زرعی غلام اور خانہ بدوش آثاریات قدیم کے ریکارڈ میں چند ہی سراغ چھوڑتے

UUNOVELS.COM

ہیں۔"

بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کا قصہ طویل عرصے سے موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ کتاب شاہاں 1-6 میں بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے بارے میں واضح تاریخی بیان موجود ہے۔ "اسرائیلیوں کے سرزمین مصر سے نکلنے کے چار سو اسی سال بعد حضرت سلیمان کی حکومت کے چوتھے سال ہیکل سلیمانی کی تعمیر شروع ہوئی لیکن اس کی تعمیر کی تاریخ دوسری بائبلی روایات اور مصری تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتی۔

سرنا اور دیگر ماہرین آثاریات اس کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہاں ہر چالیس سال کا مطلب ایک نسل ہے۔ اس زمانے میں سالوں کی گنتی وہ نہیں ہوسکتی جو آج کل ہے کہ ہر سال میں اتنے دن اتنے ہفتے اتنے مہینے ہوتے ہیں۔ وہ مختلف قسم کی گنتی ہے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق ماہرینِ آثاریات اور تاریخی محققین کے مطابق خروج کا زمانہ تیرھویں صدی قبل مسیح کا ہوسکتا ہے۔ جب منفتاح بن رعمسیس دوم فرعونِ مصر تھا۔ اس زمانے کے واقعات و حوادث آثاریاتی ریکارڈ سے مماثل رکھتے دکھائی دیتے ہیں۔

گزشتہ چار عشروں کے دوران جو دریافتیں ہوئی ہیں، وہ بائبلی روایات کی تصدیق کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر شمالی یروشلم کے ایک غار کے اندر واقع قبرستان میں ایک مصلوب آدمی کی باقیات دریافت ہوئی ہے۔ رومنوں نے اپنے دورِ حکومت میں باغیوں، لٹیروں اور ہزاروں غداروں کو مصلوب کیا تھا۔ ان کی باقیات آج تک دریافت نہیں ہوسکیں۔ اس غار میں پائی جانے والی یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ اس شخص کی ہوسکتی ہیں جسے حضرت عیسیٰ کے دھوکے میں مصلوب کیا گیا تھا یعنی یہوداسکریوتی کی۔

یہ ہڈیاں پتھر کے ایک صندوق میں محفوظ کرلی گئی ہیں۔ یہ کسی ایسے شخص کی معلوم ہوتی ہیں جس کی عمر چھبیس تیس سال کے درمیان تھی۔ اس کی کلائیوں پر کیلوں کے ٹھونکے جانے کے سوراخ موجود ہیں۔ اس کے گھٹنے باہر کی طرف موڑے گئے ہیں۔ دونوں پیروں میں بھی لوہے کی کیلوں کے سوراخ موجود ہیں۔ گھٹنوں کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ یوں کتاب یحییٰ کے اندراج کی تصدیق ہوتی ہے کہ "پھر سپاہی آئے انہوں نے اس آدمی کی ٹانگیں توڑ دیں۔"

کہا گیا ہے کہ رومی مصلوب لوگوں کی لاشیں ایک عام قبر میں کتوں، گیدڑوں اور گدھوں کی خوراک بننے کے لیے پھینک دیا کرتے تھے لیکن اس ایک ڈھانچے کا صحیح سلامت غار سے دریافت ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ رومی لواحقین کو اپنے مردے اپنے طور دفنانے کی اجازت بھی دے دیا کرتے تھے۔

1990ء میں جب قبۃ الصخرہ کے جنوب میں تین کلومیٹر کی دوری پر ایک پارک بناتے ہوئے وہاں کام کرنے والوں نے ایک پوشیدہ مدفن دریافت کیا۔ اس زیرِ زمین مدفن میں بارہ قبریں بنی ہوئی تھیں۔ ان کی قبروں کے پتھروں پر جو تحریریں کھدی ہوئی تھیں وہ پہلی صدی کی تھیں۔ ایک قبر میں جس آدمی کی باقیات پڑی تھیں اس کی عمر کا اندازہ ساٹھ سال کے لگ بھگ لگایا گیا تھا۔ اس کی قبر پر کھدی تحریر "یوسف بن قایافہ" تھی۔ ماہرین کا قیاس ہے کہ یہ یروشلم کے بطریق اعظم قایافہ کی باقیات ہیں جس نے حضرت عیسیٰ کو گرفتار کروایا تھا اور ان سے سوال جواب کروائے تھے اور انہیں پونتیاس پیلاطس رومی گورنر کے حوالے کردیا تھا جس نے انہیں صلیب کی سزا دے دی تھی۔

چند عشرے قبل یہودیہ کی رومی حکومت کے قدیم دارالحکومت قیصریہ کے کھنڈر کی کھدائی کے دوران پتھر کی ایک ایسی سل دریافت ہوئی جس پر کھدے ہوئے الفاظ بری طرح سے خراب اور اکھڑے ہوئے سے تھے۔ ماہرین نے جب اس کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ الفاظ "پونتیاس پیلاطس گورنر یہودیہ نے ٹائبیریئس کے نام پر یہ عبادت گاہ قیصریہ کے لوگوں کو ہدیہ کردی ہے۔" تھے۔

پونتیاس پیلاطس کے نام کی صرف یہی ایک تختی جو ایک نہایت اہم اور حتمی دریافت ہے وہاں سے مل سکی ہے۔ اس سے بائبلی اندراج کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ کی مصلوبیت کے زمانے میں وہاں واقعی رومیوں کی طرف سے پونتیاس پیلاطس گورنر تھا۔

علم آثاریات کا ریکارڈ بیشتر بائبلی تاریخ کے بارے میں خاموش ہے لیکن ماہرین آثاریات کو یقین ہے کہ شرقِ اوسط کی ریتیلی زمین کی تہوں میں بے شمار تاریخی شہادتیں دفن ہیں اور منظر عام پر لائے جانے کی منتظر ہیں۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

UUNOVELS.COM

تیسرا حصہ

روسیاہ

عاطر شاہین

وہ ایک معصوم سا سیدھا سادا نوجوان، غربت کی گود میں پلا بڑھا، خوابوں کی دنیا ہی اس کا مسکن تھا کہ اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی بہن کو اغوا کرلیا گیا اور تب اسے آنکھیں آہن پوش کرنی پڑیں۔ مصائب کے دلدل کو پار کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اس پر آشکار ہوا کہ تقدس کے ملمع چڑھے چہروں کے عقب میں مکروہ چہرے ہیں۔ وہ ان کے چہروں سے نقاب ہٹانا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ زمینی خدا بن بیٹھے مقدس ظالمین کی قوت ناقابل شکست ہے۔

پل پل بدلتے چہروں کی طویل سرگزشت

UUNOVELS.COM

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

اس کا نام علی حسن تھا۔ وہ ایم فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا۔ وہ باکسر تھا اور اسے ہیرو بننے کا شوق تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دے جس سے وہ بطور "ہیرو" پہچانا جائے۔ ایک روز وہ گھر کی طرف جارہا تھا کہ اسے ایک کار کے نیچے ایک پرس پڑا دکھائی دیا۔ آئی ڈی کارڈ عذرا اسماعیل نامی لڑکی کا تھا۔ اس نے وہ پرس لڑکی تک پہنچا دیا۔ عذرا اسماعیل کا والد اسماعیل شاہد سرکس چلاتا تھا۔ اس نے علی حسن کو اپنی سرکس میں بطور کیشئر کی جاب دے دی۔ ایک رات علی اپنے دوست سے مل کر گھر آرہا تھا کہ اسے ایک گلی میں دو لڑکے مل گئے۔ وہ ایک لڑکی کو تلاش کر رہے تھے۔ ایم این اے چودھری باسط کے بیٹے شانی کے پوچھنے پر علی نے انکار کر دیا تھا۔ پھر شانی کے دوست کو لڑکی دکھائی دی اور دونوں اس کی طرف بڑھ گئے۔ علی کو محسوس ہوا کہ لڑکی کی عزت خطرے میں ہے تو اس نے اس لڑکی کو ان دونوں لڑکوں کے چنگل سے بچایا اور اس لڑکی کو بحفاظت اس کے گھر تک پہنچا دیا۔ شانی نے اسے کافی دھمکیاں دی تھیں۔ چند روز کے بعد علی کی بہن روزینہ اغوا ہوگئی۔ علی کو شک تھا کہ اس کی بہن کے اغوا میں شانی ملوث ہوسکتا ہے اس لیے وہ اس کی کوٹھی کے باہر پہنچ گیا اور خوب ہلہ گلا کیا لیکن شانی نے اعتراف نہ کیا۔ علی اپنی بہن کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا پھر ایک روز اسے روزینہ شانی کے ساتھ پجارو میں بیٹھی دکھائی دی۔ شانی نے بھی علی کو دیکھ لیا تھا۔ علی نے پجارو کا تعاقب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ پھر علی نے شانی کی نگرانی شروع کردی اور ایک روز وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے ایک اور کوٹھی میں پہنچ گیا جہاں علی نے شانی پر بے پناہ تشدد کر کے اپنی بہن کے بارے میں پوچھا۔ علی نے اعتراف کرلیا کہ اس نے اس کی بہن کو اغوا کر کے چودھری ساجد نامی شخص کو فروخت کر دیا ہے۔ علی، شانی کو تھانے لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ تیار نہ تھا۔ پھر شانی نے چالاکی سے علی کو اپنے کمرے میں بند کر دیا۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کافی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ وہاں چودھری باسط اور پولیس پہنچ گئی۔ پولیس علی کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔ علی نے ایک ہفتہ تھانے میں گزارا۔ پولیس نے اس پر بہت تشدد کیا اور اسے اس شرط پر رہا کیا کہ وہ آئندہ چودھری باسط اور اس کے بیٹے شانی کے اردگرد دکھائی نہیں دے گا۔ ایک روز علی کو چودھری ساجد کے کارندے کی کال موصول ہوئی۔ اس نے اس کی بہن کے بارے میں بتایا تو علی بغیر سوچے مطلوبہ ایڈریس پر پہنچ گیا۔ وہاں اسے پکڑ کر کرسی سے باندھ کر اس پر تشدد کیا گیا اور اسے زخمی حالت میں سڑک پر پھینک دیا گیا۔ وہاں سے گزرتی شانزے اور اس کی سہیلی اسے اٹھا کر اسپتال لے آئیں۔ علی نے ہوش میں آنے کے بعد شانزے کا شکریہ ادا کیا۔ ان دونوں کی دوستی ہوگئی۔ علی، چودھری ساجد تک پہنچنے کے لیے دوبارہ اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا مگر وہاں چودھری باسط کو ایک عورت کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس پر چودھری ساجد نے نہیں بلکہ چودھری باسط نے تشدد کرایا ہے۔ چودھری باسط کا چودھری ساجد سے کوئی تعلق ہے چنانچہ علی نے چودھری باسط اور سیلی نامی عورت کی تصاویر اور ویڈیو بنالی۔ اس نے پرنٹ نکلوا کر چودھری باسط کو بھجوا دیے۔ چودھری باسط نے اسے فون کیا تو علی نے اس سے ملنے کی فرمائش کی۔ جب وہ ہوٹل میں پہنچا وہاں چودھری باسط کی بجائے اس کا ہمشکل کارندہ موجود تھا۔ علی نے چودھری باسط کو فون کر کے دھمکی دی کہ وہ اس کی ویڈیو چینل پر چلوا دے گا۔ ہوٹل سے نکلتے وقت علی کو شانزے اور اس کی سہیلی مل گئی۔ اس نے ان کے ساتھ ڈنر کیا اور پھر وہ اسے اس کے گھر ڈراپ کر گئیں۔ اگلے روز علی ایک پارک میں موجود تھا کہ پارک کے گیٹ سے ایک نوجوان لڑکی کو اغوا کرلیا گیا اور وہ اس کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔

اب مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بائیک پرانی تھی پھر بھی ساتھ دے رہی تھی۔ میری نظریں سفید وین پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ لڑکی کو اغوا ہونے نہیں دوں گا۔ اسے بچا کر اس کے گھر تک پہنچاؤں گا لیکن یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ انسان سوچتا کچھ ہے، ہوتا کچھ ہے، ایسا ہی میرے ساتھ ہوا۔ بائیک چلتے چلتے آواز کرنے لگی تھی۔ میں نے جھک کر دیکھا تو پچھلا ٹائر پنکچر ہوگیا تھا۔ یہ ایک ایسی افتاد تھی کہ جیتی ہوئی بازی پلٹ گئی۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر دور و نزدیک پنکچر والا بھی نظر نہیں آیا اور سفید وین دور ہوتی نظر آرہی تھی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو خود کو کوستا ہوا میں بائیک کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

کافی دور جانے کے بعد ایک پنکچر کی دکان نظر آئی۔ پنکچر لگوا کر گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر پہنچنے کے باوجود میری طبیعت بوجھل رہی۔ مرینہ نے مجھے چائے بنادی تھی لیکن میری طبیعت پر چائے کا بھی کچھ اثر نہیں پڑا تھا۔ مرینہ نے میری طبیعت کے بوجھل پن کے بارے میں پوچھا تھا لیکن میں نے ٹال دیا تھا۔ میں اسے لڑکی کے اغوا کے بارے میں بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اگلے روز اس لڑکی کے اغوا کی خبر اخبارات کی زینت بنی تھی۔ خبر کے مطابق اس لڑکی کا نام آسیہ تھا اور وہ بلال آباد کے رہائشی اصغر سیال کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ صبح اپنی دادی کے

UUNOVELS.COM

ساتھ مقامی پارک میں سیر کے لیے گئی تھی۔ سیر کرنے کے بعد وہ اپنی دادی کے ساتھ پارک سے نکل رہی تھی کہ ویگن میں سوار نامعلوم لڑکوں نے اسے اغوا کرلیا۔ ایک عینی شاہد نے وین کا نمبر بھی نوٹ کرلیا تھا لیکن تحقیق سے پتا چلا تھا کہ وہ نمبر جعلی تھا۔ اغوا کاروں نے جعلی نمبر پلیٹ لگائی ہوئی تھی۔ اخبار میں آسیہ کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ لڑکی خوبصورت اور تیکھے نقوش کی مالک تھی۔ اس کی عمر انیس بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ آسیہ کے باپ اور دادی کے بیانات بھی شائع ہوئے تھے۔ باپ کے بیان کے مطابق اس کا ذاتی جنرل اسٹور ہے اور ان کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی رات گئے اغوا کاروں نے ان سے کوئی رابطہ کیا ہے۔ پولیس نامعلوم لڑکوں کے خلاف مقدمہ درج کرکے ان کی تلاش میں سرگرداں ہوگئی تھی لیکن آخری اطلاعات تک ابھی تک لڑکی اور اغوا کاروں کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔

یہ نیوز ٹی وی چینلز پر بھی چلی تھی۔ میں نے محلے کے ہیئر ڈریسر کی شاپ پر بیٹھ کر اخبار میں یہ نیوز پڑھی تھی۔ ہیئر ڈریسر کا نام شاداب تھا اور وہ بے حد باتونی نوجوان تھا۔ وہ ادھیڑ عمر تھا اور اس نے اپنی شاپ میں سلطان راہی کی تصویریں لگائی ہوئی تھیں کیونکہ اسے سلطان راہی بے حد پسند تھا۔ وہ سلطان راہی کی فلمیں بڑے شوق سے دیکھتا تھا۔ وہ بتاتا تھا کہ اس نے لاہور میں کئی اداکاروں کے ساتھ کام بھی کیا ہے۔ میں جب بھی اس کے پاس بال کٹوانے جاتا تھا تو وہ کوئی نہ کوئی قصہ ضرور سناتا تھا۔ میں اس کے پاس صرف سر کے بال کٹوانے جاتا تھا کیونکہ شیو میں گھر میں بناتا تھا۔ آج بھی میں بال کٹوانے آیا ہوا تھا۔ جب میری باری آئی تو شاداب نے مجھے بلالیا۔

''یار علی! ایک بات کہوں۔'' شاداب نے میرے بالوں میں پانی کی پھوار چھڑکتے ہوئے کہا۔

''ہاں کہو۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم ڈراموں میں کام کیوں نہیں کرتے۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

اس نے پانی کی پھوار والی بوتل ایک سائیڈ پر رکھی اور کنگھی سے میرے بال سیٹ کرنے لگا۔ پھر بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تم ماشاء اللہ سے ہینڈسم، خوب صورت اور پُرکشش ہو۔ میرا مشورہ ہے کہ تم فلموں اور ڈراموں میں کام کرو۔ ڈراما اور فلم انڈسٹری میں بہت پیسا ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میں نے کچھ عرصہ پہلے لاہور میں ایک اداکار کے ساتھ کام کیا تھا۔ وہ بتاتا تھا کہ جو کمائی اداکاری کرنے میں ہے وہ کسی اور کام میں نہیں ہے۔ پھر شہرت اور عزت بھی بہت ہے۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تعریف کرنے کا شکریہ لیکن مجھے اداکاری کا کوئی شوق نہیں ہے۔''

میری بات سن کر اس کے ہاتھ رک گئے اور وہ حیرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ارے یار، شوق نہیں ہے تو شوق پیدا کرو۔'' اس نے کہا۔ ''آج کل کے نوجوان سیدھے ڈراموں اور فلموں کی طرف جارہے ہیں اور تم کہہ رہے ہو کہ تمہیں شوق نہیں ہے۔''

''ہم۔'' میں نے سر اثبات میں ہلایا۔ ''لیکن مجھے اداکاری کرنی نہیں آتی۔''

''یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔'' شاداب بولا۔ ''آج کل جتنے بھی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ڈراما انڈسٹری کا رخ کررہی ہیں کیا انہوں نے اداکاری سیکھنے کا کوئی کورس کیا ہوتا ہے؟ نہیں۔ پرانے اداکاروں کی اداکاری دیکھ دیکھ کر ان کے انداز میں ڈائیلاگ بولتے ہیں اور آڈیشن پاس کرلیتے ہیں۔ تم بھی سینئرز کی اداکاری غور سے دیکھو اور اسی کی طرح اداکاری کرو۔ آڈیشن میں پاس کرانا میرا کام ہے۔''

''ہم۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں تمہارے مشورے پر سوچوں گا۔''

''ضرور سوچنا، فائدے میں رہو گے۔'' شاداب خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرے کئی اداکاروں، ڈائریکٹروں اور پروڈیوسروں سے رابطے ہیں، میں کسی سے سفارش کرکے تمہیں ڈرامے میں ہیرو کا رول دلوادوں گا۔ تم راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاؤ گے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

شاداب کی زبان نہیں رک رہی تھی اور مجھے اس کی باتوں سے بیزاریت محسوس ہورہی تھی۔ وہ مسلسل اور نان اسٹاپ بولے جارہا تھا۔ ''میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ میں نے کئی اداکاروں اور اداکاراؤں کو کام دلوایا ہے۔ اب وہ خوب مزے میں ہیں۔ تمہارا ایک ڈراما بھی ہٹ ہوگیا ناں تو پھر تمہارے گھر کے سامنے پروڈیوسروں، ڈائریکٹروں کی لائن لگی ہوگی اور ہر کوئی تمہیں اپنے ڈرامے میں کاسٹ کرنا چاہے گا۔''

''اچھا، میں نے کہا ناں کہ میں سوچوں گا۔'' میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''تم جلدی سے میرے بال

UUNOVELS.COM

کا تو، مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔" وہ قینچی اٹھاتے ہوئے بولا۔ "ایک بار پھر کہہ رہا ہوں، ضرور سوچنا۔"

پھر وہ اپنے کام میں مصروف تو ہو گیا... مگر اس کی گردان بھی جاری رہی۔ مجھے اس کی باتوں سے اکتاہٹ ہو رہی تھی لیکن میں خود پر جبر کیے بیٹھا تھا۔ مجھے ڈراموں اور فلموں سے کوئی شغف نہیں تھا اور نہ ہی میں شوق سے دیکھتا تھا۔ البتہ جب کبھی دوستوں میں بیٹھا ہوتا اور وہ کیبل پر مووی دیکھ رہے ہوتے تو دیکھ لیتا تھا ورنہ میں نے کبھی باقاعدہ گھر بیٹھ کر مووی نہیں دیکھی تھی۔

جب شاداب میرے سر کے بال کاٹ کر فارغ ہو گیا تو میں کرسی سے اٹھا اور ایک طرف ہو کر کپڑے جھاڑنے لگا۔ پھر آئینہ میں، اپنا تنقیدی جائزہ لیا تو واقعی میں ہیرو ہی دکھائی دے رہا تھا۔

"اپنے آپ کو دیکھو یار، پورے ہیرو لگ رہے ہو۔" شاداب نے شاید میرا ذہن پڑھ لیا تھا اس لیے وہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ "میری بات پر غور ضرور کرنا، فائدے میں رہو گے۔"

"ہاں، ہاں، میں سوچوں گا۔" میں نے اسے چپ کرانے کی خاطر کہا اور جیب سے پیسے نکال کر اسے دے دیئے۔

"میں تمہارے فیصلے کا انتظار کروں گا۔" شاداب خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "انکار نہ کرنا ورنہ مجھے بہت دکھ ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم جیسا ہینڈسم نوجوان اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر دے۔"

اسی دوران محلے کے رہائشی حکیم قدوس صاحب دکان میں آ گئے۔ وہ جدی پشتی حکیم تھے اور اندرون بازار میں ان کی حکمت کی دکان تھی۔ وہ انتہائی شفیق اور ملنسار انسان تھے۔ سلام ودعا کے بعد وہ بینچ پر بیٹھ گئے اور اخبار اٹھا کر اس کا مطالعہ کرنے لگے۔

"علی بیٹا! کچھ پتا چلا تمہاری بہن کا۔ کیا وہ بازیاب ہو گئی؟" اچانک حکیم قدوس صاحب نے اخبار سے توجہ ہٹا کر قد آدم آئینے میں مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں جو آئینے میں اپنا آپ دیکھ رہا تھا بے اختیار چونک پڑا۔ ان کی بات سے مجھے عجیب سی کوفت محسوس ہوئی تھی۔ اپنے زخم پر کسی کے ناخن لگے تو اندر تک تکلیف ہوتی ہے۔ میرے دل پر بھی گھونسا سا لگا تھا۔

"نہیں، حکیم صاحب۔" میں نے مڑ کر انہیں جواب دیا۔ "پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔"

"ہونہہ۔" انہوں نے ہنکارا بھرا۔ "بیٹا! کیا تمہیں کسی پر شک ہے؟"

شاداب اپنا کام روک کر حیرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے شاید علم نہیں تھا کہ میری بہن اغوا ہو چکی ہے۔ اس کی شاپ دو ماہ بند رہی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کے والد کی طبیعت خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اسے گاؤں جانا پڑا تھا اور دو روز پہلے ہی واپس آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کے والد کی طبیعت اب ٹھیک ہے۔

"نہیں حکیم صاحب۔" میں نے نفی میں جواب دیا۔

وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔ "اللہ تمہاری بہن کو خیر خیریت سے واپس لائے۔ آج کل لڑکیوں، خاص کر معصوم بچیوں اور بچوں کے اغوا کی وارداتیں کافی بڑھ گئی ہیں۔ آئے روز اخبارات میں خبریں چھپ رہی ہیں کہ فلاں محلے کے رہائشی کی چھ سالہ، آٹھ سالہ، بارہ سالہ بچی اغوا ہو گئی یا زیادتی کے بعد لڑکی کو قتل کر دیا گیا۔ اللہ غارت کرے ایسے درندوں کو۔ یہ سب موبائل اور انٹرنیٹ کی وجہ سے ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اب یہی دیکھ لو، کل دن دہاڑے پارک کے گیٹ سے ایک لڑکی اغوا ہو گئی۔ پولیس ابھی تک لڑکی اور اسے اغوا کرنے والوں کا سراغ نہیں لگا سکی ہے۔" ان کے لہجے میں دکھ اور افسوس تھا۔ میں خاموش رہا۔

"کیا تمہاری بہن اغوا ہو گئی ہے؟" شاداب کی حیرت بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی دنیا جہان کی حیرت تھی۔

میں نے جھجکتے ہوئے مدھم آواز میں جواب دیا۔ "ہاں۔"

شاداب حیران رہ گیا۔ اس نے پوچھا۔ "کب......؟"

"دو ماہ پہلے۔" میں نے جواب دیا۔

"دو ماہ پہلے۔" اس کے لہجے میں ہنوز حیرت شامل تھی۔ "کیسے......؟"

عین اسی لمحے شاپ میں بیٹھے ایک شخص نے مجھے مخاطب کیا۔ "علی۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "جی......"

"سچ سچ بتاؤ۔ تمہاری بہن کو واقعی کسی نے اغوا کیا ہے یا وہ گھر سے بھاگ گئی ہے......"

اس کی بات سن کر یکدم میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں اور

UUNOVELS.COM

پورے وجود میں غصے کی لہر سی دوڑ گئی۔ ان کا نام فقیر محمد تھا اور وہ محکمہ زراعت سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ وہ ہمارے محلے میں ہی رہائش پذیر تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد ان کا زیادہ وقت شاداب کی دکان پر ہی گزرتا تھا۔ میں جب بھی شاداب کی دکان کے سامنے سے گزرتا تھا تو یہ یہیں بیٹھے نظر آتے تھے۔ ان کی دو بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ ایک بیٹا سرکاری جاب کرتا تھا جبکہ دو بیٹے پرائیویٹ کمپنیوں میں ایڈجسٹ تھے۔ ان کی دونوں بیٹیاں شادی شدہ تھیں۔ ان کے بیٹوں سے میری اچھی خاصی سلام دعا تھی لیکن مجھے اُمید نہیں تھی کہ یہ ایسی گھٹیا بات کر سکتے ہیں۔

''چاچا! یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے تحمل سے کہا۔ حالانکہ اگر وہ عمر رسیدہ نہ ہوتے تو شاید میں کچھ بھی کرنے سے گریز نہ کرتا۔

''میں نے تھوڑی کہا ہے۔'' فقیر محمد بولے۔ ''پورے محلے میں یہ بات پھیلی ہوئی ہے۔''

''وہ غلط کہتے ہیں۔'' میں نے بہ دستور تحمل سے جواب دیا، حالانکہ اس وقت مجھے اپنے وجود میں غصے سے کپکپی محسوس ہوئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اگر میں مزید کچھ دیر وہاں رکا تو آپے سے باہر ہو جاؤں گا۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ شاید میری حالت حکیم قدوس صاحب نے محسوس کر لی تھی اس لیے وہ میرے پاس آ گئے اور فقیر محمد کو غصے سے دیکھنے لگے۔

''فقیر محمد! تمہیں شرم نہیں آتی کسی کی بہن بیٹی کے بارے میں ایسی بکواس کرتے ہوئے۔'' حکیم قدوس صاحب برہمی سے بولے۔ ''کیا تم بہن، بیٹی والے نہیں ہو؟''

''ارے چاچا قدوس۔'' فقیر محمد اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''شرم تو اسے آنی چاہیے۔ اس کی بہن رات کی تاریکی میں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور یہ اغوا کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے۔ اس کی بہن کے بھاگ جانے سے محلے کی لڑکیوں پر کیا اثر پڑے گا، آپ تو جانتے ہیں۔''

''یہ سب جھوٹ ہے، بکواس ہے۔ میں جانتا ہوں روزینہ بیٹی بہت اچھی، نیک اور فرماں بردار بچی ہے۔ وہ کبھی بھی ایسا غلط قدم نہیں اٹھا سکتی۔'' فقیر محمد میرے حق میں بولے۔ ''تمہیں ایسی بے ہودہ گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ تمہیں تو بڑے ہونے کے ناطے اس بچے کی ڈھارس بندھانی چاہیے۔''

حکیم قدوس صاحب نے میری طرف اشارہ کیا۔ میں غصے سے بھرا ہوا تھا لیکن خود پر کنٹرول کیے کھڑا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ عمر کا لحاظ بھی نہ کرتا لیکن میرے والدین نے میری تربیت ایسی کی تھی کہ میں بڑوں کا ادب و احترام ملحوظ رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے فقیر محمد صاحب سے بدتمیزی نہیں کی تھی۔

فقیر محمد جو کہہ رہا تھا اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ مجھے آج ہی معلوم ہوا تھا کہ محلے میں میری بہن کے متعلق کیسی کیسی باتیں بنائی جا رہی ہیں۔ کیسے مبالغہ آرائی سے کام لیا جا رہا ہے۔ کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ سچ کیا ہے۔ پھر بھی ہر کوئی اپنی اپنی رائے قائم کر رہا تھا۔

یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ لوگ کسی بات کی تہہ تک پہنچنے کی بجائے سنی سنائی باتوں پر یقین کرتے ہیں اور مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں لیکن جب سچائی ان کے سامنے آتی ہے تو اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ شرمندگی الگ ہوتی ہے۔ خاص کر لڑکیوں کے معاملے میں تو طرح طرح کی باتیں بنائی جاتی ہیں۔

''آپ نے جو کہا اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' فقیر محمد بولے۔ ''میں تو خاموش ہو جاؤں گا لیکن جو لوگ باتیں بنا رہے ہیں ان کو کیسے چپ کرائیں گے۔''

وہ ہنکارا بھر کر وہاں سے چلا گیا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ میں آخر کتنے لوگوں کے منہ توڑ سکتا ہوں، کتنے لوگوں کی زبانیں بند کروا سکتا ہوں، کتنوں کے سامنے اپنی بہن کی صفائی پیش کر سکتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ یہ میں اور میرے گھر والے جانتے تھے کہ میری بہن کے متعلق نازیبا باتیں کرنے والے وہ لوگ غلط تھے۔ سنی سنائی باتوں پر انہوں نے یقین کر لیا تھا۔ اصل حقائق سے نابلد تھے۔

میں جب گھر پہنچا تو بدستور غصے میں تھا۔ مرینہ نے مجھے اس حالت میں دیکھا تو گھبرا کر بولی۔ ''بھائی! کیا ہوا ہے۔ تم اتنے غصے میں کیوں ہو۔''

''کچھ نہیں۔'' میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''آپ بیٹھیں میں پانی لاتی ہوں۔''

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ مرینہ میرے لیے پانی لے آئی۔ میں نے غٹاغٹ پانی پیا۔ ٹھنڈا پانی پینے سے میرے دماغ کو ٹھنڈک تو مل گئی تھی لیکن میرے اندر آگ بہ دستور موجود تھی۔

''بھائی!'' وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی

UUNOVELS.COM

تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہوا کیا ہے، جس کی وجہ سے آپ غصے میں ہیں۔"

میں نے چند ثانیے اسے دیکھا اور پھر بولا۔ "محلے والے باتیں بنا رہے ہیں۔"

"محلے والے باتیں بنا رہے ہیں۔" اس نے حیرت بھرے انداز میں میری بات دُہرائی۔ "کیا مطلب۔ کس کے متعلق باتیں بنا رہے ہیں؟"

"روزینہ کے بارے میں۔ کہہ رہے ہیں کہ...... روزینہ کو کسی نے اغوا نہیں کیا بلکہ وہ کسی کے ساتھ...... رات کی تاریکی میں بھاگ گئی ہے۔"

یہ الفاظ میں نے انتہائی کرب اور اذیت سے ادا کیے تھے۔ اپنی بہن کے بارے میں بتاتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی میرے سر پر ہتھوڑے مار رہا ہو۔ میں نے دیکھا کہ مرینہ کے چہرے پر بھی غصے کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"ان لوگوں سے تو اللہ ہی پوچھے گا۔ کسی کی ماں، بہن اور بیٹی کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہوئے انہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی۔" وہ غصیلے انداز میں بولی۔

"شرم ہو تو آئے نا۔ ایسے لوگوں میں شرم نام کی تھوڑی سی بھی رمق نہیں ہوتی۔" میں نے اسے دلاسہ دیا۔ "تم پریشان مت ہو۔ اللہ بہتر کرے گا اور ان شاء اللہ ان لوگوں کے منہ بند ہو جائیں گے۔"

"چائے بناؤں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "ہاں، تم چائے بناؤ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔"

مرینہ کمرے سے چلی گئی اور میں باتھ روم میں گھس گیا۔ فریش ہونے کے بعد ہم دونوں بہن بھائی صحن میں کرسیوں پر بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ امی اپنے کمرے میں ہی تھیں۔ بقول مرینہ ان کی حالت بدستور ویسی ہی تھی۔ میں نے انہیں نفسیات کے ڈاکٹر کو چیک کرانے کا ارادہ کر لیا تھا کیونکہ مرینہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ امی اب بہت زیادہ غصہ کرنے لگی تھیں۔ بات بات پر طیش میں آ جاتیں اور چیخنے چلانے لگتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ چیزیں بھی اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگی تھیں۔ ان کو قابو کرنا مرینہ کے لیے بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ جو رشتے دار ہمارے گھر آئے تھے وہ بھی چلے گئے تھے۔ امی کی دن بہ دن بگڑتی حالت کسی دن خطرناک صورتِ حال سے دوچار کر سکتی تھی۔

امی تو کسی صورت ڈاکٹر کے پاس جانے کو تیار نہیں تھیں لہٰذا میں ڈاکٹر کو اپنے گھر لے آیا تھا۔ ڈاکٹر نے امی کا چیک اپ کرنے کے بعد دوائیاں لکھ دی تھیں۔ اس کے مطابق دوائیاں کھانے سے میری امی کی طبیعت سنبھل جائے گی اور وہ آہستہ آہستہ نارمل زندگی کی طرف لوٹ آئیں گی۔ ڈاکٹر نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر امی دوائیاں کھانے سے انکار کر دیں تو دوائیاں انہیں دودھ یا چائے میں مکس کر کے کھلا دیں۔

میں نے دوائیاں لے کر مرینہ کے حوالے کر دی تھیں اور مرینہ نے باقاعدگی سے امی کو دوائیاں کھلانی شروع کر دی تھیں۔

چار روز گزر گئے تھے لیکن میں نے اپنا دوسرا سیل فون آن نہیں کیا تھا۔ میرے خیال کے مطابق چودھری باسط نے مجھ سے رابطہ کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہو گی لیکن جب اسے آگے سے میرا سیل فون آف ملتا ہو گا تو اس کی جھنجلاہٹ دیدنی ہوتی ہو گی۔ ان چار روز میں، میں نے محلے کے چند لوگوں کی باتیں نوٹ کی تھیں۔ ایک دکان کے باہر تو میں نے دو آدمیوں کو اپنی بہن روزینہ کے بارے میں باتیں کرتے سنا تھا لیکن جب انہوں نے مجھے دیکھا تو خاموش ہو گئے تھے۔ میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی تھی البتہ مجھے غصہ بہت آیا تھا جسے میں پی گیا تھا۔

ان چند دنوں میں، میں نے شانزے سے رابطہ کیا تھا اور نہ ہی اس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ میں اس لیے اس سے رابطہ نہیں کرتا تھا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اس کی طرف جھک رہا ہوں یا مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ یقیناً وہ بھی بزی ہو گی ورنہ وہ ہر دوسرے روز مجھے کال کر کے اپنائیت بھرے انداز میں میری خیریت دریافت کرتی تھی۔

چائے پینے کے بعد مرینہ امی کے پاس چلی گئی جبکہ میں اپنے کمرے میں آیا اور بیڈ پر نیم دراز ہو کر سیل فون پر سوشل میڈیا چیک کرنے لگا۔ جب دل اچاٹ ہو گیا تو میں نے سوشل میڈیا بند کیا اور سیل فون سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر لائٹ آف کرنے کی غرض سے اٹھا ہی تھا کہ اسی لمحے سیل فون کی مترنم بیل بج اٹھی۔ میں نے چونک کر دیکھا تو شانزے کی کال تھی۔

میں نے کال اٹینڈ کرنے کے بعد سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو۔"

"ہیلو علی۔" شانزے کی خوشگوار آواز سنائی دی۔ "کیسے ہو۔"

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

میں نے جواب دیا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟'' اس نے اپنی خیریت بتانے کے بعد پوچھا۔ ''تم بزی تو نہیں ہو؟''

''نہیں۔ کیوں؟''

''کیا ہم مل سکتے ہیں؟''

''اس وقت۔'' میں ٹھٹکا اور رسٹ واچ پر نظر دوڑائی تو رات کے دس بج رہے تھے۔

''ہاں۔'' وہ فوراً بولی۔

''خیریت تو ہے ناں؟''

''بالکل خیریت ہے۔'' وہ بولی۔ ''دراصل میرے ممی اور پاپا ایک پارٹی میں گئے ہیں، بھائی کسی دوست کے ہاں گیا ہوا ہے اور میں گھر میں اکیلی بور ہو رہی ہوں۔ سوچا کہ تمہارے ساتھ آؤٹنگ پر چلی جاتی ہوں۔ آئس کریم بھی کھا لیں گے۔''

''آئی ایم سوری شانزے، میں نہیں جا سکتا۔'' میں نے انکار میں جواب دیا۔

''پلیز علی۔'' وہ بے تکلفی سے ملتجی ہوئی۔ ''انکار نہ کرو۔''

''شانزے۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''یوں رات کے دس بجے سرعام گھومنا پھرنا ہم دونوں کے لیے اچھا نہیں ہے اور نہ ہی مجھے زیب دیتا ہے۔ ٹھیک ہے، ہم اچھے دوست ہیں پھر بھی یوں اکیلے گھومنا پھرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر تمہارے یا میرے کسی رشتے دار یا جاننے والے نے ہمیں دیکھ لیا تو وہ الٹی سیدھی باتیں بنائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہاری عزت پر کوئی حرف آئے۔''

میں دراصل اصولی باتیں کر کے اس سے اپنی جان چھڑانا چاہتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ شانزے میری بات سمجھ جائے گی اور دوبارہ ضد نہیں کرے گی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو علی۔'' شانزے نے کہا۔ ''تم بہت اچھے انسان ہو۔''

میں نے گہری سانس لی اور کہا۔ ''جو بات میری نظر میں صحیح ہے میں نے وہ کہی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ہمیں صحیح بات کو فالو کرنا چاہیے۔''

''ہمم۔'' شانزے بولی۔ ''کیا میں کل تم سے ملنے تمہارے گھر آ سکتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے آ جانا۔'' میں نے سوچ کر جواب دیا۔

''تھینکس۔'' شانزے خوش ہو کر بولی۔ ''اچھا اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ۔''

میں نے سیل فون آف کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور لائٹ آف کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔ اس پل میں شانزے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میرے دل میں خواہش ابھرتی تھی کہ کاش کوئی لڑکی میری بھی گرل فرینڈ ہوتی جس سے میں رات رات بھر ڈھیروں باتیں کیا کرتا۔ گرل فرینڈ بنانے کے لیے میں بہت جتن اور تگ و دو کرتا تھا لیکن کوئی لڑکی میرے چکر میں نہیں آتی تھی۔ کسی بھی لڑکی نے مجھے گھاس نہیں ڈالی تھی لیکن اب ایک ایسی لڑکی میری زندگی میں آ گئی تھی جو زبردستی مجھ سے منسلک ہونا چاہتی تھی اور میرے اندر اس کے لیے جذبات بھی نہیں ابھر رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ میں اس وقت انتہائی کٹھن حالات سے گزر رہا تھا۔ ایسے کٹھن حالات میں کسی لڑکی کے عشق میں ڈوبنا میرا ضمیر گوارہ نہیں کر رہا تھا اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک میں اپنی بہن کو بازیاب نہیں کرا لیتا میں اپنے دل اور دماغ میں کسی لڑکی کو جگہ نہیں دوں گا چاہے وہ شانزے ہو یا کوئی اور۔ یہی اٹل فیصلہ کرتے ہوئے میں نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر کے بعد نیند کی وادی میں چلا گیا۔

☆......☆

اگلے روز شانزے کے آنے سے پہلے ہی میں گھر سے نکل آیا تھا۔ میں شانزے کا سامنا کر کے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میرے نظر انداز کرنے والے رویے سے بددل ہو کر اپنی توجہ مجھ پر سے ہٹا لے کیونکہ فی الحال میری کوئی منزل نہیں تھی اور نہ ہی واضح راستہ تھا۔ میرے سامنے خاردار کانٹے تھے۔

اس روز غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں جن سے سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس موسم میں پکوڑے، سموسے کھانے، یخنی اور سوپ پینے کو دل کرتا ہے لیکن میری دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی قنوطیت طاری تھی۔ دل کر رہا تھا پوری دنیا کو آگ لگا دوں۔ ان تمام لوگوں کو شوٹ کر دوں جن پر مجھے روزینہ کے اغوا کا شک ہے۔ وہ مجھے بہت یاد آ رہی تھی اس کی یاد نے ہی مجھے آوارہ گردی پر مجبور کر دیا تھا۔

آوارہ گردی کرتے کرتے جب مجھے چائے کی طلب

UIUNOVELS.COM

محسوس ہوئی تو میں ایک نئی ہوٹل پر پہنچ گیا۔ ہوٹل کے باہر میزیں اور کرسیاں پڑی تھیں اور کافی لوگ چائے پینے اور باتیں کرنے میں معروف تھے۔ میں نے ہوٹل پر کام کرنے والے چھوٹے کو چائے کا آرڈر کیا اور کرسی پر بیٹھ کر اردگرد بیٹھے لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ اسی لمحے میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں نے پتلون کی جیب سے سیل فون نکال کر دیکھا۔ شانزے کال کر رہی تھی۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور کال اٹینڈ نہ کی۔ بالآخر بیل بج بج کر بند ہوگئی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے سیل فون واپس پتلون کی جیب میں رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ شانزے کی پھر کال آگئی۔

میں نے اس بار بھی اس کی کال اٹینڈ نہ کی۔ اسی دوران چھوٹا چائے لے آیا اور میں چائے سپ کرنے لگا۔ میں نے چائے کے تین یا چار سپ ہی لیے تھے کہ پھر شانزے کی کال آگئی۔

''کیا مصیبت ہے یار۔'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ پھر میں نے یس کا بٹن پریس کر کے سیل فون کان سے لگا لیا۔ ''ہیلو۔''

''علی۔ کہاں ہو تم؟'' شانزے کی تفکر بھری آواز سنائی دی۔ ''تم میری کال اٹینڈ کیوں نہیں کر رہے تھے؟''

''سوری۔ دراصل میں بزی تھا۔'' میں نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

''ہمم۔'' اس نے کہا۔ ''میں تم سے ملنے تمہارے گھر آئی ہوئی ہوں۔ تم کب تک واپس آ رہے ہو؟''

''اوہ۔ میں بھول گیا تھا۔'' میں نے ایسے لہجے میں کہا جیسے واقعی مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ ''مجھے آنے میں دیر ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے میں شام تک گھر آؤں۔''

''ہمم۔ اوکے۔ پھر ملاقات ہو گی۔'' شانزے نے جواب دیا اور کال منقطع کر دی تو مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے شانزے کو میری بات ناگوار گزری ہو۔ مجھے اپنے رویے پر افسوس ہوا تھا۔ میں شانزے کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا لیکن میں ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے سیل فون ٹیبل پر رکھا اور چائے سپ کرنے لگا۔ ٹیبل پر آج کا نیوز پیپر بھی پڑا تھا۔ میں نے نیوز پیپر اٹھایا اور سرسری سا دیکھنے لگا۔

اچانک ایک نیوز میری نظروں کے سامنے سے گزری تو میں چونک پڑا۔ خبر کے مطابق، بمبئی کے ایک ہوٹل پر چھاپہ مارا گیا تھا جس کے تہ خانے میں پورنوگرافی کا نیٹ ورک قائم تھا۔ ہوٹل کا مالک گردھاری ہوٹل کی آڑ میں پورنوگرافی کا نیٹ ورک چلاتا تھا۔ ہوٹل کے تہ خانے سے چالیس لڑکیاں، پندرہ مرد اور پندرہ چھوٹے معصوم بچے برآمد کیے گئے تھے۔ لڑکیوں اور بچوں کا تعلق بھارت کے مختلف شہروں سے تھا۔ مرد لڑکیوں اور بچوں سے پورنوگرافی بنانے کی نیت سے وہاں موجود تھے۔ گردھاری نے بتایا تھا کہ اس نے ڈیپ ویب پر اپنا پورن چینل بنایا ہوا ہے اور وہ پورن ویڈیو بنا کر اپنے چینل پر اپ لوڈ کرتا ہے۔

یہ کسی بھی ذی روح کے اعصاب جھنجوڑنے کے لیے کافی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب روزینہ کا خیال میرے دماغ میں آیا تھا تو اندر تک کانپ کر رہ گیا تھا۔ میں اپنی بہن کے بارے میں ایسے خیالات دماغ میں نہیں لانا چاہتا تھا لیکن جب سے فاروق نے مجھے پورنوگرافی کے بارے میں بتایا تھا تو یہ خیالات میرے دماغ میں گھوم جاتے تھے اور باوجود کوشش کے روزینہ کا خیال محو نہیں ہوتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد چائے کا آخری گھونٹ حلق میں اتار کر میں نے چھوٹے کو بلایا اور پیسے دینے کے بعد سیل فون پتلون کی جیب میں رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ اچانک میرے سامنے شانی آ گیا۔ وہ کچھ پل قبل ہوٹل کے سامنے آ کر رکنے والی ڈبل کیبن گاڑی سے اترا تھا۔ شاید اسے کسی نے میری یہاں موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ اس کا یوں آنا میرے لیے خطرے کا سگنل تھا۔ شانی کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی جیسے اس کا پسندیدہ شکار اسے مل گیا ہو۔

''بڑی چائے شائے پی جا رہی ہے۔'' وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا۔ میں جواب دیتا کہ اس نے کہا۔ ''میں تو تمہاری تلاش میں تھا چلو اچھا ہوا تم یہیں مل گئے۔'' پھر اس نے دائیں طرف قدرے فاصلے پر کھڑے اپنے ہم عمر نوجوانوں کی طرف دیکھتے ہوئے...... ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''ادھر ہی آ جاؤ۔''

میں نے گردن موڑ کر دیکھا چار نوجوان تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے پاس آ گئے تھے اور وہ مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے قسائی بکرے کو دیکھتا ہے۔ شاید وہ شانی کے دوست تھے۔

قصاب والی دھاردار نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے ان میں سے ایک نے پوچھا۔ ''کیا یہی ہے وہ جس کے بارے میں آپ نے بتایا تھا۔''

جواب میں شانی نے گردن ہلاتے ہوئے اثبات کا

UUNOVELS.COM

اشارہ دیا۔

"پھر اب اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے؟" دوسرے دوست نے پوچھا۔

"وہی جو میں نے کہا ہے۔ اسے اٹھا کر لے چلو۔" شانی بولا۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر میں کیا کروں۔ وہ تعداد میں پانچ تھے اور میں تن تنہا۔ کوئی فلمی ہیرو تو تھا نہیں کہ اتنے لوگوں سے اکیلے بھڑ جاتا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا، شانی کے چاروں دوست کرسیاں اِدھر اُدھر ہٹاتے ہوئے مجھ تک پہنچے اور دو جوانوں نے میرا گریبان پکڑ لیا۔

"چھوڑو میرا گریبان۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا اور اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کی۔

"نہیں چھوڑتے۔ کیا کر لو گے؟" شانی کا دوست طنزیہ انداز میں بولا۔

میں نے اس کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں ابھی بتاتا ہوں۔" کہہ کر میں نے ایک رسک لیا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ان کا گھیرا توڑ کر میں فرار نہیں ہو سکتا تھا اس لیے میں نے آخری کوشش کی۔ اس کی ناک پر اپنے سر کی ٹکر ماری۔ اس کے حلق سے سسکاری نکلی اور وہ اچھل کر عقبی کرسیوں پر جا گرا۔ اس کے باقی ساتھیوں نے جب یہ منظر دیکھا تو ایک ساتھ وہ تینوں مجھ پر پل پڑے اور بے دریغ گھونسے آزمانے لگے۔

یکدم بھگدڑ مچ گئی تھی بہت سے لوگ باہر نکل گئے تھے جو رہ گئے تھے وہ دیوار سے لگ کر تماشا دیکھ رہے تھے۔ مجھے مارنے والوں میں شانی بھی شامل ہو گیا تھا۔ میں خود کو بچانے کی حتی المقدور کوشش کر رہا تھا۔ یہ ایسا منظر تھا جیسے ریسلنگ میں ایک ریسلر کا مخالف اپنے ساتھیوں کے ساتھ مقابل پر پل پڑتا ہے۔ وہ ایک ہوتا ہے اور اس کے مخالف چار یا پانچ۔ بالآخر وہ اپنا بچاؤ کرتے کرتے نڈھال ہو جاتا ہے اور بے ہوشی اس کا مقدر بنتی ہے۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ شانی اور اس کے ساتھی انتہائی بے دردی سے مجھ پر وار کر رہے تھے۔ اپنے بچاؤ میں میں نے بھی انہیں گھونسے مارے تھے لیکن ان کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے میرا کوئی داؤ کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ اس معرکہ آرائی میں میری جیکٹ اور شرٹ بھی پھٹ گئی تھیں۔ تبھی مجھے موقع ملا اور میں نے ایک نوجوان کی ناک پر گھونسا مارا وہ بلبلاتا ہوا ایک سائیڈ پر ہو گیا تھا۔ میں ہمیشہ مدمقابل کے ناک پر ہی پہلا وار کرتا تھا کیونکہ اس سے مدمقابل کا دماغ جھنجھنا جاتا تھا اور وہ بے حال ہو جاتا تھا۔ جس طرح شانی کا دوست بے حال ہوا تھا۔ دو دوست ناک آؤٹ ہو چکے تھے اب شانی کو ملا کر تین مدمقابل تھے کہ کچھ لوگ آگے بڑھ کر بیچ بچاؤ کرانے لگے۔ بڑی مشکل سے انہوں نے شانی اور اس کے بپھرے دوستوں کو مجھ سے الگ کیا تھا۔ وہ کسی حالت میں مجھے زندہ نہ چھوڑتے اگر بازار کے گارڈز وغیرہ اسلحہ نہ تان لیتے۔

اس دھینگا مشتی میں میری اپنی حالت بھی خراب ہو گئی تھی۔ میرا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون نکل رہا تھا۔ سر کے بال بکھر گئے تھے۔ میں نے ہونٹ سے خون صاف کرتے ہوئے شانی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ شانی کے باقی دو دوست بھی اپنی اپنی ناک پر ہاتھ رکھے اس کے پاس چلے گئے تھے۔ ان سب کی ناک زخمی تھی۔

"آئندہ میرے سامنے نہ آنا ورنہ تمہاری خیر نہیں ہو گی۔" شانی نے مجھے وارن کرتے ہوئے کہا اور پھر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے چلتا بنا۔ بازار والے بھی شاید بات بڑھانا نہیں چاہتے تھے اسی لیے انہوں نے روکا نہیں۔

کسی نے پولیس کو کال کر دی تھی۔ پولیس مجھے ہی موردِ الزام ٹھہراتی اس لیے پولیس کو شانی کے متعلق بتانا فضول تھا۔ شانی اور اس کے دوستوں کے جاتے ہی میں ایک رکشا میں سوار ہو کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

میرے وجود میں غصے کی آگ بھری ہوئی تھی۔ دماغ مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ شانی لندن چلا گیا ہے لیکن اس کی موجودگی بتا رہی تھی کہ وہ لندن نہیں گیا تھا۔ یہیں تھا اور چھپا ہوا تھا۔

آٹو رکشا میرے گھر کے دروازے پر رکا تو میں نے نیچے اتر کر کرایہ ادا کیا اور آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔

"کون؟" چند لمحوں کے بعد مرینہ کی آواز سنائی دی۔

"دروازہ کھولو مرینہ، میں ہوں۔" میں نے کہا تو اس نے دروازہ کھول دیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ حیران رہ گئی۔

"بھائی! یہ......" وہ بولتے بولتے رک گئی۔

"دروازہ بند کر دو۔" میں اتنا کہہ کر اپنے کمرے میں

UUNOVELS.COM

آ گیا۔ مرینہ بھی دروازہ بند کر کے آ گئی۔
"بھائی! کیا کسی سے لڑائی ہوئی ہے؟"
میں نے مرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں ہوا۔ تم پانی گرم کر دو، منہ ہاتھ دھونا ہے۔"
مرینہ وہاں سے چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بتایا کہ پانی گرم ہو گیا ہے تو میں فریش ہونے واش روم میں چلا گیا۔
میں نے گزشتہ رات دوبارہ سیل فون آن کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں جیسے ہی سیل فون آن کروں گا تو چودھری باسط کے فون پر فون آنا شروع ہو جائیں گے لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ سیل فون آن ہونے کے باوجود چودھری باسط نے کال کر کے اپنی ویڈیو کے بارے میں دریافت نہیں کیا تھا۔
میں نے رات بارہ بجے تک اس کی کال کا انتظار کیا تھا پھر میں اسے سائلنٹ پر لگا کر سو گیا تھا۔ صبح اٹھنے کے بعد میں نے سیل فون چیک کیا تو اس پر چودھری باسط کی کوئی مس بیل کوئی نہ تھی۔ واقعی یہ حیرت انگیز بات تھی جس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے سیل فون دوبارہ آف کر کے الماری کے خفیہ خانے میں رکھ دیا تھا جس تک میرے علاوہ اور کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے ویڈیو والی فلیش بھی اسی خفیہ خانے میں رکھی تھی۔

☆......☆

شانی سے ٹکراؤ والے واقعے کو چند روز گزر گئے تھے۔ اس روز کے بعد میرا اس سے پھر ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔ شانزے نے بھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ شاید وہ میرے رویے سے بددل ہو گئی تھی اور اسی انتظار میں تھی کہ میں اسے کال کر کے سوری کروں، اسے مناؤں لیکن میں نے ایسا کرنے سے گریز کیا۔
اس روز سے نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے خفیہ طریقے سے میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ یہ میرا احساس تھا یا وہم، میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے اپنے وہم کو دور کرنے کے لیے محتاط انداز میں قرب و جوار کا جائزہ بھی لیا تھا لیکن مجھے ایسا کوئی شخص دکھائی نہیں دیا تھا جس پر میں شک کرتا۔ اس کے باوجود میں خود کو بے حد بے چین محسوس کر رہا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔
اس روز میں روزینہ کے بارے میں معلوم کرنے تھانے گیا تھا۔ میری موٹر بائیک خراب تھی اس لیے میں آٹو رکشا پر چلا گیا تھا۔ تھانے پہنچ کر مجھے پہلے کی طرح وہی جواب ملا تھا کہ میری بہن کی تلاش جاری ہے جیسے ہی کوئی خبر ملے گی تو مجھے آگاہ کر دیا جائے گا۔ تھانے سے نکل کر میں واپس پیدل ہی گھر کی طرف آ رہا تھا۔
سڑک پر ٹریفک حسب معمول رواں دواں تھی۔ دسمبر کا مہینا تھا۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ دھند کا راج تھا۔ ان دنوں سورج بمشکل ہی اپنی شکل دکھاتا تھا۔ شام ہونے میں ابھی کافی وقت پڑا تھا لیکن دھند آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گاڑی والوں نے اپنی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بھی آن کر دی تھیں۔
میں پل شوالہ کی طرف جانے والی ایک گلی میں داخل ہو کر آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے ٹائر کے چرچرانے کی آواز سنائی دی تو میں نے بے اختیار گردن موڑ کر دیکھا۔ گلی کی نکڑ پر نیلے رنگ کی ایک کار آ رکی تھی۔ اس کے دونوں سائیڈوں کے دروازے کھلے اور دو شہدے ٹائپ نوجوان کار سے نکل کر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے گلی میں داخل ہوئے۔ انہوں نے چست لباسوں کے اوپر لیدر کی جیکٹیں پہنی ہوئی تھیں۔ ایک نوجوان کا ہاتھ اس کی جیکٹ کی جیب میں تھا۔
"سنو۔" ایک نوجوان نے ہاتھ کے اشارے سے مجھ سے کہا۔
میں نے اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔ "میں۔"
"ہاں تم۔" وہ بولا اور وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے میری طرف آنے لگا۔
میں استفہامیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ یک لخت مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں جس گلی میں موجود تھا۔ یہ اکثر و بیشتر ویرانی کا ہی منظر پیش کرتی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ جب میں پائلٹ اسکول میں پڑھتا تھا تو میں اسی گلی سے گزر کر جاتا تھا۔ میں نے اس گلی کے مکینوں کو بہت کم گھروں سے نکلتے دیکھا تھا۔ ہر گھر کے دروازے بند ہی دکھائی دیتے تھے۔
چند لمحوں کے بعد وہ دونوں شہدے میرے قریب پہنچ گئے۔ شکل و صورت سے وہ چھٹے ہوئے بدمعاش دکھائی دیتے تھے۔ ایک نوجوان نے اپنے سر کے بالوں کی پونی کی ہوئی تھی جبکہ دوسرے کے سر کے بال ہلکے ہلکے تھے۔ ایسے لوگوں کے حلیے میں نے فلموں میں ولنوں کے کارندوں کے

UUNOVELS.COM

دیکھے تھے۔

"جی، کیا کہنا ہے؟"

"ہمارے ساتھ چلو۔" پونی والا بولا تو میں چونک پڑا۔

"کہاں اور کیوں؟" میں نے استفسار کیا۔ "میں تو آپ دونوں کو جانتا بھی نہیں۔"

"وڈے چودھری صاحب کو تو جانتے ہو۔" اس نے کہا۔ "انہوں نے تمہیں بلایا ہے؟"

میں نے الجھتے ہوئے آنکھیں سکیڑیں۔ "کون وڈے چودھری صاحب؟"

"چودھری باسط۔"

اب کی بار میرے دماغ میں یہ خیال کوندا کہ یقیناً چودھری باسط کو معلوم ہو گیا ہے کہ بیلی کے ساتھ اس کی وڈیو میں نے بنائی ہے۔ تاہم میں نے معتدل لہجے میں پوچھا۔

"انہوں نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"یہ تو چودھری صاحب ہی بتائیں گے۔" اس نے کہا۔ "تم چلو۔"

"ہمم۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم جا کر اپنے وڈے چودھری صاحب کو میرا پیغام دے دو کہ میں ان کا زرخرید غلام نہیں ہوں۔ اگر ان کو مجھ سے کوئی کام ہے تو وہ خود چل کر میرے پاس آئیں۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔"

میں مڑ کر جانے لگا تو پونی والے نے آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے میرا بازو پکڑ کر روک لیا۔ میں نے پہلے اپنے بازو کو پھر پونی والے نوجوان کو غصیلی نظروں سے دیکھا۔ اس کا یوں میرا بازو پکڑنا مجھے پسند نہیں آیا تھا۔

"تم شرافت سے ہمارے ساتھ چلتے ہو یا—" اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

"کیا زبردستی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔" اس نے کہا۔ "اگر تم شرافت سے ہمارے ساتھ نہ گئے تو ہم دوسرا طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"اور وہ دوسرا طریقہ کیا ہے؟" میں نے خود کو اعتدال پر رکھتے ہوئے استفسار کیا۔ پونی والے شہدے کا دوسرا ساتھی سپاٹ چہرہ لیے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس دوران اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

"ہم تمہیں زبردستی لے جائیں گے اس لیے میری بات مانو اور خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو۔" وہ بولا اور پھر مجھے لے جانے کی کوشش کی تو میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔

"یار، کیا تم پاگل ہو۔ کہہ تو رہا ہوں کہ مجھے تم لوگوں کے ساتھ نہیں جانا۔ جا کر اپنے چودھری کو بتا دو۔" میں نے بے رخی سے جواب دیا اور مڑ کر جانے لگا تو پونی والے شہدے نے کہا۔

"اچھا ہیرو، میں چودھری صاحب سے تمہاری بات کرا دیتا ہوں۔"

"ہمم۔"

پونی والے شہدے نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک سیل فون نکالا اور چودھری باسط کو کال کرنے لگا۔ جلد ہی رابطہ ہو گیا اور وہ میرے متعلق باتیں کرنے لگا پھر دوسری طرف سے چودھری باسط کی بات سننے کے بعد اس نے سیل فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "چودھری صاحب تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے سیل فون لیا اور کان سے لگا کر بولا۔ "فرمائیے چودھری صاحب۔"

"ہیرو! فوراً مجھ سے ملو۔" چودھری باسط کا لہجہ تحکم آمیز تھا۔

"لیکن کیوں چودھری صاحب۔" میں نے پوچھا۔ "پولیس نے تو مجھے آپ سے دور رہنے کا کہا تھا پھر اب آپ پر ایسی کیا افتاد آن پڑی ہے کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے۔"

"کیسی باتیں؟" میں ٹھٹکا۔

"اب فون پر تو نہیں بتائی جا سکتی نا۔" چودھری باسط بولا۔ "لیکن اتنا سمجھ لو کہ تمہاری بہن کے متعلق ہی بات ہے۔"

میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس لمحے میں کیا کروں۔ کیا میں چودھری باسط پر اعتبار کر لوں۔ چودھری باسط سیاست کا بازیگر تھا۔ کہیں وہ میرے ساتھ سیاست تو نہیں کھیل رہا۔ کئی سوالات نے میرے دماغ پر یلغار کر دی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو ہیرو۔" چودھری باسط کی آواز نے میرے سوچنے کے سلسلے کو منقطع کیا۔

"کچھ نہیں۔"

"پھر آ رہے ہو؟"

"چودھری صاحب! کہیں آپ میرے ساتھ—"

UUNOVELS.COM

اس نے میری بات کاٹ دی اور اپنے لہجے میں دنیا جہان کی چاشنی اور شیرینی لا کر بولا۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم آ جاؤ۔ تسلی سے باتیں کریں گے۔''

''ہم۔'' میں نے کہا۔ ''میں آ رہا ہوں۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھیے گا چودھری صاحب کہ میں بے بس اور مجبور نہیں ہوں۔ میں اپنی مرضی سے آ رہا ہوں ورنہ آپ کے آدمی مجھے زبردستی نہیں لے جا سکتے تھے۔''

''جانتا ہوں تم جوڈو کراٹے کے ماہر ہو۔'' چودھری باسط نے قہقہہ لگایا۔ ''تم نے میرے آدمیوں کی ہڈیاں پسلیاں توڑ دینی تھیں اسی لیے میں نے انہیں خصوصی طور پر کہا تھا کہ یہ تم سے پنگا نہ لیں۔ جلدی آ جاؤ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

میں نے سیل فون پونی والے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''چلو۔''

ہم تینوں گلی سے نکل کر کار میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر پونی والے کا ساتھی بیٹھ گیا تھا۔ پھر اس نے کار ریورس کی اور آگے بڑھانے لگا۔ پونی والا میرے ساتھ پیچھے بیٹھا تھا۔

میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکایا اور چودھری باسط کے متعلق سوچنے لگا۔ نجانے چودھری باسط روزینہ کے متعلق کیا بات کرنا چاہتا تھا۔ ابھی ہم نے تھوڑی دیر ہی سفر کیا تھا کہ پونی والے نے یکدم ایک رومال میرے ناک پر رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا یا کچھ سمجھتا، رومال پر لگا محلول میرے سانس لینے پر میرے دماغ پر سوار ہو گیا اور میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ دوسرے ہی لمحے میرے دماغ پر تاریکی نے غلبہ پا لیا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک کرسی پر رسی سے بندھا ہوا تھا۔ یہ ایک پندرہ بائے پندرہ فٹ کا کمرا تھا۔ کمرے کے کونے میں ایک چارپائی پڑی تھی جس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ چارپائی کے قریب ہی ایک میز اور چند کرسیاں رکھی تھیں۔ دیواروں پر زرد رنگ کا پینٹ کیا گیا تھا۔ دو روشندان تھے جن کے طاقچے کھلے ہوئے تھے۔ یہ وہ کمرا ہرگز نہیں تھا جہاں چودھری کے کارندوں نے میری ''درگت'' بنائی تھی۔

میرے دماغ میں فوراً یہ خیال آیا کہ چودھری باسط نے دھوکے سے مجھے ''اغوا'' کرایا ہے حالانکہ جب میں نے اس سے ملنے کی ہامی بھر لی تھی تو پھر مجھے بے ہوش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ چودھری باسط آ گیا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی جیسے مجھے اغوا کرا کر اس نے بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔

''چودھری صاحب! مجھے باندھا کیوں گیا ہے؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ تو مجھ سے میری بہن کے متعلق بات کرنا چاہتے تھے۔''

چودھری باسط نے ایک کرسی اٹھا کر میرے سامنے رکھی اور مغرورانہ انداز میں اس پر بیٹھ کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔ ''جھوٹ بولا تھا میں نے۔''

''کیا مطلب۔'' میں حیران ہوا۔

''میری ویڈیو کہاں ہے؟'' چودھری باسط نے اس بار میرے سر پر بم پھاڑتے ہوئے کہا تو میں سُن ہو کر رہ گیا۔ مجھے اپنی آنکھیں پتھرائی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ تاہم میں نے چونکنے کی ایکٹنگ کی اور دنیا جہان کی حیرت اپنے چہرے پر سجائے بولا۔ ''آپ کی ویڈیو۔ میں سمجھا نہیں۔''

چودھری باسط نے ہونٹ بھینچے اور تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔ ''تم انجان بننے کی کوشش کر رہے ہو لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

میں نے کندھے اچکائے اور مضبوط لہجے میں بولا۔ ''چودھری صاحب! میں کیوں انجان بنوں گا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا آپ کس ویڈیو کی بات کر رہے ہیں؟''

چودھری غائرانہ نظروں سے مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔ ''میری ویڈیو جو تم نے بنائی تھی۔''

میں نے اس بار کوئی جواب نہ دیا البتہ مجھے اپنے وجود میں اتھل پتھل محسوس ہو رہی تھی۔ میری سمجھ سے باہر تھا کہ چودھری باسط کو کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں نے اس کی بلی کے ساتھ ویڈیو بنائی ہے۔ حالانکہ میں نے ایسا کوئی ثبوت بھی نہیں چھوڑا تھا۔

چودھری باسط چند لمحے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''ٹھہرو، میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ پھر تمہارے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔''

اتنا کہہ کر چودھری باسط نے اپنی قمیص کی جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور اسے آن کر کے مجھے ایک ویڈیو دکھانے لگا۔ ویڈیو دیکھنے کے بعد میرے منہ سے طویل سانس نکل گئی۔ یہ وہ ویڈیو تھی جس میں، میں ہوٹل کی راہداری میں کھڑا فون پر باتیں کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ میں ہوٹل کے ہال میں بیٹھا دکھائی دیا۔ ویڈیو دکھانے کے بعد چودھری باسط نے سیل فون آف کر کے میز پر رکھ

UUNOVELS.COM

دیا۔ اس کے چہرے پر اب طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کرختگی بھی ابھر آئی تھی اور میرے پاس بھی اب انکار کرنے کا جواز نہیں تھا۔ اس نے مجھے ثبوت دکھا دیا تھا۔

''کیا اب بھی انکار کرو گے؟''

میں خاموشی سے اسے تکتا رہا۔ وہ گرجا۔

''میری بات کا جواب دو۔''

''نہیں۔''

''ہم۔'' اس نے گردن ہلائی۔ ''ویڈیو کہاں ہے؟''

''میں نے ویڈیو اپنے ایک جرنلسٹ دوست کو دے دی ہے۔'' میں نے صفائی سے جھوٹ بولا تو اس نے آنکھیں سکیڑیں۔

''کس دوست کو؟'' چودھری باسط نے پوچھا۔ ''اس کا تعلق کس چینل سے ہے؟''

''نہیں بتا سکتا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اس کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔''

''زندگی تو تمہاری بھی خطرے میں ہے۔'' چودھری باسط نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''مجھے کوئی پروا نہیں۔'' میں نے اس کے لہجے سے مرعوب ہونے کی بجائے اطمینان سے کہا۔ ''اگر مجھے کچھ ہو گیا تو اس کے ذمے دار تم ہو گے۔ یہ بات میں نے اپنے دوست کو بھی بتا دی ہے۔''

''تم مجھ پر نفسیاتی داؤ آزمانا چاہتے ہو۔'' چودھری بدستور اسی لہجے میں بولا۔

''نہیں۔ یہ سچ ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

''آپ کو یقین نہیں ہے تو میں آپ کے سامنے اپنے دوست سے بات کر کے تصدیق کر دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

میں نے اپنی طرف سے حتی الامکان جھوٹ بولنے کی کوشش کی تھی لیکن شاید چودھری باسط جہاندیدہ اور کھلاڑیوں کا کھلاڑی تھا۔ اس نے میری بات پر یقین ہی نہ کیا۔ مسلسل نفی میں سر ہلاتا رہا۔

''دیکھو ہیرو۔ تم خوامخواہ مجھ سے بھڑنے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم میرے بارے میں جانتے نہیں ہو۔ میرے ہاتھ بے حد لمبے ہیں۔ مجھ سے بھڑنے والا آج تک مجھے نہیں ہرا سکا۔ تم نے میرے بیٹے پر گھناؤنا الزام لگایا میں نے تمہارے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا۔ اگر میں چاہتا تو تمہیں جیل میں ہی گولی مروا کر تمہاری لاش غائب کرا سکتا تھا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

''تو اب اپنی خواہش پوری کر لیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن بھیں گے آپ بھی نہیں۔''

''میں تمہارے گندے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا۔'' چودھری باسط نے نخوت بھرے لہجے میں کہا تو غصے کی شدت سے میری کنپٹیاں سنسنا اٹھیں۔ اس نے مجھے گالی دی تھی اور یہ میرے لیے ناقابل برداشت بات تھی۔ تاہم میں نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟''

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 9000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن منیجر سیکریٹری: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

URDUNOVELS.COM

میرے اس جواب پر چودھری باسط کے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی۔

"شٹ اپ۔" چودھری باسط گرجا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے بائیں ہاتھ سے میرے جبڑے بھینچ لیے۔ "جو پوچھ رہا ہوں، وہ بتاؤ۔ کہاں ہے ویڈیو؟"

"نہیں..... بتاؤں..... گا؟" میں نے بھینچے جبڑے سے جواب دیا تو اس نے ایک جھٹکے سے میرے جبڑے چھوڑ دیئے۔

"اب تم مجھے غصہ دلا رہے ہو۔" اس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

"مجھے کوئی پرواہ نہیں۔" میں نے بے پرواہی سے کہا۔ "ویسے آپ کی ویڈیو چینل پر چلنی تو چاہیے تاکہ عوام بھی اپنے نام نہاد لیڈر کے بدنما چہرے سے واقف ہو جائیں۔"

میری اس بات پر چودھری باسط ایک بار پھر مشتعل ہو گیا تھا۔ بولا۔ "ہم۔ لگتا ہے گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلے گا۔"

"آپ انگلی ٹیڑھی کر کے بھی دیکھ لیں۔" میں نے اسے تپایا۔ "لیکن میں بتانے والا نہیں ہوں۔"

"میں آخری بار تم سے ویڈیو کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ بتا دو اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ تمہارے نہ بتانے پر میں انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔" چودھری باسط مجھے وارن کرتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔ کیا کر لیں گے آپ؟" میں نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ میں اس سے تمیز کے دائرے میں رہ کر بات کر رہا تھا۔

"میں وہ کر سکتا ہوں جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔" وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

"مثلاً آپ کیا کریں گے؟" میں نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"تو پھر سنو۔ میں..... تمہاری چھوٹی بہن کو اغوا کر لوں گا اور....." اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو یک لخت میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میری مٹھیاں خود بخود بھنچ گئیں۔ اگر میں بندھا ہوا نہ ہوتا تو شاید میں اس کا وہ حشر کر دیتا کہ اس کا مکروہ چہرہ پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ پہلے ہی میری ایک بہن اغوا ہو چکی تھی اور دوسری کو اغوا کرنے کی دھمکی چودھری باسط دے رہا تھا۔

"چودھری..... اگر تم نے ایسا کچھ کیا یا میری بہن کی طرف غلط نظر ڈالی تو....." غصے کی شدت سے میں بدلحاظی پر اتر آیا اور میرے منہ سے کف بھی نکل آیا تھا۔

"تو..... تو کیا۔ کیا کر لو گے تم۔" وہ اشتعال دلانے والے لہجے میں بولا۔ میں نے اسے جواب تو نہ دیا البتہ دل ہی دل میں اسے سبق سکھانے کا عہد کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد چودھری باسط نے مزید کہا۔

"دیکھو ہیرو! اگر تم نے ویڈیو میرے حوالے نہ کی تو میں ایسا کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا، کون روکے گا مجھے۔ تم تو مجھے بالکل بھی نہیں روک سکتے۔ اب گیند تمہاری کورٹ میں ہے۔ تمہارا فیصلہ تمہارے اور تمہاری بہن کے حق میں اچھا بھی ثابت ہو سکتا ہے اور نقصان دہ بھی۔ اچھی طرح سوچ لو۔"

اتنا کہنے کے بعد چودھری باسط نے سگریٹ سلگائی اور کش لینے لگا پھر اس نے فضا میں دھویں کا مرغولہ چھوڑا۔ فضا میں پھیلتے دھویں سے وہ بغور میری طرف دیکھ رہا تھا اور میرے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا فیصلہ کروں۔ اس کی بات درست تھی۔ میرا کوئی بھی فیصلہ میرے اور میری بہن مرینہ کے حق میں بہتر یا نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ میں ایک بار پھر بری طرح پھنس گیا تھا۔

"مجھے مت گھورو، صرف سوچو۔" چودھری باسط نے اس بار دھواں میرے چہرے پر پھینکتے ہوئے کہا تو میں نے سانس روک لیا۔

"تم ڈرتے ہو کہ عوام تمہارا مکروہ چہرہ نہ دیکھے۔" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے، میں ایک سیاستداں ہوں اور میرا تعلق ایک بڑی پارٹی سے ہے۔" اس نے سگریٹ کا کش لینے کے بعد جواب دیا۔ "اگر عوام کو ہمارے کرتوتوں کا پتا چل جائے تو وہ ہم پر تھوکیں گے بلکہ نفرت کریں گے اور ہمارا استقبال گندے انڈوں اور ٹماٹروں سے کریں گے۔ پھر ہماری سیاسی حیثیت کے ساتھ ساتھ گھریلو زندگی بھی برباد ہو جائے گی۔"

"تمہیں کتنا خوف ہے عوام اور اپنے گھر والوں سے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "لیکن تمہارے دل میں اللہ کا خوف نہیں ہے جو تمہاری سب حرکتوں کو دیکھ رہا ہے۔ جس کے سامنے تم نے پیش ہونا ہے تو اس وقت کیا جواب دو گے؟"

میرا خیال تھا کہ میری بات پر چودھری باسط لرز جائے گا لیکن اس نے بے ساختہ مگر مکروہ انداز میں بھرپور قہقہہ لگایا تھا۔ پھر مغرورانہ انداز میں بولا۔ "تمہاری تبلیغ کا

UUNOVELS.COM

مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔"

"ہو بھی نہیں سکتا۔" میں نے چوٹ کی۔

"ان باتوں کو چھوڑو۔" چودھری باسط نے ہاتھ اٹھا کر گویا مجھے روکا۔ "مطلب کی طرف آؤ، ویڈیو کہاں ہے۔"

"میں ویڈیو تمہارے حوالے کرنے پر تیار ہوں۔" میں نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہیں بھی مجھے کچھ بتانا ہوگا یعنی کچھ لو اور کچھ دو۔"

"ہونہہ۔" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ "یعنی سودا کرنا چاہتے ہو۔ ٹھیک ہے، پوچھو، تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"مجھے چودھری ساجد کے بارے میں بتاؤ۔" میں نے گویا اس کے سر پر بم پھاڑا۔ وہ ایسے چونکا تھا جیسے چودھری ساجد کا نام پہلی بار سن رہا ہو۔

"کون چودھری ساجد؟" اس نے کہا لیکن مجھے اس کے لہجے میں کھوکھلا پن واضح محسوس ہوا تھا۔ حالانکہ اسے میں پہلے بھی بتا چکا تھا کہ یہ نام مجھے شانی نے بتایا ہے اس وقت بھی چودھری باسط نے میری بات مکھی کی طرح اڑا دی تھی۔

"تم اسے نہیں جانتے؟"

"نہیں۔"

"مجھے تمہارے جھوٹ کا کھوکھلا پن واضح دکھائی دے رہا ہے۔"

"تمہاری اختراع ہے۔"

"ویسے تم سیاست کے بازیگر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین اداکار بھی ہو۔ داد دینی پڑے گی تمہیں۔ بہرحال تمہاری یادداشت کے لیے میں بتا دیتا ہوں...... یہ وہی چودھری ساجد ہے، جس کے ہاتھوں تمہارے بیٹے شانی نے میری بہن کو اغوا کر کے فروخت کیا ہے...... جس کا نام لے کر تمہارے کارندے نے مجھے شہزاد کالونی والی کوٹھی پر بلایا تھا۔ جہاں مجھ پر تشدد کیا گیا تھا اور مجھے زخمی حالت میں سڑک پر پھنکوا دیا تھا۔ آیا کچھ یاد؟" آخر میں میرا لہجہ سوالیہ ہوگیا تھا۔ چودھری باسط سنجیدگی سے میری بات سن رہا تھا۔

"میں نہیں جانتا کسی چودھری ساجد کو؟" چند لمحوں کے بعد اس نے جواب دیا۔

"تم مکر رہے ہو چودھری۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "تم جانتے ہو اسے مگر بتانا نہیں چاہتے۔ اگر میں تمہیں شہزاد کالونی والی کوٹھی میں تمہاری "دوست" بیلی کے ساتھ نہ دیکھتا تو میں یہی سمجھتا کہ وہ کوٹھی چودھری ساجد کی ہے لیکن اب مجھے سو فیصد یقین ہے کہ تم بھی چودھری ساجد کے ساتھ ملے ہوئے ہو اور میری بہن کے اغوا میں تمہارا ہاتھ بھی ہے۔ بتاؤ کہاں ہے میری بہن۔"

چودھری باسط کا چہرہ فق ہوگیا تھا لیکن جیسا کہ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ سیاست کا بازیگر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین اداکار بھی ہے تو شاید غلط نہ تھا۔ وہ واقعی گرگٹ کی طرح تھا۔ اس کے چہرے پر رنگ آ اور جا رہے تھے تاہم اس نے بہت جلد خود پر قابو پا لیا تھا۔

میں نے مزید کہا۔ "تم دونوں باپ بیٹا چودھری ساجد کے گینگ سے منسلک ہو۔ یاد رکھو، تم دونوں کا انجام بے حد بھیانک ہوگا۔ جب لوگوں کو تمہارے کرتوتوں کا علم ہوگا تو وہ تم پر تھوتھو کریں گے اور تم دونوں باپ بیٹے کو چھپنے کے لیے جگہ نہیں ملے گی۔"

"خاموش ہو جاؤ۔" یک لخت چودھری باسط گرجا۔

"سچ کڑوا ہوتا ہے۔" میں نے طنزیہ کہا۔

"بکواس بند کرو۔" چودھری باسط گرجا۔ "مجھے ویڈیو کے بارے میں بتاؤ، وہ کہاں ہے۔ اگر تم نے اب نہ بتایا تو میں ابھی تمہاری دوسری بہن کو بھی اغوا کرالوں گا اور تمہاری آنکھوں کے سامنے اس کی عزت کی دھجیاں بکھیر دوں گا۔"

چودھری باسط کی آنکھوں میں وحشت اور سفاکی ابھر آئی تھی۔ ایسے میں وہ اس وقت واقعی ایک درندہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ مجھے اشتعال دلا رہا تھا لیکن میں بے بس تھا۔ میں اس شیر کی مانند تھا جسے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ وحشت اور سفاکی مجھ میں بھی ابھر آئی تھی لیکن میں مجبور تھا۔ وہ میری بہن کے بارے میں بکواس کر رہا تھا اور میں اس کا منہ توڑنے کے قابل نہیں تھا۔ مجبور، بہت مجبور تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے چودھری باسط کو ویڈیو کے بارے میں نہ بتایا تو وہ میری بہن کو اغوا کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا لہٰذا اپنی بہن کی عزت کی خاطر میں اسے بتانے پر آمادہ ہوگیا تھا ورنہ میں نے تو یہی ارادہ کیا ہوا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں اسے ویڈیو کے بارے میں ہرگز نہیں بتاؤں گا بلکہ اس شرط پر ویڈیو اس کے حوالے کروں گا کہ وہ مجھے چودھری ساجد کے بارے میں تفصیل سے بتائے لیکن بازی اس کے ہاتھ میں تھی اور میں تہی دامن تھا۔

"چودھری۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "میں ویڈیو کے بارے میں بتاتا ہوں لیکن پہلے تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ میرے گھر والوں کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔"

UUNOVELS.COM

"کچھ نہیں ہوگا..... وعدہ کرتا ہوں۔" چودھری باسط اس بار کرخت انداز میں بولا۔ جیسے وہ میری بے بسی سے محظوظ ہو رہا ہو۔ "بتاؤ....."

"ویڈیو میرے کمپیوٹر میں ہے۔"

"ہمم۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اور اس کے علاوہ۔"

"میرے سیل فون میں۔"

"سیل فون کہاں ہے؟"

"میرے گھر میں۔"

"گھر میں کس جگہ رکھا ہے؟"

اس کی بات سن کر میں ٹھٹکا۔ "کیا مطلب؟"

"جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔" چودھری درشت لہجے میں بولا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔

"سیل فون الماری میں پڑا ہے۔" میں نے ہونٹ بھینچ کر جواب دیا۔

"اگر ویڈیو کی کوئی اور کاپی کسی اور جگہ چھپا کر رکھی ہے تو اس بارے میں بھی بتا دو۔" وہ بولا۔ "تاکہ بعد میں تمہیں پچھتانا نہ پڑے۔"

"نہیں۔ صرف کمپیوٹر اور سیل فون میں ویڈیو موجود ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تم نے ویڈیو اپنے کسی جرنلسٹ دوست کو دی ہوئی ہے؟" چودھری باسط نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"وہ میں نے تمہیں..... ڈرانے کے لیے کہا تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"ہونہہ۔" چودھری باسط نے ایسے ہونٹ بھینچے جیسے کڑوی گولی نگل رہا ہو، پھر وہ دروازے کی طرف رخ کر کے اونچی آواز میں بولا "رفیق۔"

چند لمحوں کے بعد پونی والا اندر آ گیا۔

"آپ نے بلایا ہے چودھری صاحب۔" رفیق نے مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔

"شکور کو لے کر فوراً اس کے گھر جاؤ۔" چودھری باسط نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کا کمپیوٹر اور الماری سے موبائل لے آؤ۔"

میں یکدم چونک پڑا۔ وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ میرے چہرے پر استعجاب کے تاثرات ابھر آئے اور میں پریشان کن نظروں سے چودھری باسط کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو چودھری۔" میں نے تیز لہجے میں کہا تو رفیق نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے میرا چودھری باسط سے سوال کرنا اسے پسند نہیں آیا ہو لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔

"تم جاؤ۔" چودھری باسط نے اسے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا تو وہ مجھے گھورتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"چودھری! اسے روکو۔" میں نے احتجاج کرنے والے انداز میں کہا۔ "یہ غلط ہے۔ میں تمہیں خود کمپیوٹر اور موبائل لا دیتا ہوں۔ پلیز، روکو اسے۔"

"مجھے تم پر بھروسا نہیں ہے۔" چودھری باسط بولا۔

"تمہیں بھروسا کرنا چاہیے۔" میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

"کیا تم بھروسے کے قابل ہو؟"

"بھروسے کے قابل تو تم بھی نہیں ہو۔" میں نے بھی دو بدو جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے کمپیوٹر اور سیل فون لینے کے بعد تم مکر جاؤ اور......"

"ہو سکتا ہے تمہاری بات درست ہو۔" چودھری باسط نے خباثت بھرے لہجے میں کہا تو میں تپ گیا تاہم میں نے خود کو نارمل رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی کیونکہ میں اس وقت چودھری باسط کے رحم و کرم پر تھا۔

میں نے مزید کہا۔ "دیکھو چودھری! تمہارے آدمیوں کو دیکھ کر میرے گھر والے پریشان ہو جائیں گے۔ خوف زدہ ہو جائیں گے۔ تم اپنے آدمی کو روکو، میں خود جاتا ہوں۔ میں تمہیں کمپیوٹر اور سیل فون لا دوں گا۔ پلیز، اپنے آدمی کو روکو۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔" وہ بولا۔

"کیوں کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے اس بار درشت لہجے میں کہا۔ "پہلے ہی میری بہن کے اغوا کی وجہ سے میری ماں کی ذہنی حالت بگڑ گئی ہے۔ محلے والے الگ باتیں بنا رہے ہیں۔ جب لوگ تمہارے آدمیوں کو دیکھیں گے تو......"

"مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔" وہ مضحکہ خیز انداز میں بولا۔

"چودھری! تم اچھا نہیں کر رہے۔" میں نے پھنکارتے ہوئے کہا اور ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن بندھا ہونے کی وجہ سے کسمسا کر رہ گیا۔ میری بے بسی پر چودھری باسط کا زوردار قہقہہ گونجا۔ پھر وہ اٹھا اور کمرے سے باہر جانے لگا۔

"یاد رکھو چودھری۔ اگر تم نے یا تمہارے آدمیوں نے

UUNOVELS.COM

میرے گھر والوں کے ساتھ کچھ بھی برا کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یاد رکھنا میری بات۔"

چودھری باسط نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور کمرے سے باہر چلا گیا جبکہ میں وحشت زدہ انداز میں رسیاں جھنجوڑنے لگا۔ میں انہیں توڑنے میں پوری قوت صرف کر رہا تھا لیکن وہ نائیلون کی رسیاں تھیں دھاگے نہیں تھے جو تھوڑا سا زور لگانے پر ٹوٹ جاتے۔

میں بے نیل و مرام ہو کر رہ گیا۔ مجھے مرینہ اور امی کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ وہ جب چودھری باسط کے مشٹنڈوں کو دیکھیں گی تو وہ حقیقتاً گھبرا جائیں گی... مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا اس لیے میں بے بسی کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد رفیق اپنے ساتھی کے ساتھ وارد ہوا۔ اس کے ساتھی کے ہاتھ میں چھوٹی نال والا ریوالور تھا۔ وہ دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا جبکہ رفیق نے میرے بازوؤں کے گرد بندھی رسیاں کھولنی شروع کر دیں۔ شاید وہ مجھے کہیں لے کر جا رہے تھے۔

"کیا تم میرے گھر سے کمپیوٹر اور میرا سیل فون لے آئے ہو۔" میں نے رفیق سے مخاطب ہو کر کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم نے میرے گھر والوں کو......"

رفیق میری بات کاٹ کر بولا۔ "انہیں کچھ نہیں کہا۔ تمہاری بہن اور ماں کو ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ وہ ٹھیک ہیں۔"

اس کی بات سن کر میرے دل کو اطمینان ہوا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس ہوا کے سپرد کی۔ پھر جیسے ہی میں رسیوں سے آزاد ہوا تو میں سکون کی سانس لیتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بازو مسلسل ایک ہی رخ پر بندھے ہونے کی وجہ سے شل ہو چکے تھے۔ میں اپنی گردن کو دائرے کے انداز میں گھمانے لگا جیسے ریسلر کرتے ہیں۔ بازوؤں کو بھی ادھر ادھر گھمایا تاکہ میں خود کو ہشاش بشاش کر سکوں۔ بیٹھے بیٹھے جسم اکڑ گیا تھا۔ رفیق اور اس کا ساتھی بہ غور میری طرف دیکھ رہے تھے۔ دروازے پر موجود شہدے کے ریوالور کا رخ بدستور میری طرف ہی تھا۔

"چلو اب۔" رفیق کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ رفیق نے بھی اپنے لباس کی جیب سے چھوٹی نال والا ایک ریوالور نکال لیا تھا۔

"کوئی شرارت مت کرنا ورنہ......" رفیق نے اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں مجھے لے کر ایک اور کمرے میں پہنچ گئے جہاں چودھری باسط موجود تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا ایل سی ڈی پر جھکا باریک بینی سے کچھ تلاش کر رہا تھا۔

میز پر میرا اسسٹم رکھا ہوا تھا اور چودھری باسط شاید وہ ویڈیو تلاش کر رہا تھا جس میں وہ ببلی کے ساتھ تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں ایک سگریٹ پھنسا ہوا تھا جس کی چنگاری دہکتی ہوئی واضح دکھائی دے رہی تھی۔ میرا اپنا سیل فون بھی میز پر پڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر چودھری اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے سیل فون سے تو ویڈیو اڑا دی ہے لیکن تمہارے کمپیوٹر سے نہیں مل رہی۔" چودھری باسط مجھ سے مخاطب ہوا۔ "بیٹھو اور میرے سامنے ویڈیو ڈیلیٹ کرو۔"

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا کرسی پر بیٹھا اور کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ رفیق اور اس کا ساتھی دروازے پر ہی اٹن شن کھڑے تھے۔ میں نے کمپیوٹر میں بھی ویڈیو ایسی جگہ چھپا کر سیف کی ہوئی تھی کہ چودھری لاکھ سر پٹخ لیتا، ویڈیو تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ چودھری نے ایک کرسی اٹھا کر میرے عقب میں رکھی اور اس پر بیٹھ کر ایل سی ڈی کی اسکرین کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے سامنے ویڈیو تلاش کر کے آن کی۔ تھوڑی سی ویڈیو دیکھنے کے بعد چودھری باسط کی آواز گونجی۔

"ٹھیک ہے، اسے ڈیلیٹ کر دو۔"

میں نے ویڈیو ڈیلیٹ کر دی اور چودھری باسط کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میں نے تمہارا کام کر دیا ہے چودھری۔ اب تم بھی مجھے چودھری ساجد کے بارے میں بتا دو۔"

"ارے، تمہاری سوئی چودھری ساجد پر ہی اٹکی ہوئی ہے۔" چودھری باسط خشونت بھرے لہجے میں بولا۔ "میں نے کہا تھا ناں کہ میں کسی چودھری ساجد کے بارے میں نہیں جانتا۔"

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ چودھری باسط چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "تم نے میری ویڈیو بنا کر بہت بڑا جرم کیا ہے۔ میں اگر چاہوں تو میں تمہیں گولی بھی مار سکتا ہوں لیکن مجھے تم پر ترس آ رہا ہے اس لیے میں تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں لیکن میری ایک بات کان کھول کر سن لو بلکہ اپنے دماغ میں بٹھا لو۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا اور سگریٹ کا کش لے کر فضا میں دھواں چھوڑنے لگا۔ میں اس کی بات سننے کا منتظر تھا۔ پھر اس نے مجھے ڈرانے والے

UUNOVELS.COM

انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے آئندہ میرے یا میری فیملی کے ارد گرد منڈلانے کی کوشش کی، یا تم نے پولیس کو میرے بارے میں کچھ بتانے کی کوشش کی تو میں تمہیں تمہارے خاندان سمیت آگ میں جلا کر خاک کر دوں گا۔ یہ محض دھمکی نہ سمجھنا۔''

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کی باتوں سے سمجھ گیا کہ وہ مجھے اپنی قید سے رہا کر رہا ہے اسی لیے میں اٹھ کھڑا ہوا تو چودھری باسط بھی کھڑا ہو گیا۔

''کیا تم نے میری بات اپنے بھیجے میں بٹھا لی ہے۔'' چودھری باسط نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا اب میں جا سکتا ہوں۔''

''رفیق۔'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے رفیق کو پکارا۔

''جی چودھری صاحب۔'' وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''اسے اس کے گھر چھوڑ آؤ۔'' وہ ہنوز مجھے گھورتے ہوئے بولا تھا۔

''ٹھیک ہے چودھری صاحب۔'' رفیق نے جواب دیا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر ریوالور میرے پہلو سے لگایا اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اپنا کمپیوٹر سسٹم اٹھانا چاہا تو چودھری باسط نے کہا۔

''اسے یہیں پڑا رہنے دو تم اسے نہیں لے جا سکتے۔''

''اس میں میری کام کی چیزیں ہیں۔'' میں نے کہا۔

چودھری باسط نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا۔ تم اسے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ کیونکہ ہارڈ ڈسک فارمیٹ ہونے کے بعد بھی ڈیلیٹ فائلیں نکل آتی ہیں۔ میں تمہاری زندگی بخش رہا ہوں کیا یہ تمہارے لیے قیمتی نہیں ہے؟''

رفیق اور اس کا ساتھی مجھے کمرے میں لے آئے پھر رفیق نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کار میں بٹھایا وہ بھی اس طرح کہ دوسری طرف ایک اور بندہ تھا۔ اس کے بعد مجھے جگہ ملی پھر رفیق بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کار چل پڑی۔ رفیق اور اس کے ساتھی میرے دائیں بائیں ہی بیٹھے تھے اور ان کے ریوالوروں کی نالیں میرے پہلوؤں سے لگی ہوئی تھیں۔

میں حیران تھا کہ چودھری باسط نے مجھے زندہ کیوں چھوڑ دیا تھا۔ اسے شاید ویڈیو درکار تھی، وہ ثبوت مٹانا چاہتا تھا اور ساتھ ہی مجھے دھمکانا بھی چاہتا تھا۔ اگر وہ خود کو بہت بڑا شاطر، جہاندیدہ اور زیرک سمجھتا تھا تو میں بھی اگر خود اس کی طرح نہیں صحیح لیکن اس سے کم بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کی ویڈیو کی کاپی ایک اور کارڈ میں محفوظ کی ہوئی تھی جسے میں نے اپنے کمرے کے کارپٹ کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔ میں نے ایسا دانستہ کیا تھا یا غیر دانستہ، لیکن میرے لیے ابھی وہ کارآمد تھا۔ چودھری باسط سے چودھری ساجد کے بارے میں معلوم کرنا تھا لیکن سب سے پہلے مجھے اپنی فیملی کو محفوظ جگہ پر پہنچانا تھا۔ چودھری باسط کو جب میں بتاؤں گا کہ اس کی ویڈیو کی ایک اور کاپی میرے پاس محفوظ ہے تو وہ پاگل کتے کی طرح مجھے کاٹ کھانے کو دوڑے گا۔ اب میں آخری پتا اس کی طرف پھینکوں گا۔ اگر اس نے چودھری ساجد کے بارے میں نہ بتایا تو میں اس کی ویڈیو نیٹ پر دے دوں گا پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

تقریباً چالیس منٹ کے بعد کار رکی اور رفیق نے میری آنکھوں سے پٹی اتاری تو میں نے دیکھا کہ کار میرے گھر کی گلی کی نکڑ پر موجود تھی۔ رفیق کے کار سے اترنے کے بعد میں کار سے نیچے اترا، رفیق دوبارہ اندر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔

میں اس وقت تک کھڑا کار کو دیکھتا رہا جب تک وہ مڑ کر نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ پھر میں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا گھر کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ گلی سنسان اور ویران پڑی تھی۔ سناٹے کا راج تھا۔ لوگوں کے گھروں کی لائٹیں بند تھیں لیکن میرے گھر کی بیٹھک کی لائٹ ابھی تک جل رہی تھی۔ میں نے کال بیل بجائی تو دو منٹ کے بعد آہٹ ابھری اور پھر مرینہ کی آواز سنائی دی۔

''کون ہے؟''

''مرینہ! میں ہوں۔ علی۔'' میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا، دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا اور مجھے مرینہ دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر خوف اور پریشانی کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔ میں دروازہ بند کر کے پلٹا تو وہ بھائی کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ میں نے شفقت بھرے انداز میں اس کے سر پر پیار کیا۔ وہ لمحہ بے حد جذباتی تھا۔ میری آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی تھی تاہم میں نے ضبط کیا۔

''ارے پگلی! کیوں رو رہی ہو۔'' میرا لہجہ شفقت سے بھرپور تھا۔

''وہ...... وہ بہت خطرناک لوگ تھے۔'' وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔ ''میں ڈر گئی تھی کہ آپ کو کچھ......''

''مجھے کچھ ہوا تو نہیں ناں...... دیکھو میں تمہارے سامنے ٹھیک ٹھاک کھڑا ہوں۔'' میں نے کہا۔

پہلے روزینہ کی جدائی کا غم تھا کہ اب میری وجہ سے اس کے دکھ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مرینہ کو جذباتی دیکھ کر میری آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے تھے اور اسی لمحے میں نے چودھری باسط اور اس کے بیٹے شانی سے بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ میں اسے کسی صورت چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے آنسو صاف کیے اور دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔

''اچھا روو مت۔ اللہ بہتر کرے گا۔ چلو۔''

میں اسے تھامے ہوئے صحن میں آ گیا۔ پھر ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے اور وہ مجھے بتانے لگی جس کا لب لباب یہ تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے دروازے پر جا کر پوچھا تو کسی نے میری آواز کی نقل کر کے میرا نام بتایا تھا۔ مرینہ آواز سن کر یہی سمجھی تھی کہ میں آیا ہوں تو اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ تین تھے جنہوں نے مرینہ کو امی کے کمرے میں بند کر دیا تھا اور پھر وہ میرے کمرے سے میرا کمپیوٹر اور الماری سے سیل فون نکال کر لے گئے۔ جاتے جاتے ایک نے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ یہ تو شکر ہوا تھا کہ امی اس وقت سو رہی تھیں اور انہیں ان کے آنے کا پتا نہیں چلا تھا ورنہ ان کی طبیعت بگڑ جاتی تو گڑبڑ ہو سکتی تھی لیکن شکر ہے کہ ایسا کچھ ہوا نہیں تھا۔

''بھائی! وہ کون تھے؟ اور......'' ساری تفصیل بتانے کے بعد اس نے پوچھا۔

''وہ چودھری باسط کے کارندے تھے۔'' میں نے کہا۔

''وہ آپ کا کمپیوٹر کیوں لے گئے؟'' اس نے پوچھا۔

''انہوں نے الماری کی تلاشی بھی لی تھی۔''

میں نے مختصراً اسے بتا دیا۔ مرینہ بہت ڈری اور سہمی ہوئی تھی۔ میری باتیں سن کر اس کے خوف میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور یہ صورتِ حال قدرے خطرناک تھی۔ میری ماں اور بہن محفوظ نہیں تھیں اس لیے میں انہیں کسی محفوظ جگہ پر پہنچانا چاہتا تھا اس کے بعد ہی میں چودھری باسط سے دوبارہ ٹکرا سکتا تھا۔ میں نے مرینہ کو دلاسہ دے کر امی کے کمرے میں بھیجا اور خود فریش ہونے کے بعد اپنے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز ہو کر آیندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا۔

سوچتے سوچتے اچانک مجھے اسماعیل شاہد کا خیال آ گیا۔

''اوہو! وہی میری مدد کر سکتے ہیں۔ مجھے ان سے رابطہ کرنا چاہیے۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں سوچا اور پھر میں انہیں کال کرنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ اسماعیل شاہد ابھی تک جاگ رہے ہوں گے کیونکہ امیر لوگ رات گئے تک جاگتے رہتے تھے اور دن چڑھے تک سوتے تھے لیکن دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی اور کال اٹینڈ نہیں کی گئی۔ شاید میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ اسماعیل شاہد سو رہے تھے۔ میں نے فون آف کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور لائٹ آف کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆

اگلی صبح آٹھ بجے کا وقت تھا۔ میں ہاتھ منہ دھو کر صحن میں آیا تو مرینہ نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ہی فاروق میرا پوچھنے آیا تھا۔ چونکہ میں سو رہا تھا اس لیے اس نے مجھے جگانا مناسب نہ سمجھا اور میری خیریت پوچھ کر چلا گیا۔ اسی لمحے میرے سیل کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے جیب سے سیل فون نکال کر دیکھا تو اسماعیل شاہد کی کال تھی۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''بیٹا! رات تمہاری کال آئی تھی۔ خیریت تو تھی نا؟''

''سر! میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ہم۔ خیریت تو ہے ناں؟'' انہوں نے دوبارہ اپنی بات دُہرائی۔

''سر! آپ سے مل کر آپ کو ساری بات بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''ہم۔'' وہ بولے۔ ''ابھی تو میں رحیم یار خان میں ہوں اور تھوڑی دیر کے بعد ملتان کے لیے نکلوں گا۔ تم دوپہر دو بجے کے بعد آ جانا۔ میں گھر پر ہی ہوں گا۔''

''شکریہ سر۔''

انہوں نے کال کاٹی تو میں نے سیل فون میز پر رکھ دیا۔ مرینہ کچن میں تھی اور میرے لیے ناشتا بنا رہی تھی۔ اس نے امی کو ناشتا کروا دیا تھا۔

''کس کا فون تھا بھائی؟'' مرینہ نے کچن سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس پر میرے لیے ناشتا تھا۔

''اسماعیل شاہد صاحب کا۔'' میں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ناشتا ٹیبل پر رکھ کر واپس کچن میں چلی گئی اور میں ناشتا کرنے میں مصروف ہو گیا۔

ناشتے سے فراغت کے بعد میں اپنے کمرے میں آیا

UUNOVELS.COM

اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگا لیکن وقت تھا کہ کٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وقت ہمارے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ہم جیسے چاہیں اسے گزارتے ہیں۔ بعض اوقات وقت ہمارے ہاتھ میں نہیں ہوتا اور ہم اس کے گزرنے کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں جس طرح میں کر رہا تھا۔ مجھے ایک ایک پل صبر نہیں آ رہا تھا۔ میں جلد بازی میں کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنی امی اور بہن کو محفوظ جگہ پر پہنچا کر ہی چودھری باسط کے خلاف میدان میں آنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جب تک میرے پاس اس کی ویڈیو ہے وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

میں مقررہ وقت پر اسماعیل شاہد صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ چوکیدار نے بتایا کہ وہ ابھی تک نہیں پہنچے البتہ ان کا فون آیا تھا اور انہوں نے مجھے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کرنے کا کہا تھا چنانچہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ گھر کی ملازمہ میرے لیے چائے لے آئی اور میں انتظار کرنے کے ساتھ ساتھ چائے سپ کرنے لگا۔ تقریباً آدھا گھنٹے بعد اسماعیل شاہد صاحب آئے۔ دعا سلام اور حال احوال پوچھنے کے بعد میں نے انہیں اپنی آمد کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے بڑے غور سے میری باتیں سنی تھیں۔ ان کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے ہوئے تھے جنہیں میں سمجھنے سے قطعاً قاصر تھا۔ ساری بات بتانے کے بعد میں ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ میرے پاس چودھری باسط کی بلی کے ساتھ والی ویڈیو کی ایک اور کاپی محفوظ ہے۔ مجھے خود بھی یہ سمجھ نہیں آیا تھا کہ میں نے انہیں یہ بات کیوں نہیں بتائی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہوا تھا جیسے کسی نادیدہ قوت نے مجھے یہ بات بتانے سے روک دیا ہو۔ حالانکہ میں اب تک اپنی ساری باتیں ان سے شیئر کرتا آیا تھا۔

"دیکھو علی!" اسماعیل شاہد صاحب گلا کھنکار کر بولے۔ "میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ چودھری باسط سے پنگا نہ لو لیکن تم نے میری بات نہیں مانی۔ اب نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ اگر ویڈیو حاصل کرنے کے بعد وہ تمہیں گولی مار دیتا تو...... تو تمہاری ماں اور بہن کا کیا ہوتا؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔" میں نے شرمندگی بھرے لہجے میں کہا۔ "لیکن مجھے اس کے ذریعے چودھری ساجد تک پہنچنا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ چودھری ساجد کون ہے اور اس کا ٹھکانا کہاں ہے۔ دونوں باپ بیٹا چودھری ساجد سے ملے ہوئے ہیں اور اس کے لیے کام کرتے ہیں۔ میری بہن کی گمشدگی کی وجہ سے میری ماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شانی نے غلط بیانی کی ہو۔" اسماعیل شاہد صاحب بولے تو میں چونک پڑا۔

"نہیں سر، مجھے یقین ہے کہ اس نے سچ بولا تھا، وہ پولیس کے سامنے بھی بیان دینے پر تیار تھا۔" میں نے کہا۔

"ہم۔ایسے لوگوں سے کچھ بعید نہیں ہوتا علی۔" وہ بولے۔ "اب تم مجھ سے کیا مدد چاہتے ہو؟"

"سر۔" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے کوئی محفوظ ٹھکانا چاہیے۔"

"کیا مطلب؟...... کیسا ٹھکانا؟"

"سر۔میری ماں اور بہن محفوظ نہیں ہیں۔" میں نے وضاحت کی۔ "میں انہیں کسی ایسی محفوظ جگہ رکھنا چاہتا ہوں جہاں چودھری باسط یا اس کا کوئی کارندہ نہ پہنچ سکے۔ پھر میں چودھری باسط کے خلاف کام کروں گا اور ایسا ثبوت حاصل کروں گا کہ وہ نہ صرف میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے بلکہ مجھے چودھری ساجد تک بھی پہنچا دے۔"

"ہونہہ۔" اسماعیل شاہد نے ہنکارا ابھرا۔ "کیا تم اپنا مکان فروخت کر دو گے؟"

"جی سر۔"

"اسی شہر میں نیا مکان خریدنا چاہتے ہو یا دوسرے شہر میں؟" انہوں نے استفسار کیا۔

"کسی دوسرے شہر میں۔"

"ہونہہ۔" اسماعیل شاہد صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ "لیکن میں تمہیں ایک بار پھر مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ تم بھیڑیوں کے جتھے میں چھلانگ نہ لگاؤ...... ان سے دور رہو۔ پولیس تمہاری بہن اور اسے اغوا کرنے والوں کو تلاش کر رہی ہے لہٰذا اسے اپنا کام کرنے دو۔ چودھری باسط نے اس بار تو تمہیں زندہ چھوڑ دیا ہے، ہو سکتا ہے اگلی بار وہ تمہیں نہ چھوڑے۔"

"سر، ابھی تک پولیس نے کوئی پیشرفت نہیں کی۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اور میرا نہیں خیال کہ پولیس کچھ کر سکے گی۔ آپ یہی دیکھ لیں، چند روز پہلے میری

UUNOVELS.COM

آنکھوں کے سامنے ایک لڑکی اغوا ہو گئی تھی اور ابھی تک پولیس اسے بھی برآمد کرنے میں ناکام رہی ہے۔''

اسماعیل شاہد صاحب سوچ میں غرق ہو گئے۔ ڈرائنگ روم میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ کئی ساعتیں اسی خاموشی کی نذر ہو گئیں۔ چند لمحوں کے بعد اسماعیل شاہد صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''سمجھ نہیں آرہا تمہیں بھیڑیوں سے کیسے بچاؤں۔ تم خود ہی ان کے درمیان کود رہے ہو۔ مجھے تمہاری بہت فکر ہو رہی ہے۔''

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''سر! آپ فکر نہ کریں، اللہ نے چاہا تو مجھے کچھ نہیں ہوگا۔''

''میں ڈی آئی جی احسان اللہ سے دوبارہ بات کرتا ہوں۔'' اسماعیل شاہد بولے۔ ''وہ اپنے ماتحتوں پر دباؤ ڈالیں گے تو پولیس اغوا کاروں اور تمہاری بہن کو ضرور ٹریس کرلے گی۔''

میں نے کہا۔ ''سر، آپ ان سے بھی بات کرلیں لیکن میرا کام بھی کردیں۔''

اسماعیل شاہد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہمارے درمیان دس سے پندرہ منٹ تک اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ وہ مجھے مسلسل خطرے میں پڑنے سے روکتے رہے تھے لیکن میں ہنوز اپنی ضد پر اڑا رہا تھا۔ شاید انہیں میری زندگی عزیز تھی اسی لیے وہ مجھے باز رہنے کا کہہ رہے تھے۔

بالآخر اسماعیل شاہد صاحب نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں تو چاہتا تھا کہ تم بھیڑیوں سے نہ ٹکراؤ لیکن تم اپنی ضد پر اڑ گئے ہو۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ غریب آباد کالونی میں میرے ایک دوست کا مکان کرائے کے لیے خالی ہے۔ تم اپنی ماں اور بہن کو وہیں شفٹ کردو۔ کرائے کی تم فکر نہ کرنا۔ وہ میرا مسئلہ ہے۔ جب تک میں دوسرے شہر میں تمہارے لیے مکان کا بندوبست کرتا ہوں۔''

میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ ''شکریہ سر۔''

''میں تمہیں مکان کی لوکیشن بھیج دوں گا۔'' اسماعیل شاہد صاحب نے کہا۔ ''تم جب چاہو وہاں شفٹ ہو سکتے ہو۔ میں اپنے دوست سے بات کرلیتا ہوں...... اور ہاں...... تمہیں فرنیچر لے کر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں فرنیچر اور ضرورت کا ہر سامان موجود ہے۔''

''آپ کا بے حد شکریہ سر۔'' میں نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ پھر مزید چند باتیں کرنے کے بعد میں ان سے اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے خرچے کے لیے انہوں نے کچھ پیسے بھی دے دیے۔ میں لینا تو نہیں چاہتا تھا کیونکہ شرمندگی آڑے آ گئی تھی لیکن انہوں نے زبردستی میری جیب میں ٹھونس دیے تھے۔

میں جب گیٹ سے باہر نکل رہا تھا تو اسی لمحے آف وائٹ کلر کی ایک کار وہاں آکر رکی۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر شانزے بیٹھی تھی۔ میں اسے وہاں دیکھ کر چونکا، وہ بھی مجھے دیکھ کر چونک پڑی تھی۔ وہ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ ہم دونوں کافی دنوں کے بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ ایسے کھل اٹھی تھی جیسے میں صدیوں بعد اسے ملا ہوں۔

''کیسے ہو علی!'' وہ کار کا دروازہ بند کرکے میری طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟''

''میں...... میں ٹھیک نہیں ہوں۔'' اس نے جواب دیا تو میں چونکا۔

''کیا مطلب۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔'' میں نے پوچھا۔

وہ چند لمحے محبت پاش نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''وہ...... دراصل...... اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ، تم میری کال ریسیو کیوں نہیں کرتے۔''

اس کے لہجے میں شکوہ، خفگی اور شکایت تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اسے کیا جواب دوں۔ اپنی موجودہ کنڈیشن تو اسے بتانے سے رہا۔ تاہم میں نے کہا۔ ''سوری شانزے۔ دراصل میں ان دنوں بہت بزی رہا ہوں اس لیے تمہاری کال اٹینڈ نہیں کرسکا۔ تم بتاؤ، تم یہاں کیسے؟''

''میں اپنی فرینڈ عذرا سے ملنے آئی ہوں۔'' شانزے نے جواب دیا۔

''ہم۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

وہ بولی۔ ''اور تم یہاں......''

''میں اپنے باس اسماعیل شاہد صاحب سے ملنے آیا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''میں ان کے سرکس میں جاب کرتا ہوں۔''

''اچھا۔'' وہ حیران ہوئی۔ ''ویسے مجھے سرکس دیکھنے کا بے حد شوق ہے۔ کبھی مجھے سرکس دکھاؤ نا۔''

''میں......'' میں حیران ہوا۔

''ہاں۔'' وہ بولی۔ ''کیا ہم اکٹھے سرکس دیکھنے نہیں جاسکتے؟''

UUNOVELS.COM

"فی الحال تو سرکس رحیم یار خان میں لگا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر ہمارے شہر میں دوبارہ لگا تو تمہیں ضرور لے چلوں گا۔"

"شکریہ۔"

"اچھا۔ میں چلتا ہوں۔" میں کہہ کر آگے بڑھنے لگا۔

"پھر کب ملاقات ہو گی؟" پیچھے سے شازیہ کی آواز سنائی دی تو میرے قدم رک گئے۔

"فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے گردن موڑ کر جواب دیا اور پھر میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ شازیہ تو کچھ زیادہ ہی مجھ میں انٹرسٹڈ ہو رہی تھی۔ نجانے وہ کتنی دیر تک مجھے دیکھتی رہی لیکن میں نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے جب مرینہ کو غریب آباد کے مکان میں شفٹ ہونے کا بتایا تو وہ حیران رہ گئی۔ اس کی پڑھائی متاثر ہو رہی تھی لیکن مجبوری تھی۔ میں نے اسے ضروری سامان پیک کرنے کا کہا اور خود بھی اپنا ضروری سامان پیک کرنے میں مصروف ہو گیا۔

شام تک اسماعیل شاہد صاحب نے نہ صرف مجھے مکان کی لوکیشن بھیج دی بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ میں ان کے چوکیدار سے مکان کی چابی بھی لے لوں اور جا کر مکان دیکھ آؤں۔ انہوں نے اپنے دوست سے مکان کی چابی منگوائی تھی۔

اگلے روز میں نے ان کے چوکیدار سے چابی لی اور غریب آباد پہنچ گیا۔ مکان تلاش کرنے میں مجھے دقت نہ ہوئی۔ وہ ایک دس مرلے کا مکان تھا۔ چار کمرے، ڈرائنگ روم، بڑا سا کچن تھا اور ہر کمرے کے ساتھ اٹیچ باتھ روم تھا۔ صحن بھی قدرے بڑا تھا۔ ہر کمرے میں فرنیچر اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ مجھے وہ مکان پسند آ گیا تھا چنانچہ میں واپس گھر آ گیا۔

چونکہ ہم نے ضرورت کا ہر سامان پیک کر لیا تھا اس لیے ہم اسی رات گیارہ بجے ٹیکسی میں سوار ہو کر غریب آباد پہنچ گئے۔ امی نے روزینہ کے بارے میں ہی پوچھا تھا۔ ان کی دماغی حالت بدستور ویسی ہی تھی۔ چونکہ وہ دوائیوں کے زیر اثر تھیں اس لیے ان پر دورے پڑنے بند ہو گئے تھے۔ وہ بڑے تحمل اور نرمی سے بات کرتی تھیں۔ میں نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ روزینہ اپنی کزن کے گھر گئی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر میں آ جائے گی۔ یہ شکر تھا کہ انہوں نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کس کزن کے گھر گئی ہے اور ہم اتنی رات کو کہاں جا رہے ہیں۔ وہ خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑی تھیں۔

ٹیکسی گلی کی نکڑ پر رکی اور ہم اپنا سامان اٹھائے نیچے اتر آئے۔ کرایہ ادا کرنے کے بعد میں قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا۔ گلی ویران و سنسان پڑی تھی۔ کہیں کہیں بلبوں کی روشنیاں پھیل کر اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ میں نے ایک بیگ کاندھے پر لادا اور دوسرا اٹھائے، امی کو سہارا دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ مرینہ بھی دو بیگ اٹھائے ہوئے تھی اور خاموشی سے ساتھ چل رہی تھی۔

پانچ منٹ کی مسافت کے بعد ہم دوسری گلی میں مڑے اور تیسرے گھر کے چھوٹے سے گیٹ پر پہنچ کر رک گئے۔ گیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے جیب سے چابی نکالی اور تالا کھول دیا۔ پھر ہم تینوں اندر آ گئے۔ مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے برآمدے میں جا کر لائٹیں جلائیں اور پھر امی اور مرینہ کو اندر لے آیا۔ مرینہ تو حیرت بھری نظروں سے مکان کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے امی کے لیے ایک کمرا پہلے ہی منتخب کر لیا تھا اس لیے ہم سب انہی کے کمرے میں آ گئے۔ میں نے امی کے چہرے کو غور سے دیکھا تو ان کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔ بیڈ پر بیٹھتے ہی انہوں نے پہلا سوال کیا۔

"علی! یہ تم ہمیں کہاں لے آئے ہو؟ کس کا گھر ہے یہ؟"

"یہ...... اپنا گھر ہے امی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا تو وہ چونکیں۔

"اپنا گھر...... کیا مطلب...... ہمارا گھر تو وہ ہے۔" امی حیرت زدہ لہجے میں بولیں۔

"امی! وہ گھر بھی ہمارا ہے اور یہ گھر بھی۔" میں نے جواب بناتے ہوئے کہا لیکن امی میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔ وہ سوال پر سوال کیے جا رہی تھیں اور مجھے جواب دینے میں قدرے دقت ہو رہی تھی۔ وہ پھر مجھ سے روزینہ کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ میں نے مرینہ کو اشارہ کیا تو وہ امی کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور امی کو دوسری باتوں میں لگا لیا۔ میں دوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرا میں نے اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ اس کی واحد کھڑکی گیٹ کی طرف کھلتی تھی اور وہاں سے باہر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ کمرا کارپٹڈ تھا۔ اس نئے مکان میں شفٹ ہو کر میں قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

میرے خیال کے مطابق یہ گھر امی اور مرینہ کے لیے بالکل محفوظ تھا۔ گھر سے نکلتے وقت میں کارپٹ کے نیچے سے کارڈ اٹھانا نہیں بھولا تھا۔ اب وہ کارڈ میری جیب میں تھا اور میں صحیح وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ دس منٹ کے بعد مرینہ نے آ کر بتایا کہ امی سو گئی ہیں تو میں نے طویل سانس لیتے ہوئے مرینہ کو بھی سونے کی ہدایت کی اور خود بھی لیٹ گیا۔

صبح میری آنکھ سیل فون کی گھنٹی پر ہی کھلی۔ میں نے کروٹ بدلتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پر پڑے سیل فون کو اٹھایا اور بجی بجی آنکھوں سے اسکرین کی طرف دیکھنے لگا۔ فاروق کال کر رہا تھا۔ شاید اس نے جب ہمارے گھر کے دروازے پر تالا لگا دیکھا ہوگا تو وہ پریشان ہو گیا ہوگا اسی لیے وہ مجھے کال کر رہا تھا۔ میں نے کال اٹینڈ کر کے سیل فون کان سے لگا لیا۔ ''ہیلو!''

''السلام علیکم علی بھائی۔'' فاروق کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''وعلیکم السلام۔''

''علی بھائی! آپ لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔ آپ کے گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔'' فاروق کی تشویش بھری آواز سنائی دی۔

''ہاں...... وہ......'' میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''دراصل امی اپنے بھائی کے گھر جانے کی ضد کر رہی تھیں اس لیے انہیں لے کر آ گیا ہوں۔''

''ہم۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔'' فاروق بولا۔ ''اسی لیے آپ کو کال کی۔ آپ کب تک واپس آئیں گے؟''

''ہو سکتا ہے میں چند روز بعد آ جاؤں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''امی اور مرینہ ابھی وہیں رہیں گی۔''

''ٹھیک ہے بھائی۔'' فاروق مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔ ''کسی کام کے لیے میری ضرورت ہو تو بتایئے گا۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔''

میں نے بھی اللہ حافظ کہا اور فون آف کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر سر کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ فریش ہونے کے بعد میں نے قریبی دکان سے ناشتے کا سامان لا کر مرینہ کو دیا اور وہ ناشتا بنانے میں مصروف ہو گئی۔ ناشتا کرنے کے بعد میں مارکیٹ نکل گیا۔ میں نے ایک مہینے کا راشن اور ضرورت کی دوسری چیزیں لے لیں تا کہ میری عدم موجودگی میں امی اور مرینہ کو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔

نئے گھر میں شفٹ ہوئے ہمیں ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ محلہ کافی بڑا اور پر رونق تھا۔ صبح ہوتے ہی گلیوں سے بچوں کی آوازیں سنائی دینا شروع ہو جاتی تھیں۔ میں زیادہ تر گھر پر ہی رہتا تھا۔ باہر نکلتا تو پہلے مختلف گلیوں میں یوں ہی پھرتے پھراتے اپنی گلی میں آتا تھا تا کہ اگر کوئی تعاقب کر رہا ہو تو اندازہ ہو جائے۔ مگر ابھی تک کوئی مشکوک بندہ ملا نہیں تھا پھر بھی میں ابھی صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ چودھری باسط سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا اور اگر اسے یہ پتا لگ جائے کہ میرے پاس اس ویڈیو کی ایک کاپی اور ہے تو وہ آپے سے باہر ہو جائے گا اور مجھے تلاش کرنے کے لیے اپنے بندوں کو شہر میں پھیلا دے گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں محتاط ہو کر چلنا چاہتا تھا۔ میری چھوٹی سی غلطی مجھے کسی نقصان سے دوچار کر سکتی تھی اور میں کسی نقصان کا متحمل نہیں تھا۔ اسی دوران شانزے کی بھی کال آئی تھی لیکن میں نے اٹینڈ نہیں کی تھی۔

منگل کو شام کے وقت فاروق کی کال آ گئی۔ سلام و دعا کے بعد اس نے کہا۔ ''علی بھائی! میں نے آپ کو ایک بات بتانے کے لیے فون کیا ہے۔'' اس کا انداز پُراسرار سا تھا۔

''ہاں بتاؤ۔'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''بھائی! میں نے آج بدمعاش ٹائپ دو آدمیوں کو آپ کے گھر کے باہر منڈلاتے دیکھا ہے۔ وہ بڑے پُراسرار انداز میں آپ کے گھر کی طرف دیکھ رہے تھے۔'' فاروق نے انکشاف کیا تو میں بے اختیار چونک پڑا۔

''او ہو۔ کون تھے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں کون تھے۔'' فاروق نے بتایا۔ ''لیکن پُراسرار دکھائی دیتے تھے۔ وہ چند منٹ آپ کے گھر کی طرف دیکھتے رہے پھر سڑک پر موجود کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ وہ پیدل ہی آپ کے گھر کے پاس آئے تھے۔ میں نے تو اچانک ہی انہیں دیکھ لیا تھا۔''

''ہونہہ۔'' میں نے ہونٹ بھینچے۔ ''تمہارا شکریہ فاروق۔ تم میرے گھر پر نظر رکھنا اور اگر کوئی غیر معمولی بات ہو تو مجھے بتا دینا۔'' میں نے اسے ہدایت کی۔

''ٹھیک ہے بھائی۔ آپ فکر نہ کریں۔'' فاروق نے مجھے حوصلہ دیا۔

میں نے کال منقطع کر دی۔ میں بھی پریشان ہو چکا تھا اسی لیے میرے ذہن میں پہلا خیال چودھری باسط کا ہی

UUNOVELS.COM

آیا تھا۔ یقیناً اسی کے آدمی ہوں گے لیکن وہ میرے گھر کے باہر کیوں منڈلا رہے تھے۔ کیا ابھی تک چودھری باسط کو مجھ پر کوئی شبہ تھا؟ میں جیسے جیسے سوچتا مزید الجھتا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ البتہ میں نے ایک اور فیصلہ کرلیا تھا۔

پہلے تو میں چاہتا تھا کہ چودھری باسط مجھے چودھری ساجد کے بارے میں بتادے لیکن اب میں نے اپنے منصوبے میں تبدیلی کرلی تھی۔ اب میں چودھری باسط سے ٹکرانے پر غور کرنے لگا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اس سے کہوں کہ وہ مجھے چودھری ساجد کے پاس لے جائے۔ اگر وہ نہ مانا تو میں اسے چند روز کی مہلت دوں گا۔ اگر وہ پھر بھی نہ مانا تو میں اس کی ویڈیو لیک آؤٹ کردوں گا۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

کئی دن بعد کی بات ہے ایک روز شام کے وقت میں اور مرینہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے چائے پینے کے ساتھ ساتھ باتیں کررہے تھے۔ ہماری گفتگو کا موضوع اس کی تعلیم تھا۔ وہ بے حد پریشان تھی لیکن جس طرح کے حالات گزر رہے تھے اس سے بھی وہ واقف تھی۔ ہم باتیں کرنے میں مصروف تھے کہ فاروق کی کال آگئی۔ چھوٹتے ہی بولا۔ ''علی بھائی۔ آج دوپہر میں ایک آدمی آیا تھا۔ شکل وصورت سے عام سا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے مجھ سے آپ کے گھر کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا یہ مکان کرائے کے لیے خالی ہے تو میں نے انکار کردیا اور بتایا کہ نہیں، پھر اس نے کہا کہ اسے کسی نے بتایا تھا کہ یہ مکان کرائے کے لیے خالی ہے۔ پھر وہ آپ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے اسے یہی بتایا کہ اسے جس نے بھی بتایا ہے غلط بتایا ہے، گھر کے مکین اپنے رشتے داروں کے ہاں گئے ہوئے ہیں، پھر وہ چلا گیا۔ میں نے تو اسے عام بات سمجھی تھی لیکن تھوڑی دیر پہلے میں نے اسے گلی کی نکڑ پر دیکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جلدی سے کہیں چھپ گیا تھا۔''

فاروق کی بات سن کر میں ایک بار پھر الجھن میں مبتلا ہوگیا تھا۔ تاہم میں نے اسے تسلی دی اور اسے ہوشیار رہنے کی تلقین کرکے کال منقطع کردی۔ مجھے پریشانی نے تو نہیں گھیرا تھا لیکن میری پیشانی پر سوچ کی لکیریں ضرور نمودار ہوگئی تھیں جنھیں مرینہ نے بھی دیکھ لیا تھا۔

''بھائی! کیا کوئی مسئلہ ہے؟''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر کہا۔

''نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''چائے پی لیں..... ٹھنڈی ہورہی ہے۔'' مرینہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا... میں نے کپ اٹھایا اور چائے سپ کرنے لگا۔ میری سوچ کا دائرہ ایک بار پھر چودھری باسط کے گرد گھومنا شروع ہوگیا تھا۔ یہ حرکت اس کی ہوسکتی ہے۔ ایسے کمینے لوگ اتنی آسانی سے مطمئن نہیں ہوتے، انہیں جب تک سبق نہ دیا جائے وہ خاموش نہیں ہوتے لیکن میں اکیلا اس سے نمٹ نہیں سکتا تھا اس لیے خاموشی سے مکان تبدیل کیا مگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آرہا تھا۔ اسے سبق سکھانا ضروری ہوگیا تھا لیکن ماں بہن کی وجہ سے مجبور ہورہا تھا۔ وہ یہاں بھی آسکتا تھا کیونکہ شہر ایک تھا اس لیے میں غور کرنے لگا کہ کسی طرح ماں، بہن کو ایسی جگہ بھیج دوں جہاں وہ پوری طرح محفوظ ہوجائیں اور تب میں کھل کر ان سے دو دو ہاتھ کروں۔ اس کے یا جس کے بھی پاس میری بہن ہے اسے آزاد کرالوں، خواہ اس معرکہ میں میری جان چلی جائے۔

''بھائی۔'' مرینہ کی آواز نے مجھے سوچ کے بھنور سے باہر نکالا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''کس بارے میں؟'' میں نے ناسمجھی کے عالم میں پوچھا تو اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''میری پڑھائی کے بارے میں؟''

''تم پرائیویٹ طور پر تیاری کرو۔'' میں نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''فیس میں جمع کرادوں گا۔''

مرینہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چائے کے برتن اٹھائے اور کچن میں چلی گئی۔

ان دنوں میں نئے سرے سے لائحہ عمل بنانے میں مصروف تھا۔ میری امی کی ذہنی حالت میں اب قدرے بہتری آنا شروع ہوگئی تھی۔ شاید یہ نئے ماحول کا اثر تھا۔ بہرحال یہ ہمارے لیے خوش آئند بات تھی۔

اپنی بوریت دور کرنے کے لیے میں نے ٹی وی آن کرکے ایک نیوز چینل لگادیا۔ وہی ملکی حالات کے علاوہ ٹاک شوز، شوبز، اسپورٹس اور کامرس کی نیوز چل رہی تھیں۔ مہنگائی کے حوالے سے لوگ رو رہے تھے۔ میں چینل بدلنے ہی لگا تھا کہ اچانک اسکرین پر ''بریکنگ نیوز'' لکھا ہوا

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

آ گیا۔ پھر اینکر ایک معروف سیاست داں ایاز کے بارے میں بتانے لگا کہ اس کی نجی محفل میں نیم برہنہ رقاصاؤں کے ساتھ رقص کرتے ہوئے ویڈیو لیک ہو گئی ہے۔ پھر اسکرین پر ویڈیو بھی چلنے لگی۔

اس ویڈیو میں ایاز دکھائی دے رہا تھا جو نوجوان لڑکیوں کے ساتھ رقص کرنے میں مگن تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی لیکن وہ نوجوان اور نیم برہنہ لڑکیوں کے ساتھ بڑے پُرجوش انداز میں رقص کر رہا تھا۔ وہاں موجود لوگ تالیاں بجا کر ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ سابق وفاقی وزیر کے ٹھمکوں پر ٹھمکے لگانے پر میرے چہرے پر بے اختیار طنزیہ مسکراہٹ آ گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب اس کی خیر نہیں۔ پوری دنیا میں بے عزت ہونے کے علاوہ اس کی اپنے گھر میں بھی اچھی خاصی عزت افزائی ہو گی۔

میں نے دیگر چینل بھی بدل کر دیکھے لیکن مجھے کسی اور چینل پر ایسی ویڈیو دکھائی نہ دی۔ شاید یہ ''ایکسکلوسیو نیوز'' صرف اسی چینل کے حصے میں آئی تھی۔ ویڈیو دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں ایک منصوبہ آ گیا تھا۔ گو کہ اس منصوبے پر کام کرنا حد درجہ خطرناک تھا مگر کیا کرتا کہ ہاتھ میں وقت نہیں تھا میری معصوم بہن نہ جانے کیسی کیسی افتاد کا شکار ہو رہی ہو گی اسی لیے میں نے چودھری باسط کا مکروہ چہرہ عوام کے سامنے عیاں کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس سے پہلے میں اس سے ایک بار پھر ڈیل کرنا چاہتا تھا۔ میں اس سے چودھری ساجد کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اب اگر اس نے مجھے نہ بتایا تو میں چینل کے رپورٹر کو ویڈیو دینے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا چنانچہ میں یہ فیصلہ کرنے کے بعد مکان کی چھت پر آ گیا۔

چھت کی چار دیواری کی لمبائی چار فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ وہاں سے اردگرد کے مکانوں کی چھتیں بھی صاف دیکھی جا سکتی تھیں لیکن میری ایسی عادت نہ تھی۔ میں نے سیل فون آن کیا اور چودھری باسط کا نمبر ڈائل کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد دوسری طرف بیل جانے لگی۔ پھر چھٹی یا ساتویں بیل پر فون اٹینڈ ہو گیا۔

''ہیلو......'' چودھری باسط کی گمبھیر آواز سنائی دی۔

''علی بول رہا ہوں۔''

''علی۔'' چودھری باسط کی اس بار چونکتی ہوئی آواز آئی۔

''کیا مجھے بھول گئے ہو؟''

''نہیں......لیکن تم نے مجھے فون کیوں کیا ہے؟''

''تم نے اپنے آدمیوں سے میرے گھر کی نگرانی کرا کر معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے اس لیے ایک اہم انکشاف کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیسا انکشاف؟''

''پہلے یہ بتاؤ، کیا تم نے ایاز سیال کی ٹھمکوں والی ویڈیو دیکھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''میں بھی تمہاری ویڈیو لیک کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا تو چودھری باسط کی کیا حالت ہوئی ہو گی میں چشم تصور سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ تو گویا اچھل ہی پڑا ہو گا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو۔'' وہ گرجا۔ ''تم نے تو ویڈیو ڈیلیٹ کر دی تھی۔''

''اس کی ایک اور کاپی اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہاری نیچر سمجھ گیا تھا اور جانتا تھا کہ موقع ملتے ہی تم مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرو گے اس لیے میں نے ویڈیو کی ایک کاپی محفوظ کر لی تھی۔''

چودھری باسط مغلظات بکنے لگا۔ میں نے ایک بار پھر چشم تصور میں دیکھا تو وہ خارش زدہ کتے کی طرح ہو رہا تھا۔

''میں تمہیں دیکھ لوں گا...... میں تمہاری ہڈیاں پسلیاں ایک کر دوں گا۔ اگر تم نے میری ویڈیو لیک کی تو......''

''اب تم مجھے نہیں روک سکتے چودھری۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں آج ہی تمہاری ویڈیو چینل والوں کو دے دوں گا۔''

''رک جاؤ......رک جاؤ۔'' چودھری باسط منمنانے لگا۔ ''تم ایسا نہیں کرو گے۔''

''اگر تمہارے آدمی میرے گھر کی نگرانی نہ کرتے تو میں سمجھتا کہ معاملہ ختم ہو گیا مگر تمہاری ان حرکتوں نے میرے اندازے کو تقویت دی ہے کہ تم کتے کی دم ہو جو کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔''

''تم جو کہو گے میں وہی کروں گا۔''

''میں کیسے یقین کر لوں۔ تم نے پہلے بھی یہی کہا تھا۔''

''ہاں......لیکن اب میں تمہاری ہر بات مانوں گا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں منمناہٹ بدستور موجود تھی۔

''مجھے تو لگتا ہے تم سیاسی وعدہ کر رہے ہو۔''

''نہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔'' چودھری جلدی سے بولا۔ ''تم جو کہو گے میں ویسا ہی کروں گا۔ تم بتاؤ، تم کہاں ہو میں تمہارے پاس آجاتا ہوں۔''

مجھے چودھری باسط کی کسی بات پر اعتبار نہیں تھا اس لیے میں نے کہا۔ ''نہیں تمہیں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

چودھری نے کہا۔ ''میں اس وقت اسلام آباد میں ہوں۔ آج رات کو واپس آجاؤں گا۔ ہم کل کہیں مل لیتے ہیں اور مل بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں۔ تمہیں چودھری ساجد کے بارے میں معلومات چاہئیں نا، میں تمہیں اس کے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔''

''تم نے تو کہا تھا کہ تم چودھری ساجد کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''وہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔'' اس کی خجالت بھری آواز سنائی دی۔

''لیکن مجھے نجانے ایسے کیوں لگ رہا ہے کہ مجھے تمہاری بات پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم میرے ساتھ دغابازی کرو گے۔''

شاید چودھری باسط یہی سمجھتا تھا کہ میں اس کی بات پر اعتبار کر کے اس کے جھانسے میں آجاؤں گا لیکن اس بار میں اس کا پکا بندوبست کرنا چاہتا تھا تاکہ کوئی ابہام نہ رہے اور چودھری باسط کی ڈور میری مٹھی میں آجائے۔

''آخری بار اعتبار کر کے دیکھ لو۔'' چودھری بولا۔ ''میں اس بار تمہارے اعتبار کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

میں نے طویل سانس لینے کے بعد کہا۔ ''ٹھیک ہے چودھری! میں تم پر ایک بار پھر اعتبار کر لیتا ہوں۔''

''شکریہ۔'' چودھری باسط نے کہا تو میں حیران رہ گیا۔ چودھری باسط... مجھے شکریہ کہہ رہا تھا یہ غیر یقینی بات تھی۔ تاہم میں نے پوچھا۔

''کل ہم کہاں ملیں گے؟''

''جہاں تم کہو۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد بولا۔ ''ٹھیک ہے چودھری! میں تمہارے گھر آجاتا ہوں۔''

''میرے گھر......'' وہ چونکا۔

''ہاں۔ کیا میں تمہارے گھر نہیں آسکتا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

چودھری گڑبڑا گیا۔ ''آسکتے ہو...... لیکن...... اچھا ٹھیک ہے۔ تم کل میرے گھر آجانا۔ کتنے بجے آؤ گے؟''

''شام پانچ بجے۔'' میں نے وقت بتایا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

میں نے کال منقطع کر دی اور سیل فون سوئچڈ آف کر کے پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں ٹہلتے ہوئے حالات کے بدلتے رخ پر غور کرنے لگا۔ سوچتے سوچتے مجھے فاروق کا خیال آگیا۔ وہی میرا ساتھ دے سکتا تھا۔ میں نے سیل فون نکالا اور فاروق کو کال کی۔

''جی بھائی۔'' رابطہ ہوتے ہی فاروق کی آواز سنائی دی۔

''کیا تم مجھے ابھی مل سکتے ہو؟''

''ابھی......'' اس کی پُرسوچ آواز سنائی دی۔ ''ہاں مل سکتا ہوں۔ کہاں ملنا ہے؟''

''تم علامہ اقبال پارک آجاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''خیال رکھنا کوئی تمہارا تعاقب نہ کر رہا ہو۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں بھائی۔'' فاروق نے مجھے تسلی دی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم علامہ اقبال پارک پہنچو، میں وہیں آرہا ہوں۔''

میں نے سیل فون آف کر کے جیب میں رکھا اور مڑنے ہی لگا تھا کہ اچانک میرے بازو پر ایک پتھر لگا تو میں چونک پڑا۔ میں نے غیر ارادی طور پر ادھر دیکھا جدھر سے مجھ پر پتھر پھینکا گیا تھا۔ ساتھ والے گھر کی تیسری منزل کی بالکونی میں ایک لڑکی کھڑی تھی اور ہاتھ سے اشارے کر رہی تھی۔ میں سمجھا کہ وہ کسی کو اشارے کر کے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن غلطی سے اس کا پھینکا گیا پتھر مجھے لگ گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا لیکن مجھے دور دور تک کوئی بھی ذی روح دکھائی نہ دیا۔ میں نے دوبارہ اس لڑکی کی طرف دیکھا تو اس نے اشاروں میں مجھ سے کہا۔ ''میں تم سے مخاطب ہوں۔''

''مجھ سے۔'' میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اشارے میں ہی جواب دیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو؟'' میں نے پھر اشاروں میں پوچھا تو وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کر کے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے۔ دو منٹ کے بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ اس نے کاغذ کو ایک پتھر کے ساتھ لپیٹا اور اس پر دھاگا باندھ کر پتھر میری طرف پھینکا۔

UUNOVELS.COM

میں نے پتھر کیچ کیا اور دھاگا اتار کر کاغذ کھولا۔ اس پر لکھا تھا۔

''میں تم سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھ سے دوستی کرو گے؟ میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گی۔ اگر تمہارا جواب ہاں میں ہو تو مجھے کال کرنے کی بجائے صرف میسج کر دینا۔'' نیچے اس نے اپنا سیل فون نمبر بھی لکھ دیا تھا۔

میں نے حیرت سے پہلے کاغذ کو دیکھا پھر بالکونی کی طرف۔ وہاں اب وہ لڑکی موجود نہیں تھی اور دروازہ بھی بند دکھائی دے رہا تھا۔ میں حیران ہی نہیں پریشان بھی تھا کہ ہمارا کس تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ موبائل اور انٹرنیٹ نے ہمیں کہاں پہنچا دیا ہے۔ دیگر نوجوانوں کی طرح مجھے بھی صنف مخالف میں کشش محسوس ہوتی ہے مگر اس طرح مادر پدر آزاد نہیں۔ یہ لڑکی بغیر سوچے سمجھے اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگانے پر آمادہ ہے۔ میں نے کاغذ لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھا اور چھت سے نیچے اتر آیا۔ فی الحال مجھے اس سے دوستی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی میں اسے کوئی جواب دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا تنقیدی جائزہ لیا پھر ایک کیپ سر پر رکھ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ مرینہ صوفے پر بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔

''مرینہ!''

میری آواز پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''جی بھائی۔''

''میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم گیٹ کو اندر سے لاک کر لو۔ میں تمہیں فون کروں گا تو تب تم نے دروازہ کھولنا ہے۔''

''کہاں جا رہے ہیں۔'' اس نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

''ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ میں نے اسے فاروق کے بارے میں بتانا مناسب نہ سمجھا۔

''ٹھیک ہے بھائی۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کتاب میز پر رکھی اور صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اپنا خیال رکھنا بھائی۔ مجھے آپ کی بہت فکر رہتی ہے۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ جب مرینہ گیٹ کو اندر سے لاک کر کے چلی گئی تو میں مطمئن ہو کر آگے بڑھ گیا۔ ایک آٹو رکشے میں بیٹھ کر میں علامہ اقبال پارک پہنچا۔ میری موٹر بائیک میرے گھر میں ہی کھڑی تھی۔ وہ خراب تھی اس لیے میں اسے اٹھانے نہیں گیا تھا۔

فاروق مجھ سے پہلے ہی پارک پہنچ گیا تھا۔ ہم دونوں گرمجوشی سے گلے ملے۔ پھر ہم ایک بینچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اس نے بتایا کہ گھر سے نکل کر قرب و جوار کا اس نے اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا لیکن وہاں کوئی موجود نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے اس کا تعاقب کیا ہے۔ میں نے اس کی کھلے دل سے تعریف کی۔ پھر وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ ہم کہاں رہ رہے ہیں اور اچانک گھر کیوں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

''بعد میں بتاؤں گا۔ میں نے جس کام کے لیے تمہیں یہاں بلایا ہے وہ غور سے سنو۔''

''بولو بھائی!''

''مجھے کل چودھری باسط سے ملنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''جانتے ہو چودھری باسط کو؟''

''چودھری باسط۔'' اس نے زیر لب دہرایا پھر چونکتے ہوئے بولا۔ ''تم اس کی بات کر رہے ہو جسے سیاست کا بازیگر کہا جاتا ہے۔''

''ہاں وہی۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ اور اس کا بیٹا میری بہن کے اغوا میں ملوث ہیں لیکن میرے پاس ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ میرے پاس چودھری باسط کی ایک ویڈیو ہے جسے میں اس کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے چودھری کو یہی بتایا ہے کہ اس کی ویڈیو میں نے ایک نیوز چینل کو پہنچا دی ہے۔ ہو سکتا ہے چودھری کی تسلی کے لیے میں تمہیں فون کروں یا چودھری تم سے خود بات کرے۔ تم نے خود کو کسی چینل کا رپورٹر ظاہر کرنا ہے اور بتانا ہے کہ اس کی ویڈیو تمہارے پاس موجود ہے۔''

پھر میں اسے اپنے پلان کے بارے میں مزید بتانے لگا۔ فاروق کے چہرے پر تشویش کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔

''بھائی! میں نے سنا ہے کہ چودھری باسط بے حد خطرناک آدمی ہے۔'' وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ بھی روزینہ بہن کے اغوا میں ملوث ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے سو فیصد یقین ہے۔ دونوں باپ بیٹا لڑکیوں کی اسمگلنگ کرنے والے گروہ کے لیے کام کرتے ہیں اور میں چودھری باسط کے ذریعے اپنی بہن تک پہنچنا چاہتا ہوں۔''

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ہمارے درمیان اور بھی باتیں ہوئیں۔ فاروق مجھے محتاط رہنے کی تلقین کرتا رہا۔ اس نے ایک بار پھر مجھ سے پوچھا کہ ہم کہاں رہائش پذیر ہیں لیکن میں نے ٹال دیا تھا۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ میری فیملی محفوظ رہے میرے لیے یہی بہت تھا۔

جب اس نے دوبارہ اصرار کیا تو میں نے کہا۔ ”بعد میں تمہیں بتاؤں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ فاروق سے مصافحہ کرنے کے بعد میں پارک کے خارجی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پارک سے باہر نکل کر میں نے قرب و جوار کا عامیانہ انداز میں جائزہ لیا اور پھر پیدل چلتا ہوا ایک طرف بڑھنے لگا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ یہ میرا وہم تھا یا حقیقت تھی۔ بہر حال میں اپنا شک دور کرنا چاہتا تھا اس لیے بس اسٹاپ پر پہنچ کر میں رک گیا اور سرسری انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میرا شک درست ثابت ہوا تھا۔ واقعی ایک آدمی میرے تعاقب میں تھا۔ جیسے ہی میں نے اس کی طرف دیکھا تھا تو وہ جلدی سے فٹ پاتھ پر موجود درخت کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ وہ اسی زعم میں ہو گا کہ میں نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ یقیناً فاروق کا تعاقب کرتے ہوئے علامہ اقبال پارک پہنچا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے مزید ساتھی بھی اِدھر اُدھر موجود ہوں اور وہ بھی خفیہ رہ کر میرا تعاقب کر رہے ہوں۔ یہ میرے لیے پریشان کن بات تھی۔ اگر میں گھر کی طرف گیا تو وہ میرا گھر بھی دیکھ لیں گے۔

میں پریشان ہو کر ان پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں نے انہیں دیکھ لیا ہے یا مجھے اپنے تعاقب کا احساس ہو گیا ہے۔ میرے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ یقیناً یہ چودھری باسط کے آدمی ہوں گے۔ میں نے ایک آٹو رکشا روکا اور اس میں بیٹھ گیا۔

”کہاں چلنا ہے؟“ رکشا ڈرائیور نے پوچھا۔

”فی الحال سیدھے چلو، بتاتا ہوں۔“

رکشا ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رکشا آگے بڑھا دیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد میں نے اسے دائیں طرف والی سڑک کی طرف مڑنے کا کہا تو اس نے رکشا دائیں سڑک پر موڑ دیا۔ میں نے رکشے کے بیک مرر سے دیکھ لیا تھا کہ ایک کار رکشے کے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ قدرے فاصلے پر موجود تھی لیکن میرے کہنے پر ڈرائیور جدھر رکشا موڑتا تھا تو کار بھی اسی طرف آ جاتی تھی۔ میرے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ میں تعاقب کرنے والوں کو کیسے دھوکا دوں؟ میں نے ڈرائیور کو مرکزی بازار کی طرف جانے کا کہا۔ وہ کافی گنجان علاقہ تھا اور میں رکشے سے اتر کر فوری طور پر کہیں چھپ سکتا تھا۔

مرکزی بازار کے قریب پہنچے تو ٹریفک جام تھا۔ چوک پر لوگوں کا جم غفیر موجود تھا۔ شاید ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ میرے لیے فرار ہونے کا یہی اچھا اور بہترین موقع تھا۔ چنانچہ میں نے جیب سے دو سو روپے نکال کر ڈرائیور کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں اتر رہا ہوں۔“

ڈرائیور نے پیسے لے لیے۔ وہ مجھے بقایا جات دینا چاہتا تھا لیکن میں جلدی سے رکشے سے اتر کر جم غفیر کی طرف بڑھ گیا۔ وقت کم تھا۔ جم غفیر میں پہنچتے ہی میں نے دیکھا کہ فٹ پاتھ کے کنارے دو کم عمر لڑکے زخمی حالت میں موجود تھے۔ ایک لڑکے کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ نڈھال کی سی حالت میں تھا جبکہ دوسرے لڑکے کے چہرے پر اذیت کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ کچھ لوگوں کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے سنا کہ تیز رفتار دو موٹر بائیکس آمنے سامنے سے ٹکرا گئی تھیں جس سے دونوں لڑکے زخمی ہو گئے تھے۔ میں نے نامحسوس انداز میں مڑ کر دیکھا تو متعاقب کار میں سے دو آدمی نکل کر اسی طرف آ رہے تھے۔ ان کی چال ڈھال سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ خاصے تربیت یافتہ ہیں۔

میں جم غفیر سے نکل کر تیز تیز چلتا ہوا مین روڈ کی طرف بڑھ گیا۔ ایک پیٹرول پمپ کے قریب ہی مجھے ایک اور آٹو رکشا مل گیا۔ رکشے میں سوار ہوتے ہی میں نے ڈرائیور کو غریب آباد چلنے کا کہا اور اس نے رکشا آگے بڑھا دیا۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے اپنا سر رکشے کی سیٹ سے ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ تعاقب کرنے والے پیچھے رہ گئے تھے اس لیے اب ان کا مجھ تک پہنچنا محال تھا کیونکہ ٹریفک بلاک تھی۔ البتہ اگر وہ مجھے رکشے میں سوار ہوتے دیکھ لیتے تو یقیناً دوبارہ میرا تعاقب کرتے۔

میں جب گھر پہنچا تو رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ مرینہ کھانا تیار کر چکی تھی۔ میں نے اسے تعاقب کے بارے میں بتانا مناسب نہیں سمجھا ورنہ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی۔ امی، میں اور مرینہ ہم تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ امی کھانے کے دوران خاموش رہی تھیں۔ بہر حال کھانا

UUNOVELS.COM

کھانے کے بعد میں امی کو لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا اور مرینہ چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔ مجھے امی میں واقعی خوشگوار تبدیلی نظر آئی تھی تاہم اداسی اور فکر ان کے چہرے پر بدستور موجود تھی۔ میں نے ٹی وی آن کر کے ڈراما لگا دیا تاکہ امی کا دل بہل جائے۔ وہ چند منٹ ڈراما دیکھتی رہیں پھر انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔

''علی!''

''جی امی۔'' میں امی کی طرف متوجہ ہوا۔

''ٹی وی کی آواز کم کرو۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

میں نے ریموٹ سے ٹی وی کی آواز کم کر دی اور پھر امی کی طرف دیکھنے لگا۔ ''جی امی، بولیں۔''

امی بغور میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگیں جیسے میرے چہرے پر ابھرے تاثرات پڑھنا چاہتی ہوں۔ میں گڑبڑایا۔ وہ بولیں۔ ''علی! میں تم سے جو پوچھوں مجھے سچ سچ بتانا۔''

میں جانتا تھا کہ امی مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہیں تاہم میں نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے انتہائی ادب سے کہا۔ ''پوچھیں امی، آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ''روزینہ کہاں ہے؟ اس کا کچھ پتا چلا۔''

میرے دل پر برچھی چل گئی۔ تاہم میں نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ ''امی! روزینہ کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ آپ فکر مت کریں، پولیس اسے تلاش کر رہی ہے اور میں بھی اسے تلاش کر رہا ہوں، انشاء اللہ جلد ہی وہ مل جائے گی۔''

میں نے دیکھا کہ امی کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ وہ ماں تھیں بیٹی کی جدائی کیسے برداشت کر رہی تھیں یہ وہ جانتی تھیں۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا اور تسلی دینے لگا۔ امی کو روتے دیکھ کر میری اپنی حالت بھی غیر ہو رہی تھی اور اس لمحے میرے اندر ایک لاوا سا ابھرا تھا جو پھٹنے کو تیار تھا۔

میرے اندر چودھری ساجد، چودھری باسط اور شانی کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ وہ درندے تھے جو میری بہن کے اغوا کے ذمے دار تھے لیکن شومئی قسمت میں ابھی تک چودھری ساجد تک پہنچ نہیں پایا تھا۔

میں امی کو تھوڑی دیر تک تسلی دیتا رہا اور وہ بے آواز آنسو بہانے کے بعد سیدھی ہو گئیں۔ جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا ہو۔

''علی! یہ بتاؤ ہم اس مکان میں کیوں شفٹ ہوئے ہیں؟ اور یہ مکان ہے کس کا۔''

اس سوال پر میں گڑبڑا گیا۔ ان کی دماغی حالت اب ٹھیک ہو رہی تھی۔ اسی لمحے مرینہ ٹرے اٹھائے ڈرائنگ روم میں آئی۔ ٹرے پر رکھے کپوں میں سے بھاپ اڑ رہی تھی۔ اس نے پہلے ٹرے میز پر رکھی اور پھر ایک ایک کپ ہمارے سامنے میز پر رکھے اور اپنا کپ لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ ٹی وی پر اس کی پسند کا ڈراما چل رہا تھا اس لیے وہ ڈرامے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''بتاؤ علی! میں نے کچھ پوچھا ہے۔'' امی اپنے سوال پر قائم تھیں۔

''امی!'' میں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ چائے پئیں، میں بتاتا ہوں۔''

''میں چائے بعد میں پی لوں گی، پہلے مجھے بتاؤ۔'' وہ بضد تھیں۔

اب مرینہ بھی ڈرامے سے توجہ ہٹا کر ہماری طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کہا کہ وہ امی کی توجہ کسی اور طرف لگائے لیکن وہ آنکھوں کی زبان نہیں سمجھ سکی تھی، پھر اس سے پہلے کہ امی دوبارہ پوچھتیں اسی لمحے میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی اور پھر بجتی ہی چلی گئی۔ میں نے کپ میز پر رکھا اور سیل فون نکال کر دیکھا تو اسکرین پر ایک اجنبی نمبر جگمگا رہا تھا۔

''کس کی کال ہو سکتی ہے؟'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ پھر میں امی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''امی! میں آتا ہوں۔''

میں اٹھ کر ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔ گھنٹی ابھی تک بج رہی تھی۔ میں نے یس کا بٹن پریس کر کے سیل فون کان سے لگا لیا۔

''ہیلو......'' میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

''بھائی...... مجھے بچا لو...... بھائی۔'' دوسری طرف سے کرب آمیز آواز سنائی دی تو میں ایسے اچھل پڑا جیسے میرے سر پر کسی نے بم پھاڑ دیا ہو۔ میرے حواس مختل ہو گئے تھے اور میں اپنی جگہ جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی حرکت کرے گا۔ اسے بچانے کے لیے جانا اپنی موت کو آواز دینا تھا مگر کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔

(باقی آئندہ)

UUNOVELS.COM

فراری

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
ہمارے آس پاس اتنی ساری کہانیاں بکھری ہوئی ہیں جو حیران کن ہیں۔ ایسی ہی ایک سچ بیانی ہم نے سمیٹی ہے۔ سانول اور مومل کی زندگی کا عکس کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ اُمید ہے قارئین کو پسند آئے گی۔

زین مہدی
(کراچی)

فلمیں بنتی ہیں۔ ناول لکھے جاتے ہیں۔ افسانہ و کہانیاں تخلیق ہوتی ہیں۔ ایک عام تاثر یہی ہے کہ یہ سب فرضی ہوتی ہیں۔ شاید کچھ ایک فرضی ہوتی ہوں لیکن میں جو کہانی آپ کو سنانے جا رہا ہوں یہ سچ پر مبنی ہے۔ سنانے والا ہی اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ پہلے سوچا کہ اس کہانی کو اسی کی زبانی بیان کروں لیکن یہ کہانی بیک وقت دو کرداروں پر چل رہی ہے اس لیے بیانیا انداز بدل دیا اور پھر اسے سیکنڈ پرسن میں ہی بیان کرنا شروع کر دیا تاکہ پڑھنے والے کو ایک کہانی کا انداز محسوس ہو۔ سچ کڑوا ہوتا ہے اس لیے میں نے اس کڑواہٹ کو کم کرنے کی خاطر منظر کشی کی شیرنی میں الفاظ تر بتر رکھے ہیں۔ یعنی کہ وہ تمام لوازمات شامل کر دیئے ہیں جو ایک کہانی کے لیے ضروری ہیں اور لوگ اسے صرف واقعات کا مجموعہ نہ کہہ کر کہانی کی طرح دلچسپی سے پڑھیں۔ تو آیئے کہانی کی طرف چلتے ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار سانول ہے کیونکہ اسے لوگ سانول ہی کہہ کر پکارتے تھے۔ خود اسے بھی علم نہیں تھا کہ اس کا نام کیا ہے۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کا یہ نام کیوں پڑا۔ اگر ماں باپ ہوتے تو شاید اسے بتا دیتے کہ اس کا اصل نام کیا ہے مگر وہ تو اس بھری دنیا میں اکیلا تھا۔ نہ صرف اکیلا تھا بلکہ اپنے بارے میں انجان بھی تھا۔ جو انجان ہوتے ہیں انہیں جاننے کی جستجو ہوتی ہے۔ اسے بھی جستجو تھی کیونکہ اسے یہ بھی علم نہ تھا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ اس کا جنم کہاں ہوا تھا۔ اس نے یہ سب جاننے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ اس کے ماضی سے پردہ اٹھ نہیں پایا تھا۔ اس لیے کہ اس کی دنیا اسی احاطے تک محدود تھی۔

وہ احاطہ بھی کوئی چھوٹا موٹا نہیں تھا۔ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا جس کے گرد خاردار تار لگے ہوئے تھے۔ اور تار کے بعد میلوں تک پھیلے کھیت تھے جس کی وجہ سے احاطے والے کھیتوں کے پار بھی ویرانی ہی دیکھتے تھے۔ اس احاطے میں اور بھی لوگ تھے مگر وہ بھی اس احاطے کے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ انہیں روکنے کے لیے یہ تندمند سے بڑی بڑی مونچھوں اور سخت چہرے والے موجود تھے۔ انہی کی یہاں چلتی تھی۔ وہ لوگ ایک الگ تھلگ بنی جھونپڑی میں رہتے تھے۔ ان کے چہرے ہی نہیں دل بھی پتھر جیسے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے ڈنڈے ہوتے تھے جن کے سر پر پیتل کی موٹھ لگی تھی۔ وہ موٹھ جب کسی کی پیٹھ سے ٹکراتی تو اس کی جان نکل جاتی تھی اور وہ کئی دن تک کراہتا نظر آتا تھا۔ سب ان موٹھ والوں سے نفرت کرتے تھے مگر ان کے اشارے پر چلنے پر مجبور بھی تھے۔ اگر ان کی نہ مانتے تو پیٹھ پر موٹھ کی چوٹ پڑتی۔ اس وقت تو ان کے گرد چہرہ مزید سخت ہو جاتا جب بوائی یا کٹائی کا وقت آتا۔ تین دن پہلے سے سب کو ہوشیار کر دیا جاتا کہ کوئی بھی جھونپڑے سے باہر نہ نکلے۔ اگر کسی نے غلطی سے بھی باہر قدم رکھ دیا تو وہ ایک ڈیڑھ ہفتے کے لیے بستر کا ہو جائے گا۔ دھاڑیل کی موٹھ اس کی پیٹھ اور پیروں کو چومتی جس کا درد اسے ہفتے بھر ہلکان رکھتا۔

اس موٹھ کا مزہ سانول بھی چکھ چکا تھا اسی لیے اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ان لوگوں کو موٹھ استعمال کرنے کا

URDUNOVELS.COM
URDUNOVELS.COM

موقع ہی نہ دے۔ ایک وہی نہیں اس احاطے میں رہنے والے تمام لوگوں کی کوشش ہوتی کہ ان ڈنڈا برداروں سے دور ہی رہیں اور ان کو شکایت کا موقع نہ ملے مگر قسمت کے لکھے کو کیسے ٹالا جاسکتا ہے۔ ان لوگوں سے ایسی کوئی نہ کوئی چوک' کوئی نہ کوئی غلطی ہو ہی جاتی تھی اور ان موٹھ والوں کو موقع مل جاتا تھا۔

ان موٹھ برداروں سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ اسی لیے وہ یہاں بسنے والوں کو انسان کم اور پالتو جانور زیادہ سمجھتے تھے۔ بالکل اسی طرح پٹائی کرتے تھے جیسے کسی اڑیل بھینس کو آگے بڑھانے کے لیے ڈنڈے برسائے جاتے ہیں۔ یہ مونچھوں والے مظلوموں کو اس وقت تک روئی کی طرح دھنکتے رہتے تھے جب تک پٹنے والا بے ہوش نہ ہو جائے۔ اس احاطے میں رہنے والا شاید ہی کوئی بندہ ہو جو پٹا نہ ہو کیونکہ یہ کوئی معمولی جگہ تو تھی نہیں۔ یہ دراصل بڑے سائیں کی جیل تھی۔ اس جیل میں آنے والا باہر کی دنیا سے کٹ جاتا۔ بلکہ انہی مونچھ والوں کے رحم و کرم پر زندگی کا بوجھ ڈھونے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

اس جیل کے احاطے میں چھوٹی چھوٹی بہت ساری جھونپڑیاں تھیں جن میں عورت مرد اور بچے رہتے تھے۔ وہ سب صبح سے شام تک ہڈی توڑ محنت کرتے تھے اور بدلے میں آدھا پیٹ کھانا وصول کرتے تھے۔ یہ ان کی مزدوری تھی، یہی ان کی قسمت تھی اور وہ اسی میں خوش تھے۔

مطمئن ہونے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انہیں یہاں دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی اور وہ اسی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ باہر جانے پر پابندی تھی اس لیے نئی باتوں کے ادراک سے کوسوں دور تھے۔ ان میں ایک بڑی تعداد ان کی تھی جنہوں نے یہیں جنم لیا اور اب جوانی کی دہلیز پر تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں سانول کا شمار ہوتا تھا۔ اس نے باہر کی دنیا دیکھی ہی نہیں تھی تو وہ آزادی کا مطلب کیسے سمجھتا۔ وہ بھی اسی قید کی دنیا کو سب کچھ سمجھتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی جب بوڑھا ہزاری رات کے اندھیرے میں چپکے چپکے اسے اپنی کوئی بات بتاتا، اپنا تجربہ سناتا تو اسے حیرت ہوتی کہ باہر بھی ایک دنیا ہے جو بہت خوبصورت ہے۔

خوبصورت تو اسے بڑے سائیں کی حویلی بھی لگی تھی۔ صرف ایک بار وہ وہاں گیا تھا۔ کسی خاص کام سے۔ اسے ایک دھاڑیل اپنے ساتھ بوجھ اٹھانے کے لیے لے گیا تھا۔ وہ حویلی کی اونچائی دیکھ کر سکتے میں آ گیا تھا۔ اس دن اسے پہلی بار پتا چلا تھا کہ اس دنیا میں کچھ ایسے گھر بھی ہیں جو اینٹوں سے بنتے ہیں۔ وہ حویلی اندر سے کیسی ہے یہ دیکھنے کی حسرت اسے رہ گئی تھی کیونکہ دھاڑیل اسے باہر سے ہی واپس لے آیا تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ اکثر اس حویلی کو خواب میں دیکھا کرتا تھا جو اسے بہت خوبصورت لگا کرتی تھی۔

اسے ایک اور چیز خوبصورت لگتی تھی، وہ تھی مول۔ مول بھی اسی کی طرح بڑے سائیں کے اس قید خانے میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ماں اور باپ دونوں تھے اس لیے دھاڑیل ابھی تک اس کی طرف بڑھ نہیں پائے تھے۔ مول کا باپ ہزاری اس جگہ رہ رہے دیگر افراد سے کچھ اوپر کا مقام رکھتا تھا اس لیے بھی دھاڑیل اس سے دبتے تھے۔ بڑے سائیں اسے کبھی کبھی اپنے پاس بھی بلا لیتے تھے۔ کہیں وہ دھاڑیلوں میں سے کسی کی شکایت بڑے سائیں سے نہ کر دے اس لیے بھی اسے اہمیت حاصل تھی۔ ایک دھاڑیل نے ہی سانول کو بتایا تھا کہ برسوں پہلے مول کا باپ ہزاری بھی کچھ زمینوں کا مالک تھا۔ کسی ضرورت پر اس نے اپنی زمین بڑے سائیں کے پاس رہن رکھی تھی۔ سود کی رقم جب اصل سے بڑھ گئی تو اسے اپنی زمین سائیں کے نام کرنا پڑی مگر یہ مرحلہ ایسے طے نہیں ہوا تھا۔ ابتدا میں اس نے اکڑ دکھائی تھی اور سائیں کو انگلی ٹیڑھی کرنا پڑی تھی۔ انگلی ٹیڑھی کرنے پر وہ اور اس کے بال بچے اگلے ہی دن اس نجی جیل میں نظر آنے لگے تھے۔ وقت گزرنے پر اس نے اس حقیقت کو مان لیا کہ اب وہ یہاں سے باہر نہیں جاسکتا... کیونکہ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ یہاں رہنے والی عورتوں کے ساتھ دھاڑیل کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ ان دھاڑیلوں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ بڑے سائیں کی بات پر سر ہلاتا رہے اور اس نے یہی کرنا شروع کر دیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس کی عزت بڑھ گئی تھی۔ وہ محفوظ ہو گیا تھا۔ وقت گزرتا رہا پھر وہ باہر کی دنیا کو بھول ہی گیا۔ اس نے دو وقت کی روٹی کو ہی سب کچھ مان لیا اور اب یہاں زندگی کے باقی... دن گزار رہا تھا۔

مول کا باپ دوسروں کی طرح محنت نہیں کرتا تھا مگر محنت کرانے میں دوسروں کو اکساتا ضرور تھا۔ وہ دھاڑیل کی طرح ڈنڈوں سے کام نہیں لیتا۔ شیریں زبانی کو اس نے ہتھیار بنا لیا تھا۔ لوگ بھی اس کی بات مانتے تھے مگر سانول کو اس کی چرب زبانی ذرا بھی اچھی نہیں لگتی تھی اسی لیے وہ مول سے برملا کہتا تھا کہ تمہارا باپ بھی اسی قطار میں ہے جس میں ظالم دھاڑیل ہیں۔ مول اس کی بات پر کھلکھلا دیتی۔

وہ اس کی اسی کھلکھلاہٹ کا اسیر تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر کسی کو اپنے ساتھ رکھنے کی بات ہوئی تو وہ موہل کو اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت طلب کرے گا۔

ابھی یہ بات اس کے ذہن میں ہی تھی کہ ایک نئی بات سامنے آ گئی۔ اس دن خلاف توقع بڑے سائیں معائنہ کے لیے پہنچ گئے تھے۔ اس بار عید کی وجہ سے ٹوپیوں کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ آرڈر پورا کرنا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ بڑے سائیں نے دھڑیلوں کو حکم دے رکھا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو کام میں تیزی لاؤ، پھر وہ خود بھی معائنہ کے لیے پہنچ گئے تھے۔ وہ عورتوں مردوں کے سامنے جمع ڈھیر کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ ان کی نظر موہل پر ٹھہر گئی۔ وہ اس کے پاس پہنچ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ انہیں رکتے دیکھ کر موہل کا باپ تیزی سے آگے آیا تھا اور بولا تھا

''سائیں یہ میری بیٹی ہے...... موہل نام ہے۔''

''ہوں'' سائیں نے ہنکارا بھرا اور آگے بڑھ گئے۔ سب کے کام کا معائنہ کرنے کے بعد انہوں نے موہل کے باپ کو بلایا۔ ''ہزاری ادھر آنا۔''

ہزاری مل ایک آواز پر ایسے دوڑا جیسے کتے مالک کی آواز پر دوڑے چلے آتے ہیں۔ سائیں اسے اپنے ساتھ لے کر گاڑی تک آیا اور ایک پیر پائیدان پر رکھتے ہوئے بولا۔'' آج کل سائین کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ کچھ دن کے لیے اپنی بیٹی کو حویلی میں بھیج دے۔'' اتنا کہہ کر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اسے علم تھا یہاں صرف اس کا حکم چلتا ہے۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا لفظ حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ کسی میں جرأت نہیں ہے کہ وہ اس کے حکم سے سرتابی کرے۔

مگر ہزاری مل کے لیے یہ حکم ایک ایسا خنجر تھا جس نے اسے اندر تک لہولہان کر دیا۔ وہ خوف سے کانپ اٹھا تھا۔ اب تک اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی اس کے ساتھ بھی ایسا واقعہ رونما ہو گا۔ اسے بھی ایسا حکم دیا جائے گا۔ اس نے اب تک نہ جانے کتنی لڑکیوں کو کام کرنے کے لیے حویلی بھیجا تھا۔ جو بھی یہاں سے گئی تھی وہ پھر واپس نہیں آئی اس لیے کہ پہلے وہ حویلی کے کام کرتی رہیں پھر ان کو دھڑیلوں کے یہاں کام کرنے بھیج دیا جاتا تھا۔ کبھی یہ حکم اس کی بیٹی کے لیے بھی ہو گا اس بارے میں اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔ اب وہ کیا کرے، اسے کوئی راہ سوجھ ہی نہیں رہی تھی۔ ایسے وقت میں بس ایک ہی نام اسے نظر آیا اور وہ تھا

سانول۔ اس کے قدم سانول کی طرف اٹھنے لگے۔ شام اب اترنے لگی تھی اس لیے کئی ایک مزدوروں نے اپنے ہاتھ روک لیے تھے۔ ان میں ایک سانول بھی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کا کام ختم کر لیا تھا اس لیے آرام کرنے کی غرض سے ایک پیڑ کے نیچے گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ اس وقت اس کے نزدیک کوئی نہیں تھا اس لیے ہزاری نے بھی موقع غنیمت سمجھا اور اس کے پاس چلا گیا۔

ہزاری کو اپنے نزدیک کھڑا دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''آؤ چاچا کیسے ہو..... بیٹھو۔''

ہزاری نے اس پر ایک نظر ڈالی اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس وقت بھی اس کا چہرہ سنجیدگی کا مظہر تھا۔ وہ فکر و پریشانی کے سمندر میں غوطہ زن نظر آ رہا تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اسے مخمصے میں پھنسا دیکھ کر سانول نے ہی لب کھولے۔ اس نے قدرے جھک کر سرگوشی میں کہا۔ ''چاچا' سائیں نے کوئی بات کہہ دی؟''

ہزاری نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر انتہائی کمزور آواز میں بولا۔ ''سانول، تجھے موہل کیسی لگتی ہے؟''

یہ بات کوئی شہر والا اتنی آسانی سے نہیں کہہ سکتا۔ معاشرتی پابندیاں۔ شرم و حیا اس کے آڑے آ جاتیں مگر یہاں۔ اس نجی جیل میں کیسی شرم کیسی حیا۔ یہاں تو بس زندگی کی ڈور کو کھینچنے کا نام زندگی ہے ورنہ کوئی دھڑیل اتنی آسانی سے شوہر کے پہلو میں سوئی ہوئی عورت کو بیدار کر کے اپنے ساتھ لے جانے کی ہمت نہ کرتا اس ظلم پر کوئی احتجاج بھی نہیں کرتا۔ ہر ایک کو اپنی زندگی پیاری لگتی ہے۔ رشتے ناتے سب یہاں بیکار ہیں اسی لیے سانول نے بھی حیرت کا اظہار نہیں کیا اور عام سے لہجے میں کہا۔ ''بہت اچھی لگتی ہے۔''

''میں نے بھی دیکھا ہے وہ تمہارے ساتھ زیادہ خوش رہتی ہے۔'' ہزاری نے سر جھکا کر سنجیدہ آواز میں کہا۔

''چاچا ایک بات کہوں؟'' سانول نے دور بیٹھے ایک دھڑیل پر نظر جما کر کہا۔

''بول۔''

''دیکھ چاچا آج نہیں تو کل یہ دھڑیل تیرے ساتھ بھی کچھ کر سکتے ہیں اسی لیے میرا مشورہ ہے کہ تو موہل کو میرے ساتھ کر دے۔ ہم ایک الگ جھگی بنا لیں گے۔''

ہزاری کو ایسا لگا جیسے سانول نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ وہ یہی کہنے تو آیا تھا۔

''مگر یہ بھی سوچ لے۔ یہاں کوئی دھڑیل نہیں چاہے گا کہ تو موہل کو اپنے ساتھ رکھے۔ سائیں بھی نہیں۔ اس لیے میرا مشورہ ہے۔''

''کیسا مشورہ؟''

''میرا مشورہ ہے کہ تو یہاں سے چلا جا۔''

''چلا جاؤں؟ مگر کہاں؟'' وہ حیرت سے اچھل پڑا تھا۔ یہ ایک ایسا مشورہ تھا جس کا تصور بھی محال تھا۔ ایک ناممکن بات تھی۔

''کراچی چلا جا..... کراچی بڑا شہر ہے۔ وہاں سائیں کا حکم نہیں چلتا۔'' موہل کے باپ کی آواز کسی گہرے کنواں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے جیسے خود سے مخاطب تھا۔

''یہاں سے جانے کون دے گا؟ دھڑیل جان سے مار دیں گے..... تجھے پتا نہیں کہ فرار ہونے والوں کی سزا کیا ہے؟''

''سب جانتا ہوں..... اسی لیے تو مشورہ دے رہا ہوں۔''

''مگر یہاں سے نکلیں گے کیسے؟''

''نکالنا میرا کام ہے۔''

''کیسے؟'' سانول کے لہجے میں فکر کا عنصر در آیا تھا۔ منزل اسے پکار رہی تھی مگر خوف بھی پھن اٹھائے ڈسنے کو تیار تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ موہل اس کی زندگی ہے۔ موہل کا نام ذہن میں آتے ہی ہوا کا ایک سرد جھونکا تپتے موسم کو خوشگوار کر گیا۔ جیسے صحرا میں نخلستان کی ٹھنڈی ہوا۔ وہ رگ و پے میں نشہ سا تیرتا ہوا محسوس کرنے لگا تھا کہ ہزاری کی آواز پھر آئی۔

''کیا سوچنے لگے..... بولو راستہ بتاؤں؟''

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''غور سے سنو..... کچھ دیر بعد مال لینے ٹرک آئے گا..... میں ڈرائیور کو ساتھ لے کر دور چلا جاؤں گا۔ تم دونوں ڈالا پر بیٹھ جانا۔ اوپر بہت جگہ ہوتی ہے..... لیٹ جانا..... یہ صبح ہونے سے پہلے ایک ہوٹل پر رکتے ہیں..... وہاں خاموشی سے اتر کر ادھر ادھر ہو جانا..... پھر کراچی کی بس میں بیٹھ جانا..... کراچی میں کوئی بھوکا نہیں رہتا..... محنت کرو گے تو خوب پیسا ملے گا۔''

سانول کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے آگے شراب طہور رکھ دیا ہو۔ صرف اس بات کا احساس ہی اسے سرشار کرنے کے لیے کافی تھا کہ موہل اس کی ہو جائے گی۔ وہ

UUNOVELS.COM

موہل کے لیے کچھ بھی کرسکتا تھا۔ اس نے زندگی داؤ پر لگا دینے کا ارادہ کرلیا۔

''تم یہیں اس پیڑ کے نیچے کھڑے رہنا میں موہل کو بھیجتا ہوں۔ اس کے ساتھ تم اس جہنم سے نکل جاؤ۔''

نوید خوشی بھری تھی۔ ایک نئی زندگی مل رہی تھی۔ وہ خواب پورے ہونے جا رہے تھے جس کا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ یوں بھی ہزاری کی باتوں نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی تھی۔ ذہن منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر بھی وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ''ہزاری چاچا آپ کیوں نہیں چلتے؟''

''میں نے اپنی زندگی جی لی...... اب اور کتنا جیوں گا...... یہیں قبر مل جائے یہی بہت ہے۔ تم لوگ اس جہنم سے نکل جاؤ یہی میرے لیے کافی ہے۔'' کہتے ہوئے ہزاری اپنی جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ سانول اسے دور ہوتے دیکھتا رہا۔ اس وقت تک اس پر نظریں جمائے رہا جب تک وہ اپنی جھونپڑی میں داخل نہ ہو گیا۔

ابھی وہ اسی طرف دیکھ رہا تھا کہ جھونپڑی سے موہل نکلی اور اسی کی طرف آنے لگی، اسے آتا دیکھ کر سانول کا ہر موئے تن خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہ بے صبری سے اس کا انتظار کرنے لگا۔

جب تک وہ نہیں آئی تھی تو اسے یہ دنیا بے رنگ لگ رہی تھی مگر اب اس کی قربت نے اس کی سانسوں میں تپش بھر دی تھی۔

سانول کچھ کہتا کہ دور سے اسے ٹرک کی لائٹ نظر آئی۔ وہ ہوشیار ہو گیا۔ یہی روشنی اس کی اندھیری زندگی میں اجالا کرنے والی تھی۔ مشعل راہ بننے والی تھی۔ وہ اسی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے ہی ٹرک بڑے گیٹ سے اندر آیا۔ وہ دونوں ہوشیار ہو گئے...اور جب ڈرائیور اتر کر ہزاری سے باتیں کرنے لگا تو وہ دونوں موقع پا کر دوسری طرف سے اوپر چڑھ گئے۔ اوپر چڑھتے ہی انہوں نے اپنے اوپر ترپال ڈال لیا۔ اب وہ ٹرک کا حصہ لگ رہے تھے۔ موہل اس کے سینے سے لگی دبکی ہوئی تھی۔ اس کے بدن کی میٹھی میٹھی آنچ اسے بہت بھلی لگ رہی تھی۔ مگر ایک خوف کا عفریت بھی منہ پھاڑے ہوئے تھا۔ جو اس کے احساسات پر بھاری پڑ رہا تھا۔ جب جان خطرے میں ہو تو جذبات سرد ہی رہتے ہیں۔ وہ بھی برف جیسا بنا، سانس روکے پڑا تھا اور ٹرک پر سامان لوڈ ہوتا جا رہا تھا۔ سامان لوڈ کرنے کی ذمے داری مزدوروں کی تھی اور ان کی نگرانی ہزاری کرتا تھا مگر آج ہزاری کچھ بے پرواہ لگ رہا تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ ایک طرف کھڑا تھا۔ اس سے پتا نہیں کیا کیا باتیں کیے جا رہا تھا۔ ڈرائیور بھی باتونی تھا اس لیے دونوں کسی بات پر مسلسل بحث کیے جا رہے تھے۔

جتنی دیر وہ دونوں باتیں کرتے رہے مزدور کام میں مشغول رہے۔ ایک ہفتے میں کافی ساری ٹوپیاں بن جاتی تھیں۔ اس بار تو کچھ زیادہ ہی بنی تھیں اسی لیے ٹرک کارٹنوں سے بھر گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ٹرک پر سامان لوڈ ہو گیا اور وہ چل پڑا۔ نہ ڈرائیور کو خبر ہوئی اور نہ دھڑیلوں کو کہ ایک ساتھ دو پنچھی نئی زمین کی تلاش میں اڑ گئے۔ طائر نے قفس سے نجات پالی ہے۔ ایسا پہلے بھی ایک دو بار ہوا تھا۔ قیدی فرار ہوئے مگر کھیت پار کرنے سے پہلے ہی پکڑے گئے۔ ان کو جو سزا ملی وہ نشان عبرت بنی اس لیے دوسروں نے کوشش نہیں کی اور عرصہ گزر گیا، وقت ہر بات بھلا دیتا ہے۔ ایسا واقعہ بھی عرصہ قبل ہوا تھا اس لیے دھڑیل اور ڈرائیور بھی بھول چکے تھے۔ بے پروا ہو چکے تھے اسی لیے کسی نے تلاشی کی زحمت نہ اٹھائی۔

ٹرک احاطے کے مرکزی گیٹ کو پار کر گیا تھا اور اب سڑک پر دوڑ رہا تھا۔ سانول نے ترپال کے نیچے سے ذرا سا سر باہر نکالا۔ مگر فوراً ہی سر اندر کر لیا اس لیے کہ اس نے دیکھ لیا تھا۔ کلینر ٹرک کے پچھلے حصے میں لیٹا ہوا تھا۔ شاید وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی نظر ان پر پڑ سکتی تھی۔ اگر وہ انہیں دیکھ لیتا تو قیامت آ جاتی۔ انہیں اسی وقت واپس کر دیا جاتا اور پھر دھڑیلوں کا جبر جاگ اٹھتا۔ اتنا ظلم ہوتا کہ وہ خود پناہ مانگنے پر مجبور ہو جاتے۔

''کیا دیکھا۔'' موہل نے سرگوشی میں پوچھا۔

''خاموش...... کلینر اوپر ہی ہے۔ سن لے گا۔''

جھڑکی میں پیار تھا۔ مگر جھڑکی تو جھڑکی ہوتی ہے، وہ سہم گئی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی اس لیے کہ اسے بھی پتا تھا کہ اگر کلینر نے سن لیا تو اسے جستجو ہو گی۔ ادھر دیکھنے آ جائے گا اور اگر دیکھ لیا تو کیا ہو سکتا ہے۔ وہ مزید دبک گئی۔ اس کا قرب سانول کے دل میں طوفان برپا کر سکتا تھا مگر وہ خاموش تھا۔ خوف نے دہلا رکھا تھا۔ اس سے نجات کی راہ کیا ہو گی یہ وہ ابھی سوچ نہیں پایا تھا۔ ٹرک دوڑ رہا تھا۔ بڑے سائیں کا عقوبت خانہ دور ہوتا جا رہا تھا مگر وسوسے کا سانپ اب بھی پھن کاڑھے کھڑا تھا۔ وہ انتظار کی سولی پر ٹنگا تھا کہ

UJUNOVELS.COM

نیند کی دیوی کو اس پر رحم آ گیا۔ انسانی جسم ہے ہی ایسا با کمال کے کانٹوں بھری سیج پر بھی نیند آ جاتی ہے۔ یہاں تو کھلی ہوا بھی تھی۔ ترپال کے نیچے بھی گرمی کا احساس نہ تھا۔ سول تو پہلے ہی خراٹے بھر رہی تھی۔

وہ بے خبر سو رہا تھا کہ اسے عجیب سے شور نے بیدار کر دیا۔ ٹرک رکا ہوا تھا۔ اس نے ترپال کے نیچے سے سر نکال کر جھانکا۔ ٹرک ہائی وے کے ایک ڈھابے پر کھڑا تھا۔ رات کے اس پہر بھی وہاں رونق تھی۔ لوگ چل پھر رہے تھے۔

"چائے ادھر دے...... اوئے کھانا لگا۔" ایسی آوازیں گونج رہی تھیں۔

☆......☆

اندھیرے میں ڈوبی بڑے سائیں کی حویلی کے دروازے پر ایک دھڑیل کھڑا تھا اس کے ساتھ ہزاری بھی تھا۔ دروازے کی دوسری طرف سے گن مین اس سے پوچھ رہا تھا کہ اتنی رات کو ایسی کون سی آفت ٹوٹ پڑی کہ وہ بھاگا آ رہا ہے۔

"سائیں سے صرف اتنا کہو کہ ہزاری ملنے آیا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔" ہزاری نے آگے بڑھ کر کہا۔

"تم یہیں ٹھہرو میں پوچھ کر آتا ہوں۔" اس نے کہا اور چھوٹی کھڑکی بند کر دی۔ یہاں کا قاعدہ تھا کہ گن مین پہلے چھوٹی کھڑکی کھول کر آنے کی وجہ پوچھتا تھا، پھر وہ اندر خبر دیتا تھا۔ اگر سائیں کو ملنا ہوتا تو وہ آنے والے کو اندر بلا لیتا ورنہ وہ کھڑکی بند ہی رہ جاتی اور آنے والا مایوس ہو کر چلا جاتا۔ وہ دونوں بھی کھڑے یہی سوچ رہے تھے کہ پتا نہیں سائیں انہیں اندر بلائے گا بھی یا نہیں۔ یوں بھی رات کا آدھا پہر گزر چکا تھا۔ سائیں اپنی تین بیویوں کے ساتھ نیند پوری کر رہا ہوگا۔ وہ اتنی رات کو شاید ہی باہر آئے۔ اگر خبر اہم نہ ہوتی تو شاید وہ دونوں بھی نہ آتے۔

ابھی انہیں وہاں کھڑے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ چھوٹی کھڑکی کھلی۔ گن مین کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے ان دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "گیٹ کھول رہا ہوں۔ اندر آ جانا۔"

گن مین کا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ دروازہ کھل گیا اور وہ دونوں اندر چلے آئے۔ برآمدے میں بڑے سائیں اجرک اوڑھے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے سے بے زاری ہویدا تھی۔ جیسے ہی وہ دونوں نزدیک پہنچے۔ سائیں نے تپے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "کیا قیامت آ گئی...... صبح کا انتظار بھی نہیں کیا...... ایسی کیا بات ہو گئی۔"

"سائیں ہم برباد ہو گئے...... لٹ گئے۔ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔" ہزاری نے بین کرنے کے انداز میں اپنی بات پوری کی۔

"ایسا کیا ہو گیا؟" سائیں نے پوچھا۔

"سائیں ہم نے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے۔ سب مٹی میں مل گئے۔" ہزاری نے پھر بین کیا۔

"اب بول بھی دے ہوا کیا ہے؟" سائیں نے گرج کر پوچھا۔

"سائیں آج جب ہم کام ختم کر کے کارخانے سے نکلے تو سول میرے ساتھ تھی۔ پھر میں دوست محمد اور جانو کے ساتھ بیٹھ گیا۔ گپیں لگانے لگا۔ ایک گھنٹے بعد جب گھر پہنچا تو سول نہیں تھی۔"

"اپنی کسی دوست کے پاس بیٹھی ہو گی۔ اور کہاں جائے گی۔"

"سائیں ہم نے ہر جگہ دیکھ لیا...... وہ کہیں بھی نہیں ملی...... سانول بھی نہیں ہے۔ وہ دونوں غائب ہیں۔"

"کیا...... ہمارے کارخانے سے دو لوگ غائب ہیں...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"سائیں ایسا ہوا ہے...... لگتا ہے وہ دونوں فرار ہو گئے ہیں۔"

"اگر ایسا ہوا ہے تو اس کی سزا کڑی ملے گی۔ میں ابھی آتا ہوں۔" کہہ کر وہ اندر چلے گئے۔

کچھ دیر بعد جب واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں شکاری بندوق تھی۔ وہ ان سے کچھ کہے بنا گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ وہ دونوں بھی ان کے پیچھے لپکے۔ گیٹ پر پہنچ کر انہوں نے چوکیدار سے کہا۔ "عنایت سے کہو کہ وہ گاڑی نکلوائے...... ابھی اور اسی وقت۔"

حکم کی دیر تھی کہ ایک بندہ تیزی سے باہر آیا اور گیراج کی طرف دوڑ گیا۔ وہ ایک کھلی ہوئی جیپ پر واپس آیا۔ اس نے جیپ کو نزدیک لا کر کھڑی کر دی۔ بڑے سائیں اچک کر پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "اوئے تم دونوں بھی آ جاؤ۔"

وہ دونوں بھی جیپ پر سوار ہو گئے۔ جیپ چل پڑی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ سب کارخانے کے بڑے گیٹ پر کھڑے تھے۔ پہرے دار جاگ رہے تھے۔ سائیں کی جیپ دیکھتے ہی انہوں نے گیٹ کھول دیا۔ وہ سب اندر داخل ہوئے پھر چلتے ہوئے اس احاطے میں پہنچے جس میں

ہزاری اور دیگر لوگ رو رہے تھے۔
سائیں سیدھا ہزاری کے جھونپڑی میں پہنچے۔ ہزاری کی بیوی بیٹھی رو رہی تھی۔ سائیں نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر بولے۔ ''ہزاری، دیکھ وہ لوگ کیا کیا لے کر گئے ہیں۔''

''سائیں ہم نے دیکھ لیا...... کوئی چیز غائب نہیں ہے۔ صرف مول کے کپڑے کم ہیں۔''

''وہ لڑکا کس جھونپڑی میں رہتا تھا؟'' سائیں نے سوال کیا۔

''سائیں، وہ سامنے والی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ اس کی بھی تلاشی لے چکا ہوں۔ وہ بھی کچھ لے کر نہیں گیا ہے۔''

سائیں کو دیکھ کر تمام دھڑیل جمع ہو گئے تھے۔ سائیں نے ان پر غصیلی نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''اوئے تم لوگ کیا بھنگ پی کر سو رہے تھے...... وہ دونوں نکلے کیسے؟''

''پتا نہیں سائیں وہ لوگ کیسے باہر نکلے' اس لیے کہ دو بندے گیٹ پر اور باقی سب ساری رات ٹہلتے رہتے ہیں۔ گیٹ سے وہ لوگ گزرے ہی نہیں ہیں۔''

''حرام خوروں پھر کیا وہ لوگ ہوا میں اڑ گئے یا سرنگ کھود کر فرار ہو گئے؟''

''سائیں مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ دونوں اس وقت جب ڈرائیور گپ لگا رہا ہوگا اور مال لوڈ ہو رہا ہوگا' موقع دیکھ کر سامان کے پیچھے دبک گئے ہوں گے۔ جاتے وقت ٹرک کی تلاشی تو ہوتی نہیں ہے۔'' ایک دھڑیل نے اپنا خیال پیش کیا۔

اس کی بات میں دم تھا۔ سائیں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''عنایت گاڑی اسٹارٹ کرو...... اس کا اندازہ صحیح ہے کہ وہ لوگ ٹرک سے گئے ہیں۔ چلو ہم انہیں راستے میں پکڑ لیں گے۔''

سائیں کا حکم سنتے ہی ڈرائیور نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔ ہزاری بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ گاڑی تیزی سے ہائی وے کی جانب دوڑنے لگی۔

دوڑتی ہوئی گاڑی میں سب اپنی اپنی سوچوں میں غلطاں تھے۔ سائیں تلملا رہا تھا تو ہزاری اندر سے خوش تھا مگر رہ رہ کر خود کلامی کے انداز میں کہہ اٹھتا ''ہائے'' کیونکہ اسے بھی تو زندہ رہنا تھا، اس لیے وہ غمزدہ بنا ہوا تھا اور فکر مند لہجے میں بار بار کہہ رہا تھا کہ پتا نہیں وہ میری معصوم بیٹی کو لے کر کہاں گیا۔ اس کی بک بک سے اکتا کر سائیں نے زور سے کہا۔ ''اوئے تُو چپ رہے گا یا تجھے ہمیشہ کے لیے چپ کرا دوں۔''

اس کی ڈانٹ پر وہ خاموش تو ہو گیا مگر اس کی اداکاری جاری رہی۔

☆......☆

ہوٹل آوازوں سے گونج رہا تھا۔ لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کسی کی توجہ ٹرک کی جانب نہیں تھی۔ سانول نے سر اونچا کر کے نہایت احتیاط سے باہر جھانکا۔ لوگ خود میں مست تھے۔ اِدھر اُدھر بچھی چارپائیوں پر بیٹھے لیٹے تھے۔ پھر اس نے ٹرک کے آخری حصے کی جانب نظر ڈالی۔ جہاں کچھ دیر قبل کلینر لیٹا ہوا تھا وہ جگہ خالی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''موقع اچھا ہے۔ چل نیچے اتر جا۔''

''نیچے اتر کر کیا کریں گے؟'' مول نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

''تیرا کیا ارادہ ہے...... کیا تو اس ٹرک کے ساتھ واپس جانا چاہتی ہے...... ارے نیچے نہیں اتریں گے تو کراچی کے لیے گاڑی کہاں سے پکڑیں گے؟''

''ہاں یہ تو ہے...... اگر نیچے نہیں اترے تو ڈرائیور دیکھ لے گا اور ہم دوبارہ وہیں...... اس جہنم میں پہنچا دیے جائیں گے۔'' کہتے ہوئے وہ نیچے اتر گئی۔ سانول بھی تیزی سے نیچے اتر گیا۔ انہیں اترتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ اگر دیکھ بھی لیتا تو یہی سمجھتا کہ وہ مزدور ہیں۔

نیچے اترتے ہی سانول بولا۔ ''جلدی سے ادھر اس پیڑ کی طرف چل۔ وہاں بیٹھنے کی جگہ بھی ہے اور ادھر اندھیرا بھی ہے۔ ڈرائیور کی نظروں سے بھی ہم محفوظ رہیں گے۔''

وہ دونوں تیزی سے اسی طرف بڑھتے چلے گئے۔ اس پیڑ کے گرد پشتہ سا بنا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے بنایا گیا ہو کہ لوگ وہاں بیٹھ سکیں۔ وہ دونوں بھی اسی پر بیٹھ گئے۔ انہیں بیٹھا دیکھ ایک بچہ دوڑتا ہوا قریب آیا۔ ''سائیں کچھ چاہیے؟'' اس نے سوال کیا۔

زندگی میں پہلی بار کسی نے اسے سائیں کہا تھا۔ سانول کا سینہ فخر سے بلند ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''کھانے میں کیا کیا ہے؟''

''سائیں مٹن ہے۔ چکن ہے۔ سبزی ہے، پوری ہے کیا چاہیے؟''

سوائے پوری کے وہ ان کھانوں کو جانتا بھی نہیں تھا۔ پوریاں سال میں ایک دوبار اس نے کھائی تھیں جو اسے

بہت پسند آ گئی تھی۔ اس نے پوچھا "پوری کتنے کی ہے؟"

"سائیں دس روپے کی ایک۔ سالن فری۔"

"ایسا کر چار پوریاں لے آ۔" اس نے موہل کی طرف فتح مندی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تیرے پاس پیسے ہیں نا؟" اس نے سانول کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دو سو روپیا ہے...... تُو فکر ہی نہ کر۔ عیش کر عیش۔" سانول نے پیار بھرے انداز میں کہا۔

لڑکا مشین کی سی پھرتی سے ایک پلیٹ میں پوریاں اور دوسری میں سالن لے کر آ گیا۔ وہ دونوں اب شدید بھوک محسوس کر رہے تھے اس لیے کہ شام سے انہوں نے کچھ کھایا نہیں تھا۔ پوریوں کی اشتہا انگیز مہک نے بھوک کو بڑھا دیا تھا۔ وہ دونوں گویا پوریوں پر ٹوٹ پڑے۔ موہل نے نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔ "سانول...... یہ پوریاں تو بڑے مزے کی ہوتی ہیں۔ سائیں کے یہاں سے عید پر جو پوریاں آتی ہیں ان میں تو ایسا مزہ نہیں ہوتا۔"

"پچھلی باتوں کو بھول جا۔ ہمیں اب نئی زندگی گزارنا ہے۔ سائیں کے خوف سے آزاد زندگی۔" سانول نے اسے مشورہ دیا۔

جہاں وہ لوگ بیٹھے تھے وہ جگہ سڑک سے متصل تھی۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ان کی باتیں کوئی سن نہیں رہا مگر وہیں ایک کار کھڑی تھی، اس کے دروازے بند تھے مگر شیشے کھلے ہوئے تھے۔ اس کار میں ایک بندہ لیٹا ہوا تھا۔ شاید کہیں دور سے آ رہا تھا اسی لیے کمر سیدھی کرنے کے لیے کار کی سیٹ پر لیٹ گیا تھا۔ ہوا کے دوش پر سوار سانول اور موہل کی باتیں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر ایک بار انہیں دیکھا اور پھر ان کی باتیں سننے لگا۔ پوریوں کی تعریف سن کر اس نے ڈیش بورڈ پر نظر ڈالی۔ وہاں ایک پلیٹ میں پوریاں تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ موہل اور سانول اپنی باتوں میں منہمک تھے۔ انہیں پتا بھی نہیں چلا کہ کوئی ان کے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ وہ اس وقت چونکے جب اس شخص نے کہا۔ "یہ پوریاں میں نے منگوائیں تھیں مگر کھانے کا دل نہیں چاہا اب اسے واپس کرنا پڑے گا۔ پیسے تو دینے ہی ہیں۔ ایسا کرو تم لوگ کھا لو۔"

سانول نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہتا کہ موہل نے ہاتھ بڑھا کر پلیٹ لے لی۔ سانول کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ وہ شخص پوریاں دے کر واپس اپنی کار میں جا بیٹھا مگر اس کی نظریں انہیں کی طرف تھیں۔ وہ دونوں مزے سے پوریاں کھا رہے تھے۔ تمام ڈر خوف ہوا ہو چکا تھا۔ سانول کے چہرے سے ذرا بھی نہیں لگ رہا تھا کہ اسے کوئی فکر یا پریشانی ہے۔ تبھی نوالہ توڑتے ہوئے موہل بولی۔

"یہ سوچا ہے کہ یہاں سے آگے کیسے جائیں گے؟"

"کیسے جائیں گے؟ ارے ابھی بس آنے والی ہو گی۔ سنتے ہیں بس میں کوئی بھی سوار ہو کر کہیں بھی جا سکتا ہے۔ بس کرایہ ہونا چاہیے۔" سانول نے کہا۔

"تیرے پاس کل کتنے روپے ہیں؟"

"یہی کوئی دو سو ہوں گے۔ اتنے میں تو ہم کراچی پہنچ ہی جائیں گے۔"

"ادھر دیکھ...... وہاں...... وہ ڈرائیور ہے نا...... وہ ادھر ہی آ رہا ہے...... اب کیا ہو گا؟"

"لگتا ہے اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔" سانول کی آواز میں فکر مندی در آئی تھی۔ "ایسا کر کہ گھونگھٹ اور نیچا کر لے۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"ہو سکتا ہے وہ ہمیں نہ پہچانے...... میں نے بھی سر پر چادر لپیٹ لی ہے نا۔ اتنی آسانی سے وہ پہچان نہیں پائے گا۔"

تبھی ہیلپر نے آواز لگائی۔ "استاد ادھر ایک منجھی خالی ہے...... وہ والی منجھی کا غم چھوڑ دو اسی پر لیٹ کر باقی کی نیند پوری کر لو...... یہ لوگ جان بوجھ کر ٹوٹی منجھی رکھتے ہیں تاکہ گاہک سے پیسے وصول کر سکیں۔"

"اچھا چل چل۔" کہتے ہوئے ڈرائیور ایک منجھی پر لیٹ گیا۔

انہیں ادھر جاتے دیکھ کر سانول کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا۔ تبھی موہل بولی۔ "یہاں سے جلدی نکلنا ہو گا۔"

"ہاں۔" سانول نے کہا۔ "بس آتی ہو گی۔"

تبھی موہل بولی۔ "وہ ادھر دیکھ...... وہ ایک انگریز بیٹھا ہے۔"

"ہاں بیٹھا تو ہے۔"

"یہ لوگ بڑے دل والے ہوتے ہیں...... بابا بتاتے ہیں کہ ایک بار ہمارے بھٹہ پر انگریز آئے تھے۔ جس جس کی فوٹو کھینچی تھی سب کو ایک ایک ہزار روپیہ دیا تھا۔"

"تو کیا اب اس سے جا کر بھیک مانگوں کہ ہماری مدد کر دیں۔" سانول نے جھنجلا کر کہا۔

"میں نے یہ کب کہا...... اس کے پاس بڑی والی گاڑی ہو گی...... اگر یہ ہمیں بٹھا لے تو ڈر کے مارے کوئی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا پھر پیسے بھی بچ جائیں گے۔"

UUNOVELS.COM

''تیری بات تو سچ ہے لیکن اس سے بات کیسے کریں؟'' سانول کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

''ادھر دیکھ ایک بندہ بیٹھا ہے نا...... وہ پڑھا لکھا لگ رہا ہے۔ وہ تیری بات اس سے انگریزی میں کر دے گا۔ اپنا کام بن جائے گا۔''

''اور اگر ڈرائیور ادھر آ گیا تو؟'' سانول نے ڈرائیور کی طرف دیکھ کر کہا۔

''وہ سو رہا ہے۔ اس کا ساتھی بھی سو رہا ہے۔''

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' کہہ کر وہ اس آدمی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے نزدیک پہنچ کر سانول نے کہا۔

''سائیں...... انگلش جانتے ہو؟''

''ہاں۔'' حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے نہیں آتی...... میری بات اس انگریز کو سمجھا دیں۔'' سانول نے انگریز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ میری بات سمجھ نہیں پا رہا۔''

''بولو کیا کہنا ہے؟''

''میں ایک غریب بندہ ہوں...... مجھے انگریزی نہیں آتی...... مجھے کراچی جانا ہے لیکن میرے پاس پیسا نہیں ہیں...... مجھے آپ کی مدد درکار ہے...... پھر اس نے وہی جملہ سندھی میں ادا کیا۔ ''ما ہک غریب مارو اہن...... مو کھے انگریزی نا ایندی آ...... کراچی وںجڑو آہے...... پر مون داٹھیھاٹرے جا پیسا کونا ہن...... مون جی مدد کاریو۔''

''او۔'' کہہ کر وہ شخص اس انگریز کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ انگریز کے نزدیک پہنچ کر اس نے اسے مخاطب کیا ''you know english''

'':yes:''

''i know also.'' (اشارہ سانول کی طرف) very poor...this man۔''

''اوہ۔''

''his name''...وہ بولتے بولتے رکا پھر مڑ کر سانول سے پوچھا۔ ''کیا نام ہے۔''

''سانول۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

karachi.....but sanwal want.go'
he have no mony...no kiraya he
want...plese you bring with you

انگریز نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''مان انگریز نہ...... سندھی آہیان...... مون کے کو ۂ آ ہے۔ ان کرے منھنجو رنگ اچھو گورو آہے'' (میں انگریز نہیں...... سندھی ہوں...... مجھے برص کا مرض ہے...... اسی لیے میں اتنا گورا لگ رہا ہوں)

اس کی بات سن کر دونوں ہنسنے لگے۔ سانول منہ لٹکائے واپس مول کے پاس آ گیا۔

''وہ انگریز نہیں ہے اور نہ اس کے پاس گاڑی ہے۔'' سانول نے سر جھکا کر کہا۔ اسی وقت ہیلپر کی آواز گونجی۔ وہ ڈرائیور کو جھنجوڑ کر اٹھا رہا تھا۔

''استاد فون...... آپ کا فون۔''

''کس کا فون ہے۔'' ڈرائیور کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

''استاد بڑے سائیں کا فون ہے۔'' وہ اتنی بلند آواز میں بولا کہ اس کی آواز مول تک صاف پہنچ گئی۔ ان دونوں کے چہرے اتر گئے۔ ڈرائیور موبائل کانوں سے لگائے بول رہا تھا۔

''ہیلو...... کون...... اچھا...... بڑے سائیں...... بولیں...... کیا...... سانول نامی لڑکا وہاں کی ایک لڑکی مول کو لے کر بھاگ گیا...... کیا...... میرے ٹرک پر...... اچھا اچھا میں ابھی دیکھتا ہوں۔''

فون بند کر کے وہ ہیلپر سے بولا۔ ''اوپر چڑھ کر تلاشی لے۔ سائیں کا کہنا ہے ایک لڑکی اور ایک لڑکا اسی ٹرک پر سوار ہو کر باہر آئے ہیں۔ ان کو ہر قیمت پر تلاش کرنا ہے ورنہ ہماری خیر نہیں ہے۔'' اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ مول اور سانول دونوں سہم گئے۔ مول کا جسم کانپ اٹھا۔ اس نے سانول کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی جکڑ اتنی سخت تھی کہ سانول کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی لمبی لمبی پتلی پتلی انگلیاں گوشت میں اتر جائیں گی۔ وہ دونوں خوف سے سکڑ گئے تھے۔ ایک دوسرے میں پیوست ہو جانے کی حد تک جسم سے جسم مل گیا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اس اندھیرے حصے کی طرف کوئی نہیں آئے گا اور وہ ڈرائیور سے محفوظ رہیں گے مگر انہیں خبر نہ تھی کہ ان پر ایک اور آدمی نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ آدمی بھی اندھیرے میں تھا اس لیے مول سانول کی نظروں سے بچا ہوا تھا۔ گو کہ وہ اندھیرے میں تھا مگر اس کی نگاہیں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ دونوں ہر جانب سے بے خبر ڈرائیور کو دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور کے سامنے کھڑے ہیلپر نے آواز سنی اور تیزی سے ٹرک کی جانب چل پڑا۔

☆......☆

UUNOVELS.COM

سائیں نے اپنی گاڑی مقامی پولیس چوکی پر روک دی۔ اسے گاڑی روکتے دیکھ ہزاری بولا۔ "سائیں سب خیر ہے نا...... اب کیا آپ بھی پولیس میں رپورٹ لکھواؤ گے؟"

"جھلا ہوا ہے کیا۔ میں کیوں پولیس میں رپورٹ لکھوانے لگا۔ ایک دو میرے نمک خوار ہیں۔ ان سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔" کہہ کر وہ پولیس چوکی میں داخل ہو گیا۔ باقی سارے لوگ باہر ہی کھڑے تھے۔ اندر پتا نہیں کیا بات ہوئی، ان لوگوں نے صرف ہوا کے دوش پر آتی ہوئی آوازوں سے اندازہ لگایا تھا کہ اندر والے سائیں کو دیکھ کر خوش ہو اٹھے تھے۔ پھر جب سائیں باہر آیا تو اس کے ساتھ دو پولیس والے اور ایک ایس آئی بھی تھا۔ اب وہ ایس آئی اور سپاہی پیچھے بیٹھے شیخی بگھار رہے تھے

"آپ بالکل فکر نہ کریں...... اس کو تو ایسا چھترول لگاؤں گا کہ اس کی اولادیں بھی گنجی پیدا ہوں گی۔"

"نہیں ہے...... اولاد نہیں...... اولاد میری ہوگی۔" سائیں نے ہنستے ہوئے کہا اور ہزاری کی طرف دیکھا۔ ہزاری لاتعلق بنا ہوا تھا۔

"اچھا اچھا...... اس کی چھترول تو ضروری ہے نا۔"

"ہاں اسے اتنا مارنا اتنا مارنا......"

"ہڈی پسلی ایک ہو جائے۔" ہزاری نے سائیں کو جملہ مکمل کرنے نہیں دیا اور خود بول اٹھا۔

"...... سر میں ٹھڈے ماروں گا۔" سپاہی نے بوٹ دکھا کر کہا۔ "ایسے ماروں گا" کہتے ہوئے اس نے برابر والے سپاہی کے گال پر طمانچہ مار دیا پھر جلدی سے بولا۔ "سوری سوری...... غلطی ہوگئی......"

"یہ لے ڈبل سوری...... مجھ سے بھی غلطی ہو گئی۔" اس نے جوابی طمانچہ مار کر کہا۔

"تم دونوں کو یہیں اتار دوں گا...... خاموشی سے بیٹھے رہو۔" ایس آئی چیخا پھر مڑ کر سائیں سے بولا۔ "اس کو آپ پہچانتے ہیں نا۔"

"ہاں ہاں...... اب چپ رہو میرے اندر آگ جل رہی ہے۔"

"آپ فکر ہی نہ کرو...... اس کی تو......" ایس آئی نے ایک ناقابل گرفت جملہ کسا۔

"وہ دیکھو شاید کوئی ہوٹل ہے...... روشنی تو یہی بتا رہی ہے۔" بڑے سائیں نے کہا۔

"سائیں اس ہوٹل پر ٹرک ضرور رکتا ہے۔ ڈرائیور بتایا کرتا ہے کہ وہ چائے یہیں آ کر پیتا ہے۔ رات کی تھکن اتارنے کو آرام بھی کرتا ہے۔" ہزاری نے جواب میں کہا۔

"سیدھا وہیں چل۔" سائیں نے کہا۔

"وہ مجھے مل گیا نا تو دیکھنا کیا حشر کرتا ہوں۔" ایس آئی نے پھر شیخی بگھاری۔

"صاب جی آپ کچھ بھی بولو...... میں تو اسے وہیں آٹھ دس ٹھڈے لگاؤں گا۔" سپاہی نے لقمہ دینا ضروری سمجھا۔

"تم چپ نہیں رہ سکتے ہو۔" سائیں نے جھڑکا۔

سپاہی نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا۔ "لو چپ ہو گیا مگر میں اسے ٹھڈے ضرور ماروں گا۔"

☆......☆

موتی اور سانول دونوں سکتے کی سی کیفیت میں تھے۔ جہاں بیٹھے تھے وہیں جم کر رہ گئے تھے۔ ان کی نظریں ڈرائیور پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی ایک ایک حرکت کو ان کی نظریں جانچ رہی تھیں۔ انہیں کوئی ڈر تھا تو بس یہی کہ وہ ادھر نہ آ جائے۔ بس اسی خوف سے وہ اس کو نظروں کے محدب شیشے سے پرکھ رہے تھے۔ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اگر اندھیرے کا راج نہ ہوتا تو وہ ادھر ادھر ہو جاتے مگر اندھیرے میں کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے۔ بس دعا کر سکتے تھے اور کیے جا رہے تھے۔ زبان ہلائے بغیر اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا رہے تھے کہ تُو حفیظ ہے ہماری حفاظت فرما۔ ان لوگوں سے بچا لے میرے مولیٰ۔

اسی وقت ان کی سماعت سے ہیلپر کی آواز ٹکرائی۔

"استاد یہ اوپر ڈالے پر ایک پوٹلی پڑی تھی...... اس میں زنانہ کپڑے ہیں...... ضرور لڑکی کے ہوں گے...... وہ اسی ٹرک سے آئی ہے۔"

ڈرائیور نے آواز لگائی۔ "اسے ڈھونڈ...... وہ یہیں کہیں ہوگی...... وہ کہیں جا نہیں سکتی۔"

"ابھی دیکھتا ہوں...... ایک ایک پنجر کو دیکھتا ہوں۔" ہیلپر نے جواب دیا۔

موتی اور سانول کو یقین آ گیا تھا کہ اب وہ ایک ایک پنجر کو دیکھتا ہوا ان تک پہنچ جائے گا۔ کیا کیا جائے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ سائیں کی گاڑی آ کر رکی اور اس سے ایک کے بعد ایک آدمی اترنے لگا۔ انہیں دیکھ کر موتی نے سرگوشی کی۔ "ادھر دیکھو انو...... کتا اپنے ساتھ پولیس بھی لایا ہے۔"

تبھی ہزاری کی آواز سنائی دی۔ "وہ رہا رحمان ڈرائیور۔" کہتے ہوئے وہ اس کی طرف دوڑا اور نزدیک پہنچ

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

کر اس کے ہاتھ کو تھام کر بولا: "رحمان بھائی...... میری بچی کہاں ہے۔"

"مجھے کیا پتا؟" رحمان بولا۔

"لو یہ کیا بات ہوئی...... وہ تمہارے ٹرک میں چھپ کر آئی ہے۔" ہزاری نے شکوہ کے انداز میں کہا۔

"تم نے کہا نا کہ وہ چھپ کر آئی ہے تو مجھے کیسے پتا چلے گا کہ کون کہاں چھپا ہوا ہے...... جاؤ ڈھونڈو۔" رحمان ڈرائیور نے جھنجلاہٹ بھری آواز میں کہا۔

"تمہیں نہیں پتا کہ لڑکی تمہارے ٹرک میں آئی ہے؟" سائیں نے سوال کیا۔

"سائیں ایسے کیسے ہو سکتا ہے...... مجھے پتا ہوتا تو میں پکڑ نہ لیتا......" ڈرائیور نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

"یہاں سے کوئی بس تمہارے آنے کے بعد گئی ہے؟" سائیں نے سوال کیا

"بس تو کوئی نہیں گزری مگر گاڑیاں بہت سی نکلی ہیں۔" ڈرائیور بولا۔

"ڈھونڈو تب وہ یہیں کہیں چھپی ہوئی ہو گی...... وہ دو ہیں ایک ساتھ ہی ہوں گے...... ایک ایک مسافر کو دیکھو۔"

ڈرائیور اور ہزاری اِدھر اُدھر بیٹھے لوگوں کو دیکھنے لگے۔ ہزاری ایسے ایک ایک آدمی کو دیکھ رہا تھا جیسے وہ نہایت باریک بینی سے تلاش کر رہا ہو جب کہ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ وہ دونوں دور نکل گئے ہوں۔

ان سے کچھ دوری پر۔ اندھیرے میں پیڑ کے پشتے پر بیٹھے وہ دونوں حد سے زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں سے کیسے نکلیں۔ وہ دعا کر رہے تھے کہ کسی طرح وہ دونوں ان سے محفوظ رہیں۔ تبھی کار میں سوار آدمی باہر آیا اور ان کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میں نے سن لیا تھا کہ تم لوگ کراچی جانا چاہتے ہو...... میں بھی کراچی جا رہا ہوں اور میرے پاس گاڑی ہے۔ اگر ساتھ چلنا چاہتے ہو تو چلو۔"

"ہاں ہاں ہم کراچی جانا چاہتے ہیں۔" مول جلدی سے بولی۔

"تو آ جاؤ میں جا رہا ہوں۔"

وہ دونوں لپک کر کار کے پاس پہنچے۔ اگلا دروازہ اس شخص نے کھول دیا تھا۔ سانول اندر بیٹھ گیا۔ پچھلا دروازہ کیسے کھلے گا یہ بات مول کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اس شخص نے ہاتھ بڑھا کر وہ دروازہ بھی کھول دیا...... مول جلدی سے اندر بیٹھ گئی۔

ایسی نرم نرم گدی۔ مول کو لگا جیسے جھاگ کے ڈھیر پر بیٹھی ہو۔ اسے بڑا آرام مل رہا تھا۔ وہ کبھی اپنے جسم کو بائیں کرتی اور کبھی دائیں۔ اسے بہت مزہ آ رہا تھا۔ کار چلی جا رہی تھی مگر وہ ہر طرف سے بے پرواہ تھی۔

ادھر ہوٹل میں کھڑے سائیں نے اپنے قریب سے گزرتے چائے پہنچانے والے لڑکے سے پوچھا "تو نے ایک عورت ایک مرد کو دیکھا؟"

"خوبصورت سی مگر غریب لڑکی؟" ملازم لڑکے نے جواباً سوال کیا۔

"ہاں...... ہاں...... خوبصورت سی لڑکی۔"

"ہاں میں نے ان کو دیکھا ہے۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"کہاں دیکھا ہے؟"

"جب وہ جا رہے تھے...... وہ ایک کار میں بیٹھ کر گئے ہیں۔"

"ہزاری...... رحمان...... سپاہی...... سب آؤ...... جلدی چلو...... وہ دونوں ایک کار میں بیٹھ کر گئے ہیں...... زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔"

سائیں کے کہتے ہی سپاہی اور ایس آئی جلدی سے گاڑی میں سوار ہوئے اور گاڑی آگے کی جانب بھاگنے لگی۔

☆......☆

اس اجنبی کی کار بھی آگے کی جانب بھاگ رہی تھی۔ وہ بیک ویو مرر میں مول کو دیکھ رہا تھا۔ گو کہ اس کی عمر ستر کے قریب ہو گی مگر کسی کی نیت کا کہا بھی تو نہیں جا سکتا۔ وہ آئینہ میں اس کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بولا۔ "ہاں بھائی تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔" اس نے مڑ کر سانول کی طرف دیکھا تھا اس لیے سانول جلدی سے بولا:

"سائیں میرا نام سانول ہے۔"

"اور اس کا نام؟" اس کا اشارہ مول کی طرف تھا۔

"میرا نام مول ہے سائیں۔" مول بولی: "اور آپ کا کیا نام ہے؟"

"میرا نام قیصر ہے۔ میں کراچی میں وکالت کرتا ہوں۔"

"یہ وکیل کیا ہوتا ہے سائیں؟" مول نے پوچھا۔

"اگر کسی کو ناحق پولیس پکڑ لے تو اس کی طرف سے وکیل لڑتا ہے۔ عدالت میں اسے بے قصور ثابت کرتا ہے۔"

"وکیل عدالت میں جا کر لڑتا ہے؟ مگر آپ تو اتنے بڑے ہیں، ملاکھڑا کیسے کھیلتے ہوں گے؟" مول نے

UUNOVELS.COM

معصومیت سے پوچھا۔

''ہاہاہا...... وکیل ملاکھڑا نہیں لڑتا...... وہ اپنے انداز سے لڑتا ہے...... دلیل سے لڑتا ہے...... عدالت میں ثابت کرتا ہے کہ میرے موکل پر جھوٹا الزام لگا ہے۔ قانونی جنگ لڑتا ہے یعنی دماغی ملاکھڑا کرتا ہے۔'' قیصر نے مسکراتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اچھا اچھا ...... میں بھی ایسا ملاکھڑا دیکھوں گی۔'' مومل نے کہا۔

اسی وقت دور سے اذان کی آواز سنائی دی۔

''اذان ہو رہی ہے...... آگے ایک مسجد ہے میں نماز پڑھوں گا۔''

''اچھا۔'' مومل بولے جا رہی تھی مگر سانول خاموش تھا۔

قیصر نے سانول کی طرف دیکھ کر کہا''تم بھی پڑھ لینا...... اللہ سے مانگو گے تو وہ بہت کچھ عطا کرے گا۔''

''مگر مجھے تو نماز آتی نہیں۔'' سانول نے منہ بنا کر کہا۔

''نماز نہیں آتی...... حیرت ہے۔''

''جی ...... ہم سائیں کے گوٹھ میں پل کر جوان ہوئے...... وہیں پیدا ہوئے۔ ہم صرف محنت کرنا جانتے ہیں۔''

''تو کیا تم لوگ نماز روزہ کچھ نہیں کرتے؟''

''وقت ہی نہیں ملتا...... سائیں ایک ایک منٹ کا حساب رکھتا ہے...... ہاں کچھ لوگ زبردستی عید بقرعید کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔''

''حیرت ہے...... مسلمان ہو کر بھی سائیں تم لوگوں کو نماز کا وقت نہیں دیتا۔''

''ہماری زندگی صرف سائیں کی تابعداری میں گزر جاتی ہے...... کسی اور کام کا وقت ہی نہیں ملتا۔''

''اچھا اچھا جیسے میں وضو کروں تم بھی کرنا۔ پھر جیسے میں رکوع اور سجدہ کروں تم بھی کر لینا...... مالک بڑا رحیم و کریم ہے...... ضرور قبول کرے گا...... اچھی سی نوکری مل جائے گی۔''

''اچھا...... نماز پڑھنے سے نوکری مل جاتی ہے...... میں ضرور پڑھوں گا۔''

''ہم بھی پڑھیں گے...... مجھ کو بھی سکھا دینا۔'' مومل نے کہا۔

''عورتیں پردے کے ساتھ نماز پڑھتی ہیں...... تم گھر پہنچ کر پڑھ لینا...... ابھی تو گاڑی میں ہی بیٹھنا۔'' قیصر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہ نہ ایسا نہیں کر سکتی...... ایک منٹ کے لیے بھی میں سانول سے دور نہیں ہو سکتی۔''

''اچھا اچھا کچھ فاصلہ دے کر سانول کے کچھ پیچھے کھڑی ہو جانا۔'' کہتے ہوئے قیصر نے کار روک دی۔ سامنے ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔

☆......☆

''ارے یار...... او فیتے...... ذرا تیز نہیں چلا سکتا...... وہ لوگ دور نکل گئے ہوں گے...... ان کو ہر حال میں پکڑنا ہے۔'' سائیں نے اپنے ڈرائیور کو جھڑکا۔

''سائیں۔ سوئی اسپیڈ رکھی ہے...... پیٹرول بھی ختم ہے...... آگے ایک پیٹرول پمپ ہے وہاں رکنا بھی پڑے گا۔ پیٹرول بھروانے کے لیے اور قریب میں ہوٹل ہے آپ وہاں آرام کر لیں گے۔ وہیں پاس میں مسجد ہے میں نماز بھی پڑھ لوں گا۔''

''اچھا اچھا پڑھ لینا...... ابھی تو تیز چلو۔'' سائیں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''صاب جی بھوک بھی لگنے لگی ہے۔''

''وہاں ایک ہوٹل بھی ہے۔ پہنچ کر کھا لینا۔''

''اور اگر وہاں وہ دونوں مل گئے تب......؟''

''ان کو باندھ کر جیپ میں ڈال دیں گے...... تب تک تم پیٹ بھر لینا۔''

''وہ رہا ہوٹل...... وہاں جہاں وہ کار کھڑی ہے۔'' اسی سپاہی نے دور کھڑی کار کی طرف اشارہ کیا۔ دراصل صبح کاذب کی سفیدی پھیلنے لگی تھی اسی لیے دور کھڑی کار کا ہیولا نظر آ گیا تھا۔ ڈرائیور نے اس کار کے نزدیک لے جا کر گاڑی روک دی۔

گاڑی رکتے ہی ایک کے بعد ایک سب اتر گئے۔

سپاہی نے ہزاری کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا''بھائی ہم کھانے کے لیے جا سکتے ہیں۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

ہزاری نے اس کی طرف تیز نظروں سے دیکھا پھر کہا''منع کس نے کیا ہے۔ ہزار بار جاؤ...... پورا ہوٹل کھا جاؤ۔''

''بھائی غصہ کیوں ہوتے ہو۔ سائیں سے کہنے کی ہمت نہیں تھی اس لیے آپ سے پوچھا...... ٹھیک ہے ہم جا رہے ہیں مگر بل کون دے گا؟''

''کھاؤ گے تم تو پھر بل کیا فرشتے آ کر دیں گے۔ اپنا بل خود ادا کرنا۔''

''نہ نہ ایسا بھی کبھی ہوتا ہے...... ہم آپ لوگوں کی مدد

UUNOVELS.COM

کے لیے ہیں تو پھر کھانا کھلانا بھی آپ کی ذمے داری ہوئی نا۔'' سپاہی نے بے شرمی سے کہا۔

''اچھا اچھا جاؤ جو کھانا ہے مانگ لینا۔'' سائیں نے مداخلت کی۔

سپاہی جاتے جاتے ایس آئی کو اشارہ کرتے ہوئے گئے۔ کچھ دیر تک ایس آئی وہیں کھڑا رہا پھر وہ بھی ان کی طرف چل پڑا۔ ڈرائیور نے پیٹرول پمپ والے سے کہہ کر ٹنکی فل کرائی۔ اب وہ بھی سپاہیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو کھانے میں مصروف تھے۔

''جاؤ تم بھی کھالو۔'' ہزاری نے ایسے کہا جیسے وہ ہی سائیں ہو۔ دراصل خود اسے بھی بھوک لگنے لگی تھی۔ اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو اسے ٹیبل کی طرف کھینچ رہی تھی۔ مگر وہ سائیں کی وجہ سے مجبور تھا۔ سائیں اِدھر اُدھر بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

☆......☆

قیصر نے مسجد کے قریب کار روک دی اور نیچے اترتے ہوئے بولا ''مومل۔ تم یہیں بیٹھنا ہم نماز پڑھ کر ابھی آتے ہیں۔''

''میں اکیلی کیسے بیٹھوں گی۔ اگر کوئی آ گیا تب؟''

''ڈرنے کی کیا بات ہے...... اجالا پھیل چکا ہے...... ہم ابھی گئے اور ابھی آئے۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھنے چلوں گی۔''

''اچھا اچھا چلو۔ اگر مسجد میں کوئی ہوا تو گیٹ پر ہی رک جانا۔'' کہہ کر قیصر اندر کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ سانول بھی نماز کی نیت سے جا رہا تھا مومل نے ان دونوں کا ساتھ پکڑ لیا۔ وہ بھی اس چھوٹی سی مسجد میں داخل ہو گئی۔ وضو کرتے ہوئے قیصر نے کہا ''مومل تم سانول کے پیچھے کھڑی ہو جانا اور جیسے جیسے میں کروں تم دونوں کرتے جانا۔ قیصر نے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھا ہی تھا کہ مومل نے اس سے بھی بلند آواز میں تکبیر بلند کی، اس کی آواز پر قیصر چونک گیا تھا مگر اس نے خود کو سنبھال لیا اور ہنسی دباتے ہوئے نماز میں خود کو جذب کر لیا۔ سلام پھیر کر وہ اٹھا تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا اس لیے کہ مومل وہاں نہیں تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر جب اندر کہیں نظر نہ آئی تو وہ باہر کی سمت بڑھا۔ اس کے ساتھ سانول بھی تھا۔ اس نے قیصر کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''مومل کہاں گئی۔ ابھی تو وہ ادھر ہی تھی۔''

''ارے بھائی میں بھی تو تمہارے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ وہ یہیں کہیں ہو گی۔ باہر چلو۔'' اس نے برابر میں نماز پڑھتے بندے پر نظر ڈالی۔ وہ نماز میں مشغول تھا اس لیے وہ اس سے کچھ پوچھ نہ سکے۔ پولیس وردی میں ملبوس نمازی اس وقت سجدے میں تھا۔ وہ دونوں باہر نکل گئے۔

باہر بھی وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اب قیصر کو بھی فکر ہونے لگی تھی کہ وہ گئی کہاں؟ جب کہ سانول کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ مسلسل ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ اسے اسی شخص نے غائب کرایا ہے۔ اس سے کہا کہ جب نماز میں رہنا تو اِدھر اُدھر مت دیکھنا۔ پوری توجہ نماز پر رہے اور اس کی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر اس نے مومل کو غائب کر دیا۔

''سائیں وہ گئی کہاں؟'' سانول نے قیصر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' قیصر نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ دونوں بہت معصوم ہیں۔ یہ ہائی وے ہے۔ ٹرک ڈرائیور، کلینر، جرائم پیشہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر یہ کسی ایسے ویسے کے ہتھے چڑھ گئی تو بہت برا ہو گا۔

''سائیں ادھر ہوٹل جا کر دیکھیں۔ شاید وہ ادھر چلی گئی ہو۔'' سانول نے اشارے سے ہوٹل دکھاتے ہوئے پوچھا۔

قیصر نے ادھر دیکھا۔ ہوٹل کے سامنے ایک ڈبل کیبن گاڑی کھڑی تھی جس کے ساتھ ٹیک لگائے ایک روایتی وڈیرا کھڑا تھا۔ اس کے آس پاس کئی لوگ تھے جن میں سے دو کے بدن پر پولیس کی وردی بھی تھی۔ ابھی قیصر ادھر ہی دیکھ رہا تھا کہ شش کی آواز گونجی۔ قیصر نے آواز کی سمت دیکھا۔ مومل اس کی کار کے پیچھے کھڑی نزدیک آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ قیصر اور سانول تیزی سے اس کی جانب بڑھے۔ جیسے ہی وہ اس کے پاس پہنچے اس نے بے تابی سے کہا۔ ''جلدی یہاں سے چلو۔''

''اندر تو بیٹھو۔'' قیصر نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اندر بیٹھ گئے۔

قیصر نے کار اسٹارٹ کر کے جیسے ہی آگے بڑھائی۔ سانول نے اس سے پوچھا ''اے تو باہر کیوں آ گئی تھی؟''

''جب میں نماز پڑھ رہی تھی تو ایک پولیس والا اندر آ گیا۔ اس نے میری طرف بڑے خونخوار انداز میں دیکھا۔ میں ڈر گئی بس اسی لیے باہر آ گئی۔''

''ہم نے اِدھر اُدھر سب جگہ دیکھا تھا مگر تو نظر ہی نہیں آئی۔''

''ارے نظر آتی تو کیسے...... میں تو کار کے پیچھے

UUNOVELS.COM

چھپ کر بیٹھی تھی۔"

"ارے بے وقوف اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ پولیس والے سے بھی کوئی ڈرتا ہے۔" قیصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہ سائیں نہ...... ایسا نہ بولو...... ایک بندہ سائیں سے چھپ کر بھاگا تھا۔ اسے جب سائیں دوبارہ لے کر آیا تو اس نے بتایا کہ اسے پولیس والوں نے پکڑا تھا، بہت بری طرح اسے مارا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ پولیس والے بہت ظالم ہوتے ہیں۔"

"اب تم میری پناہ میں ہو...... کوئی ایسے ہی تمہیں مارے گا۔ میں اسے عدالت میں گھسیٹ لوں گا...... تم اب کوئی فکر ہی نہ کرو......"

"سائیں آپ سچی سچی بولو...... آپ بڑے سائیں سے زیادہ طاقت رکھتے ہو؟"

قیصر نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔ "اب ہم کراچی پہنچنے والے ہیں۔ یہاں کوئی ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ کراچی میں کسی وڈیرے۔ کسی سائیں کی نہیں چلتی۔ وہاں قانون ہے پولیس ہے۔ اگر بڑے سائیں نے تجھے دیکھ بھی لیا نا تو تیرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ الٹا میں اسے تھانے میں بند کرا دوں گا۔"

"واہ سائیں تب تو مزہ آجائے گا۔ ایک بار اس کو بند ضرور کراؤ......"

مومل کی بات پر قیصر ہی نہیں سانول بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ قیصر کے دلاسے نے کچھ حد تک اس کے خوف کو کم کر دیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ سائیں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔

☆......☆

بڑے سائیں گاڑی سے ٹیک لگائے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں ایک ایک مسافر کو ٹٹول رہی تھیں، اسے یقین تھا کہ مومل اور سانول ادھر ہی کہیں چھپے ہوئے ہوں گے۔ اسے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لیتے دیکھ کر ہزاری ٹیبل سے اٹھ گیا اور منہ پونچھتا ہوا سائیں کے پاس آگیا۔ دیگر لوگ بھی آچکے تھے کہ نماز پڑھنے جانے والا سپاہی بھی آگیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"کیا بات ہے انور۔ نماز پڑھ کر مسکرا رہے ہو...... کوئی خاص دعا مانگی ہے کیا؟" ایس آئی نے دانت میں خلال کرتے ہوئے پوچھا۔

"سائیں آج میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔" سپاہی نے کہا۔ "ایک پیرانی کو دیکھا...... وہ مسجد میں نماز پڑھ رہی تھی...... مسجد میں پہلی بار کسی عورت کو دیکھا جو مردوں کے ساتھ نماز پڑھ رہی تھی۔"

"ضرور اللہ لوک ہوگی...... اس سے پروموشن کی دعا کے لیے کہہ دیتا......" ایس آئی نے تنکے کو زمین پر پھینک کر کہا۔

"اس سے کچھ کہتا کہ وہ نماز چھوڑ کر بغیر سلام پھیرے باہر نکل گئی۔"

"اور دوسرے لوگ؟"

"مسجد میں اور تھا ہی کون...... ایک بندہ تو معقول نظر آیا دوسرا کوئی مزدور ٹائپ تھا۔ وہ دونوں نماز پڑھتے رہے۔ مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے مزدور ٹائپ بندہ نماز پڑھنا نہیں جانتا تھا اس لیے کہ وہ کبھی ہاتھ کھول دیتا اور کبھی باندھ لیتا۔ رکوع سے سیدھا سجدے میں چلا گیا پھر جلدی سے قیام کر کے دوبارہ سجدے میں گیا۔"

"وہ بندہ کیسا تھا؟" سائیں نے اس سے پوچھا۔

"سائیں بس یہ سمجھ لو کہ مزدور ٹائپ تھا۔ کپڑے بھی بس ایسے ہی تھے۔"

"اور وہ لڑکی جو نماز پڑھ رہی تھی؟"

"سائیں وہ بہت خوبصورت تھی لیکن اس کے کپڑے بھی پرانے میلے کچیلے...... مسلے ہوئے۔ جیسے انہی کپڑوں میں سوتی رہی ہو......"

"ابے وہی دونوں تھے...... کدھر گئے...... جلدی بول۔" سائیں نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"کراچی کی طرف۔ شاید کار میں تھے اس لیے کہ جب میں مسجد میں داخل ہو رہا تھا تو باہر ایک کار کھڑی تھی مگر جب نماز پڑھ کر نکلا تو کار نہیں تھی۔"

"سب بیٹھو...... جلدی جلدی...... وہی دونوں ہوں گے۔" کہہ کر وہ گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی کراچی کی طرف بھاگنے لگی۔

☆......☆

قیصر کار ڈرائیو کرتا ہوا کراچی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ سانول خاموش تھا۔ وہ ونڈ اسکرین سے باہر کی طرف دیکھ رہا تھا مگر صاف لگ رہا تھا کہ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ تبھی مومل نے اسے پکارا۔ "سانول او سانول۔"

"کیا ہے؟" اس نے جواب دیا اور مڑ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا۔

UUNOVELS.COM

''وہ دیکھ...... سامنے...... سڑک کے بیچوں بیچ دروازہ...... لیکن یہ کیسا عجیب دروازہ ہے...... صرف دروازہ اور اس میں نہ تو کوئی پلڑا لگا ہے اور نہ دیوار ہے۔ ایسا دروازہ لگانے سے کیا فائدہ؟''

''وہ دروازہ نہیں، ٹول پلازہ ہے...... ہم کراچی میں داخل ہونے والے ہیں۔'' قیصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو کیا یہ کراچی شہر کا دروازہ ہے؟''

''نہیں وہاں رک کر ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ ٹول ٹیکس۔''

''کیوں کیوں؟''

''ارے بھائی یہ سڑک جو بنی ہے اس پر پیسے لگے ہیں یا نہیں؟ ایک قسم کا کرایہ سمجھ لو...... سڑک سے گزرنے کا کرایہ۔''

''تو کیا آپ کو بھی کرایہ دے کر کراچی میں داخل ہونا پڑے گا؟''

''سب کو دینا پڑتا ہے...... جو بھی شہر سے باہر جائے گا یا اندر آئے گا اسے ٹول ٹیکس دینا ضروری ہے۔''

''اچھا...... تو کیا ہمیں بھی دینا ہوگا؟''

''نہیں صرف موٹر گاڑیوں پر ٹیکس ہے۔'' کہتے ہوئے قیصر نے کار روک دی اور کھڑکی سے ہاتھ باہر کر کے رقم بڑھا دی۔

موول کچھ بولتی کہ قیصر نے جلدی سے کار کا ایکسیلیٹر دبا دیا۔

''ارے کراچی کہاں نظر آیا...... یہ تو کھلا میدان ہے؟'' موول نے کہا۔

''ابھی ہم کراچی کے حدود میں داخل ہوئے ہیں۔ شہر ابھی دور ہے۔''

''مجھے تو کراچی نظر آنے لگا ہے۔ دیکھ کتنی ساری گاڑیاں...... وہ دیکھ کتنے مکانات ہیں۔'' سانول نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

قیصر اب نوری آباد بھی پار کر چکا تھا۔ سہراب گوٹھ آنے والا تھا۔

''ارے ادھر دیکھ کتنی بڑے بڑے مکان ہیں...... کیسے اونچے اونچے۔'' موول چیخ کر خوشی سے سرشار لہجے میں بولی۔

''یہ کچھ بھی نہیں ہے...... ابھی تو اس سے بھی اونچی اونچی عمارتیں نظر آئیں گی۔'' قیصر بولا۔

''واقعی اب تو بلند نگوں کا جنگل نظر آنے لگا ہے...... اے سانول ادھر دیکھ کتنے لوگ اس والی گاڑی میں بھرے ہوئے ہیں۔'' اس نے ایک بس کی طرف اشارہ کیا۔ بسیں اور ٹیکسیاں۔ کاریں اور رکشے آس پاس سے فراٹے بھرتے گزر رہے تھے۔ وہ ایک ایک چیز کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ دنیا ایسی رنگ رنگیلی ہے یہ اسے اب معلوم ہوا تھا۔ وہ تو بس ایک احاطے کی قیدی تھی۔ اس احاطے کے باہر کیا ہے یہ اسے معلوم بھی نہیں تھا۔ بھاگتی دوڑتی دنیا کی پہلی جھلک اس نے رات دیکھی تھی اور اب سورج کی روپہلی روشنی میں دیکھ رہی تھی۔ یہ سب اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی محویت کو قیصر صاحب کی آواز نے توڑا۔

''یہ کیا ہے۔ دیکھتی رہو لوگ بس کی چھتوں پر بھی چڑھے ملیں گے۔'' قیصر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''سائیں آپ بتاؤ یہ اتنے لوگ کہاں جارہے ہیں۔'' ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہر بات جان لینا چاہتی ہے۔

''سب اپنے اپنے کام پر جارہے ہیں۔'' قیصر نے کہا اور کار کو بائیں جانب موڑ لیا اب وہ پل پر آچکا تھا۔ گھر بہت کم دوری پر رہ گیا تھا۔ وہ آدھی رات کو چلے تھے۔ نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ تھکن الگ تھی اس لیے وہ آرام کرنے کے خیال سے جلدی گھر پہنچنا چاہتے تھے۔ ان کی نظریں ونڈ اسکرین پر ٹکی ہوئی تھیں۔ موول کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہی تھی کہ چیخی:

''ارے ارے...... ہماری گاڑی ہوا میں اڑ رہی ہے...... وہ دیکھو نیچے کتنے لوگ آجا رہے ہیں۔''

سانول نے جلدی سے باہر کی جانب دیکھا پھر اس کی آواز میں آواز ملا کر بولا۔'' ہم اتنا اوپر کیسے پہنچ گئے۔ باقی ساری گاڑیاں تو نیچے چل رہی ہیں۔'' مگر برابر سے گزرتی گاڑی کو دیکھ کر سنبھل گیا اور بولا۔'' نہیں رے...... بات کچھ اور ہے۔''

''ہاں بات کچھ اور ہے...... اس وقت ہم پل پر ہیں۔ نیچے سے دوسری سڑک گزر رہی ہے۔ ہم شہر میں آچکے ہیں۔ اب میرا گھر بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ بس دیکھتے رہو۔ شہر کو اچھی طرح سے دیکھ بھی لو۔ اب تم لوگوں کو یہیں رہنا ہے نا۔'' قیصر صاحب نے دخل دیا۔

''سائیں کی بات صحیح ہے۔ اب تو ہم لوگ یہیں رہیں گے اس لیے شہر کو اچھی طرح سے دیکھنا ہوگا۔'' موول نے دانشمندانہ انداز میں سر کو ہلا کر کہا۔

''مگر وہ لوگ وہاں کیوں کھڑے ہیں...... اس دھوپ میں۔'' سانول نے کار سے باہر دیکھتے ہوئے قیصر صاحب سے پوچھا۔'' سائیں مزدوری بنے گی کیا؟''

UUNOVELS.COM

سانول کی بات پر قیصر نے چونک کر ادھر دیکھا پھر ہنستے ہوئے کہا: "ارے احمق وہ نادرا کا دفتر ہے۔ وہ لوگ اپنا شناختی کارڈ بنوانے کے لیے کھڑے ہیں۔"

"یہ شناختی کارڈ کیا ہوتا ہے جی؟" مومل نے پوچھا۔

"یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ جس کے پاس ہو اسے کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہر کام خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے۔"

"کیا وہ جادو کا کوئی منتر ہے؟" مومل کی آواز میں حیرت کا عنصر در آیا تھا۔ وہ پیچھے چھوٹ گئی بھیڑ کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"نہیں ---- وہ ہر پاکستانی کے لیے ضروری کارڈ ہے۔ ہر ایک کے پاس ہونا ضروری ہے۔ یہی پاکستانی کی پہچان ہے۔"

"لگتا ہے یہ لوگ پاکستانی نہیں ہیں اسی لیے لائین لگائے کھڑے ہیں..... اگر پاکستانی ہوتے تو ایسی ضروری چیز ان کے گھر پہنچ جاتی۔" مومل نے پھر کہا۔ اس کا معصوم جواب قیصر صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔

"بس اسی کا تو رونا ہے---- مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے ---- کاش پاکستانی کو اس کا حق گھر بیٹھے مل سکتا۔" قیصر صاحب کی آواز میں دکھ ہی دکھ تھا۔

"یہ کارڈ ہمیں بھی بنانا پڑے گا؟" سانول نے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"یقیناً اگر نہیں ہے تو بنوانا پڑے گا...... لیکن فکر نہ کرو---- میں بنوا دوں گا۔"

"لیکن میں بنا دوں تو کیوں؟"

"تمہارا نکاح ہوا ہے نا؟"

"جی ہاں ہو چکا ہے۔" سانول نے جلدی سے کہا۔ جواب دینے کے بعد بھی وہ اسی سوال پر غور کرتا رہا کہ سائیں نے یہ بات کیوں کی؟ کیا انہیں شک ہو گیا ہے؟

"مگر ہم کیسے مانیں کہ ہو گیا۔ اس کے لیے نکاح نامے کی ضرورت ہو گی جو یقیناً تمہارے پاس نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ گاؤں گوٹھ میں نکاح نامہ بنانے کا رواج نہیں ہے۔ حکومت اعلان پر اعلان کرتی ہے مگر کوئی سنتا ہی نہیں۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔ ہم نے بھی نہیں بنوایا ہے۔" سانول جلدی سے بولا۔

"مگر شہر میں رہنے کے لیے نکاح نامہ بنوانا پڑے گا اور نکاح نامہ بنوانے کے لیے شناختی کارڈ ضروری ہے..... لیکن تم فکر نہ کرو میں سب بنوا دوں گا۔"

"کیسے؟"

"تم دونوں میاں بیوی ہو نا؟ ایک بار نکاح ہو چکا ہے اگر دوبارہ پڑھا دیا جائے تو کوئی نقصان نہیں..... کسی مولوی کو بلا کر تمہارا نکاح دوبارہ رجسٹرڈ کرا دوں گا اور پھر تمہیں نادرا کا نکاح نامہ مل جائے گا۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" سانول نے ممنون لہجے میں کہا۔

قیصر نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ دونوں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سب کچھ بھول گئے ہوں۔ انہیں یہ بھی یاد نہ تھا کہ وہ فراری ہیں۔ ان کے تعاقب میں دھڑیل ہوں گے۔ وڈیرا ہو گا۔ اس وقت انہیں اور کوئی خیال نہ تھا۔ وہ زندگی کو بوند بوند پینے، اس کا مزہ اٹھانے میں مشغول تھے۔ جن کو ہمہ وقت پلاؤ ملے انہیں اس کی قدر معلوم نہیں ہوتی مگر سوکھی روٹی والے کو مرغن کی قیمت پتا ہے۔ کراچی والوں کے لیے جو منظر عام سا ہے وہ انہیں بہت خاص لگ رہا تھا۔ وہ ایک ایک منظر کو بغور دیکھ رہے تھے۔ مزہ لے رہے تھے۔ گاڑی اس سڑک سے اس سڑک پر چلتی رہی۔ بھاگتی رہی۔ پھر ایک گلی میں پہنچ کر رک گئی۔ سامنے ایک اونچی سی بلڈنگ تھی۔

"یہ ہے میرا غریب خانہ!" قیصر نے بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا۔ سانول اور مومل نے ایک ساتھ اس بلڈنگ کا جائزہ لیا۔ اتنی اونچی بلڈنگ...... وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ لگانے پر مجبور ہو گیا تھا اور پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"ایسا ہوتا ہے غریب خانہ؟" سانول کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

"ارے بھلے ایسا ہی کہتے ہیں۔ اسے کسر نفسی سمجھ لو۔ خود کو چھوٹا بنا کر بولنا چاہیے اس لیے کہ افضل ذات بس خدا کی ہے...... خیر، اندر چلو۔" وہ انہیں ساتھ لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ "اسے فلیٹ کہتے ہیں۔ یہاں کراچی میں تمہارے گوٹھ کی طرح بڑے بڑے احاطے والے مکانات نہیں ملیں گے۔ ویسے میرا ایک بنگلا بھی ہے۔ یہاں سے کافی دور..... ڈیفنس میں مگر میں خود یہاں رہتا ہوں۔"

"جی جی۔" سانول نے ایسے کہا جیسے قیصر کی بات سمجھ رہا ہو جب کہ تمام باتیں اس کے سر پر سے گزر رہی تھیں مگر وہ خود کو مومل کے سامنے عقل مند ثابت کر رہا تھا۔

تینوں آگے پیچھے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اوپر پہنچے اور پھر ایک دروازے کے سامنے قیصر صاحب رک گئے۔

"یہ ہے میرا فلیٹ۔یعنی گھر۔"

"یہ آپ کا گھر ہے؟ اتنا اوپر گھر بنایا.....نیچے کیوں نہیں بنایا؟" موتی کو کچھ زیادہ ہی بولنے کی سوجھ رہی تھی۔وہ سوال کر بیٹھی۔

"یہاں ایک ایک گھر کے کئی کئی حصے ہوتے ہیں۔ نیچے دوسرے لوگ رہتے ہیں۔اوپر دوسرے لوگ۔میرے حصے میں یہ والا پورشن آیا ہے۔"

قیصر صاحب کی ساری باتیں موتی کے سر پر سے گزر گئی تھیں لیکن وہ ایسے سر ہلا رہی تھی جیسے سب کچھ سمجھ گئی ہو۔

قیصر صاحب نے تالے میں چابی گھمائی اور دروازہ کھل گیا۔وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔"بچے امریکا میں سیٹل ہوگئے.....بیوی اللہ کو پیاری ہوگئی.....اب ہم ہیں اور یہ خالی فلیٹ۔"

"اللہ کو پیاری کیسے ہوئی؟" موتی پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"وہ اتنی ہی عمر لکھا کر آئی تھی۔" قیصر صاحب نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"عمر لکھی کس نے؟ عمر تو لکھی نہیں جاتی؟"

"ہاہا۔" قیصر صاحب نے قہقہہ لگایا۔"ارے بے وقوف.....میں قسمت کی بات کررہا تھا۔اس کی قسمت میں اتنی ہی عمر تھی۔" قیصر صاحب بولے۔

"او اچھا.....قسمت.....آپ کی بیوی کی قسمت خراب ہے مگر آپ نے تو کہا وہ اللہ کو پیاری ہے۔"

"اللہ کو پیاری ہونے کا مطلب وہ انتقال کر گئی.....مرگئی۔"

"او اچھا مرگئی.....تو ایسے بولے نا۔" کہتے ہوئے وہ سانول کا ہاتھ تھامے قیصر صاحب کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوئی۔

اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ایک ہال نما کمرا۔ کمرے میں بڑا سا صوفہ سیٹ۔ایک طرف ٹی وی دوسری طرف شیشے کی الماری جس میں کتابیں ہی کتابیں۔وہ حیرت بھری نظروں سے سجاوٹ دیکھ رہی تھی۔

"اتنا بڑا گھر.....آپ اکیلے رہتے ہیں!؟"

"ہاں۔بالکل اکیلا۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"یہاں اتنے لوگ آجا رہے ہیں پھر بھی آپ اکیلے ہیں؟" موتی کے لہجے میں تعجب تھا۔

"یہی تو المیہ ہے.....ہم بھیڑ میں بھی تنہا ہیں..... اب تم لوگ بھی یہیں رہو گے۔" انہوں نے چابی سے ایک اور دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

اس وقت سانول کا چہرہ تو سپاٹ تھا لیکن موتی کے چہرے پر حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت تھی۔اس نے آگے بڑھتے ہوئے سرگوشی میں سانول سے کہا۔"ہائے اللہ یہ گھر ہے یا عجائب خانہ؟"

"یہ عجائب خانہ کیا ہوتا ہے؟" سانول نے بھی سرگوشی میں پوچھا۔

"مجھے کیا پتا۔قیصر صاحب راستے میں بولے تھے کہ ان کے دوست کا گھر عجائب خانہ ہے جہاں اتنا سامان بھرا ہے کہ مت پوچھو۔"

اچھا اچھا.....ایسے بول نا کہ جہاں زیادہ سامان ہو اس کو عجائب خانہ کہتے ہیں۔"

"ہاں نہیں تو کیا.....اتنا سامان کوئی گھر میں رکھتا ہے۔ادھر دیکھو ایک ٹیبل کے ساتھ کتنی کرسیاں بچھی ہیں۔" اس نے اشارے سے ڈائننگ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں.....تیرے سائیں کے پاس بھی اتنا کچھ نہیں ہوگا۔" اس بے چارے نے سائیں کے اوطاق سے آگے دیکھا ہی نہیں تھا اسی لیے جلدی سے بولا۔اسی وقت قیصر صاحب مڑ کر بولے:

"اس والے کمرے میں تم دونوں ٹھہرو گے۔اس کمرے میں سب کچھ ہے۔فریش ہو جاؤ۔" انہوں نے اشارے سے سامنے والا کمرا دکھایا۔

وہ دونوں جھجکتے ہوئے اس کمرے میں داخل ہو گئے۔کمرا مکمل کارپیٹنگ تھا۔ایک طرف ڈبل بیڈ تھا تو دوسری طرف ایک بڑی سی ٹرپل ڈور الماری جس کے ایک پلڑے میں قد آدم شیشہ لگا ہوا تھا۔موتی نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پوٹلی کو بیڈ پر پھینکا اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔"اتنا بڑا آئینہ.....اس میں تو میں سر سے پاؤں تک نظر آرہی ہوں۔" وہ کھلی پڑ رہی تھی۔

"ارے زیادہ نہ دیکھ.....خود کو زیادہ دیکھے گی تو نظر لگ جائے گی۔" وہ ہنستے ہوئے اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔اتنا قریب کہ اس کی سانسیں اسے اپنی گردن پر محسوس ہوئیں۔جسم صرف گوشت کا مجموعہ نہیں کچھ طلب بھی رکھتا ہے۔وہ گھبرا کر آگے کی جانب کھسک گئی۔

"ئے.....مجھ پر آپڑے گا کیا؟" وہ غصیلی آواز میں بولی۔

"ارے غصہ نہ کر۔ایسے بھی اب تو میری بیوی ہے۔"

"کوئی نہیں.....ابھی نکاح کہاں ہوا ہے.....پہلے

UUNOVELS.COM

نکاح ہو لینے دے۔'' مومل اٹھلا کر بولی۔

''یہ کون سا مشکل ہے۔ سنا نہیں تھا' سائیں قیصر کیا بولے تھے۔ وہ مولوی بلا کر ہمارا نکاح پڑھوائیں گے۔''

''پہلے نکاح تو ہو لینے دو۔'' کہتے ہوئے وہ بستر پر گر سی گئی مگر فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔

اسے جھٹکے سے کھڑا ہوتے دیکھ کر وہ بولا۔'' ارے کیا ہوا؟''

''دیکھ دیکھ...... یہ بستر کتنا نرم ہے۔'' وہ بستر پر ہاتھ مار کر بولی۔

سانول نے بستر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔'' ہاں یہ بات تو ہے...... کیسا نرم نرم بالکل ملائی جیسا بستر ہے...... سائیں قیصر ہمیں بھی بڑے سائیں جیسا بنا کر چھوڑیں گے۔''

''ہم نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔'' مومل بولی۔ اس کا چہرہ کھلا پڑ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خوابوں کی دنیا میں آ گئی ہو۔ اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ قیصر صاحب دروازے پر کھڑے تھے۔

☆......☆

گاڑی طوفانی رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ سائیں بیٹھے ہوئے بھاگتی گاڑی سے باہر کی سمت دیکھ رہے تھے۔ اس وقت بھی ان کے دماغ میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ان کے سامنے کسی نے پلیٹ سجا کر رکھی تھی کہ کسی نے اس پلیٹ سے بوٹیاں اچک لی ہوں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ پہلی بار کوئی ان کے یہاں سے فرار ہونے کے بعد اتنی دور آیا ہو۔ ماضی میں ایک دو واقعات ہوئے ضرور تھے مگر فرار ہونے والے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پکڑ لیے گئے تھے۔ مگر یہ دونوں تو ایسا غائب ہوئے تھے کہ رات بھی گزر گئی تھی۔ انہیں پکڑنا ضروری تھا ورنہ دوسرے لوگ بھی اسی راہ پر چل نکلیں گے اور ان کا بہشتی کارخانہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ مومل کو تو اپنے بستر کی زینت بنائیں گے مگر سانول کو...... اسے تو کتوں سے اس وقت تک نچوائیں گے جب تک وہ مر نہیں جاتا۔ اسے ہر حال میں ڈھونڈنا ہوگا۔ اس کے لیے معافی حرفِ غلط ہو چکی ہے۔ کسی بھی حال میں چھوڑا نہیں جائے گا۔ مگر وہ ملے تو سہی...... ابھی وہ یہی سوچ رہے تھے کہ پیچھے ہزاری کے ساتھ بیٹھا ایس آئی بولا۔'' سائیں...... آگے ایک ہوٹل ہے۔ وہاں ہمیں اتار دیں گے۔''

''تم لوگ کتنا کھاتے ہو۔ ابھی تو پچھلے ہوٹل پر رکے تھے۔'' سائیں نے غرا کر کہا۔

''سائیں ہم کھانے کے لیے نہیں رکنا چاہتے۔''

''پھر کس لیے رکو گے؟''

''سائیں ہمارے تھانے کا ایریا تو بہت پیچھے رہ گیا ہے اب تو ہم ضلع کے حدود سے بھی باہر آ چکے ہیں۔ آگے ہم کچھ کر بھی نہیں سکیں گے اس لیے آگے جانے سے فائدہ؟ وہاں ہمیں اتار دیں گے تو واپسی کے لیے کوئی نہ کوئی گاڑی مل جائے گی۔''

''ٹھیک ہے...... اتار دوں گا۔''

''سائیں آگے کراچی ہے۔ وہاں میرا ایک دوست پوسٹیڈ ہے۔ میں آپ کو اس کا نمبر دے دیتا ہوں۔ وہ آپ کی مدد کر دے گا۔''

''تو کیا سمجھتا ہے کراچی میں میرے جاننے والے نہیں ہیں؟ تو جانا چاہتا ہے چلا جا۔ میں کراچی پہنچ کر انہیں ڈھونڈوں گا۔'' پھر وہ ڈرائیور سے بولا۔'' اب جو ہوٹل آئے وہاں ان کو اتار دینا۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ روپے نکالے اور ایس آئی کے ہاتھ پر رکھ کر بولا۔'' یہ لے کرایہ میں کام آئیں گے۔''

☆......☆

قیصر صاحب دروازے پر کھڑے ان لوگوں کا جائزہ لیتے رہے پھر بولے۔'' تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کراچی غریب پرور شہر ہے۔ محنت کرنے والوں کو آگے بڑھنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ بس ایک دو دن کی بات ہے۔ میں تمہیں نوکری دلوا دوں گا۔''

''جی۔'' سانول مشکور انداز میں بولا۔

''نوکری اچھی والی ...... اتنی بڑی دلوانا۔'' کہتے ہوئے مومل نے ہاتھ پھیلا دیا۔

''اچھا بھئی اچھا ...... بڑی والی دلواؤں گا۔ اسی کمرے میں اٹیچڈ باتھ روم ہے۔ اس دروازے کے پیچھے نہا دھو کر تیار ہو جاؤ میں کھانے کے لیے کچھ لے آتا ہوں۔'' کہہ کر وہ مڑ گئے۔

ان کے جاتے ہی مومل بولی۔'' یہ کتنا بڑا کمرا ہے رے اور......'' اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔'' یہ پلنگ ہے یا جھولا...... تو بھی بیٹھ ناں......''

مومل نے ایسا کچھ غلط نہیں کہا تھا لیکن سانول کی پیشانی پر بل آ گئے۔ وہ غراتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے باتھ روم کی طرف اشارہ کر کے بولا۔'' یہ سب بعد میں دیکھیں

UUNOVELS.COM

گے...... پہلے جا کر نہا لے۔''

''نہیں ہم تو ابھی اور جھولیں گے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی اور بیٹھی بیٹھی اچھلنے لگی۔ ایسا لگتا تھا اس کے اندر کی معصوم بچی اب تک بیدار تھی۔ شاید اس لیے کہ ابھی اسے تہذیب کی ہوا نہیں لگی تھی۔ نئی تہذیب جب احساسات کو چھو لیتی ہے تو بہت کچھ بدل دیتی ہے۔ شہر کی مسموم ہوا میں صرف مفاد پرستی باقی رہ جاتی ہے۔ اس کی خوشی کو سانول سبوتاژ کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے چمکارتے ہوئے بولا۔ ''راستے بھر کی تھکن ہے...... نہا لے گی تو اتر جائے گی۔ سائیں والے کپڑے ہیں نا۔''

''ہاں ہیں۔''

''تو جا...... جا کر نہا لے۔''

''اچھا تو کہتا ہے تو نہا لیتی ہوں۔'' کہتے ہوئے وہ بادلِ نخواستہ اٹھی اور باتھ روم کی طرف چل پڑی۔ دروازے پر پہنچ کر بولی۔ ''جب میں کہوں تو قیصر سائیں کی بیوی والے کپڑے دے دیجیو مگر دیکھ منہ ادھر۔ اس والے دروازے کی طرف رکھیو۔'' پھر وہ باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ اندر جاتے ہی اس نے آواز دی۔ ''سانول اے سانول...... یہاں آ رے۔''

سانول نہ چاہتے ہوئے بھی اندر چلا گیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بولی۔ ''کیسا کھوب صورت ہے یہ کمرا...... یہاں نہایا کیسے جائے؟''

''سائیں جب بولے ہیں تو اسی میں نہانا ہے۔'' سانول کے لہجے میں حکم کا عنصر تھا۔

''مگر یہ تو گندا ہو جائے گا۔'' مول کا لہجہ افسردہ تھا وہ ٹائلز لگے چکنے فرش پر پیر رگڑتے ہوئے بولی۔ ''ایسے کھوب صورت فرش پر مجھ سے نہایا نہیں جائے گا۔''

''ہمیں کیا...... جو کہا گیا وہی کرو۔ جب سائیں نے اس کمرے میں نہانے کو کہا ہے تو سب اسی میں نہاتے ہوں گے۔'' سانول نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''مگر یہ کیا ہے؟'' مول نے باتھ ٹب کو دکھایا۔ اس کے اشارے پر سانول کی نظریں گھومتی ہوئی اس طرف پہنچیں۔

''یہ...... لگتا ہے یہ کشتی ہے۔ تیرے بابا نے ایک فوٹو دکھایا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ ندی میں چلتی ہے۔ لگتا ہے جب نہانے کا زیادہ مزہ لینا ہوتا ہوگا تو اس کمرے میں پانی بھر کر اس کشتی میں بیٹھ جاتے ہوں گے۔''

''اور یہ کیا ہے؟'' مول نے کموڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''ارے بے وقوف یہ کرسی ہے...... اس پر بیٹھ کر پانی بھرنے کا انتظار کرتے ہیں۔'' سانول نے کہا اور آگے بڑھا تھا کہ چکنے فرش پر پیر پھسل گیا۔ اس نے سہارے کے لیے دیوار میں لگے نوب کو پکڑا۔ نوب گھوم گیا اور شاور سے پانی گرنے لگا تو مول چلائی۔ ''ارے ارے...... چھت میں سوراخ ہو گیا۔ بارش کا پورا پانی گر رہا ہے۔''

سانول نے اوپر دیکھا پھر کہا۔ ''ارے بے وقوف یہ اس نل سے نکل رہا ہے۔ بڑے لوگ ہیں...... بارش میں باہر نکلتے ہوئے شرم آتی ہوگی گھر میں بارش کرا لیتے ہیں...... تو بارش میں نہا میں باہر بیٹھا ہوں۔''

سانول باہر نکل گیا۔ وہ خود بھی چکرا رہا تھا کہ یہاں اس ایک چھوٹے سے گھر میں کیا کیا جمع کر لیا گیا ہے۔ ایسی خوبصورت خوبصورت چیزوں کو استعمال کیسے کیا جائے۔ وہ کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ باہر والا دروازہ کھلا۔ قیصر صاحب اندر آئے اور وہیں سے آواز لگائی۔ ''سانول...... مول کہاں ہو آ جاؤ...... سموسے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔''

آواز سنتے ہی مول شکن آلود کپڑوں میں بھیگے بالوں کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ اسے اس طرح آتے دیکھ کر قیصر صاحب بولے۔ ''ارے یہ کیا...... وہاں تولیا تو رکھا تھا۔ پہلے جسم خشک تو کر لیتیں۔''

''تولیا...... کیسا تولیا؟'' مول نے سوال کیا۔

قیصر صاحب بھاگ کر باتھ روم میں گئے اور تولیا اٹھا لائے۔ پھر اسے دکھاتے ہوئے بولے۔ ''یہ والا تولیا۔ نہا کر اس سے بدن پونچھتے ہیں۔ اپنے سر کو اس سے خشک کر دو ورنہ ٹھنڈ لگ جائے گی۔''

مول نے وہیں کھڑے کھڑے تولیا سے بھیگے بالوں کو پونچھنا شروع کر دیا تبھی اس کی نظر ڈائننگ ٹیبل پر رکھے سموسوں پر پڑی۔

''ارے واہ...... یہ تو میں نے ایک بار دھڑیل کے پاس دیکھے تھے۔'' کہتے ہوئے مول نے سموسوں کی پلیٹ اٹھا لی اور زمین پر بیٹھ گئی۔

''ارے ارے یہ کیا...... زمین پہ کیوں بیٹھ گئیں، اوپر آؤ...... یہاں کرسی پر بیٹھو۔'' قیصر صاحب نے ہنستے ہوئے ٹوکا۔ ان کے اشارے پر مول کو اٹھنا پڑا۔ وہ طوعاً کرہاً کرسی پر جا بیٹھی مگر انتہائی بھونڈے انداز میں۔ وہ پالتی مار کر کرسی پر بیٹھی تھی۔ سانول کھڑا تھا۔

''ارے تم بھی بیٹھو...... کھاؤ۔'' قیصر صاحب نے

UUNOVELS.COM

اسے بھی بیٹھنے کو کہا تو وہ سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا۔

"ارے ایسے نہیں..... لوگ کیا کہیں گے..... کرسی پر ایسے بیٹھا جاتا ہے جیسے میں بیٹھا ہوں۔" قیصر صاحب تنبیہی انداز میں بولے۔ مومل نے قیصر صاحب کی طرف غور سے دیکھا پھر وہ بھی پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔

"تم لوگ میاں بیوی ہو مگر شہر میں نکاح نامہ مانگا جائے گا۔ میں کل ہی اپنے ایک دوست سے بات کرتا ہوں۔ وہ انتظام کر دے گا..... تمہارا شناختی کارڈ تو ہے نا۔"

"سائیں شناختی کارڈ کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ پھر وہاں ہمیں بنوا کر دیتا کون..... وہاں کے لوگ تو شناختی کارڈ کا نام بھی نہیں جانتے ہیں..... میں نے تو اس کے بارے میں مومل کے ابا سے سنا تھا کہ یہ بہت ضروری کارڈ ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ بہت ضروری چیز ہے۔ اس کے بغیر ہزاروں کام ہو نہیں پائیں گے۔ شہر میں قدم قدم پر اس کی ضرورت پڑتی ہے..... خیر فکر نہ کرو..... میں بنوا دوں گا۔"

وہ لوگ باتوں میں مصروف تھے اور مومل ہر طرف سے بے پرواہ جلدی جلدی کھانے میں مصروف تھی۔

"مومل میں نے چائے گرم کرنے کے لیے چولہے پر چڑھا دی تھی..... جاؤ کپ میں لے آؤ۔"

"ابھی لائی۔" کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔ وہ ہاتھ اپنے لباس سے صاف کرتی ہوئی کچن میں داخل ہو گئی۔ اندر جاتے ہی اس کی نظر ایک بوتل پر پڑی۔ وہ بوتل کی طرف ہاتھ بڑھا کر زیر لب بولی۔ "یہ ہوئی نا بات..... رمضان میں بڑے سائیں لال شربت بھجواتے ہیں۔ اماں بہت کم دیتی تھی..... اب میں یہ روز پیوں گی..... خوب پیوں گی۔" کہتے ہوئے اس نے بوتل کا ڈھکن کھولا اور ایک گھونٹ لے لیا۔ جیسے ہی پہلا گھونٹ حلق کے پار اترا وہ چیخ پڑی۔ اس کی چیخ اتنی بلند تھی کہ قیصر اور سانول دوڑتے ہوئے کچن میں داخل ہوئے۔

"کیا ہوا؟ قیصر صاحب نے پوچھا۔

مومل نے سسکاری لے کر کہا۔ "ہائے ہائے..... میں مر گئی۔"

"ہوا کیا بولے گی بھی؟" سانول نے پوچھا۔

"ہائے ہائے" وہ ایسے سر کو ہلانے لگی جیسے سخت اذیت میں ہو۔ "اس بوتل میں ہائے..... یہ کیسا شربت تھا ہائے ہائے۔"

"کون سی بوتل..... کیسی بوتل.....؟" سانول نے پوچھا۔

مومل نے انگلی کے اشارے سے دکھایا۔ "وہ رہی شربت بھری بوتل۔"

قیصر نے سوس کی بوتل کو اٹھا کر کہا۔ "اس میں تو سوس ہے۔ چلی سوس..... اسے پی لیا کیا؟"

مومل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ارے بے وقوف..... اسے پیتے تھوڑی ہیں۔ کھانے کا مزہ بڑھانے کے لیے ذرا سا شامل کرتے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولے۔ پھر شہد کی بوتل اٹھا کر اسے دیا۔ "اسے تھوڑا سا پی لو..... آرام آ جائے گا۔"

قیصر صاحب کے باہر نکلتے ہی سانول نے غراتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا بے وقوفی تھی۔ بغیر پوچھے شربت پینے لگی۔ یہ تو ایک قسم کی چوری ہے۔"

"چوری کیسی؟ سائیں نے کہا ہے کہ اب یہ گھر تم لوگوں کا ہے۔ یہاں کی ہر چیز استعمال کر سکتی ہو..... دل آ گیا اس لیے پی لیا۔"

"دل آ گیا تو پی لیا۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "اور اللہ نے کیسی سزا دے دی۔ اب کوئی چیز بغیر اجازت مت کھانا۔"

"اچھا اچھا اب زیادہ رعب نہ دکھاؤ۔ جاؤ دیکھو سائیں سے باتیں کرو۔ وہ کیا کرنے کو کہتے ہیں کہیں نہ کہیں تو وہ چاکری لگوا ہی دیں گے۔"

سانول ابھی اس سے باتیں کرنے کے موڈ میں تھا مگر اسے جھکنا پڑا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بڑے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

☆......☆

بڑے سائیں کو کراچی آئے آج تیسرا دن تھا۔ پہلا دن تو ایسے گزرا تھا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ سائیں کا مومل سانول کو ڈھونڈتے اور بیزاری، ڈرائیور کا کراچی دیکھتے گزرا تھا۔ ٹھہرنے کے لیے سائیں کے پاس بہت جگہ تھی۔ بہت سے واقف کار تھے مگر وہ ان لوگوں سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ ان سے ملتا تو اس کی کمزوری سامنے آتی۔ بپتا سننے والے کہتے کہ اب تیری یہ اوقات ہو گئی ہے کہ ایک معمولی سا لڑکا تیرے سامنے سے تیری پسند اڑا لے گیا اور تُو کچھ نہ کر سکا اسی لیے وہ اپنے طور پر انہیں تلاش کر رہا تھا۔ اپنے طور پر تلاش کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی آمد کی خبر سب سے چھپا کر رکھتا اور اس نے وہی کیا تھا، ایک ہوٹل میں ٹھہرا

UUNOVELS.COM

تھا...... اس کے ساتھ ہزاری اور ڈرائیور بھی تھے۔ جو اس کی مصاحبی کم اور اپنی دلبستگی کا خیال زیادہ رکھ رہے تھے۔ نیچے ڈائننگ روم میں اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے ملتے تھے۔ وہ دونوں ہر تھوڑی دیر بعد نیچے جاتے اور پسند کی ڈش منگوا کر آدھا کھاتے اور آدھا چھوڑ کر اٹھ جاتے کیونکہ پیٹ غریب کا تھا۔ مٹھی بھر چاول سے بھر جاتا تھا مگر نیت بھی غریب کی تھی جو کبھی نہیں بھرتی اس لیے وہ خوب کھل کھیل رہے تھے۔ سائیں کی مکمل حمایت حاصل تھی اس لیے وہ مطمئن تھے۔

سائیں کو صرف ایک چیز کی فکر تھی کہ کسی بھی طرح سانول مل جائے اور وہ اسی لیے انہیں کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ بس صبح اٹھتا اور انہیں لے کر نکل جاتا تھا۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکتا پھر واپس آجاتا۔ پھر ذہن پر دباؤ بڑھتا اور وہ دوبارہ نکل پڑتا۔ یہ پروگرام شام تک چلتا۔ تواتر سے چلتا۔ اس نے چھوٹے موٹے جتنے بھی مسافر خانے اور ہوٹل تھے سب میں دیکھ لیا تھا مگر ان کا سراغ نہیں ملا تھا۔ وہ دونوں کہاں جا سکتے ہیں اس وقت بھی وہ اسی پر غور کر رہا تھا۔

''سائیں ایک بات بولوں؟'' ہزاری نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر کہا۔

'ہوں۔'' سائیں نے ہنکارا بھرا۔

''یہ شہر تو بہت بڑا ہے۔ اتنے بڑے شہر میں ہم انہیں کیسے ڈھونڈیں گے۔ ایسا کرتے ہیں۔ ان دونوں پر لعنت بھیج کر واپس چلتے ہیں۔''

''نہیں...... ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ میرے مجرم ہیں۔ انہیں سزا دینا ہی دینا ہے۔ اگر وہ قبر میں سو گئے ہوں تو بھی ہم انہیں ڈھونڈیں گے۔'' وہ رک کر کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ''تو نے بھی موُل کی کوئی تصویر کھنچوائی تھی؟''

''نہیں سائیں کبھی نہیں...... کیمرا کہاں سے لاتا۔'' ہزاری نے دونوں ہاتھ جوڑ کر خاندانی مسکین کی طرح جواب دیا۔

''چل اٹھ...... ایسا کرتے ہیں کسی مصور کے پاس چلتے ہیں۔ اس سے ایک تصویر بنواتے ہیں۔ تو اسے خدوخال بتاتا جائے گا۔ وہ تصویر بنا دے گا پھر ہم اس تصویر کو پولیس والوں کو دکھائیں گے۔ بالا بالا اس کا پتا لگانے کی بات کریں گے۔ اس تصویر کے بارے میں خبر دینے والے کو معقول انعام دیں گے۔'' سائیں نے اپنا پلان بتایا۔

اس بات نے ہزاری کو دہلا دیا۔ وہ کسی بھی حال میں پولیس کی مدد سے گھبرا رہا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اگر بات پولیس تک پہنچی تو وہ ان دونوں کو ڈھونڈ نکالے گی...... اور پھر وہ دونوں دوبارہ سے اسی جہنم میں دھکیل دیئے جائیں گے۔

''سائیں آپ مالک ہو جیسا چاہو کرو لیکن میرا ایک مشورہ ہے۔'' ہزاری ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''بولو!'' سائیں نے کہا۔

''ہم تصویر ضرور بنوائیں گے مگر اسے پولیس کے پاس لے کر نہیں جائیں گے۔ یہاں کے پولیس والے آپ سے تعاون نہیں بھی کر سکتے ہیں۔ اگر انہوں نے یہ کام آفیشلی کیا تو؟ تو پھر ہم سب پکڑ میں آ جائیں گے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے...... تیرے دماغ کا جواب نہیں...... اگر یہ خبر اخبار والوں تک پہنچ گئی تو وہ پھر ہمارے کارخانے کے بارے میں پتا لگانا شروع کر دیں گے۔ تو ٹھیک کہتا ہے۔'' سائیں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ''ایسا کرتے ہیں۔ تصویر تو بنواتے ہیں مگر وہ تصویر اپنے لیے بنوائیں گے۔ اسے دکھا کر لوگوں سے معلوم کریں گے...... ایک بار کراچی آیا تھا تو طارق روڈ پر کچھ آرٹسٹوں کو دیکھا تھا جو پیسے لے کر لوگوں کی تصویر بنا رہے تھے۔ چل ان کے پاس چلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ہزاری اور ڈرائیور بھی باہر نکلنے کے لیے آگے بڑھ گئے۔

☆......☆

سائیں اور ہزاری طارق روڈ کی چورنگی پر کھڑے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور ایک کھلی جگہ دیکھ کر گاڑی کو پارک کر آیا تھا۔ اب وہ بھی انہی کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''سائیں آپ کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ سانول کیا یہیں کہیں چھپا ہے؟''

''اِدھر کہیں ایک دکان ہے جس میں آرٹسٹ بیٹھتے ہیں'' کہہ کر اس نے چلنا شروع کر دیا۔ کئی گلیاں، موڑ مڑنے کے بعد کافی دور جا کر سائیں بولا۔ ''ارے یہ رہا۔'' اور اس دکان میں داخل ہو گیا۔ سامنے ہی کئی آرٹسٹ بیٹھے تھے۔ وہ ان کے سامنے پہنچ کر بولا۔ ''تم میں سے کون میرے کہنے کے مطابق چہرہ بنا سکتے ہو۔''

''ہم سب بنا سکتے ہیں لیکن پیسے کتنے ملیں گے؟'' ایک نے جواباً کہا۔

''کام ہماری مرضی کا اور پیسے تمہاری مرضی کے۔'' سائیں نے فراخ دلی سے جواب دیا۔

''بس آپ بے فکر ہو جائیں۔ آپ صرف بتاتے جائیں۔ ہم بنا دیتے ہیں۔''

آرٹسٹوں نے کینوس پر لکیر پر لکیر کھینچنا شروع کر دیا۔

UUNOVELS.COM

دسیوں لڑکیوں کے اسکیچ بنا چکے تھے مگر اب تک سائیں نے او کے نہیں کیا تھا۔ دوپہر کب کی ڈھل چکی تھی۔ پچاس سے زائد بار چائے کی پیالیاں سب نے خالی کر دی تھیں مگر سائیں کو مطمئن نہیں کر پائے تھے۔ اس لیے اب انہیں بھی اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ مگر سائیں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ سائیں کے پاس پیسے تھے اور آرٹسٹ کو کرارے نوٹوں کی ضرورت تھی اس لیے وہ کچھ بول نہیں رہے تھے۔ اگر سائیں ان کے کھانے وغیرہ کا بل نہ دے چکا ہوتا تو وہ اسے بھگا چکے ہوتے۔ اب وہ بے دلی سے کام کر رہے تھے۔ ہزاری جیسے کہتا وہ اسی قسم کی آنکھیں بناتے۔ جیسا کان کہتا وہ اسی انداز کی لکیر کھینچتے پھر اسے جال بنا کر ابھارتے جب ناک یا آنکھ بن کر تیار ہو جاتی تو کبھی ہزاری اور کبھی سائیں انکار کر دیتے کہ یہ مل نہیں رہی ہے۔ اس کوشش میں کئی شیٹ برباد ہو چکی تھیں۔

''سائیں آپ پہلے سوچ لو کہ اس لڑکی کی ناک کیسی تھی پھر ہم سے بولو اس میں وقت کم لگے گا۔'' بالآخر ایک آرٹسٹ نے کہا۔

''بس ناک کو ہلکا سا پتلا کرو اور آنکھوں کو ابھارو۔ یہ بہت حد تک مل رہی ہے۔'' سائیں نے کہا۔

''سائیں رات آٹھ بجے اسٹوڈیو بند ہو جاتا ہے۔'' ایک دوسرے آرٹسٹ نے تاویل پیش کی۔

''تو کیا ہوا۔ آج کی مزدوری آج دے دوں گا۔ کل پھر کوشش کریں گے۔'' سائیں نے مسکرا کر جواب دیا۔

☆......☆

ڈرائنگ روم میں قیصر صاحب، سانول اور سول بیٹھے تھے۔ شام کا ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سول اور سانول دونوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ قیصر صاحب کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سخت غصے میں ہوں۔ ''دیکھو میاں...... کراچی میں اگر رہنا ہے تو یہ شرافت کا دامن ڈھیلا کرنا پڑے گا۔ یہاں آنکھیں کھلی اور دماغ حاضر رکھنا پڑتا ہے۔''

''سائیں آپ فکر ہی نہ کرو...... میں اسے سمجھا دوں گی۔ اب یہ دماغ کھلا رکھے گا۔'' سول نے اتنے بھولپن سے کہا کہ قیصر صاحب نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرانے لگے۔ انہوں نے آواز میں نرمی پیدا کر کے کہا۔ ''میں نے محمد بخش کو بلایا ہے۔ وہ آ کر تمہیں سمجھائے گا کہ کرنا کیا ہے۔'' انہیں ان دونوں کی معصومیت نے گرویدہ کر لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ دونوں ان کے گھر سے جائیں اس لیے کہ ان کی معصومیت کا کوئی بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ ان کی زندگی تباہ ہو سکتی تھی، اسی لیے انہوں نے سوچا تھا کہ ان دونوں کو اپنی نگرانی میں رکھ کر ان کی مدد کرتے رہیں گے تاکہ وہ لوگ کراچی جیسے بڑے شہر میں رچ بس جائیں۔ ابتدا کے ہی کچھ دن ایسے تھے جو ان پر بھاری تھے۔ کچھ دن گزار لیں گے تو وہ عادی ہو جائیں گے اور ان میں کچھ چالاکی آ جائے گی پھر وہ آرام سے رہ سکیں گے۔ ان کے دوستوں کی یہاں کمی نہ تھی مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان دونوں کو کوئی بھی بے وقوف بنا کر اپنا کام نکال سکتا ہے اسی لیے کسی ایسے شخص ہی کے پاس وہ انہیں بھیجنا چاہتے تھے جو ان کی ذمے داری اٹھا سکے۔ کافی سوچنے کے بعد محمد سراج کا نام ذہن میں آیا تھا اور اسی لیے انہوں نے اسے بلایا تھا۔ اس کی کریانہ کی دکان تھی۔ کریانہ کی دکان میں عقل کی اتنی ضرورت نہیں پڑتی اور وہاں آنے والے بھانت بھانت کے لوگ ہوتے ہیں ان کی وجہ سے اس کی عقل بھی تیز ہو جائے گی۔

''محمد سراج کی دکان پر تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ وہاں کام بھی کوئی زیادہ نہیں ہے اس لیے جلد کام سیکھ جاؤ گے۔''

''جی میں سیکھ لوں گا۔'' سانول نے جھکے سر کے ساتھ جواب دیا۔

''یہاں رہنا ہے تو بس اپنے کام سے کام رکھنا۔''

''جی اچھا۔'' سانول نے بسعادت مندی سے جواب دیا۔ اسی وقت کال بیل بجی۔ بیل کی آواز کے ساتھ تینوں کی نظریں دروازے کی جانب گھوم گئیں۔ قیصر صاحب نے سانول کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ دیکھو کون آیا ہے۔ اسے عزت کے ساتھ اندر لا کر بٹھاؤ۔ میں ابھی آیا۔''

وہ اٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئے اور سانول دروازے کی جانب چل پڑا۔ موقع پا کر سول اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ اسے ٹی وی کے پروگرام بہت اچھے لگ رہے تھے۔ قیصر صاحب نے اسے ٹی وی آن آف کرنے، چینل بدلنے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ وہ سارا دن بیٹھی ٹی وی دیکھتی رہی تھی۔

سانول نے دروازے پر پہنچ کر پوچھا کون ہے اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک مفلوک الحال عورت کھڑی تھی۔ اس نے سانول کو دیکھتے ہی کہا۔ ''دیکھیں جناب میں کوئی بھیک مانگنے والی نہیں ہوں۔ میرا شوہر بیمار ہے۔ اس

UUNOVELS.COM

کی دوا کے پیسے نہیں ہیں۔ اگر آپ مدد کریں تو بڑی نوازش ہوگی۔"

"آپ اندر تو آئیں۔" سانول نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں آپ یہیں لا کر دے دیں۔ آپ سے جو بھی ہوسکے دے دیں۔"

"نہیں نہیں آپ کو اندر آنا ہوگا۔" سانول نے ضد باندھ لی۔

"دیکھیں جناب میں حالات کی ستائی ہوئی عورت ہوں۔ ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔"

"آپ کو جو کہنا ہے اندر آ کر کہیں نا۔" سانول نے التجائیہ انداز میں کہا۔ "مہمان تو اللہ کا فرشتہ ہوتا ہے نا...... دروازے سے مہمان کو کیسے رخصت کر دیں۔" وہ سندھی لہجے میں اردو بول رہا تھا۔ اس کی کچھ بات عورت کی سمجھ میں آئی کچھ نہیں اسی لیے وہ کچھ پیچھے ہٹ گئی۔ اسے پیچھے ہٹتے دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ پکڑنا تھا کہ عورت نے چیخ ماری۔ اس کی چیخ اتنی زوردار تھی کہ آس پاس کے فلیٹ کے دروازے کھڑکیاں کھلتی چلی گئیں۔

☆......☆

ہوٹل کے اس کمرے میں ہزاری بھی موجود تھا اور ڈرائیور بھی، مگر دونوں خاموش تھے۔ ان کی نظریں بڑے سائیں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ بڑے سائیں کے داہنے ہاتھ کی انگلیوں میں ایک سگریٹ کافی دیر سے پھنسی ہوئی سلگ رہی۔ سلگ سلگ کر راکھ ہو رہی ہے اور سائیں کو خبر تک نہیں ہے۔ وہ اپنی سوچوں میں گم ہے۔ اس کی سوچ کا عکس چہرے پر بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ سائیں حد سے زیادہ غصے میں ہے۔ وہ صبح سے تین بار ہوٹل سے باہر نکلے تھے اور بے نیل و مرام واپس آئے تھے۔ ناکامی نے ہی ان کے غصے کو تیز کیا تھا۔ اس وقت اگر سانول ان کے سامنے آ جاتا تو وہ اسے ٹکڑوں میں بدل دیتے۔ ایک ایک ریشہ الگ کر دیتے۔ وہ ان کا نوالہ چھین کر بھاگا تھا اس کا غم تو تھا ہی اس بات کا بھی رنج تھا کہ اس نے ان کے قلعہ میں سیندھ لگا دی ہے۔ اس کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی بغاوت کر سکتے ہیں۔ اسے طعنہ دیا جائے گا کہ اس کو ایک معمولی سے چھوکرے نے شکست دے دی۔

وہ اسے زندہ پکڑ کر اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتا تھا۔ تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا لیکن وہ مل کر نہیں دے رہا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں اسے کیسے ڈھونڈے، وہ اسی پر غور کر رہا تھا مگر کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ تب اس نے ایک فیصلہ کیا اور بیڈ سے اترنے لگا۔ اسے اترتے دیکھ کر ہزاری جلدی سے آگے بڑھا۔ اس نے سائیں کی چپل اس کے پیروں میں ڈالی۔ سائیں نے چپل پہن کر کہا۔ "اوئے تم دونوں بھی ساتھ چلو۔"

"حکم سائیں...... ہم تیار ہیں۔" دونوں بیک وقت ایک ساتھ بولے تھے۔

"میں گاڑی تیار کرتا ہوں۔" ڈرائیور نے کہا اور نیچے جانے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"سنو ابھی ہم ایک ایسے بندے کے پاس جائیں گے جو مجھے بالکل پسند نہیں ہے لیکن معاملہ سلجھ نہیں رہا ہے اس لیے اس کا سہارا لینا اب ضروری ہو گیا ہے۔" سائیں نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

"آپ جیسا کہو سائیں...... آپ مالک ہو۔" ہزاری نے دل میں اسے ایک موٹی سی گالی دی اور پھر دونوں ہاتھ باندھ کر شیریں لہجے میں بولا۔ یہ اس کا خاص انداز تھا۔ وہ سائیں کے ساتھ رہ کر بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ دیکھنے والے یہی کہتے کہ وہ بیٹی کے غم میں مرا جا رہا ہے مگر حقیقت یہی تھی کہ وہ دل سے چاہ رہا تھا کہ موہل کسی بھی طور اس کے ہاتھ نہ آئے۔ وہ اس لیے بھی سائیں کے ساتھ تھا کہ اگر موہل اس کے ہاتھ لگ بھی گئی تو وہ اسے بچانے کی کوشش کرے گا۔

"سائیں کہاں جائے گا۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ "کہیں پولیس کا سہارا نہ لے لے۔" یہ ایک ایسا خوف تھا جس سے مفر نہ تھا۔ پولیس سے موہل کو بچانا ناممکن بات تھی اسی لیے وہ دعا کر رہا تھا کہ سائیں اپنے کسی پولیس دوست کی مدد نہ لے لے۔

سائیں کمرے سے باہر نکل چکا تھا اس لیے وہ بھی باہر نکل آیا۔ اب سائیں لفٹ کی طرف جا رہا تھا جو انہیں نیچے لے جاتی۔

"ابھی ہم جس کے پاس چل رہے ہیں اس کا دعوا ہے کہ وہ ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ وہ آدھے کراچی کا مالک ہے۔" سائیں کے لہجے میں فخر تھا۔

☆......☆

سانول اس عورت کی چیخ سن کر سکتے میں آ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جس کے لیے قیصر سائیں

UUNOVELS.COM

نے کہا کہ اسے عزت سے اندر لا کر بٹھاؤ وہ اندر آنے پر تیار کیوں نہیں۔ اور ایسا کیا ہو گیا ہے جو وہ اس قدر چیخ رہی ہے۔ اس عورت کی چیخ پکار پر گھروں کی کھڑکیاں کھلنے لگی تھیں۔ تمام کے تمام فلیٹ کے بند دروازے کھل گئے تھے۔

عورتیں مرد اپنے اپنے فلیٹوں سے باہر آ کر یا کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر ان کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ اتنے شور شرابے کے بعد قیصر صاحب اندر کیسے رہتے وہ بھی باہر نکل آئے تھے۔

"کیا ہوا کیوں شور مچا رکھا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"یہ اندر آنا نہیں چاہتیں۔" سانول بولا ہی تھا کہ وہ عورت دہاڑی۔

"مجھے کیا ایسی ویسی عورت سمجھ رکھا ہے جو مجھے اندر بلا رہا ہے۔ میں عزت دار ہوں عزت دار۔"

"اسے غلط فہمی ہو گئی ہے۔" قیصر صاحب نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

"ارے واہ..... لگتا ہے یہ تمہارے کہنے پر ہی مجھے اندر بلا رہا تھا..... تجھے ابھی بتاتی ہوں ٹھرکی بڈھے!" عورت غصے سے اکڑی ہوئی تھی۔ وہ کسی طور خاموش نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی چیخ و پکار پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔

"دیکھو بی بی یہ ابھی ابھی گوٹھ سے آیا ہے۔ اسے میں نے ہی کہا تھا کہ ابھی میرا ایک دوست آئے گا اسے اندر لے جا کر بٹھاؤ۔ یہ سمجھا کہ دوست کے بجائے اس کی بیگم آئی ہے۔ اب اگر شور مچایا تو میں پولیس کو بلا لوں گا۔" بڑی مشکل سے قیصر صاحب نے اسے خاموش کیا۔ قیصر صاحب کے بولنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ وہ عورت ڈر گئی۔

اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے سانول سے کہا۔ "تم اندر جا کر بیٹھو۔ اندر آ کر میں تم سے نمٹتا ہوں۔"

چند دیگر لوگوں نے بھی قیصر صاحب کی حمایت کی تھی اس لیے معاملہ سلجھ گیا اور وہ عورت بک بک کرتی ہوئی چلی گئی۔ وہ عورت تو چلی گئی مگر قیصر صاحب کا غصہ کم نہ ہوا وہ سنتاتے ہوئے اندر آئے اور سانول کو آواز دی۔ "سانول ادھر آؤ۔"

"حاضر سائیں۔" سانول کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

"یہ کیا حرکت تھی..... تم نے اس عورت کا ہاتھ پکڑ کر کیوں اندر کھینچا تھا۔"

"سائیں آپ ہی تو بولے تھے کہ جو بھی ہو اسے عزت کے ساتھ اندر لا کر بٹھاؤ..... میں نے اسے اندر آنے کو کہا تو وہ انکار کرنے لگی تو میں نے اسے اندر لانے کی کوشش کی۔ بس وہ برا مان گئی۔"

"جانتے ہو وہ تمہارے ساتھ مجھ پر بھی الزام لگا گئی ہے کہ میں ایسا ویسا آدمی ہوں۔"

"یہی بات وہ بھی بول رہی تھی کہ میں ایسی ویسی نہیں ہوں۔"

قیصر صاحب کچھ بولتے کہ کال بیل بج اٹھی۔ "تم یہیں ٹھہرو میں دیکھتا ہوں کون ہے۔" کہتے ہوئے وہ دروازے کی جانب بڑھے۔ پھر فوراً ہی واپس آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ چہرے سے ہی سیدھا سادا لگ رہا تھا۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سانول سے بولے۔

"میرے دوست سراج ہیں۔ انہی کا میں انتظار کر رہا تھا۔ یہ میری کلائنٹ مسز سلطان کے اسٹور کو چلاتے ہیں۔" پھر وہ مڑ کر اس آدمی سے بولے۔ "یہ ابھی ابھی گوٹھ سے آیا ہے۔ نہایت سیدھا سادا بندہ ہے۔ اس دن تم کہہ رہے تھے نا کہ اگر کوئی ایماندار آدمی مل جائے تو اسے یہ دکان سونپ کر تم آرام کرو گے۔ یہ بہت ایماندار آدمی ہے۔ میری مسز سلطان سے بات ہو چکی ہے اسے تم اپنی دکان میں رکھ لو۔"

"میں واپس لاہور جانا چاہ رہا ہوں اسی لیے کسی اچھے آدمی کی تلاش میں تھا۔ اب آپ کا حکم ہے تو رکھنا ہی پڑے گا۔" اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ٹھیک ہے اسے ساتھ لے جاؤ..... اچھی طرح طور طریقے سکھاؤ..... یاد رہے کہ یہ بہت معصوم ہے اسے کچھ بھی نہیں پتا کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ لوگ کس طرح ایک دوسرے کی لاش پر کھڑے ہو کر اپنا قد اونچا کرتے ہیں۔"

"اب آپ فکر ہی نہ کرو..... انشاءاللہ میری نگرانی میں یہ ایک اچھا بزنس مین بن جائے گا۔" کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا پھر سانول کی طرف مڑ کر بولا۔ "چلو میاں..... میری دکان دیکھ لو۔ کل صبح سے آ جانا۔"

وہ دونوں باہر نکل گئے تو قیصر صاحب نے آواز دی "مول یہاں آنا۔"

مول اپنے کمرے میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ آواز سنتے ہی بولی۔ "آئی سائیں ابھی آئی۔" دوپٹا سر پر رکھ کر وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ اسے دیکھتے ہی قیصر صاحب کے ہونٹوں پر ہنسی کی لکیر کھنچ گئی۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

''بیٹھو۔'' انہوں نے اسے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
مومل بیٹھ گئی۔ دو تین بار کے ٹوکنے سے اب وہ صحیح انداز میں بیٹھنے لگی تھی۔
''سانول کی نوکری کا تو انتظام ہوگیا۔ اگر وہ سیٹ ہو گیا تو اچھے سے گزارا ہو جائے گا۔'' انہوں نے کہا ہی تھا کہ کال بیل بجی۔
''یہ اب کون آ گیا۔'' قیصر صاحب بولے۔
''سائیں آپ بیٹھو میں دیکھ کر آتی ہوں۔'' کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے اسپائی آئی سے باہر دیکھا اور بولی: ''سائیں وہی کل والی عورت آئی ہے جو بہت بولتی ہے۔''
''ایسا نہیں کہتے۔ اگر عورت پختہ عمر کی ہے تو اسے آنٹی کہتے ہیں اگر چھوٹی عمر کی ہے تو باجی۔'' قیصر صاحب نے سمجھایا۔ ''دروازہ کھول کر کہنا اندر آجائیں آنٹی۔''
''جی میں یہی کہوں گی۔'' کہتے ہوئے وہ دروازے پر پہنچی۔
''اندر آجائیں آنٹی۔'' اس نے بیگم جواد کو دیکھتے ہی کہا۔ بیگم جواد نے اندر قدم رکھا تھا کہ ان کے ساتھ ان کے میاں جواد درانی بھی داخل ہونے لگے تبھی وہ بولی: ''ٹھہریں آنٹا پہلے میں پوچھ لوں۔''
جواد صاحب حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ مومل نے مڑ کر قیصر صاحب سے کہا: ''آنٹی کے ساتھ آنٹا بھی ہیں۔ ان کے لیے کیا حکم ہے؟''
قیصر صاحب حیرت سے اسے دیکھتے رہے پھر جلدی سے بولے آنٹا نہیں انکل کہو۔''
''یہ کیا بات ہوئی آنٹی کے شوہر آنٹا ہوئے نا۔''
''نہیں آنٹی کے شوہر کو انکل کہتے ہیں...... ان کو بھی اندر بلالو۔''
بیگم جواد جو کھڑی ہوگئی تھیں وہ بھی صوفوں کی طرف بڑھتے ہوئے مسکرانے لگیں پھر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ''یہ کہاں سے پکڑی ہے جسے انکل اور آنٹی کا پتا نہیں ہے۔''
''نئی نئی گوٹھ سے آئی ہے۔ کہیں کوئی ٹھکانا نہیں تھا اس لیے اپنے یہاں لے آیا۔ اب اسے سیٹ کرانا ہے۔''
''اگر چاہیں تو اسے میرے ہاں بھیج دیں۔ میرے گھر جو لڑکی کام کرتی تھی وہ شادی ہو کر لاہور چلی گئی ہے۔ نذرالاسلام کا مجبور ہے دو دن رہتا ہے پھر بھاگ کر اپنی بہن کے پاس موسیٰ کالونی چلا جاتا ہے۔'' بیگم جواد نے مومل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
''کیوں مومل ان کے ہاں جاؤ گی؟'' قیصر صاحب نے پوچھا۔
''سائیں آپ کہو گے تو ضرور جاؤں گی۔''
''جواد صاحب میرے پرانے کلائنٹ ہیں اور ان سے گھر جیسا تعلق ہے۔''
''ہم کوئی زندگی بھر کے لیے تو لے جا نہیں رہے ہیں۔ صبح دس بجے تک پہنچ جانا اور شام کے پانچ بجے لوٹ آنا...... اور ہمارے ہاں کام وام بھی جیادہ نہیں ہوتا ...... بس ہم دو جنے ہیں اور دو بیٹوا ہے۔ بس یہی ہمرا کھاندان ہے۔'' بیگم جواد نے خالص بہاری لہجے میں کہا۔
''سائیں جیسا کہیں گے ویسا ہی ہم کریں گے۔'' مومل قیصر صاحب کی طرف دیکھ کر بولی۔
''تو ڈن...... کل سے تم آجانا۔''
''یہ کہاں آتی جاتی ہے۔ اس نے تو اب تک کراچی کی سڑکیں بھی پوری طرح نہیں دیکھی۔ اکیلی کیسے جائے گی۔ اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور پھر واپس پہنچادیں۔''
''لیکن......'' جواد صاحب نے کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ بیگم دھاڑیں:
''آپ تو چپ ہی رہیں۔'' پھر وہ مڑ کر بولیں۔ ''اے لڑکی چلو ہم تم کو اپنا گھر دکھادیں۔ جیادہ دور بھی نہیں ہے۔ بس تین گلی بعد ہے۔''
مومل کھڑی ہوگئی۔ اس نے قیصر صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''سائیں سانول آئے تو اسے بتا دینا، اب میں بھی نوکری کرنے لگی ہوں۔''
قیصر صاحب مسکرا کر رہ گئے اور جواد صاحب کی بیگم اسے لے کر چلی گئیں۔

☆......☆

اتنی محنت کے بعد جو تصویر ابھر کر سامنے آئی تھی وہ تعریف کے قابل تھی۔ واقعی وہ منجھے ہوئے آرٹسٹ تھے۔ صرف زبانی خدوخال سن کر ایسی تصویر بنادی تھی جس پر حقیقی کا گمان ہونے لگا تھا مگر سائیں مطمئن نہ تھے۔ انہوں نے مزید کوشش کی تلقین کی اور یہ مزید کچھ دیر کی کوشش بار آور ثابت ہوئی، اب جو تصویر بنی وہ ہو بہو مومل کا عکس تھی۔ بڑے سائیں روایتی جاگیردار تھے۔ ہاریوں سے کتوں جیسا سلوک

UUNOVELS.COM

کرتے تھے اور اس کام میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ہاریوں کو ایک پھوٹی کوڑی بھی دینے کے روادار نہ تھے مگر اپنا نام اونچا کرنے کے معاملے میں وہ دونوں ہاتھوں سے لٹاتے تھے۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ بڑے سائیں نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور ہزار ہزار کے دس نوٹ مصور کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ گو کہ وہ رقم ان کی محنت کے مقابلے میں کم تھی لیکن آج کل فن کی قدر رہتی بھی کہاں ہے۔ ''ویسے تو کیا کچھ نہ بکا ہے زرداروں کی محفل میں۔'' اگر ان کی محنت بھی بک گئی تو کون سی قیامت آ گئی۔ وہ بھی خوش ہو گئے اور سائیں بھی لیکن ہزاری کا دل کانپ اٹھا۔ فوٹو دیکھ کر تو کوئی بھی سوہل کو پہچان سکتا تھا۔ اس کی مدد سے اسے تلاش کرنا آسان ہو گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ سائیں ناکام ہو جائے۔ میری سوہل اس کے شر سے بچی رہے۔

تصویر لے کر سائیں باہر آیا۔ اب اس کے قدم اس فوٹو اسٹوڈیو کی طرف اٹھ رہے تھے جس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ تصویر کی کاپی ایسی بنا دے گا کہ اس پر فوٹو کا گمان ہوگا۔

☆......☆

سانول دکان پر بیٹھا تھا۔ اسے دکان سنبھالتے ہوئے تیسرا چوتھا دن تھا۔ پہلے ہی دن سراج نے اسے کاروباری گر بتائے تھے جسے اس نے یاد کر لیا تھا۔ کس چیز کی قیمت کیا ہے وہ اسے سمجھا دی تھی۔ ساتھ ہی ایک رجسٹر میں بھی لکھ دیا تھا تا کہ اسے پریشانی نہ ہو جو اس کے لیے بیکار تھا لیکن کسی کی مدد سے آسانی پیدا کر سکتا تھا۔ انہوں نے ایک خاص نکتہ بتایا تھا کہ وہ خریدار سے پیار کی زبان میں بات کرے۔ خریدار ایک لفظ بولے تو وہ جواب میں دو بولے اس سے خریدار زیادہ سوال جواب نہیں کرتا۔ اس نے ایک دو خریدار پر اس کلیہ کو آزمایا تو نتیجہ اچھا نکلا اس لیے اب وہ زیادہ سے زیادہ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خریدار اگر پوچھتا کہ آپ کے پاس پریکلی ہیٹ ہے تو وہ جواب میں دیگر پاؤڈر کا نام بھی بتا دیتا۔ ان کی خصوصیت بھی بتانے کی کوشش کرتا۔ اس کی کارکردگی سے سراج مطمئن ہو گئے تھے اسی لیے آج وہ آڑھت جاتے وقت کہہ گئے۔ ''آج تم اکیلے ہو۔ اُمید ہے دکان سنبھال لو گے۔''

''جی ہاں...... آپ فکر ہی نہ کرو سائیں...... میں کسی گاہک کو خالی ہاتھ لوٹنے نہیں دوں گا۔'' سانول نے فخریہ انداز میں کہا۔ اس کے جواب پر وہ خوش ہو گئے۔ اور اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولے۔

''مجھے یقین ہے ایک دن تم بہت کامیاب ہو گے۔ تمہارے اندر معصومیت ہے، ایمانداری ہے اور اللہ پر یقین کامل ہے اور یہی چیز انسان کو کامیاب کراتی ہے۔''

وہ اپنی پرانی ہنڈا ففٹی پر بیٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد سانول اکیلا بیٹھا پرانے اسباق یعنی وہ باتیں جو اسے وقتاً فوقتاً سراج صاحب بتاتے رہے تھے انہیں دماغ میں دُہرا رہا تھا۔ اسی وقت ایک خریدار آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی سانول اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ''جی سائیں...... حکم۔''

''سویاں ہوں گی؟''

''جی ہاں...... ہیں...... کون سی لیں گے۔ کچی سویاں یا پکی......؟''

''پکی دے دو۔''

''تیل میں پکی یا گھی میں؟''

''گھی والی دے دو۔''

''اصلی گھی یا ویجیٹیبل آئل میں پکی؟''

''جو اچھی ہو وہ دے دو۔''

''دیسی دوں یا غیر ملکی؟''

''غیر ملکی دے دو۔''

''امریکن یا چائنیز کون سی لینا پسند کریں گے؟''

''امریکن دے دو۔''

''مہنگی والی یا سستی والی۔ کون سی لیں گے؟''

''سستی مہنگی میں سمجھا نہیں۔''

''سستی وہ جو ہم نے گزشتہ عید میں منگوائی تھیں بکی نہیں۔ اسٹاک میں رکھ دیا اور مہنگی وہ جو تازہ تازہ منگوائی ہے۔''

''تازہ والی دو باسی لے کر کیا کروں گا۔''

''ایک کلو یا دو کلو یا پانچ کلو؟''

''ایک کلو۔''

''اچھا اچھا ابھی دیا مگر آپ نے کیا مانگا ہے؟''

''تمہارا سر۔'' وہ بھناتا ہوا دکان سے جانے لگا تھا کہ سانول نے آواز دی۔ ''نہیں سر میں کسی کو نہیں دے سکتا...... کچھ اور بولیں۔ کیا دوں؟'' اتنی دیر میں وہ دکان سے باہر جا چکا تھا۔ سانول بڑبڑانے لگا:

''پتا نہیں کیسے کیسے خریدار آ جاتے ہیں جن کو یہ بھی پتا نہیں کہ لینا کیا ہے۔''

☆......☆

سوہل کو کام کرتے ہوئے دو دن ہو چکے تھے۔ اس دوران میں اس نے بہت کچھ سیکھا۔ بہت کچھ سمجھا

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

تھا۔ جواد صاحب کی بیگم اسے سمجھانے میں خصوصی دلچسپی لیتی تھیں۔ دراصل ان کے بچے ان کی سنتے نہیں تھے۔ اگر کوئی سنتا تھا تو وہ تھے جواد صاحب جو ہمہ وقت دبے دبے رہتے تھے۔ جواد صاحب سقوط مشرقی پاکستان کے زخم خوردہ تھے۔ کراچی آنے سے پہلے ڈھاکا میں جوٹ پرچیز رتھے۔ اللہ نے خوب دولت دی تھی مگر وہ سب ڈھاکا میں ہی رہ گئی۔ صرف جان بچا کر کراچی پہنچے تھے تب سے وہ بہت کم گو ہو گئے تھے۔ بیوی رات کہتی تو وہ رات سمجھ لیتے۔

ایک بیٹا تھا آصف جس نے عجب ہیئت اختیار کر رکھی تھی۔ کانوں سے گدی تک بال نہایت باریک مگر سر کے درمیان خوب بڑے بڑے۔ کانوں میں بالیاں پہنتا تھا اور گلے میں ہر وقت گٹار لٹکائے رکھتا تھا۔ باتیں بھی گٹار بجا کر دھن میں کرتا تھا۔ بیگم جواد اس کی شادی کے لیے پریشان رہا کرتی تھیں مگر کیا کرتیں اس کی قسمت دھوکا دینے پر کمر بستہ تھی۔ لڑکی والے اسے دیکھتے اور نا پسند کر دیتے۔ چھوٹا بیٹا عفان جو تھا تو دس گیارہ سال کا مگر انتہائی حاضر جواب اور شریر تھا۔ ایک نوکر بھی تھا نذرول۔ کبھی اس کا باپ ڈھاکا میں ان کے یہاں ملازم تھا۔ پھر وہ بھی بنگلہ دیش بن جانے کے بعد کراچی آ گیا تھا۔ اتفاق سے ایک دن اس کی ملاقات جواد صاحب سے ہو گئی۔ اور اس نے فرمائش کر دی کہ نذرول کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیں۔ جواد صاحب نذرول میں اپنا ماضی دیکھتے تھے۔ اس کے لب و لہجے میں سابقہ مشرقی پاکستان کے دن انہیں نظر آتے تھے اسی لیے اس کام چور کو برداشت کر رہے تھے۔ نذرول کی بدحواسی کی وجہ سے بھی بیگم جواد موبل پر خصوصی توجہ دے رہی تھیں۔ انہوں نے موبل کی پریکٹیکل تعلیم پر بھرپور توجہ دی تھی۔ اسے نئے نئے اسباق یاد کرائیں۔ کیسے کس سے بات کی جاتی ہے۔ کھانا کیسے ٹیبل پر سجایا جاتا ہے۔ ڈش کیسے بڑھائی جاتی ہے۔ ایک انورائیڈ موبائل بھی خرید کر دیا تھا۔ اسے کیسے استعمال کیا جاتا ہے یہ بھی سکھا دیا تھا۔ موبائل آنے سے موبل کو ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ وہ جب چاہتی سانول سے بات کر لیتی تھی۔ سانول کو بھی دکاندار نے موبائل دیا ہوا تھا۔ اسے چلانے کا طریقہ کچھ اس نے اور کچھ قیصر صاحب نے سکھا دیا تھا۔ قیصر صاحب جب سانول کو فنکشن سمجھاتے تو وہ بھی غور سے سنتی تھی اسی لیے اسے اتنی جلدی استعمال کرنا آ گیا تھا۔ اب وہ بہ آسانی موبائل چلا لیتی اور خالی وقت میں گیم کھیل لیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ بیٹھی گیم کھیل رہی تھی کہ بیگم جواد نے آواز دی ”موبل ادھر آئیو۔“

موبل نے موبائل بند کیا اور ان کی خدمت میں پہنچ گئی۔ ”جی بیگم صاحب...... آپ نے کچھ فرمایا ہے؟“

”ارے ہاں یاد آ گوا۔ ہم ای کہہ رہے تھے کہ تم جلدی سے باجار چلی جاؤ اور سبجی وبجی لے آؤ۔“

”جی اچھا...... کیا کیا لینا ہو گا؟“

”جو سبجی بھی تاجی تاجی ملے سب لے آئیو۔“ بیگم جواد نے پانچ سو کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”اور ہمن اور ہمن بھی لے لیجیو...... ہاں گوست جرور لیجیو۔“

”جی اچھا۔“ موبل نے روپے لیے اور باہر کی جانب چل دی۔ بازار خاصہ دور تھا۔ وہ پیدل پیدل ہی چل دی۔ اسے پیدل چلنا اچھا لگتا تھا۔ راستے بھر وہ سجی سجائی دکانوں کو دیکھتی جاتی تھی۔ لوگوں کا جائزہ لیتی ہوئی چلتی تھی۔ اس وقت بھی ٹہلنے کے انداز میں بازار کی جانب بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

وقت اور راستہ کٹتا جاتا ہے اور منزل خود ہی نزدیک آ جاتی ہے۔ بشرطیکہ قدم آگے بڑھ رہے ہوں۔ وہ بھی اپنی منزل یعنی بازار تک پہنچ ہی گئی۔ پہلے اس نے گوشت خریدا پھر سبزی کی دکان پر پہنچی۔ ”اے بھائی یہ لوکی کیسے دی؟“

”بیس روپے کلو۔“

”اور بھنڈی؟“ سوال کر کے دھنیا کی گڈی اٹھائی اور پھر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ارے یہ دھنیا ہے...... کیسی سوکھ کر جھاڑ بن گئی ہے؟“ اسے رکھ کر مرچوں کی ٹوکری کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔ ”یہ کیا مرچی بھی ایویں سوکھی سوکھی کہ دیکھ کر دل دہل جائے...... بھائی کچھ تازہ بھی ہے یا نہیں؟“

”باجی سب کچھ تازہ تازہ ہے...... آج ہی منڈی سے لایا ہوں اور آپ کہہ رہی ہو یہ باسی ہے؟“

”اور کیا...... یہ دیکھو۔“ کہہ کر اس نے پودینہ کی گڈی اٹھائی اور بولی، ابھی میں میڈم کو دکھا کر ان کی رائے لیتی ہوں۔“ پھر اس نے موبائل نکالا واٹس اپ آن کر کے اسپیکر کھول لیا پھر کیمرا کے سامنے گڈی کو لہرا کر بولی۔ ”میڈم یہ دیکھیں ایسی مرجھائی ہوئی گڈی ہے۔ لے لوں۔“

”ہاں لے لو...... اور کیمرا ذرا الٹے ہاتھ کی طرف

کرنا...... واہ مولی بھی ہے...... لے لو اور اچھی والی گاجر بھی ہے وہ بھی لے لو...... ہاں سنو مسز سلطان بھی یہیں بیٹھی ہیں۔ وہ بول رہی ہے ان کے لیے ٹماٹر وماٹر اور آلو والو لیتی آنا اور کہہ رہی ہے مٹر ہو تو وہ بھی لے لینا۔ اب گھر جا رہی ہیں۔ ان کے گھر دیتی ہوئی آنا۔"

مومل نے سامان تولنے کو کہا۔ سبزی والے نے سبزیاں تول کر شاپر میں بھرا اور شاپر آگے بڑھاتے ہوئے کہا "یہ کیا ہے؟ بڑا اچھا طریقہ نکالا ہے۔"

"ارے بھائی اسے ڈیجیٹل خریداری کہتے ہیں...... پینڈو کے پینڈو رہ گئے۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی، کچھ خبر بھی ہے؟" کہہ کر وہ واپسی کے لیے مڑ گئی۔

☆......☆

سانول اور مومل کو کراچی آئے کئی ہفتے ہو چکے تھے مگر وہ دونوں ابھی تک ایک نہیں ہو پائے تھے۔ مومل تو آرام سے بیڈ پر سوتی مگر سانول کو نیچے فرش پر سونا پڑ رہا تھا۔ اس نے ایک بار التجا بھی کی تھی کہ اسے بھی اس مکھن جیسے گدے پر سونے دے مگر مومل نے صاف انکار کر دیا تھا کہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ دروازہ بند ہے تو کیا ہوا اللہ سائیں تو دیکھ رہا ہے نا۔ میں تجھے اوپر بلا کر اسے ناراض نہیں کر سکتی۔ جب تو نکاح پڑھا کر میرا سائیں بن جائے گا تب تجھے یہاں سونے کی اجازت ہوگی۔ بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا تھا۔ وہ کچھ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر اونچی آواز میں بولتا بھی تو آواز قیصر صاحب کے کمرے تک پہنچ جاتی اور پھر ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا اسی لیے وہ خاموش تھا۔ اور نیچے فرش پر ہی سوتا تھا۔ گوٹھ اور کراچی میں بس اتنا فرق آیا تھا کہ یہاں فرش پر کارپٹ اور اس پر چادر اور نرم تکیہ بھی ملا ہوا تھا۔ وہ رات میں آتا اور کھانا کھا کر سو جاتا۔ صبح اٹھتا اور کام پر نکل جاتا۔ اب وہ دکان بھی کھولنے لگا تھا۔ اس کی ایمانداری دیکھ کر سراج صاحب نے اس کی ذمے داری بڑھا دی تھی اور وہی دکان کھولنے لگا تھا۔ بند کرنے کی ذمے داری سراج صاحب کے پاس تھی۔ اسے ڈپلی کیٹ چابی بنوا کر دے دی تھی۔ وہ اسی سے دکان کھولتا تھا۔

آج بھی وہ وقت پر اٹھ گیا تھا۔ یہاں آ کر مومل کو اچھے قسم کا کھانا بنانا آ گیا تھا۔ بیگم جواد کھانا بنانے میں ماہر تھیں۔ انہوں نے ایک ہفتے میں اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا پھر اسے موبائل سے کھانا بنانے کی سائٹ ڈھونڈنے کا طریقہ بھی سکھا دیا تھا جہاں سے وہ نت نئی ترکیبیں سیکھتی اور پھر اسے قیصر صاحب کے یا بیگم جواد کے کچن میں آزماتی۔ وہ صبح صبح پراٹھے اور آملیٹ بناتی تھی جو سانول نے گوٹھ میں شاید ایک دو بار ہی عید کے موقع پر چکھا تھا۔

مومل اٹھ چکی تھی اور کچن میں پراٹھے بنا رہی تھی۔ یہاں آ کر اسے دودھ والی چائے بھی ملنے لگی تھی جو وہ بڑے شوق سے پیتا تھا۔ ناشتا کر کے وہ باہر جانے کے لیے نکل پڑا تھا۔

☆......☆

رات کے دس بج چکے تھے۔ قیصر صاحب کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ یہ ان کے سونے کا وقت تھا۔ مومل اور سانول بھی کھانے سے نمٹ کر اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔ اس وقت مومل بیڈ پر لیٹی تھی اور سانول کارپٹ پر۔ ٹی وی پر کوئی ڈراما چل رہا تھا مگر آواز ہلکی تھی تاکہ قیصر صاحب ڈسٹرب نہ ہوں۔ کچھ دیر تک سانول نے ڈراما دیکھا بلکہ دیکھنے کی کوشش کی پھر بولا "اے مومل۔ تیری چاکری کیسی چل رہی ہے رے؟"

"ارے مت پوچھ...... ایسے لوگ ہیں کہ تو ان کے ساتھ ایک دن بھی گزارا نہ کر سکے۔ بہت مزہ آتا ہے۔ ایک دن تجھ کو بھی وہاں ملوانے لے جاؤں گی، بڑے عجیب لوگ ہیں۔"

"مجھے بھی دن بھر ایسے ایسے لوگوں سے پالا پڑتا ہے کہ کیا بتاؤں...... اللہ معاف کرے۔ انسان کی اتنی قسمیں ہیں یہ پہلی بار جانا ہے۔"

"کراچی کراچی ہے۔ ہر آدمی ایک نئی کہانی ہے۔ قیصر سائیں یہی کہتے ہیں نا؟"

"ہاں رے...... ہم پہلے سمجھتے تھے کہ بڑے سائیں ظالم ہیں لیکن اب پتا چلا کہ ہر آدمی ظالم ہے اور ہر آدمی مظلوم بھی ہے۔"

"یہی تو عجیب بات ہے کہ ہر آدمی ایک نئی کہانی ہے۔ ایک نیا قصہ ہے۔ گوٹھ میں تو سب دو طرح کے تھے۔ ظالم اور مظلوم۔"

"اے مومل تجھے گوٹھ کی یاد آتی ہے۔"

"ہاں آتی تو ہے لیکن رلاتی نہیں ہے۔ بس یاد آئی اور میں نے ذہن سے جھٹک دیا۔ وہاں ظلم بھی تو تھا جو یاد آتا ہے تو تڑپا جاتا ہے۔ ہم کیسے ایک علاقے تک محدود تھے۔ ہمیں انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔" کہہ کر مومل ہنس دی۔

"پتا نہیں بڑے سائیں نے کیسا طوفان اٹھایا ہوگا۔ کس کس کی کھال کھینچی ہوگی۔"

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

"وہاں تیرا تو کوئی ہے نہیں جس پر ظلم ہوا ہوگا جس سے اس جسارت کا بدلہ لیا ہوگا۔ ہاں میرے بابا سائیں ہیں لیکن وہ اتنے ہی چالاک ہیں۔ انہوں نے خود کو بچالیا ہوگا اور سارا الزام تجھ پر لگا کر خود مظلوم بن گئے ہوں گے۔" مومل نے کہا اور کروٹ بدل لی۔ اگر وہ کروٹ نہ بدلتی تو اس کی آنکھوں میں آگئے آنسو سانول دیکھ لیتا۔ وہ ماں بابا کے لیے روتی تھی لیکن اپنے آنسو دکھاتی نہیں تھی۔ اندر اندر رو لیتی تھی۔ وہ آنسو پونچھ کر بولی "سو جا صبح اٹھنا ہے۔"

"وہ تو اٹھنا ہی ہے لیکن یہ بتا ہم اس طرح کب تک الگ الگ سوتے رہیں گے۔ کب تک دوری قائم رہے گی۔"

"جب تک نکاح نہیں ہو جاتا۔ سائیں نے بولا ہے وہ ہمارا نکاح کرا دیں گے تا کہ شناختی کارڈ بن سکے۔ اب سو جا۔"

مومل اندر ہی اندر رونا چاہتی تھی اسی لیے وہ بار بار اسے سونے کو کہہ رہی تھی، سانول نے اس کے زخم کو چھیڑ دیا تھا۔ اسے ماں بابا کی یاد آنے لگی تھی۔

☆......☆

بڑے سائیں کے چہرے پر تھکن تھی۔ وہ اس درمیان کئی بار گوٹھ کا چکر لگا آیا تھا۔ کارخانہ کیسے چل رہا ہے اس کی بھی اسے خبر نہ تھی۔ اس کی انا مجروح ہوئی تھی وہ کیسے چین سے بیٹھ سکتا تھا۔ اسی لیے ایک دن سے زیادہ گوٹھ میں رکتا نہیں تھا۔ پھر سے کراچی آجاتا تھا۔ اس وقت وہ اس کے پاس آیا تھا جو ہر مرض کا علاج مشہور تھا لیکن ابھی تک وہ اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس کے انتظار میں وہ صوفے پر نیم دراز تھا۔ دوسرے صوفے پر ہزاری اور ڈرائیور بیٹھے تھے۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ بتا رہی تھی کہ یہ کسی صاحبِ حیثیت کا ڈرائنگ روم ہے۔ قیمتی ڈیکوریشن پیس سے کمرا اٹا ہوا تھا۔ انہیں وہاں بیٹھے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ نوکر ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آیا۔ ٹرالی میں خشک میوے، بسکٹ اور اسی قبیل کی دیگر چیزیں تھیں۔ اس نے یہ سب ان لوگوں کے سامنے رکھی چھوٹی ٹیبل پر سجا دیا۔ ہزاری کو بھوک لگ رہی تھی لیکن سائیں کا چہرہ دیکھ کر اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ کسی چیز کو ہاتھ لگاتا۔ سب کچھ اسی طرح رکھا تھا اور سائیں آنکھیں بند کیے صوفے سے پشت ٹکائے نیم دراز تھا۔ ہزاری بڑے سائیں کو متوجہ کرنے کا طریقہ سوچ رہا تھا کہ اندر والے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک قد آور شخص داخل ہوا۔ اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا۔ "سائیں افضل یہ تم ہو...... کب آئے؟ ملازم نے تمہارا نام بتایا تو میں کچھ اور سمجھا تھا۔ سکھر سے ایک تمہارا ہم نام آتا رہتا ہے میں نے سمجھا کہ وہی آیا ہے۔"

سائیں افضل نے گہری سانس لے کر کہا "یار ایک کام پڑ گیا تھا اسی لیے آنا ہوا۔"

"کام بولو۔" اس نے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہمارے گوٹھ سے ایک لڑکی اور ایک لڑکا بھاگ کر کراچی آیا ہے۔ اسے ڈھونڈنا ہے۔"

"تم نے تو ایسی بات کہی جیسے کراچی تمہارا گوٹھ ہے۔ دس گھر کی تلاشی لی اور گیارہویں گھر سے نکل آئی...... یہ کراچی ہے کراچی...... بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کر لینا آسان ہے لیکن کراچی میں کسی لڑکی کو ڈھونڈنا آسان نہیں۔"

"بخت شاہ، تم تو کہتے تھے کہ کراچی میں ہمارے نام کا سکہ چلتا ہے۔ ایک اتنا سا کام نہیں کر پا رہے ہو۔" سائیں افضل نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"سائیں، تم نے پہلی بار کوئی کام بولا ہے اب تو کرنا ہی پڑے گا۔ لڑکی کو ڈھونڈنا ذرا مشکل ہے ایسا کرو لڑکے کا کوئی فوٹو ووٹو ہے تو دے دو۔ میں کوشش کرتا ہوں۔"

"یہ لو۔" کہہ کر اس نے مصور کی بنائی تصویر بڑھا دی۔ پھر بولا۔ "ایک نشانی ہے۔ اس کی پیشانی پر کٹ کا نشان ہے...... یہ اتنا بڑا......" اس نے انگلی سے اپنی پیشانی پر فرضی نشان بنا کر بتایا۔

"نام کیا بتایا ہے؟"

"لڑکی کا نام مومل ہے اور لڑکے کا سانول۔"

"ایک ہفتے کا ٹائم دے دو...... میرے آدمی ایک ایک محلے میں جا کر نئے آنے والوں کو چیک کرتے ہیں۔"

"میں انتظار میں رہوں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں کل صبح تک گوٹھ پہنچنا ضروری ہے۔ ان کمینوں کی وجہ سے بہت بے عزتی ہو رہی ہے۔" کہہ کر سائیں افضل کھڑا ہو گیا۔

"اتنی جلدی کیا ہے...... ایک رات تو ہمارے مہمان رہ جاؤ۔"

"نہیں بالکل وقت نہیں ہے۔"

☆......☆

رات کا وقت تھا۔ حسبِ سابق مومل بیڈ پر اور سانول فرش پر لیٹا تھا۔ اس نے کروٹ بدل کر پوچھا "اے مومل...... تیرا دل لگ تو رہا ہے نا؟"

"ہاں کیوں نہیں...... روز ایک نیا تماشا ہوتا ہے۔"

"میں بھی روز ایسے ایسے تماشے دیکھتا ہوں کہ بتا نہیں سکتا۔ آج دن میں ایک شخص آیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی کمپنی نے ایک ہاربل کنگھی بنائی ہے۔ اس کی یہ خوبی ہے کہ اسے متواتر استعمال کیا

UUNOVELS.COM

جائے تو سفید بال کالے ہو جاتے ہیں۔ بال جھڑنا بند ہو جاتے ہیں اور تیزی سے بڑھتے ہیں۔ میں آرڈر دینے ہی والا تھا کہ سراج صاحب آگئے اور اس ایجنٹ کو بھگا دیا۔ بعد میں وہ بولے کہ ایسے فراڈیے دن بھر گھومتے رہتے ہیں۔ اگر ایسی جادوئی کنگھی اس کے پاس ہے تو وہ دکان دکان بھٹک کیوں رہا ہے۔"

"واقعی اگر ایسی معجزاتی کنگھی اس کے پاس ہے تو وہ اسے امریکا یورپ لے جائے جہاں پیسے بھی اچھے ملیں گے۔ پتا نہیں شہر والے اتنے فراڈیے کیوں ہیں" موٗل بولی۔

موٗل نے قہقہہ لگایا تو سانول بولا۔ "ایسا لگتا ہے شہر کا شہر جعلساز ہو گیا ہے۔ ہر طرف ایک ہی صدا ہے "لوٹ لو" اور عوام لٹ رہی ہے۔"

"اب مجھے نیند آ رہی ہے۔ باقی لٹنے کا قصہ کل سنوں گی۔" کہہ کر اس نے کروٹ بدل لیا۔

☆......☆

رات کے گیارہ بج رہے تھے لیکن رونق کم نہ ہوئی تھی۔ سڑک کنارے استادہ لیمپ پوسٹ پر لگی بڑی بڑی لائٹس، دکانوں کے اندر دن کا سما بناتے مرکری بلب، باہر لگے نیون سائنز گویا پورا علاقہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ چہل پہل بھی خوب تھی۔ مختلف قسم کے ریسٹورنٹ اور چائے خانے آباد تھے۔ فٹ پاتھ پر بچھی کرسیوں پر بیٹھے لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سانول نے اپنی دکان چھ بجے بند کی تھی۔ بس میں آدھا گھنٹا لگا تھا۔ اسی لیے وہ اب تیز تیز آگے بڑھ رہا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ وہ موٗل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شہر آئے آج [illegible] سے زائد ہو چکے تھے۔ اس قلیل عرصے میں اس نے شہر کی طرز زندگی کو بڑی تیزی سے سمجھ لیا تھا۔ اپنا لیا تھا۔ اسے ایک نظر میں دیکھ کر کوئی بھی نو وارد نہیں کہہ سکتا تھا۔ دماغ کا تو پہلے ہی تیز تھا۔ قیصر صاحب نے اسے مزید تیز کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک سال میں وہ شہر والوں کے بھی کان کاٹنے لگے گا۔ اتنی تیزی کے بعد بھی وہ موٗل سے شکست کھا رہا تھا۔ دونوں کے درمیان فاصلہ اب بھی اتنا ہی تھا جتنا پہلے روز تھا۔ یا یہاں آنے سے پہلے تھا۔ وہ اب بھی فرش پر سوتا تھا اور موٗل بیڈ پر۔ موٗل کا کہنا تھا کہ نکاح کے بعد ہی وہ اسے بیڈ پر سونے کی اجازت دے گی۔ بالآخر وہ وقت آ گیا تھا۔ صبح جب گھر سے نکلا تھا تو اسے خبر نہ تھی کہ آج اس کی زندگی میں ایک اور تبدیلی آنے والی ہے۔ دوپہر کو قیصر صاحب نے فون کر کے کہا تھا کہ وہ آج جلدی آجائے کیونکہ نکاح خواں کا انتظام ہو گیا ہے جو نکاح کا خطبہ پڑھ دے گا اور نکاح نامہ بھی بنا دے گا۔ دو دن پہلے ہی قیصر صاحب نے اپنے سورس سے ارجنٹ شناختی کارڈ بنوا دیا تھا۔ اسے تو شناختی کارڈ کی اہمیت کا پتا نہ تھا... مگر قیصر صاحب نے کہا تھا کہ اب اس کے تمام کام بہ آسانی ہو جائیں گے اور یہی ہوا۔ اس کا سب سے اہم کام ہونے جا رہا تھا۔ نکاح جس کا خواب وہ عرصے سے دیکھ رہا تھا۔ وہ خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔

فون آنے کے بعد سے اسے چین نہیں تھا۔ دل یہی کر رہا تھا کہ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ آج اس نے دکان جلد بند کر دی۔ وہ خوشی سے سرشار بس سے اترا تھا اور موٗل کے بارے میں سوچتا ہوا گھر کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اب وہ میری اور صرف میری ہونے والی ہے۔

اسی بات پر غور کرتا ہوا وہ بڑھ رہا تھا کہ اس کے برابر سے ایک جانی پہچانی جیپ گزری۔ کچھ آگے جا کر وہ رکی تو اسے خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے سائیں کی کریہہ آواز بھی سن لی تھی۔ اس نے چیخ کر حکم دیا تھا "روک روک... وہ دیکھ، سانول جا رہا ہے۔"

آواز سنتے ہی اس نے دوڑ لگا دی تھی۔ گاڑی سے کود کر سائیں اترا تھا اور اب وہ اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے وہ شور بھی مچا رہا تھا کہ رک جا ورنہ گولی مار دوں گا۔ اس نے نہ صرف دھمکی دی تھی بلکہ بغل میں لٹک رہے ہولسٹر سے پسٹل بھی نکال لیا تھا۔ اس نے بھاگتے ہوئے فائر کیا۔ دھماکے کی آواز دور تک پھیلی۔ سائیں بھول گیا تھا کہ یہ اس کا گوٹھ نہیں ہے، کراچی ہے اور یہ علاقہ تو دو پارٹیوں میں چل رہی رسہ کشی کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی بدنام ہے۔ سانول پر اس نے گولی چلا کر بہت بڑی غلطی کر دی تھی۔ اس نے ایک فائر کیا تھا کہ کئی طرف سے اس پر فائر ہوئے اور وہ اپنے ہی خون میں نہا گیا۔ وہاں پہرے پر بیٹھے لوگوں نے یہی سمجھا تھا کہ مخالف پارٹی والے گھس آئے ہیں۔ انہوں نے اسے چھلنی کر دیا۔ خود کو زمینی خدا سمجھنے والے بڑے سائیں کی لاش گٹر کے قریب گری ہوئی تھی اور پاس جانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ سانول تو کب کا گلیوں گلیوں بھاگ کر اپنے فلیٹ پر پہنچ چکا تھا۔ اسے خبر بھی نہ تھی کہ اسے مارنے والا مخالف پارٹی کا شوٹر کہہ کر مار دیا گیا تھا۔ وہ تو قیصر صاحب سے باتوں میں مشغول تھا کہ نکاح خواں کتنی دیر میں آئے گا۔ اور قیصر صاحب اسے سمجھا رہے تھے کہ نکاح تک وہ مولوی صاحب کو یہ نہ بتائے کہ اس کا نکاح ہو چکا ہے۔ اسے تجدید نکاح سمجھے۔ اس وقت بھی سانول یہی سوچ رہا تھا کہ آج سے اس کی ایک نئی زندگی شروع ہو گی۔ اور اس سفر میں موٗل اس کی ہم سفر ہو گی۔

URDUNOVELS.COM

خالی ہاتھ

جناب ایڈیٹر سرگزشت

سلامِ مسنون!

میں اپنی سرگزشت بھیج رہا ہوں۔ شاید ایسی سرگزشت کسی اور کی نہ ہو۔ مجھے قسمت نے جو چرکے دیے ہیں انہیں میں نے قلم بند کردیا ہے۔ آپ پڑھ کر حیران رہ جائیں گے کہ کسی کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

کامران چودھری

(لاہور)

میں دس برس سے بابر چودھری کا پرائیویٹ سیکریٹری تھا۔ جب میں دفتر آتا تو کوئی نہ ہوتا۔ میں ہی تالے کھولتا اور میں ہی دفتر بند کرتا تھا۔ سارے دن دفتر میں موجود ہوتا۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ دفتری اور باس کی غیر موجودگی میں تمام کام نمٹا سکوں۔ میرے باس کے پاس جو مؤکل آتے تھے وہ امیر کبیر لوگ ہوتے تھے۔ ان سے جو گفتگو ہوتی تھی اسے خفیہ طور پر ٹیپ کرلیتا تھا کیونکہ وہ ایک نمبر کا کائیاں تھا۔ اسے کسی پر اعتماد نہیں تھا۔ اس نے یہ بات مجھ سے بھی پوشیدہ رکھی تھی۔ بس اتفاقیہ طور پر مجھے اس کا علم ہوگیا تھا۔ وہ اس ٹیپ سے خوب فائدہ اٹھاتا تھا۔ وہ غیر

UUNOVELS.COM

محسوس انداز سے شوگل کو بلیک میل کر کے اپنی مٹھی میں رکھتا تھا۔

دفتر میں ایک چپڑاسی اور ایک ٹائپسٹ نادیہ کے سوا کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔ لنچ کرنے کے لیے باس اور ملازم وکیل بھی آجاتے تھے۔ مگر وہ دو بجے کچہری لوٹ جاتے تھے۔ کچہری زیادہ دور نہیں تھی۔ پانچ سات منٹ کی مسافت پر تھی۔ باس زیادہ تر ہائی اور سپریم کورٹ کے کیس لیتا تھا۔ ان کے کچہری جاتے ہی میں کسی ضروری کام کے بہانے باس کے کمرے میں جا کے اسے اندر سے چٹخنی لگا کے بند کر لیتا تھا۔ یہ میرا روز کا معمول تھا۔ اس قلیل وقت میں ٹیپ چلا کر ریکارڈ شدہ باتوں کو سنتا اور ضروری باتیں نوٹ کر لیتا۔

میں ان راز کی باتوں سے اس طرح فائدہ اٹھاتا تھا کہ باس کے فرشتوں کو خبر نہیں ہو پاتی تھی۔ اس طرح میں نے خاصی دولت پیدا کر لی۔ میں نے اس راز کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھا تھا۔ اپنی بیوی شازیہ کو بھی نہیں بتایا تھا۔ اسے اعتماد میں نہیں لیا تھا کہ اگر اسے میری بالائی آمدنی کا علم ہو جاتا تو وہ اسے اڑانے کا سوچتی۔ عورت سے زیادہ فضول خرچ کوئی نہیں ہوتا۔ میرے والد کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو بھی کبھی اپنی اصل آمدنی نہیں بتانا ورنہ تم کہیں کے نہیں رہو گے۔

نادیہ میرے رحم و کرم پر تھی۔ اسے میرے اشاروں میں چلنا پڑتا تھا۔ وہ ایک طرح سے کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی۔ وہ غریب میرا حکم بلا چوں و چرا مانتی تھی۔ وہ اس لیے مجبور تھی کہ اسے میں نے یہ ملازمت دلوائی تھی۔ وہ خوب صورت تھی اور بیس برس کی تھی۔ کوئی دو برس سے میرے ایک احسان کو وہ کئی مرتبہ چکا چکی تھی۔ اس نے کبھی میری کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا۔

ایک روز شام کے وقت سعید میرے باس سے ملنے آیا تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ فلمی صنعت کا بہت بڑا نام تھا۔ وہ کسی سے ملنے اس کے پاس نہیں جاتا تھا بلکہ ہر شخص اس سے ملنے آتا تھا اس لیے اس کا یہاں آنا تعجب خیز تھا۔ اس کی شخصیت ہر قسم کے داغ دھبے سے بالاتر تھی۔ اس کی فلم انڈسٹری میں بڑی عزت اور قدر تھی۔ اس نے اپنا جو مقام بنایا تھا شاید ہی کسی اور نے بنایا ہوگا۔ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ دوسرے فلم ساز اس پر رشک کرتے تھے۔

میں نے دوسرے دن اس کی گفتگو کی کیسٹ سنی تو میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے ہاتھ کوئی خزانہ لگ گیا ہو۔ وہ میرے باس کے پاس ایک وصیت کی تیاری کے لیے آیا تھا... کیونکہ اسے کینسر کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اس کا مرض لاعلاج ہے۔ وہ صرف چھ سات مہینے مہمان رہے گا۔

اس کی ایک بھانجی نازنین تھی جو ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی تھی۔ دو کمرے کے ایک فلیٹ میں تنہا رہتی تھی چونکہ وہ معمولی شکل و صورت کی لڑکی تھی اور ساتھ ہی غریب بھی تھی اسی لیے اس کی شادی نہیں ہو پا رہی تھی۔ دنیا میں اس کے علاوہ نازنین کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ وہ نازنین اور اس کے ہونے والے شوہر کے نام پانچ کروڑ کی جائیداد کرنا چاہتا تھا۔

پانچ کروڑ کی رقم کم نہیں تھی۔ رقم اور جائیداد میں شوہر کو نصف ملنا تھا۔ بعد میں ذرا سی کوشش سے بیوی کے حصے کا مالک بھی بنا جا سکتا تھا۔ یہ میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

میں نے نازنین کو دیکھنے اور ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوستی کر کے اسے شیشے میں اتارنا تھا۔ نیک کام میں دیر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں کوئی دوسرا ہاتھ نہ مار دے، میں کف افسوس ملتا رہ جاؤں۔ اس شکار کو پھانسنے کے لیے جال بچھانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

میں شادی شدہ تھا۔ شادی کو دو برس ہو گئے تھے لیکن میں اب تک باپ نہ بن سکا تھا۔ میری بیوی شازیہ نہ صرف دل کش اور موہنی صورت کی تھی بلکہ سگھڑ، نیک سیرت، سلیقہ مند اور شوہر پرست بھی تھی۔ بے حد سیدھی سادی اور بھولی بھالی بھی تھی۔ وہ میرا کتنا خیال رکھتی تھی آج کے دور میں شاید ہی کوئی اور عورت رکھتی ہوگی۔ ایک زرخرید کنیز کی طرح خدمت کرتی اور والہانہ محبت کرتی تھی۔

میں شازیہ کو کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے محض میری خاطر اپنے گھر والوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ کالج کے زمانے میں بیوٹی کوئین کا خطاب پا چکی تھی۔ اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ کزن سے شادی کرے مگر وہ میرے پیار میں پاگل تھی وہ لوگ اسے ہراساں کر رہے تھے۔ میں نے اسے باپ اور کزن سے نجات دلا دی تھی۔ کیونکہ ہوم سیکریٹری کے سیکریٹری سے میرا رابطہ رہتا تھا۔ میری سفارش پر ان کے دماغ درست کر دیے تھے۔ اس احسان کا معاوضہ چکانے کو وہ میری بیوی بن گئی تھی مگر اب مجھے خوبصورتی نہیں دولت چاہیے تھی اور دولت نازنین کے پاس تھی۔

میرے ذہن میں ایک نادر تدبیر آئی تھی۔ اس طرح سانپ بھی مر سکتا تھا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی۔ نازنین کو حاصل کر کے میری پانچوں انگلیاں گھی میں ڈوب سکتی تھیں۔

نازنین کا پتا تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش

UUNOVELS.COM

نہیں آئی۔ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ وہ کسی کام سے اس عمارت سے باہر آئی تھی جس میں اس کا فلیٹ تھا۔ چوکیدار نے مجھے اشارے سے بتایا تھا کہ اسی لڑکی کا نام نازنین ہے اور یہ اسکول ٹیچر ہے۔

میں نے نازنین کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے ایک شکاری مرد کسی لڑکی کو دیکھتا ہے۔ اس کی صورت اتنی اچھی نہ تھی کہ کوئی مرد اس سے شادی کرنے کے لیے مائل ہو سکے لیکن مجھے نازنین نہایت حسین اور بے حد پُرکشش لگی کیونکہ وہ محض جوان لڑکی نہ تھی بلکہ کروڑوں کا اثاثہ تھی۔ میں نے ہر قیمت پر نازنین کے حصول کا تہیہ کر لیا۔ میدان میرے لیے صاف تھا۔ کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ نازنین جیسی لڑکی کو بس میں کرنا میرے لیے چنداں مشکل نہ تھا کیونکہ عورت کے تصوراتی مرد کی طرح خوب صورت، وجیہہ اور دراز قد تھا۔ نادیہ اسی لیے تو میرے اشاروں پر ناچتی تھی۔

نازنین بازار سے کچھ چیزیں لے کر اپنے فلیٹ میں گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کے فلیٹ پر دستک دی۔ اس نے چند لمحوں کے بعد دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کے حیران ہوئی۔

میں نے اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''یہ فلیٹ نمبر بیس ہے نا؟ آپ مس نازنین اعوان ہیں ناں؟''

''جی...... جی......!'' اس نے چونکتے ہوئے میری بات کے جواب میں سر ہلایا۔ ''جی ہاں! میں نازنین اعوان ہوں آپ کون ہیں؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

''میرا نام کامران چودھری ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مٹھاس بھرے لہجے میں کہا۔ ''دراصل میں ایک اسکول کھولنا چاہتا ہوں۔ چونکہ مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے اس لیے میں مشورے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

''آپ مجھ سے مشورہ لینے آئے ہیں؟'' اس کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ اس کی پلکیں ساکت ہو گئیں۔ اگلے لمحے وہ مسکرائی تو اس کے لہجے میں شوخی عود آئی۔ ''میں اسکول چلاتی نہیں بلکہ اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ اسکول چلانے اور پڑھانے میں بڑا فرق ہے۔ مجھے پڑھانے کا تو تجربہ ہے اسکول چلانے کا نہیں۔''

''کیا ساری باتیں یہیں ہو جائیں گی؟'' میں نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ اجازت دیں تو میں اندر آ کر کچھ کہنے کی جسارت کروں۔'' میں نے پھر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''آئی ایم سوری۔'' اس نے فوراً ہی ایک طرف ہٹ کے مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ اس کے چہرے پر خجالت چھا گئی۔ ''پلیز آپ میری اس بدتمیزی کا کوئی خیال نہ کیجیے گا۔''

اس نے مجھے اس کمرے میں لے جا کر... بٹھایا جسے وہ نشست گاہ اور پڑھنے کے لیے استعمال کرتی تھی۔

''اصل بات یہ ہے مس نازنین! آپ کے اسکول میں میرے ایک دوست کی بچی پڑھتی ہے۔ میری بھابی آپ کی بہت تعریف کرتی ہیں۔ آپ کا شمار اسکول کی بہترین استانیوں میں ہوتا ہے۔ بچے آپ کو بے انتہا چاہتے ہیں۔ اتنا پسند کسی اور استانی کو نہیں کرتے۔ پسند کو پیار کا نام دیا جا سکتا ہے۔''

''آپ نے میری حد سے زیادہ تعریف کر دی جب کہ ہرگز میں اس قابل نہیں ہوں۔ بہرکیف آپ کی اس تعریف کا بہت بہت شکریہ۔'' وہ انکساری سے بولی۔

''جو تعریف کے قابل ہوتا ہے اس کی تعریف کی جاتی ہے۔ میں نے ذرا برابر بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دراصل میری یہ دیرینہ تمنا ہے کہ میں ایک اسکول کھولوں تاکہ ناخواندگی کم ہو اور تعلیم کا معیار قائم ہو سکے۔ آج کل نجی اسکول کمرشل بن گئے ہیں اور تعلیم کے نام پر لوٹ مار کر رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی اجارہ داری ختم کروں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اسکول چلانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ اسکول کی پرنسپل

شمارہ فروری 2020ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری خوش کش...... آپ کا انتخاب

☆ اول: کیکلس...... روشن سلطین (یو اے ای)

☆ دوم: اپنا گھر...... احمد (لاہور)

☆ سوم: نرالی...... شوکت حیات (کراچی)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

UUNOVELS.COM

بن کر اسے چلائیں۔"

"کون؟ میں......!" وہ حیرت اور خوشی سے بولی تو اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ "یہ تو میرا دیرینہ خواب ہے جسے آپ پورا کرنا چاہتے ہیں۔"

"اگر آپ کی اسکول چلانے کی تمنا تھی تو آپ نے اپنے ماموں مراد سعید چودھری کی مدد کیوں نہیں لی۔ ان کے لیے آپ کو پچاس ساٹھ لاکھ روپے دینا ایسا ہی ہے جیسے پچاس ساٹھ ہزار ہوں۔"

"آپ نے کس خبیث شخص کا نام لے لیا ہے۔" اس کا منہ بن گیا۔ پھر وہ حقارت سے کہنے لگی۔ "میں انہیں اپنا ماموں نہیں بلکہ بدترین دشمن سمجھتی ہوں۔ پچاس ساٹھ ہزار تو دور کی بات ہے انہوں نے کبھی تہوار پر پچاس روپے تک نہیں دیئے۔ میں تو ان کی شکل تک دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ میری امی بھی ان سے سخت نفرت کرتی تھیں۔ میں ان پر لعنت بھیجتی ہوں۔"

چونکہ وہ بے حد جذباتی ہو گئی تھی اس لیے اس کا چہرہ نفرت اور غصے سے نہ صرف سرخ ہو گیا تھا بلکہ اگر اس کا ماموں سامنے ہوتا تو وہ اسے بلا تامل شوٹ کر دیتی۔

"آیندہ میں کبھی آپ کے ماموں کا نام نہیں لوں گا۔" میں نے اس کا غصہ ختم کرنے کے خیال سے کہا۔

"یہ آپ کی مجھ پر بڑی نوازش ہو گی۔" وہ نارمل ہو کے بولی۔

"اچھا یہ بتائیں کہ کیا آپ اسکول چلانے اور میری پیشکش قبول کرنے کو تیار ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے آپ سے عرض کیا نا کہ یہ میرا دیرینہ خواب ہے۔" وہ خوشی میں ڈوب کے بولی۔ "میں بالکل تیار ہوں۔ یہ میرے لیے بڑی عزت اور اعزاز کی بات ہے۔"

"ٹھیک ہے...... آپ نے میری پیشکش قبول کر کے مجھے اعزاز دیا۔ میں کل پھر حاضر ہو جاؤں گا۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "اجازت ہے؟"

"پلیز! آپ تشریف رکھیے۔" اس نے مجھے ملتجیانہ نظروں سے دیکھا۔ "میں آپ کو چائے پیے بغیر جانے نہیں دوں گی۔ میں چائے بہت عمدہ بناتی ہوں۔ میری چائے کی سہیلیوں میں دھوم ہے جو ایک بار پیتا ہے وہ بار بار پینے کی فرمائش کرتا ہے۔"

اس کے روکنے کے انداز میں پیار تھا۔ میں رک گیا۔ میں خود بھی جلدی جانا نہیں چاہتا تھا تا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ باتیں کر سکوں۔ میں اس پہلی ملاقات کو سود مند رکھنا چاہتا تھا۔ اس خیال سے بھی کہ میرے قرب، میری شخصیت اور میری ذات سے متاثر ہو جائے۔ ہم دونوں فلیٹ کی تنہائی میں بے تکلفی سے باتیں بھی کر سکتے تھے۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ نہ صرف میرے جذبے بلکہ مجھ سے بھی متاثر ہو گئی ہے۔ مجھ سے متاثر نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میں اس کے انجانے خواب کی تعبیر جو تھا۔ اس لیے بھی کہ ایک وجیہہ مرد جو اس کی خزاں رسیدہ زندگی میں چپکے سے بہار بن کے آیا تھا۔ وہ دوران گفتگو مجھے تیکھی نظروں سے دیکھتی اور آنکھوں میں جذب کرتی رہی تھی۔ مجھے اس کی محرومیوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا قرب اسے دیوانہ کیے دے رہا تھا۔ اگر میں پیش قدمی کرتا تو وہ میری جھولی میں پھل کی طرح ٹپک پڑتی... کیونکہ اس کی زندگی میں شاید کوئی مرد نہیں آیا تھا۔ کسی مرد نے لفٹ بھی نہیں دی ہو گی۔

اس نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا پھر پڑوس کے ایک لڑکے سے میرے لیے پیسٹری اور پیٹیز منگوائے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ تکلف نہ کرے۔ صرف چائے کافی ہے لیکن وہ نہ مانی۔ وہ مجھے خاطر تواضع کے بغیر جانے دینا نہیں چاہتی تھی۔ ہم ایک گھنٹے تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ اس نے مجھے کھانے پر روکنے کی کوشش کی تو میں دانستہ رکا نہیں۔

میں اس کے فلیٹ سے نکل کے گھر جاتے ہوئے خوش تھا۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ نازنین بڑی آسانی سے میرے جال میں پھنس جائے گی کیونکہ اسے ساری زندگی مجھ جیسا مرد نہیں مل سکتا تھا۔ مجھ سے شادی کرنے کے لیے فوراً تیار ہو جائے گی۔ میں نے ایک سرد آہ بھری۔ کاش! میں شادی شدہ نہ ہوتا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میری زندگی میں بھی ایسا دن آنے والا ہے لیکن میرے شادی شدہ ہونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ میں اس دولت کے حصول کے لیے اپنی دس پرکشش بیویوں کو قربان کر سکتا تھا۔ عورت کا کیا ہے ایک سے ایک مل سکتی ہے۔ تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی۔ عقل مند وہ ہے جو سنہری موقع سے فائدہ اٹھائے۔

میں اس بات کو نازنین سے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا تھا کہ میں شادی شدہ ہوں... کیونکہ یہ چھپانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ میں دہری ازدواجی زندگی گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ شریعت کی اجازت چار شادیوں کی تھی لیکن ہر عورت سوکن برداشت نہیں کر سکتی۔ نازنین نے مجھ سے نہیں پوچھا

UUNOVELS.COM

تھا کہ میں شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ اس نے مجھے ازخود کنوارا سمجھ لیا تھا اسی لیے وہ مجھ سے جلد ہی بے تکلف ہوگئی۔

میں گھر پہنچا تو میری بیوی شازیہ بے چینی سے میرا انتظار کررہی تھی۔ اسے بنے سنورے دیکھ کر خیال آیا کہ میں نے اسے آج ایک فلم دکھانے اور رات کا کھانا فوڈ اسٹریٹ کے کسی ہوٹل میں کھلانے کا وعدہ کیا تھا۔ میرے گھر پہنچنے میں دیر ہوگئی تھی۔ میں پورے دو گھنٹے کی تاخیر سے گھر پہنچا تھا۔ اس کے چہرے پر ناراضی کی کوئی لکیر تھی اور نہ ہی آنکھوں میں کوئی ملال تھا۔ اس سے پہلے کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ دفتر سے اٹھنے میں دیر ہو جاتی تو سارا پروگرام چوپٹ ہو جاتا تھا۔ اس نے کبھی شکوہ شکایت نہیں کی تھی۔ اس کا دل اس کی طرح خوب صورت ہی نہیں بڑا نرم بھی تھا۔

مجھے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں روشنی تیز ہوگئی۔ اس نے معمول کی طرح میرا استقبال گرم جوشی اور جذباتی انداز سے کیا۔ پھر میرے قدموں میں بیٹھ کر میرے جوتے کے تسمے کھولنے لگی..... موزے اتارے، پھر اس نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور گلاس میں پانی بھر کے پلایا۔ جب میں پانی پی چکا تو وہ میرے ہاتھ سے گلاس لیتی ہوئی بولی۔ ”میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔ آپ ستالیں۔“

”کیوں نہ ہم فلم کا آخری شو دیکھ کے اور کھانا کسی اچھے ہوٹل میں کھا آئیں۔ ہوٹل رات ڈیڑھ دو بجے تک کھلے رہتے ہیں۔“ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے تجویز پیش کی تھی۔ ویسے میرا موڈ نہیں ہو رہا تھا فلم دیکھنے اور کھانا کھانے کا۔

”کسی اور دن یہ پروگرام بنالیں گے۔“ اس نے مسکرا کے جواب دیا۔

”کسی اور دن کیوں؟ آج جانے میں کیا حرج ہے؟“

”اس لیے کہ گھر پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ دو تو بج ہی جائیں گے۔ آپ بہت تھکے ہوئے ہیں کیا میں نہیں جانتی۔ مجھے احساس ہے کہ دفتر میں کتنا کام ہوتا ہے۔ سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی ہے۔“ اس نے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ کیا میں تمہاری خاطر اتنا بھی نہیں کرسکتا؟“

”آپ میری خاطر جانے کیا کیا کرتے رہتے

موسم بہار کے
دل کش نظارے
مارچ کے شمارے
کے یادگار پیمانے

وبائی ہتھیار

وبائی وائرس جس نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا..... بائیولوجیکل وبائی ہتھیاروں کی تجربہ گاہ...... ایکشن، تحیر اور سنسنی خیزی کا شاہکار

انا گیر

سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے خوابوں کے سوداگر کی دل نگار داستان..... **امجد جاوید** کے زور آور قلم کا امتحان.....

الاؤ

مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل..... زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جارہی تھی..... **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ

قاتل و مقتول کی آنکھ مچولی..... قاتل اپنے مقتول کی کھوج میں تھا......

دھند کیسی ہی ہو تب بھی آنکھوں سے اوجھل ہی رہتا ہے......
دھند میں چھپے چہروں کی دوستی، دشمنی اور سفاکی......

چٹنی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے ... محبتیں... شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

ہیں؟'' وہ میرے گلے میں اپنی مرمریں اور گداز بانہوں کا ہار ڈالتے ہوئے بولی۔ ''رات گئے واپسی کے بعد آپ کو صبح سات بجے دفتر جانا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی۔''

''میں بہت شرمندہ ہوں شازیہ۔'' میں نے ندامت سے کہا۔ ''تم......''

شازیہ نے جھٹ سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ چند ساعتوں کے بعد بولی۔ ''آپ اتنی سی بات کے لیے کیوں شرمندہ ہو رہے ہیں؟''

''تم کتنی اچھی اور پیاری بیوی ہو۔'' میں نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ ''میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ مجھے تم جیسی بیوی ملی۔''

''کیا میں خوش نصیب نہیں ہوں کہ مجھے آپ ملے۔'' اس کے ہونٹ میرے لبوں کا جواب دے کے کہنے لگے۔ ''آپ میرے محبوب ہیں۔ میرے مجازی خدا ہیں۔ میں آپ پر جتنا ناز کروں کم ہے۔''

پھر وہ لباس بدل کر آئی اور اس نے میز پر کھانا چن دیا۔ شازیہ کی جگہ کوئی اور ہوتی تو نہ صرف ناراض ہو جاتی بلکہ اوپر سے دس کھری کھری سناتی۔ ایسی بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر بیویاں ہوتی ہیں جو شوہر کے دیر سے آنے پر تفریح کا سارا پروگرام چوپٹ ہونے پر ناراض نہ ہوتی ہوں۔ شازیہ بڑی حساس تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دفتر میں کتنا کام ہوتا ہے۔

آج میں پہلی بار تو دیر سے گھر نہیں آیا تھا۔ ایسا کئی بار ہو چکا تھا لیکن آج وہ اتنی موہنی نہیں لگی تھی جتنی پہلے لگتی تھی۔ اس کی وجہ نازنین تھی۔ میں نے آج جو باتیں کیں، اس میں نہ صرف اداکاری اور ریاکاری تھی بلکہ منافقت بھی تھی۔ نازنین، شازیہ کے پیر کی جوتی بھی نہ تھی۔ مگر اس لیے وہ حسین و جمیل لگی تھی کہ وہ کروڑوں کی وارث ہونے والی تھی۔ اسے پانے کے بعد میرا مستقبل تابناک ہو جاتا۔ میں نے دل میں سوچا کہ کروڑوں کا مالک بن جانے کے بعد میں امریکا کینیڈا چلا جاؤں گا۔

میں دوسرے دن دفتر پہنچا تو میرے باس نے مجھے سعید چودھری کی وصیت ٹائپ کرنے کے لیے دی۔ اس کا مضمون باس نے لکھا تھا۔ سعید چودھری نے اپنی تمام دولت اور جائیداد نازنین کے نام کروا دی تھی۔ اس نے جو بیمہ پالیسی لی ہوئی تھی وہ بھی اس کے نام کر دی جو دو کروڑ کی تھی۔

نازنین اس بات سے بالکل بے خبر تھی کہ اس کی زندگی میں خوش قسمتی کے ساتوں در ایک ساتھ کھلنے والے ہیں اور اس کا شمار ملک کے دولت مندوں میں ہونے والا ہے۔ اس نے جو بے کیف زندگی گزاری ہے اب وہ بے پناہ مسرتوں میں بدلنے والی ہے۔ اس کا ماموں اسے جو سرپرائز دینے والا ہے وہ اس کی نفرت کو دھو دے گا۔ وہ اپنے ماموں کو چاہنے لگے گی۔ یہ سب دولت کا اعجاز ہوگا جو نفرت کو محبت میں بدل دے گا۔

صرف میں اور باس اس بات سے واقف تھے کہ نازنین کی زندگی میں خوشیوں کے پھول کھلنے والے ہیں۔ ایسی وصیتیں اور دوسرے امور کے کاغذات جو ایک راز ہوتے تھے وہ صرف مجھ سے ٹائپ کراتا تھا کیونکہ اسے صرف مجھ پر اعتماد تھا۔ گو کہ وہ بڑا ہی کائیاں تھا لیکن میں اس سے کہیں زیادہ عیار تھا اور وہ اس بات سے لاعلم تھا کہ اس کی بدولت میں نے بلیک میلنگ کر کے بہت اتنا کچھ حاصل کر لیا ہے۔

میں نے دفتر سے نکل کے سیدھا نازنین کے ہاں کا رخ کیا۔ میں نے اس سے دوسرے دن آنے کا وعدہ کیا تھا کیونکہ ایک ایک لمحہ قیمتی اور بہت زیادہ اہم تھا۔ میں اس سنہرے موقع کو ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں جلد سے جلد اسے دام محبت میں گرفتار کر کے اس سے شادی کر لینا چاہتا تھا۔ مجھے اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں نازنین کے کانوں میں بھنک پڑ جائے تو وہ کسی قیمت پر مجھ سے شادی نہیں کرے گی اور میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں۔ کیا معلوم کہ کوئی اور یہ اونچا ہاتھ مار جائے اور پھر اس کے دولت مند ہوتے ہی اس سے شادی کرنے کے لیے امیدواروں کی قطار لگ جائے گی۔ اس کی بدصورتی پر دولت کی نقاب پڑ جائے گی۔ وہ ان کی نظروں میں دنیا کی حسین ترین عورت بن جائے گی۔

آج شام سعید چودھری نے دفتر آ کر اپنی وصیت پر دستخط کر دیے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ معلوم نہیں کب یہ موذی مرض اسے کسی عفریت کی طرح ہڑپ کر لے... کیونکہ اس کی بیماری اور موت کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔

اس بات کا قوی امکان تھا کہ کہیں اس کا ماموں اسے سرپرائز دینے کے لیے آگاہ کر دے اس لیے مجھے کسی قیمت پر اس کی نوبت آنے نہیں دینا تھی۔ جانے کب وقت کروٹ لے لے۔ وقت کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ وہ کسی کا نہیں ہوتا۔ میں نازنین کو جتنا جلد ہو سکے دام محبت میں گرفتار کر لینا چاہتا تھا۔

UUNOVELS.COM

نازنین میرے انتظار میں اس طرح مری جا رہی تھی جیسے وہ برسوں سے میری راہ تک رہی ہو جیسے ہم دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی ہو۔

پھر وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے نشست گاہ میں لے آئی، بولی۔ ''آج آپ کو کھانا کھا کے ہی جانا ہوگا۔ میں آپ کا انکار اور کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔''

میں نے ماحول کو رومان پرور بنانے اور اس کا دل خوش کرنے کے لیے اس کا ہاتھ تھام کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ میں یہ ناٹک اس لیے کھیلنا چاہتا تھا کہ میرا انکشاف سن کے وہ مجھ سے متنفر نہ ہو جائے۔ ''میری کیا مجال ہے کہ ان خوب صورت ہاتھوں کے پکے ہوئے کھانے نہ کھاؤں۔''

وہ پہلی رات کی دلہن کی طرح شرما گئی۔

کھانا بڑا لذیذ اور مزے دار تھا۔ اس نے بڑا اہتمام کیا ہوا تھا۔

''نازنین۔'' میں نے چائے پینے کے دوران سنجیدگی سے کہا۔ اس سنجیدگی نے اسے چونکا دیا تھا۔ ''میں ایک ایسی بات کا انکشاف کرنا چاہتا ہوں جسے سن کے تمہیں برقی جھٹکا سا لگے گا۔ لہٰذا ذرا دل مضبوط کر لو۔''

''میرا دل تو پہلے ہی زخمی ہے۔ آپ کہیں...... میں یہ زخم بھی سہہ لوں گی۔'' اس نے بھی بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''نازنین! بات یہ ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میری شادی کو دو برس کا عرصہ ہو چکا ہے۔'' اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس کے اندر کا کرب چہرے اور آنکھوں میں آ گیا۔

''میں شادی کر کے پچھتا رہا ہوں۔ وہ ایک حسین عورت ہے۔''

''آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ آپ کو ایک خوب صورت بیوی ملی۔'' وہ بے جان لہجے میں بولی۔

''خوش نصیب نہیں بلکہ بدنصیب ہوں۔ کیونکہ وہ جتنی حسین ہے اتنی ہی بدمزاج ہے۔ بات بات پر جھگڑتی ہے۔ اس کے علاوہ جو بات ناقابل برداشت ہے وہ یہ کہ بدچلن ہے۔ اسے طلاق دینے کے بعد کیا تم مجھ سے شادی کر لوگی؟''

وہ میری بات سن کر سرشار ہو گئی اور سنجیدہ ہو کر پوچھا۔ ''لیکن میں ایک معمولی لڑکی ہوں۔ کیا آپ واقعی مجھ سے شادی کرنے کے لیے سنجیدہ ہیں۔''

''نازنین! یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ تم معمولی ہو؟'' میں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

''دنیا کہتی ہے۔ میں روز آئینہ دیکھتی ہوں۔ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ میں ایک حقیقت پسند لڑکی ہوں۔ میں خوابوں میں رہنے والی ہوں تا کہ دل کو خوش رکھ سکوں۔''

''نہیں ایسا کچھ نہیں اگر ایسا ہوتا تو میں... آگے قدم نہیں بڑھاتا۔ تم وہم میں کیوں مبتلا ہو؟'' میں نے کہا۔

''پلیز! آپ میری جھوٹی تعریف کر کے مجھے فریب نہ دیں۔'' اس نے التجا کی۔

''عورت کی ظاہری خوب صورتی، پُرشکوہ سراپا، تناسب اور فراز سب کچھ نہیں ہوتے، تمہارا دل اندر سے بہت خوب صورت ہے۔ مجھے یہ کہنے دو کہ تم شعلہ بدن ہو۔ تم نہیں جانتیں کہ مردوں کا دل عورت کی ظاہری خوب صورتی سے جلد بھر جاتا ہے۔ عورت کی باطنی خوب صورتی مرد کا دل جیت لیتی ہے۔ تم میں باطنی خوب صورتی بہت ہے اب بتاؤ کیا تم مجھ سے شادی کرنا پسند کرو گی؟''

میں نازنین سے جلد سے جلد شادی کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے ماموں کی زندگی اور موت کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ ماموں کی موت کے بعد وہ مجھ سے ہرگز شادی نہ کرتی۔ اسے پتا چل جاتا کہ میں نے کس لیے محبت کا یہ ناٹک رچایا۔ شادی کے بعد پتا چلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ شادی کے بعد میں اس سے دھوکے سے ایسے کاغذات پر دستخط کرا سکتا تھا کہ وہ ساری زندگی میری مٹھی میں رہتی اور کسی بھی حسین نوجوان لڑکی کو بیوی بنا سکتا تھا۔

مجھے پہلی فرصت میں نازنین سے شادی کرنی تھی۔ اس سے پہلے کسی طرح شازیہ کو طلاق دینا تھی۔ اس کے بعد ملازمت سے استعفیٰ بھی دینا ضروری تھا۔ اس بات کی جلدی اس لیے تھی کہ اخبار میں خبر چھپی تھی کہ مراد سعید چودھری اسپتال میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں زیر علاج ہیں۔

میں نے دوسرے ہی دن ایک شخص سے بھاری رقم کے عوض معاملہ طے کر لیا۔ اس نے دوسرے دن ہی معاملہ نمٹا دیا۔ میرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ دور کر کے میرا سب سے بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ ہوا یہ تھا کہ میں نے دفتر جاتے وقت شازیہ سے کہا تھا کہ وہ اچھی طرح سے تیار ہو کے بیٹھے۔ میں شام کے وقت آؤں گا۔ وہ کالی ساڑی اور بغیر آستین کا بلاؤز جو نیچی تراش کا ہے وہ پہنے میں نے اسے چھ بجے کا وقت دیا تھا۔ میں پانچ بجے ہی گھر پہنچ گیا۔ گھر پہنچ کے جو منظر دیکھا وہ یہ تھا کہ شازیہ ایک خوش پوش مرد کے

UUNOVELS.COM

بازوؤں کی گرفت میں نامناسب حالت میں تھی۔ مجھے کمرے میں آتے دیکھ وہ مرد مجھے دھکا دے کر بھاگ گیا تھا۔ وہ اس مرد کے بازوؤں کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کررہی تھی۔ یہ منظر طلاق کا سبب بن گیا۔ شازیہ بہت روئی، گڑگڑائی اور اپنی صفائی پیش کرنے لگی لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کی عزت پر آنچ نہیں آئی ہے۔ میں چونکہ ایک فیصلہ کر چکا تھا مجھے ہر صورت میں یہ کانٹا نکالنا تھا تو میں نے اسے بڑی بے رحمی سے نکال پھینکا۔ میں نے اس عیار شخص کو تاکید کی تھی شازیہ پر آنچ نہ آئے۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ میں نے دونوں کی باہم آغوش کی عکس بندی موبائل پر کرلی تھی۔

میں نے دوسرا کام یہ کیا کہ فوراً ہی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ باس نے بہت چاہا کہ میں یہ ملازمت نہ چھوڑوں۔ وہ میری تنخواہ دگنی کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔ میں نے اس کی ہر پیشکش کو ٹھکرادیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اب بزنس کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے سمجھایا بھی کہ میں بزنس کے چکر میں نہ پڑوں۔ میں ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد اسی شام نازنین کے ہاں پہنچا۔ وہ میری محبت اور رفاقت پا کے بہت خوش تھی۔ بڑی مہربان اور فیاض بن گئی تھی۔ میری خوب مدارت کررہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''نازنین! کل ہی ہم دونوں شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔ میں نے تمہاری خاطر اپنی بیوی کو طلاق دے دی بلکہ اپنی ملازمت سے بھی استعفیٰ دے دیا، اب میں تمہارے بغیر ایک دن کیا ایک گھڑی بھی نہیں رہ سکتا۔''

''اس...... تم نے اپنی بیوی کو اتنی جلدی طلاق دے دی؟'' اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''اور دس برس پرانی ملازمت بھی چھوڑ دی؟ کیوں؟''

''اس لیے کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک غیر مرد کے ساتھ خواب گاہ میں نامناسب حالت میں دیکھا تھا۔'' میں نے مبالغہ آمیزی کرتے ہوئے بتایا۔ ''اس کی بے شرمی، بے غیرتی اور ڈھٹائی دیکھو کہ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ یہ میرا محبوب ہے، اب میں تمہارے ساتھ ایک دن بھی گزارہ نہیں کرسکتی۔ لہٰذا تم مجھے طلاق دے دو۔ ملازمت اس لیے چھوڑی کہ مجھے مجبور کیا گیا۔ میں استعفیٰ دے دوں۔ میرا باس چونکہ میری جگہ ایک عورت کو لانا چاہتا ہے جو اس کی دیرینہ محبوبہ ہے۔''

''میں نے ایک روز تمہاری بیوی کو دیکھا تھا۔'' نازنین نے انکشاف کیا۔ ''وہ ایسی نہیں لگتی تھی جیسی تم بتا رہے ہو۔''

''تم نے میری بیوی کو کب اور کہاں دیکھا تھا؟'' میں تحیرزدہ ہوگیا۔ ''تمہاری اس سے کہاں ملاقات ہوئی تھی۔''

''تم جس فلیٹ میں رہتے ہو اس عمارت کی تیسری منزل پر ایک عورت زیب النساء رہتی ہے۔ وہ میرے اسکول کی ٹیچر ہے۔ میں اس کی بہن کی منگنی میں گئی تھی۔ وہ مجھے زینے پر مل گئی تھی۔ اس وقت میں نے ایک نہایت حسین وجمیل عورت کو سیڑھیوں سے اترتے دیکھا۔ اسے دیکھ کے میرے سینے سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ میں نے دل میں بڑے دکھ سے سوچا تھا کہ اے اللہ تو نے مجھے ایسا کیوں نہیں بنایا۔ میں نے زیب النساء سے پوچھا کہ یہ عورت کون ہے؟ اس نے تمہارا نام لیا اور بتایا کہ یہ تمہاری بیوی شازیہ ہے۔''

''وہ ویسی نہیں تھی جیسی نظر آتی تھی۔ اب اس بدکار عورت کا نام میرے سامنے مت لو۔ یہ بتاؤ کہ کل شادی کے لیے تیار ہو نا؟ میں چاہتا ہوں کہ شادی کر کے ہم ہنی مون منانے کے لیے کل سوات چلے جائیں گے۔ وہاں ایک ماہ گزار کے واپس آجائیں گے۔''

''میں کل کیا ابھی اور اسی وقت تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے اگر تم برا نہ مانو۔''

اس کی شرط والی بات مجھے پتھر کی طرح لگی کہ میرا وجود جھنجھنا گیا۔

''کیسی شرط؟'' میں نے حیرت اور ناگواری سے پوچھا۔

''میں تمہاری محبت کا امتحان لینا چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو کہ نہیں۔'' نازنین کہنے لگی۔ ''اس کے علاوہ مجھے تحفظ اور ضمانت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ میں ایک عام سی شکل والی عورت ہوں، اسکول کی ملازمت چھوڑنے کے بعد مجھے پھر ملازمت نہ مل سکے گی۔ یہ تم جانتے ہو کہ آج کل ملازمت کا ملنا کتنا دشوار ہے۔ اگر تم کل کسی وجہ سے مجھے چھوڑ دو گے تو میں کیا کروں گی۔ کہاں جاؤں گی؟ میری یہ کچھ پونجی ہوگی تو گزارہ کروں گی۔''

''بس...... اتنی سی بات کے لیے فکرمند اور پریشان ہورہی ہو؟'' میں ہنس پڑا۔ ''تمہارے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ میری محبت میں نہ تو کوئی کھوٹ ہے اور نہ ہی بناوٹ۔ میں کل ہی تمہارے نام مکان لکھ دوں گا اور شادی کی رات منہ دکھائی میں اس کے کاغذات بنا کر دے دوں گا۔''

UUNOVELS.COM

دوسرے دن ہم دونوں نے سول میرج کر لی اور میں نے جائیداد کے کاغذات پر اس کے دستخط لیے انہی میں کچھ ایسے کاغذات رکھ دیئے تھے جو کل اس کی جائیداد ہڑپ کرنے میں کام آ سکتے تھے۔ وہ بڑی حیران اور خوش تھی کہ میں نے نہ صرف اپنا مکان اس کے نام کر دیا بلکہ دس لاکھ کا چیک بھی اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ اس نے فرط مسرت سے پاگل ہو کے میرے ہاتھوں کو چوم لیا۔ پھر بولی۔ ”تم واقعی مجھ سے سچی محبت کرتے ہو۔“

☆☆☆

ہم دونوں دس دن ہنی مون گزار کے واپس آ گئے اگر وہ حسین اور پُرکشش عورت ہوتی تو مزید بیس دن اس کے ساتھ گزار دیتا ایک تو وہ شادی سے پہلے ہی مہربان ہو گئی تھی، پھر اتنی عام شکل کی تھی کہ ایک ماہ کی مدت اس کے ساتھ گزارنا کرب ناک تھا۔ میں نے خواب ناک فضا میں اس کے ساتھ دس دن کیسے گزارے یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔ کروڑوں کی دولت کے حصول کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ وہ میں بیل رہا تھا۔

اس کے ماموں اسپتال میں زیر علاج تھے۔ ہنی مون کی روانگی سے قبل شادی کی اطلاع انہیں رسمی طور پر دے دی گئی تھی۔ وہ ان کی دعا لینے بھی نہیں گئی تھی جب کہ میں نے اسے بہت سمجھایا تھا، کہا تھا اور اصرار بھی کیا تھا کہ اسپتال جا کے ان کی دعا لیتی آؤ... ورنہ وہ ناراض ہو جائیں گے۔

شازیہ کی شادی ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے ایم ڈی سے ہو گئی۔ اس کی اطلاع میرے ایک دوست نے دی تھی۔ جانے کیوں مجھے سخت صدمے کا احساس ہوا تھا۔ شازیہ جیسی روایتی، نیک سیرت اور شوہر پرست عورت خوش قسمت مردوں کو ملتی ہے۔ نازنین اس کے برعکس تھی۔ وہ ایک پھوہڑ عورت تھی، اسے سلیقہ اور سگھڑپن چھو کے بھی نہیں گیا تھا۔ کھانے اچھے نہیں پکاتی تھی۔ اس نے مجھے جو کھانے کھلائے تھے اس کی پڑوسن کے ہاں کے پکے ہوئے تھے۔ وہ اسے دو وقت کھانا پکا کے دیتی تھی جس کی وہ ماہانہ اجرت لیتی تھی۔ نازنین کا جو حسن اور خوبی تھی وہ یہ کہ وہ کروڑ پتی عورت بننے والی تھی۔

کوئی تین ماہ کے بعد نازنین کے ماموں چل بسے۔ ان کی موت سے مجھے جتنی خوشی ہوئی میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جس روز ان کی تجہیز و تدفین ہونے والی تھی مجھے ان کی کوٹھی میں نادیہ مل گئی۔ میں نازنین کو ساتھ لے آیا تھا۔ وہ آنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہ تھی۔ جنازہ مسجد میں لے جانے میں خاصی دیر تھی۔ نادیہ ایک قریبی ریسٹورنٹ میں لے گئی۔ نازنین کو زبردستی ساتھ لانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کے خاندان کی تھی اور ان کی ساری دولت اور جائیداد کی وارث بھی تھی۔ نادیہ کے علم میں یہ بات آج ہی آئی تھی۔ نازنین مراد سعید چودھری کی سگی بھانجی ہے۔۔ نادیہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین اور پُرکشش گداز بدن کی ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے سے اطمینان اور آسودگی ٹپک رہی تھی۔ اس نے کافی کا آرڈر دینے کے بعد کہا۔

”شاید یہ بات تمہارے علم میں نہیں ہے کہ اب میں باس کی سیکریٹری ہوں۔ مجھے تمہاری جگہ مل گئی ہے۔“

”مبارک ہو۔“ میں نے بڑے بے دلی سے کہا۔ مجھے یہ خبر سن کے اس سے حسد کا احساس ہوا تھا۔ ”سیکریٹری کے علاوہ تمہیں اس کی بیوی کے فرائض انجام دینے پڑتے ہوں گے؟“

”ہاں۔“ اس نے سر ہلا کے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ ”اس دنیا میں مرد عورت کی مجبوری سے بے جا فائدہ اٹھاتا ہے؟“

اس دنیا اور اکثر دفاتر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہاں ہر شخص خودغرض اور مطلب پرست ہے۔“ میں نے کہا۔

”خیر..... ایسا بھی نہیں۔“ وہ تکرار کے انداز میں بولی۔ ”تم نے اپنی نیک سیرت اور وفا شعار بیوی کو طلاق دے کر اچھا نہیں کیا۔ وہ ہرگز ایسی عورت نہ تھی کہ کسی غیر مرد سے دل بہلائے۔ اس نے مجھ سے مل کے سارا واقعہ بتایا تھا۔ میں حیران تھی کہ ایسا کیوں ہوا؟ مگر نازنین کو دیکھ کر سب سمجھ گئی ہوں مگر یہ بتا دوں کہ تم پوری روٹی کے چکر میں آدھی سے بھی گئے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے اسے گھورا۔

”وصیت نے تمہارے ارمانوں اور خوابوں کا خون کر دیا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

”بات یہ ہے کہ سعید چودھری نے ایک ہفتہ قبل اپنی وصیت تبدیل کر دی تھی۔ انہوں نے اپنی ساری دولت اور جائیداد کینسر کے مریضوں کے مفت علاج کے لیے وقف کر دی ہے۔“

UUNOVELS.COM

شکست

مدیر سرگزشت

السلام علیکم!

ہمارے اردگرد کیسی کیسی عورتیں کیسے کیسے پھندے پھیلائے بیٹھی ہیں اس کا ایک ہلکا سا عکس پیش کر رہا ہوں۔ اقصیٰ اور اس کی ماں نے کیسے اپنے مستقبل کو محفوظ بنایا انہی واقعات کو میں نے کہانی کے انداز میں پیش کیا ہے۔

خلیل جبار

(حیدرآباد)

میں ابھی کاؤنٹر پر بیٹھا ہی تھا کہ اچانک میری نظر ایک دوشیزہ پر پڑی۔ میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اسے دیکھ کر مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس غریب علاقے میں ایسی خوب صورت دوشیزہ بھی ہوسکتی ہے۔ اس کی عمر مشکل سے 18 سال ہوگی۔ وہ دکان میں اپنی پسند کی چیز تلاش کر رہی تھی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ میں اسے مسلسل دیکھ رہا ہوں۔ یہ کوئی اچھا عمل نہیں تھا کہ دکان میں آنے والے گاہک کو اس طرح دیکھا جائے۔ میں فطرتاً حسن پرست واقع ہوا ہوں جہاں

خوب صورت لڑکی دیکھی اس پر فدا ہو گیا۔ اس دوشیزہ کے نقش ونگار خوب تھے۔ میرے دل کو بھا گئے تھے۔ اچانک اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں نے اسے اپنی جانب متوجہ دیکھ کر نظریں نیچی کر لیں تاکہ اسے یہ پتا نہ چلے کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں، اسے یہی لگے کہ میری نظر اس پر اتفاقاً اٹھی تھی۔

میں مختلف علاقوں میں ایک ماہ کے لیے دکان کرائے پر لیتا ہوں اور اس دکان میں مارکیٹ سے کم قیمت پر گھروں میں استعمال ہونے والا سامان، پلاسٹک سے تیار کیے برتن اور دیگر سامان ہوتا ہے۔ غریب آبادی میں بسنے والے یہ بھی نہیں دیکھتے کہ میں ان کو جو سامان دے رہا ہوں وہ زیادہ پائیدار نہیں ہے۔ یہ کم عرصے میں ٹوٹ پھوٹ جائے گا اور ان کو دوبارہ وہ سامان خریدنا پڑے گا۔ غریب لوگوں کی بھی مجبوریاں ہیں ان کی آمدنی محدود ہوتی ہے اور اس میں انہیں زیادہ ضرورت کا سامان درکار ہوتا ہے اس لیے ناقص میٹریل سے تیار کردہ سامان خرید لیتے ہیں۔

غریب آبادی کے بعض علاقے ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں میں ایک ماہ دکان کھولنے کا ارادہ کر کے آتا تھا مگر گاہکوں کی زیادہ آمد، دکان کی زیادہ سیل دیکھ کر اپنا ارادہ بدل دیتا ہوں، کسی علاقے میں چھ ماہ اور کسی علاقے میں سال بھی گزار لیتا ہوں۔

میرا اس کام کی طرف دھیان نہیں تھا۔ میں ایک اخبار میں شعبہ اشتہارات میں کام کرتا تھا۔ اخبار کی نوکری میں ان دنوں میرا گزارہ بہت مشکل ہو گیا تھا۔ مجھے مشکل میں دیکھ کر میرے دوست جمال نے مجھے مشورہ دیا کہ مختلف غریب علاقوں میں ہلکی کوالٹی کا سامان لے کر فروخت کروں، میں اس کی بات پر بے اختیار مسکرا دیا۔

''تم نے مجھے کیا بے وقوف سمجھا ہوا ہے۔''

''اس میں بے وقوفی کی کون سی بات ہے۔'' وہ بولا۔

''ناقص میٹریل سے تیار کردہ برتن اور دیگر اشیاء جلد ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں اور گاہک مجھ سے لڑنے کو آئیں گے کہ یہ تم نے کیسا سامان دیا ہے جو چھ ماہ بھی نہیں چلا۔''

''تم مجھے کب سے جانتے ہو؟''

''تقریباً دس سال ہو گئے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''ان دس سالوں میں بھی تم نے میری دکان پر کسی گاہک کو شکایت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''میرے سامنے اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔''

''میں تمہیں اب اصل وجہ بتاتا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں ان کمپنیوں سے جو پلاسٹک کے برتن اور دیگر سامان تیار کرتی ہیں ان سے ٹرکوں کے حساب سے مال خریدتا ہوں۔ میری ان سے شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ جو مال تیار کر رہے ہیں ان کی کوالٹی تھوڑی ہلکی کر دو تاکہ جو چیز مارکیٹ میں پندرہ روپے کی مل رہی ہے میں وہ چیز بارہ روپے کی بیچ دوں جو چیز دس روپے کی فروخت ہو رہی ہے وہ آٹھ روپے کی فروخت کروں۔ فیکٹریوں کے پاس پیسا آ رہا ہوتا ہے، وہ میری بات مان لیتی ہیں۔ میری دکان میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو سو روپے سے زیادہ کی ہو۔ خود سوچو اتنی کم قیمت کا سامان لے کر جانے والا کیا مجھ سے لڑنے آئے گا۔ جب کوئی چیز ٹوٹتی ہے۔ بندہ سمجھ جاتا ہے یہ چیز مجھے کم پیسے میں ملی ہے اسی لیے جلدی ٹوٹ گئی ہے۔ اس کی قوت خرید اتنی نہیں ہے کہ پائیدار چیز خرید سکے اس لیے وہ واپس وہی ہلکی کوالٹی کی چیز خرید لیتا ہے کہ چند دن نکل ہی جائیں گے پھر کبھی پیسے ہوں گے تو اچھی کوالٹی کی چیز خرید لیں گے ابھی کام چلاؤ۔''

''غریب لوگوں کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ پائیدار چیز اس لیے نہیں خریدتے کہ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے، اس لیے ہلکی کوالٹی کی چیزیں مارکیٹ میں بکتی رہتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''بعض لوگ پیسے ہونے کے باوجود اچھی کوالٹی کی چیزیں نہیں خریدتے جیسے ہوٹل مالکان اور دیگر لوگ سامان چوری ہو جانے کے خوف سے ہلکی کوالٹی کے جگ اور گلاس ہوٹل میں رکھتے ہیں۔'' جمال نے کہا۔

''یہ بات میں نے بھی نوٹ کی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم کون سا ایک علاقے میں پورا ایک سال دکان چلاؤ گے۔ ایک ماہ کے لیے دکان کرائے پر لینا۔ دکان کی سیل جب تک اچھی رہے چلاتے رہو، تمہاری دکان کی علاقے میں ایک ماہ، کسی میں تین ماہ چل جائے گی اس سے زیادہ چل جانے پر اسے بونس سمجھنا۔ جب دیکھو دکان کی سیل نیچے آ گئی ہے۔ علاقہ تبدیل کر لینا۔''

''میں اپنی دکان کو دن رات محنت سے جماؤں گا، پھر دکان کی سیل نیچے کیسے آئے گی۔ کاروبار میں دکان جمنے پر کب ختم کی جاتی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''میری جان یہ کام ایسا ہی ہے۔ ایک جگہ مستقل نہیں چل سکتا۔ اسے بار بار دوسرے علاقے میں لے جانا پڑتا ہے۔''

''میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آ رہی ہے۔'' میں

UUNOVELS.COM

نے کہا۔

"جب علاقے کے لوگوں کو یہ بات پتا چل جاتی ہے کہ میرے پاس پائیدار چیز نہیں ہوتی اس لیے دکان کی سیل کم ہو جاتی ہے اور مجھے دوسرے علاقے میں جانا پڑتا ہے۔ اکثر تم دیکھتے ہو ہمارے شہر میں جوتوں اور چپلوں کی دکان کھلتی ہیں اور اس میں مارکیٹ سے کم ریٹ پر جوتے اور چپل بکتے ہیں۔ جب ان کی سیل کم ہو جاتی ہے وہ دوسرے علاقے میں چلے جاتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا کہ مالکان سیلز مین تبدیل کر دیتے ہیں، کبھی خود دکان پر نہیں بیٹھتے کہ کہیں گاہک ان کو پہچان نہ لے کہ ان کی فلاں علاقے میں دکان تھی اور اس کی چپل یا جوتے غیر معیاری نکلے تھے۔ ایسا کاروبار میں کرنا پڑتا ہے۔"

میری سمجھ میں اس کی بات آرہی تھی اور میں دلچسپی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم مجھے دس سال سے جانتے ہو۔ میں نے جب یہ کام شروع کیا تھا، اس وقت میری کیا حالت تھی اب کیا پوزیشن ہے۔"

جمال درست کہہ رہا تھا۔ میں نے اس کی وہ حالت بھی دیکھی تھی کہ وہ پرانی بائیسکل پر دکان آتا تھا۔ اس نے پھر موٹر سائیکل اور پھر کار خرید لی۔ پیسے کی بھی خوب فراوانی ہو گئی تھی۔ اب وہ جو کام کر رہا تھا وہ کروڑوں میں ہوتا ہے۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر میں یہ کام کس طرح کر سکتا ہوں، میرا مطلب ہے میں اخبار میں اشتہارات کا کام کرتا ہوں یہ کام بھاگ دوڑ کرنے والا ہے۔" میں نے کہا۔

میرے دل کو جمال کی بات لگی تھی۔ اس کام سے میری آمدنی میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا۔ تھوڑی دیر قبل میں اس کام کو برا کہہ رہا تھا مگر جمال کی پوزیشن دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش مچل اٹھی تھی کہ مجھے جمال کی آفر کو قبول کر لینا چاہیے۔

"اخبارات میں جو اشتہار دینے والی پارٹیاں ہیں وہ تمہیں ہی دیتی ہیں۔ کوئی تو اور بھی جائے گا تو اسے اشتہار دینے سے انکار کر دیتی ہیں۔"

"بالکل اخبار میں اصول ہے اخبار کے مالکان بھی میری پارٹی کا اشتہار میری مرضی کے بغیر شائع نہیں کرتے۔"

"موبائل تمہارے پاس ہے، پارٹیوں سے موبائل پر رابطہ رکھو، دکان میں کم از کم شروع میں ایک ملازم رکھ لینا۔ کام بڑھنے پر ایک سے زائد ملازم بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ موٹر سائیکل پاس ہے۔ پارٹی اشتہار دینے کو بلائے تو چلے جانا اور اشتہار لے کر آجانا۔ شام کو دفتر آدھے گھنٹے کے لیے چلے جانا۔ اخبارات کو تمہارے آفس میں بیٹھنے سے غرض نہیں، اشتہار سے غرض ہے۔ اشتہارات لے کر آ جانا جو مستقل اشتہار ہوتے ہیں وہ تم موبائل پر اخبار کو بتا سکتے ہو کہ کون کون سا اشتہار کل چلے گا۔ تمہاری تھوڑی دیر کی غیر موجودگی میں ملازم کے لیے دکان سنبھالنا کوئی مشکل کام نہیں ہو گا۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟" جمال نے کہا۔

"تمہاری بات سمجھ میں آرہی ہے۔ کچھ سوچنا پڑے گا۔"

"دیکھو سوچنے میں ہفتے سے زیادہ نہیں لگانا، میں یہ دکان پندرہ دن میں ختم کر کے اپنا نیا کام شروع کرنے والا ہوں۔ ان پندرہ دن میں میرے پاس بیٹھ کر کام اور اس کی باریکیاں سمجھو۔ کام کا آغاز کرنے میں تمہارا سرمایہ کچھ بھی نہیں لگے گا۔ پیسا میرا ہو گا محنت تمہاری ہو گی۔ منافع آدھا، آدھا۔ جب تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ کاروبار میں اپنا مکمل پیسا لگا سکتے ہو اس وقت تمہارا سارا منافع ہو گا۔" جمال نے کہا۔

اس کی بات سن کر میری آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ میں دس سال سے اس کے پاس آرہا تھا۔ اس کام کو خاصی حد تک سمجھ چکا تھا۔ بس کاروباری باریکیاں سمجھنی تھیں۔ وہ جمال سے سیکھی جا سکتی تھیں۔ جمال میرا مخلص دوست ثابت ہوا تھا۔ اکثر عید اور دیگر تہوار پر مجھے قرض بھی دے دیتا تھا جو اشتہارات کی مد میں کٹ جاتے تھے۔

میں نے رات بھر اس کام کے بارے میں سوچا اور اسے دوسرے دن صبح جا کر ہاں کہہ دی۔ میری بات سے وہ خوش ہو گیا۔ اس طرح میں نے کام کا آغاز کر دیا۔ چند ماہ میں ہی اس قابل ہو گیا تھا کہ میں نے جمال کی کاروبار میں لگائی رقم ادا کر دی اور پورے کاروبار کا مالک بن گیا تھا۔ اخبار سے بھی اس کام میں سہارا ملا تھا۔ میں اشتہار کی رقم پارٹیوں سے نقد لے کر کاروبار میں لگا دیتا۔ اخبار کے مینیجر کو تھوڑی، تھوڑی رقم قسطوں میں ادا کر دیتا تھا۔

انسان کے پاس ڈھیروں دولت آجانے پر اس میں کچھ خرابیاں بھی پیدا کر دیتی ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ غریب علاقوں سے تعلق رکھنے والی غربت کا شکار کچھ خواتین کاروباری مالکان کی قربت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس کے عیوض بہت معمولی رقم لے کر وہ خوش ہو جاتی ہیں۔ میں اخبار کی نوکری میں پندرہ سال کی عمر میں آگیا تھا۔ اب میری عمر 25 سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ میں بھرپور جوان تھا۔ دکان میں خوب صورت خواتین کو دیکھ کر میرے دل کی

UUNOVELS.COM

دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ ہر خوب صورت عورت مجبور نہیں ہوتی اور نہ وہ کسی دکان کے سیٹھ کو لفٹ کراتی ہے۔ ایسی عورتوں سے باتیں کر کے دل خوش ہو جاتا ہے اور جو خوب صورت عورت پکے پھل کی طرح جھولی میں آ گرے اسے چھوڑتا نہیں ہوں۔

میں وقفے وقفے سے اس دوشیزہ کو دیکھ رہا تھا مگر اس انداز میں کہ اسے برا نہ لگے اور وہ یہی سمجھے کہ میں دکان کی نگرانی کی غرض سے دیکھ رہا ہوں۔ حالانکہ میں نے دکان میں کیمرے لگائے ہوئے ہیں تاکہ آنے والے گاہکوں پر نظر رہے جو چوری کرنے کی کوشش کرے۔ وہ موقع پر ہی پکڑا جائے پھر بھی دکان میں چوری ہو جاتی ہے مگر اس کے باوجود ہمیں نقصان نہیں پہنچتا۔ میں ہمیشہ فائدہ میں ہی رہا ہوں۔

دوشیزہ نے چند چیزیں پسند کیں اور کاؤنٹر پر رکھ دیں۔ وہ اس بات پر حیران تھی کہ میں نے چیزوں کے جو ریٹ لکھ کر لگائے ہوئے تھے وہ بہت کم تھے۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اتنی کم قیمت ہے ان چیزوں کی۔''

''ہم لوگ چاہیں تو زیادہ پیسے بھی لے سکتے ہیں مگر ہم نے غریبوں کی خدمت کرنے کو یہ سیل لگائی ہوئی ہے کہ غریب لوگ اس سیل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔'' میں نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ کی دکان کی بڑی تعریف سنی تھی اس لیے چیک کرنے آئی ہوں کہ کیا واقعی یہ سچ ہے یا نہیں۔''

''پھر کیا چیک کیا؟''

''میں نے جو سنا تھا وہ سچ ہے۔''

''بس یہی چاہیے؟'' میں نے سلسلہ کلام بڑھایا۔

''فی الحال یہی چاہیے۔''

''ہمارے پاس ہر ہفتے مختلف ورائٹی آتی رہتی ہیں۔ اس سے اچھا سامان اور کم قیمت پر مل جائے گا۔ اگلے ہفتے ضرور آنا۔''

''میں نے دکان دیکھ لی ہے، اب آتی رہوں گی۔'' وہ بولی۔

''اسے اپنی دکان سمجھ کر آنا۔'' میں نے اس کا دل خوش کرنے کو کہا۔

''اتنی کم قیمت میں سامان ملنے پر ہم اسے اپنی ہی دکان سمجھیں گے۔'' دوشیزہ مسکرائی۔

''سیل کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ بازار سے کم قیمت میں سامان دیا جائے اور ہاں آپ اپنی ڈیمانڈ بھی لکھوا سکتی ہیں کہ کیا مزید سامان چاہیے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ میں دوسرے دن ہی مطلوبہ سامان لا کر رکھ دوں گا۔''

میرے سلسلہ کلام بڑھانے پر وہ مزید کچھ دیر رک گئی اور مختلف سامان کے بارے میں معلومات کرتی رہی اور میں مسکرا مسکرا کر جواب دیتا رہا۔

اس دوشیزہ کا نام آصفہ تھا۔ اس سے بے تکلفی سے بات کرنے کا یہ فائدہ ہوا۔ وہ دوسرے دن پھر کچھ سامان لینے آ گئی۔ بقول اس کے وہ کسی پڑوسن کے لیے سامان لینے آئی ہے۔ پندرہ دن تک آصفہ بھی ایک دن کبھی دو دن چھوڑ کر میرے پاس سامان لینے آتی رہی اور میں اسے دکان پر بلانے کو دکان سے بھی کم ریٹ پر سامان دیتا رہا۔ میرے دونوں ملازم اس بات سے آگاہ تھے مگر وہ بول نہیں سکتے تھے۔ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ جب مجھے کسی دوشیزہ کو پھنسانا ہوتا تھا، میں ایسی ہی حرکت کرتا تھا اور دوسرا میں ان کا مالک تھا میری مرضی میں جسے چاہے کم ریٹ پر سامان دوں۔ ان کو اس بات کا اختیار نہ تھا کہ میرے کسی عمل پر اعتراض کر سکیں۔

آصفہ کے مستقل آنے پر اس سے دوستی ہو گئی۔ میں اکثر اسے گاڑی پر بٹھا کر جہاں چاہتا لے جاتا۔ وہ جہاں جانے کی خواہش کرتی میں اسے مطلوبہ جگہ چھوڑ آتا۔ ایک طرح سے اسے مفت میں ڈرائیور مل گیا تھا۔ اسے جہاں بھی جانا ہوتا بڑی بے تکلفی سے مجھے وہاں چھوڑ کر آنے کا کہہ دیتی۔ میں فرمانبردار ڈرائیور کی طرح اس کا حکم بجا لاتا۔

میں اب اس سے مذاق کے نام پر ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ بھی کرنے لگا تھا جس کا وہ برا نہیں مانتی تھی۔ کبھی آئس کریم کھلانے لے جاتا تو کبھی فش پوائنٹ یا جوس پلانے۔ وہ میری دعوت کو کبھی نہیں ٹھکراتی تھی۔ میں بھی اسے مرعوب کرنے کو خرچا کر رہا تھا۔ مجھے یہ رقم سود سمیت وصول کرنا آتی تھی۔ میرا ارادہ اسے دو سال ساتھ رکھ کر چھوڑ دینا تھا۔ میں کسی بھی دوشیزہ کو گلے کا ہار بنانے کا عادی نہیں تھا۔ جب دل بھر جاتا اس دوشیزہ سے جان چھڑا لیتا تھا۔

اگر کوئی بہت پسند آ جائے پھر بھی میں اسے زندگی بھر کا ساتھی نہیں بنا سکتا کیونکہ ہمارے خاندان اور برادری میں برادری سے باہر شادی کرنے کا رواج نہیں اور جو ایسا کرے اسے برادری سے باہر کر دیا جاتا ہے۔ اسے کسی بھی حیثیت میں برادری کی تقریبات میں مدعو نہیں کیا جاتا۔ ایک طرح سے برادری کے لیے وہ اچھوت بن جاتا ہے اسی لیے میں جب بھی کسی دوشیزہ کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں

UUNOVELS.COM

میرے ذہن میں بھی بات ہوتی ہے۔ میں دوستی چند ماہ یا ایک سے دو سال تک ہی چلاتا ہوں۔

آصفہ پر میں ٹھیک ٹھاک رقم خرچ کر چکا تھا مگر وہ میرے لیے چکنی مچھلی ثابت ہوئی۔ کسی طرح سے قابو نہیں آ رہی تھی۔ ایک دن جب مجھ سے نہ رہا گیا تو کہہ دیا۔ ''آصفہ ہماری دوستی کو تین ماہ ہو چکے ہیں۔''

''ہاں مجھے بھی یہ بات معلوم ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''یہ کیسی دوستی ہے، ہم اجنبی لوگوں کی طرح ملتے ہیں۔''

''اجنبی سے تمہاری کیا مراد ہے۔'' وہ چونکی۔

''تم مجھے اپنے قریب ہی نہیں آنے دیتی ہو۔''

''اچھا تو تم میرے قریب آنا چاہتے ہو۔'' وہ زوردار قہقہہ مار کر بولی۔

''تم میری بات پر ہنس رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''میں تمہاری بے وقوفی پر ہنس رہی ہوں۔''

''میں نے کون سی بے وقوفی کی بات کر دی۔'' میں نے غصے سے آصفہ کو دیکھا۔

''اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ کوئی بھی مرد عورت کے پاس تب ہی آ سکتا ہے جب وہ اس سے شادی کرے، تم میرے قریب آنا چاہتے ہو نا، میری قربت چاہتے ہو۔''

''ہاں بالکل یہی بات ہے۔''

''تو پھر مجھ سے شادی کر لو، اس میں اتنا پریشان ہونے کی کون سی بات ہے۔''

''لل .... لیکن .... میں ......''

''لیکن کیا۔''

''میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔''

''ابھی قربت حاصل کرنے کی بات کر رہے تھے اور اب کہہ رہے ہو شادی نہیں کر سکتا۔''

''میرا مطلب ہے میری گھریلو ذمے داریاں ہیں جس کی وجہ سے فوری شادی نہیں کر سکتا۔'' میں نے بہانہ کیا۔

''پھر صبر کر لو۔''

''میں صبر بھی نہیں کر سکتا جب تم کو دیکھتا ہوں بے اختیار بانہوں میں بھرنے کو دل چاہتا ہے۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے بغیر شادی کے میں تمہاری بانہوں میں آ جاؤں۔''

''جیسے تم میرے ساتھ گھومتی پھرتی ہو۔''

''ساتھ گھومنا پھرنا کوئی بری بات نہیں ہے، ہم اچھے دوست ہیں، ساتھ گھوم پھر سکتے ہیں۔''

''یہ سب باتیں میں سمجھتا ہوں، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم شادی کرنے سے قبل کچھ وقت تنہائی میں ایک دوسرے کے ساتھ پُرمسرت لمحات ساتھ گزار لیں۔ کسی کو کچھ خبر بھی نہیں ہو گی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔''

''ایسا ہو سکتا ہے نا۔'' میں خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''تم مجھ سے نکاح کر لو، میں اپنے گھر میں رہوں گی جب تم اس پوزیشن میں آ جاؤ کہ اپنے گھر لے جا سکو اپنی شادی کا باقاعدہ اعلان کر دینا۔'' آصفہ نے کہا۔

وہ توقع سے زیادہ ہوشیار نکلی تھی۔ کسی طرح قابو میں آنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور میں ۔۔۔ اسے ہر حال میں قابو کر لینا چاہتا تھا۔ وہ میری نیت سے واقف نہیں تھی۔ میں اس کے ساتھ کچھ وقت گزار کر اسے چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ گلے کا ہار نہیں بنانا چاہتا تھا اور وہ میرے گلے کا ہار بننا چاہتی تھی۔ میں اس پر خوب خرچا کر چکا تھا۔ وہ میں اس سے وصول کرنا چاہتا تھا۔ میری زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی دوشیزہ پر خرچا کیا ہو اور وصول نہ کیا ہو۔ اس نے نکاح کی شرط رکھ دی تھی۔ اس لیے میں کچھ سوچ کر بولا۔ ''تم اپنے گھر میں رہو گی اس طرح نکاح کر کے بھی ہم دور دور ہی رہیں گے۔ نزدیک کیسے آئیں گے۔''

''ایسا کوئی مسئلہ نہیں، جس کا کوئی حل نہ ہو۔ میری بات غور سے سنو ہمارے گھر کی چھت پر کمرے کی دیواریں کھڑی ہیں۔ ان دیواروں پر چھت ڈالنے سے کمرا تیار ہو جائے گا۔''

''تمہارے گھر والے تیار ہو جائیں گے۔''

''کیوں تیار نہ ہوں گے، میرا گھر بس جائے ان کے لیے یہ ..... بڑی خوشی کی بات ہو گی۔''

اس کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ اس طرح کم از کم میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ آصفہ کے پاس جانے کے لیے جگہ کا بندوبست ہو جائے گا۔ مجھے اِدھر اُدھر بھٹکنا بھی نہیں پڑے گا۔ اس نکاح کی حیثیت کیا ہو گی، جب چاہا اسے طلاق دے کر جان چھڑا لوں گا۔ طلاق دینے کی صورت میں وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ میرے والدین بھی اس کی نہیں سنیں گے۔ ہاں ایک بات کا خیال رکھنا پڑے گا۔ ہر قسم کے مسائل سے نمٹنے کو یہ کوشش کرنا ہو گی کہ بچے نہ ہوں۔ مجھے سوچتا دیکھ کر وہ

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

بولی۔ ''کسی سوچ میں پڑ گئے ہو۔''

''میں سوچ رہا ہوں۔ تمہاری تجویز بہت اچھی ہے اگر تمہاری طرح والدہ کسی طرح تیار ہو جائیں۔ تمہارے والد کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ان کی گھر میں چلتی نہیں ہے۔ تمہاری والدہ جو چاہتی ہیں وہی ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ابا نے کبھی بھی گھر میں اپنا رعب و دبدبہ رکھا ہی نہیں۔ امی جان نے جیسے ہی تیز آواز میں بولا ابا کا دم خشک ہو گیا۔'' آصفہ نے کہا۔

یہ بات درست تھی کہ آصفہ کا ابا عثمان بہت ڈرپوک قسم کا انسان تھا۔ اس کا اپنی بیوی سے دبنا اس لیے تھا کہ وہ اس کے مقابلے میں گوری رنگت اور خوب صورت تھی۔ اسے ہر وقت یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ کہیں وہ اسے چھوڑ کر چلی نہ جائے۔ وہ جب بھی شوہر کو غصے میں آتا دیکھتی تھی گھر چھوڑ کر جانے کی دھمکی دے دیتی تھی اور عثمان سہم کر خاموشی اختیار کر لیتا۔ میں جب آصفہ کو گھر سے ساتھ لے کر جاتا تھا، وہ مجھے غصے سے دیکھتا ضرور تھا مگر بولتا کچھ نہیں تھا۔

ایک روز میں آصفہ کو گھر چھوڑ کر جا رہا تھا کہ راستے میں میرا سامنا عثمان سے ہو گیا۔

''آصفہ بیٹی کو چھوڑ کر آ رہے ہو؟''

''ہاں۔'' میں نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا۔

''میں سب سمجھ رہا ہوں میری بیوی کاشفہ کیا کھیل کھیل رہی ہے۔''

''کھیل...... میں سمجھا نہیں۔''

''وہ اپنی بچیوں کو اپنے رنگ ڈھنگ پر چلا رہی ہے۔ مجھے بھی اس نے ایسے ہی پھانسا تھا اور میرا مستقبل تباہ کر دیا۔''

''مستقبل تباہ کر دیا۔'' میرے لیے یہ ایک نیا انکشاف تھا اس لیے میرا چونکنا فطری تھا۔ ہم سڑک پر کھڑے تھے۔ یہ مناسب بھی نہیں تھا اور نہ ہم یہاں زیادہ دیر کھڑے رہ سکتے تھے اس لیے میں نے اسے ساتھ بٹھایا اور کافی دور کے ایک کیفے میں لے آیا۔

''ہاں اب بولیں۔'' میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میری ایک اچھے گھرانے میں شادی ہونے والی تھی۔ کاشفہ نے اپنی اداؤں سے مجھے پھانس لیا اور میرا مستقبل تاریک کر دیا۔ میرے ہونے والے سسر کا ارادہ مجھے کاروبار کرا کے دینا تھا۔ میں اس خاندان میں شادی کر کے آج ایک خوش حال زندگی گزار رہا ہوتا۔ سمیرا کی جس سے شادی ہوئی وہ آج صدر کے علاقے میں اپنا بڑا کاروبار چلا رہا ہے۔ میں جب بھی کبھی صدر کے علاقے میں جاتا ہوں سلیمان کو دیکھتا ہوں تو میرے دل کو ایک گھونسا سا لگتا ہے اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں، کاش میری شادی سمیرا سے ہو جاتی تو میں بھی ایسی ہی ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزار رہا ہوتا۔'' یہ کہتے ہوئے عثمان کی آواز بھرا سی گئی تھی۔

''انسان کی قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔'' میں نے دلاسہ دینے کو اس سے یہ بات کی۔

''ہاں قسمت سے کون لڑ سکتا ہے لیکن تدبیر بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ بعض اوقات تدبیر بھی قسمت پر غالب آ جاتی ہے۔''

''ایسا بہت کم ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں کم ہوتا ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔''

''اس میں قصور آپ کا ہی ہے۔ تدبیر سے بھرپور کام لینا چاہیے تھا۔''

''وہ کمبخت عمر ہی ایسی تھی۔ اس عمر میں انسان دماغ سے نہیں دل سے سوچتا ہے اور انسان جب عقل سے کام لینے لگتا ہے۔ وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ سوائے پچھتاوے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب باتیں مجھے بتانے کا عثمان کا مقصد کیا ہے۔ اسے خوش ہونا چاہیے کہ اس کی بیوی کاشفہ کو ایک بے وقوف انسان مل گیا ہے۔

''بیٹے تم اگر واقعی میری بیٹی کو چاہتے ہو اس سے شادی کرنا چاہتے ہو تو جلدی سے شادی کر لو اور وقت پاس کرنے کا ارادہ ہے تو میری بیٹی کاشفہ کا پیچھا چھوڑ دو، تمہاری بہت مہربانی ہو گی، ہم غریب لوگ ہیں ہمارے پاس عزت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک بار کسی غریب کی بیٹی کی عزت چلی جائے پھر واپس نہیں آتی۔ کوئی اچھا رشتہ نہیں ملتا، تم میری بات کو سمجھ رہے ہو نا؟''

''ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''مجھے تم بہت سمجھدار لگتے ہو، میری بیٹی تمہارے پاس بہت خوش رہے گی۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

☆......☆

میں یہ چاہتا تھا کہ آصفہ سے خاموشی سے نکاح ہو جائے اور میرے جاننے والوں کو اس نکاح کی خبر نہ ہو۔ میں جو چاہ رہا تھا وہی ہوا۔ آصفہ کے چند رشتے داروں کی موجودگی

میں میرا نکاح آصفہ سے ہو گیا۔ نکاح ہونے سے قبل میں نے کم خرچ میں دیواروں پر چھت ڈلوا دی تھی۔ اس طرح کمرا تیار ہو گیا۔ اب مجھے کھلی آزادی مل گئی تھی۔ میں اپنے دل کے ارمان پورے کرنے لگا تھا۔ جب دل چاہتا دن میں سسرال آجاتا۔ کبھی رات کو دیر تک آصفہ کے ساتھ وقت گزار کر چلا جاتا۔

میرے نکاح کو ہوئے ایک سال ہونے کو تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ آصفہ کا جسم پہلے سے فربہ ہو گیا تھا۔ مجھے اس کے جسم کے فربہ ہونے کی کوئی فکر نہ تھی۔ میں اپنے دل کے ارمان پورے کر چکا تھا۔ ایک سال اور ساتھ گزار کر آصفہ کو طلاق دے دینا تھا۔

ایک رات میں جب سسرال میں آیا۔ اس نے ایک ایسی خبر سنا دی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ ''مراد تم باپ بننے والے ہو۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟'' میں یہ خبر سن کر لرز کر رہ گیا۔

''کیوں تمہیں باپ بننے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے، لوگ تو باپ بننے کی خوشی میں خوب ہلا گلا کرتے ہیں، تم نے ایسے منہ بنالیا ہے جیسے تمہارا سوگ منانے کا ارادہ ہے۔''

''میں جب تک ابا کو راضی نہ کرلوں، اس رشتے کے لیے باپ بننا نہیں چاہتا۔'' میں نے بات بنائی۔

''میں اب کیا کرسکتی ہوں جس روح کو دنیا میں آنا ہے وہ آکر ہی رہے گی۔''

''تم میرے ساتھ چلنا کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس جا کر بات کرتے ہیں۔''

''وہ کیوں؟'' وہ چونکی۔

''اس بچے کو ضائع کرا دیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم کیسے باپ ہو جو اپنے بچے کو مارنے کی بات کر رہے ہو۔''

''میں نے کہہ دیا ہے نا ابھی بچہ نہیں چاہیے۔ آگئی تمہاری سمجھ میں بات یا سمجھاؤں۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''اب کچھ نہیں ہو سکتا، ایک ماہ کے اندر بچے کی آمد متوقع ہے۔'' آصفہ نے کہا۔

''تم کو میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنا ہوگا۔'' میں نے اسے حکم سنا دیا۔

آصفہ نے بچے کی آمد کا سنا کر میرا دماغ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اتنی بڑی خبر اس نے مجھ سے چھپا کر رکھی تھی اور اس بات کو اب سرپرائز کہہ رہی تھی۔ یہ سرپرائز نہیں۔ ایک طرح سے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے والی بات تھی۔ بچے پیدا ہونے پر عورت مضبوط ہو جاتی ہے۔ یہ میں کسی صورت میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مضبوط ہو جائے۔

میں کئی لیڈی ڈاکٹرز کے پاس آصفہ کو لے کر گیا کہ کس طرح بچہ ضائع ہو جائے مگر اب یہ ممکن نہیں تھا۔ وقت گزر چکا تھا۔ میں ڈاکٹرز سے مایوس ہو کر چلا آیا۔ مجھے آصفہ پر سخت غصہ تھا۔ اب غصہ کرنے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کئی دن میرا موڈ خراب رہا پھر آہستہ آہستہ میں نارمل ہوتا چلا گیا۔

ایک ماہ گزرنے پر میں ایک عدد بیٹے کا باپ بن چکا تھا۔ یہ خوشی کا موقع تھا اور میں اداس تھا۔ آصفہ کی ماں نے جس طرح عثمان کو پھانسا تھا اسی طرح آصفہ نے مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی۔ میں ہوشیار تھا پھر بھی وہ مجھ سے چالاک ثابت ہوئی تھی۔ بچے ہو جانے پر کسی عورت سے جان چھڑانا اتنا آسان نہیں رہتا۔

ایک سال مزید گزرنے پر آصفہ نے ایک بیٹی کا تحفہ دے دیا تھا۔ تیسرا سال گزرنے پر ایک اور بیٹے کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس طرح میں کاشف، جبران اور نمل کا باپ بن چکا تھا۔ آصفہ کی قسمت اچھی تھی جو اس عرصے میں کوئی اور لڑکی میری زندگی میں نہ آسکی تھی۔ میں اتنا عرصہ کسی لڑکی کو برداشت کرنے والا کہاں تھا۔

آصفہ اور اس کی ماں دونوں ہی چالاک عورتیں تھیں۔ یہ بات مجھے سسرال میں رہتے ہوئے معلوم ہوئی تھی۔ آصفہ اپنی ماں کے اشاروں پر چلتی تھی۔ مجھے بڑی خوب صورتی سے دونوں نے پھانسا تھا۔ میں ایک بے بس پرندے کی طرح قفس میں پھڑ پھڑانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ آصفہ مجھے بچے کا اس وقت بتاتی تھی جب بچے کو ضائع کرنا ناممکن ہوتا تھا۔ میرے کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ البتہ مجھے اتنا یقین تھا کہ میرا باپ دلاور راجپوت اسے کبھی اپنے گھر کی بہو تسلیم نہیں کرے گا اور مجھے آصفہ کو چھوڑنے کا معقول جواز مل جائے گا۔

ابا نے مجھے اپنے دوست کاشف کی بیٹی بینش سے منگنی کرنے کی خوش خبری سنائی، میں خوش ہو گیا۔ اب آصفہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کا موقع آ گیا تھا۔ میں بینش کو اچھی طرح سے جانتا تھا۔ وہ اکثر اپنے گھر والوں کے ساتھ ہمارے گھر آتی رہتی تھی۔ سب سے بڑی بات میں اسے پسند بھی کرتا تھا اور دل میں اس سے شادی کی خواہش بھی رکھتا تھا اس لیے ابا نے میری پسند کو مدنظر رکھ کر میری منگنی کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور یہ نوید بھی سنا دی کہ اگلے ماہ میری بینش سے منگنی ہے۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ابا کو کیسے بتاؤں کہ آصفہ اور اس کی ماں نے مجھے چالاکی سے پھانس لیا ہے۔ میں اگر یہ بات بتا دیتا ہوں کہ میری ایک عدد بیوی اور اس کے تین بچے بھی ہیں۔ گھر میں ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ ممکن تھا ابا مجھے کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیتے۔ میں گھر سے بے گھر ہونا نہیں چاہتا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ گھر والوں سے دور رہ سکوں۔ سوچتے سوچتے میرے ذہن میں یہی بات آئی کہ خاموشی سے پرسکون سے شادی کر لی جائے۔ پہلی شادی کا کسی کو نہ بتایا جائے۔ آصفہ کو شادی کا علم ہو جانے پر وہ ضرور ہنگامہ کرے گی مگر اس وقت کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ابا بھی اپنے دوست کی بیٹی کا ساتھ دیتے ہوئے آصفہ کو اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیں گے اور میں بھی اس وقت سخت ہو جاؤں گا اور کہہ دوں گا کہ وہ خاموش رہے یا پھر طلاق لے کر میری جان چھوڑ دے۔ وہ غصے میں ہوگی اور جب وہ مجھے پریشان کرنے کو طلاق مانگے گی میں کسی تاخیر کے بغیر اسے طلاق دے دوں گا اور اس طرح آصفہ سے میری ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے گی۔ دھوکے باز آصفہ اور اس کی والدہ کو کچھ سزا ملنی چاہیے۔ مجھے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کو شادی کی خبر آصفہ سے خفیہ رکھنی تھی۔ انسان سوچتا کچھ اور ہے ہو کچھ اور جاتا ہے۔ میری منگنی کی رسم ہونے کی خبر آصفہ کو ہو گئی اور یہ سب میری حماقت سے ہوا۔ مجھے آصفہ کے گھر جاوید سے موبائل پر بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ جاوید نے منگنی کی رسم کے موقع پر تیار ہونے والے کھانے کے متعلق بات کرنے کو ٹیلی فون کیا تھا۔ جاوید کی پکوان سینٹر والے سے اچھی دوستی تھی اور وہ معیاری کھانے بڑی رعایت سے تیار کروا کر دیتا تھا اس لیے کھانے کا انتظام میں نے اس کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کی کال آنے پر میں نے کہا۔ ''جاوید! کھانے کا انتظام اچھا ہونا چاہیے۔''

''بے فکر رہو، تمہیں کوئی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

''تمہیں پتا ہے نا ابا جان کھانے کے معاملے میں کوئی کوتاہی پسند نہیں کرتے۔ شروع ہی سے میرے والد نے مہمانوں کے لیے شاندار کھانے تیار کرائے ہیں۔ لوگ آج بھی کھانوں کی تعریفیں ہی کرتے ہیں، میری منگنی کی تقریب ہے اس لیے تقریب میں کھانے اچھے ہونے چاہئیں۔'' میں نے کہا۔

''بے فکر رہو۔'' وہ بولا۔

میں نے بات مکمل کر کے جیسے ہی سامنے دیکھا۔ آصفہ کھڑی نظر آئی۔

''کیا باتیں ہو رہی تھیں۔''

''کچھ نہیں ایسے ہی دوست سے بات کر رہا تھا۔'' میں نے بات ٹالنا چاہی۔

''تمہاری منگنی ہو رہی ہے؟''

''تم سے کس نے کہہ دیا۔'' میں بری طرح چونکا۔

''تم خود ہی ابھی اپنے دوست کو بتا رہے تھے کہ تمہاری منگنی پر کھانے شاندار تیار ہونے چاہئیں۔''

بات کھل گئی تھی اس لیے میں اب اس سے کچھ چھپا نہیں سکتا تھا۔

''ہاں وہ ابا جان کے دوست کی لڑکی ہے۔ اس سے ابا میری منگنی کرنا چاہ رہے ہیں لیکن میرا بالکل بھی منگنی کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔'' میں نے بتایا۔

''موبائل پر بڑے مزے لے لے کر دوست کو کہہ رہے تھے کہ منگنی میں کھانا اچھا ہونا چاہیے۔ شکایت نہیں ہونی چاہیے اور اب مجھے کہہ رہے ہو، ابا جان کر رہے ہیں۔ جب منگنی ہو جائے گی پھر شادی بھی ضرور ہوگی۔ میرا کیا ہوگا یہ سوچا ہے تم نے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔

''کیا کہا، کچھ نہیں۔ یعنی تمہاری نظر میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔'' وہ زور سے چیخی۔

''میرا مطلب ہے کہ تم میری بیوی ہو اور بیوی رہو گی۔'' میں نے اس کا غصہ کم کرنے کو کہا۔

''میں یہ منگنی نہیں ہونے دوں گی۔''

''کیوں؟''

''اس کے آنے پر تمہارے گھر میں میری کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔ وہ اپنی برادری کی لڑکی کو جو اہمیت دیں گے مجھے کہاں وہ حیثیت ملے گی۔''

''تم پھر کیا چاہتی ہو؟''

''تم اس منگنی سے انکار کر دو۔''

''ایسا اب ممکن نہیں ہے۔ میں تم دونوں کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''لیکن میں سوکن برداشت نہیں کروں گی۔ تمہیں اس منگنی سے انکار کرنا ہوگا ورنہ میں خود تمہارے گھر پہنچ جاؤں گی۔'' اس نے دھمکی دی۔

''دیکھو، بے وقوفی مت کرنا، میرے والد سخت غصے میں آ جائیں گے اور مجھے فوراً تمہیں طلاق دینے کا حکم دے دیں

UUNOVELS.COM

گے۔"

"میرے خاموش رہنے پر وہ تمہاری شادی کر دیں گے جو مجھے کسی صورت گوارا نہیں ہے۔"

"دیکھو میں کوشش کرتا ہوں ابا کو سمجھاؤں۔"

"اور منگنی......"

"منگنی ٹوٹ بھی جاتی ہے، ابا کو اپنی کر لینے دو، میری زندگی ہے اسے مجھے ہی گزارنی ہے۔ یہ بات میں ابا کو بھرپور طریقے سے سمجھاؤں گا۔ میرے ابا کو سمجھانے میں کامیابی حاصل ہو جانے پر میں منگنی ختم اور تم کو گھر لے جاؤں گا۔"

میرے سمجھانے پر آصفہ وقتی طور پر خاموش ہو گئی تھی اور میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ خاموش ہو جائے۔ منگنی ہو جائے پھر شادی بھی ہو جائے گی۔ شادی ہو جائے پھر وہ بھلے میرے گھر چلی آئے۔ وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکے گی گھر والے بھی اسے کوئی اہمیت نہ دیں گے اور میں بھی اس سے جان چھڑا لوں گا۔

میں دوسرے دن جب دکان بند کر کے گھر لوٹا۔ ابا نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ ان کی عادت تھی جب وہ غصے میں ہوتے تھے تو خود کو کمرے میں بند کر لیتے تھے اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے رہتے تھے۔ آج بھی ابا کمرے میں سگریٹ پر سگریٹ پی رہے تھے۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا جو ابا ناراض ہوتے، میں حیران تھا کہ ایسا کیا ہوا ہے جس پر انہیں شدید غصہ آ گیا ہے۔ امی بھی پریشان تھیں۔ میرے پوچھنے پر امی نے بتایا کہ ابا مجھ پر سخت غصہ ہیں۔

"امی جان میں نے ایسا کچھ کیا ہی نہیں ہے پھر وہ اس قدر غصہ کیوں ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"اتنے بھولے مت بنو، انہیں بتائے بغیر نکاح کر لیا اور تین بچوں کے باپ بن گئے ہو۔" امی جان نے کہا۔

ان کے انکشاف پر میں بری طرح چونکا۔ ان کو کس طرح میرے نکاح کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔

"امی جان! یہ کسی نے جھوٹ بولا ہے میں کس طرح گھر والوں سے چھپ کر نکاح کر سکتا ہوں۔" میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

مجھے حیرت تھی کہ میں نے اپنے نکاح کی بات کو بہت راز میں رکھا ہوا تھا۔ پھر یہ خبر کیسے ابا تک پہنچ گئی۔

"تم نے آصفہ سے نکاح نہیں کیا؟" امی جان نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

امی جان کے منہ سے آصفہ کا نام سن کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ امی جان نے جب میرے بچوں کے نام لیے اس میں شک باقی نہیں رہا تھا کہ ابا کو جس نے بھی یہ خبر دی ہے وہ درست تھی۔ میرے لیے اب یہ خبر چھپانے کا کوئی جواز باقی نہ رہا تھا۔ اس لیے میں نے امی جان سے پوچھا۔

"یہ خبر ابا کو کس نے دی ہے؟"

"خبر کون دے گا، تمہاری بیوی اپنے بچوں کے ساتھ آئی تھی۔"

"اس کے ساتھ کون آیا تھا۔"

"اس کی ماں بھی ساتھ تھی۔" امی جان نے کہا۔

مجھے آصفہ اور اس کی ماں پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا ہے۔ مجھ سے پوچھے بغیر ہی میرے گھر چلے آئے تھے۔ میں آصفہ کو مطمئن کرنے میں ناکام رہا تھا جبھی وہ میرے گھر آ گئی تھی۔ میرے گھر کا پتا اسے اچھی طرح سے معلوم تھا اسی لیے وہ گھر چلی آئی تھی۔

موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابا سے کیسے سامنا کروں گا۔ وہ سخت غصیلے تھے۔ ابا کسی صورت یہ بات برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ میں برادری سے باہر شادی کروں۔ غصہ شدید تھا وہ مجھے کسی بھی وقت گھر سے باہر نکال سکتے تھے۔ گھر سے نکالتے ہی وہ مجھ سے ہر قسم کے تعلقات ختم کر لیتے۔ آخر برادری میں ان کی عزت تھی۔ وہ اپنے دوست کو کیسے سمجھاتے کہ ان کے بیٹے نے کیا شاندار کارنامہ انجام دیا۔ گھر والوں کو علم میں لائے بغیر نکاح کر لیا۔ تین بچوں کا باپ بھی بن گیا۔

امی جان کے رویے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ میرے اس اقدام سے کس قدر انہیں تکلیف پہنچی ہے۔

رات بھر ابا کمرے میں سگریٹ پر سگریٹ پیتے رہے۔ میں نے اپنے کمرے میں رات خوف زدہ حالت میں گزار دی۔ ہر لمحہ یہ ہی خوف آ رہا تھا کہ دیکھو صبح کیا ہوتا ہے۔

صبح ہوتے پر میں جب ناشتا کرنے گیا تو ابا سے سامنا ہو گیا۔ ان کے چہرے پر غصے کی بجائے اطمینان دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی فیصلہ کر چکے ہیں۔ وہ جب بھی کسی فیصلے پر پہنچ جاتے تھے ان کے چہرے پر ایسا ہی اطمینان ہوتا تھا۔

"بیٹے میرے پاس آؤ۔" ابا کا لہجہ اطمینان بخش تھا۔ پھر بھی مجھے یہ خوف لاحق تھا کہ وہ کہہ دیں گے تمہیں دو باتوں میں سے ایک بات کا فیصلہ کرنا ہو گا۔ اس گھر میں رہنا ہے تو آصفہ کو چھوڑ دو، ورنہ اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند سمجھو، میں رات ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ ایسی بات ہوئی تو میں ابا

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

کے پاؤں پکڑلوں گا اور بولوں گا۔ "ابا میں آصفہ کو چھوڑ سکتا ہوں تم لوگوں کو نہیں چھوڑوں گا۔" اس بات پر ابا فخر سے بولیں گے۔ "بیٹے مجھے تجھ سے ایسی ہی توقع تھی۔"

میں ویسے بھی آصفہ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کل نہیں تو آج ہی سہی۔

"میں نے رات بھر خوب سوچا ہے، تم نے بہت غلط حرکت کی ہے۔ اس فیصلے سے یقین جانو مجھے سخت تکلیف اور دکھ ہوا ہے۔"

"ابا میں سمجھ رہا ہوں واقعی مجھ سے بہت بڑی غلطی سرزد ہوگئی ہے۔" میں نے ابا کو خوش کرنے کو اس کی بات کی تائید کی۔

"تمہاری بیوی آصفہ اس قابل نہیں ہے کہ ہم اسے گھر کی زینت بنائیں۔ وہ کسی اور برادری کی ہے اور ہم راجپوت لوگ ہیں۔"

"ابا یہ بات بالکل درست ہے واقعی وہ ہمارے خاندان کا فرد بننے کے لائق نہیں ہے۔ یقین جانو یہ سب مجھ سے جذباتی پن میں ہوا ہے مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"اس میں تیرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"کیا؟" میں نے حیرت سے ابا کو دیکھا۔

"ہاں بیٹے اس میں تیرا قصور نہیں بلکہ یہ عمر ہی ایسی ہے۔ اس عمر میں ایسی حماقتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اس بات کو زندگی بھر دل سے لگالیں، تم میری بات سمجھ رہے ہو ناں۔"

"ہاں، ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ابا اپنی اصل بات پر آجائیں گے اور مجھے آصفہ کو طلاق دینے کو کہیں گے۔ میں بھی ایک سعادت مند بیٹے کی طرح کہہ دوں گا۔ "ابا جب آپ کہیں گے میں آصفہ کو طلاق دے کر اس سے اپنی جان چھڑالوں گا اور جہاں آپ کہیں گے میں وہیں شادی کرلوں گا۔"

"میرے دوست کو جب خبر ملے گی کہ تم نے اس کی بیٹی کو چھوڑ کر کسی اور سے شادی کرلی ہے یقین کرو اسے بہت دکھ ہوگا اور اس کی بیٹی رو رو کر برا حال کرلے گی۔" ابا نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں ایک مجرم کی طرح ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"انسان کی زندگی میں اس سے بہت بڑے بڑے غلط فیصلے سرزد ہو جاتے ہیں۔ ان فیصلوں سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ ہم راجپوت لوگ ہیں ہم جو بات کہہ دیتے ہیں اسے نبھاتے بھی ہیں۔ تو نے آصفہ بہو سے عمر بھر ساتھ رہنے کا وعدہ کیا ہوگا جبھی اس نے تیرے ساتھ نکاح کیا اور اب تیرے بچوں کی ماں ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ہمارے خاندان کا فرد بننے کے لائق نہیں ہے لیکن اس سے جو تین بچے ہوئے وہ راجپوت کا خون ہیں۔ میں ہرگز بھی یہ برداشت نہیں کروں گا۔ میرے پوتے اور پوتی دنیا کی ٹھوکروں میں پل کر جوان ہوں اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے تیرے بچوں کی خاطر تیری بیوی آصفہ کو اس گھر میں رہنے کی اجازت دے دوں گا۔"

"ابا وہ تمہارے دوست......"

"اس کی فکر نہ کر، وہ میرا رشتے دار ہی نہیں میرا جگری یار بھی ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح اسے سمجھالوں گا۔"

"پھر بھی ابا وہ کیا سوچیں گے۔" میں نے کہنا چاہا۔

"تو اس کی فکر نہ کر ابھی اور اسی وقت بہو اور بچوں کو گھر لے آ۔ اب بہو راجپوت کے گھر کی عزت ہے اور اس کے بچے راجپوت کی اولاد ہیں۔" ابا نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

میں حیرت سے ابا کو دیکھ رہا تھا۔ آصفہ سے جان چھڑانے کا بھرپور موقع مجھے ہاتھ آیا تھا۔ ابا نے بہو کو گھر لانے کا کہہ کر اس شاندار موقع کو ضائع کر دیا تھا۔ مجھے ابا کی بات ماننا پڑی اور میں اس وقت آصفہ اور بچوں کو گھر لے آیا۔ مجھے آصفہ پر شدید غصہ تھا اور غصہ کیوں نہ آتا میں نے تو شیطان کو دوست بنانے کے لیے نکاح کیا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئی تھی۔ آصفہ نے بچوں کو کارڈ کے طور پر استعمال کیا اور میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ میں اسے شکست دینا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھے شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ اس نے اتنا خطرناک کارڈ کھیلا تھا کہ میرے سخت اصول پرست باپ نے بھی برادری کے بائیکاٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے بہو تسلیم کرلیا تھا۔

میں .... جسے نفسانی تسکین کے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ آج میرے گھر میں بیوی کی حیثیت سے رہ رہی ہے۔ گھر میں اس کا وہی مقام ہے جو ایک بہو کو حاصل ہوتا ہے۔ میرے مزید تین بیٹوں کا اضافہ ہو چکا ہے۔ میں اسے قسمت کا فیصلہ سمجھ کر آصفہ کو بیوی کی حیثیت سے گھر میں رکھے ہوئے ہوں۔

++

UUNOVELS.COM

پناہ گاہ

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم!

کبھی ہمارا معاشرہ مثالی تھا مگر اب اسے اس طرح سے آلودہ کردیا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ یہ انٹرنیٹ، موبائل فون، ٹی وی کے بے لگام ڈرامے ہمیں کس رخ پر لے جارہے ہیں، اس کا انجام کتنا بھیانک ہے اس کی ایک جھلک دکھانے کی میں نے کوشش کی ہے۔ ثانیہ کے بھٹکتے قدم نے کس طرح اپنی پناہ گاہ کو روندا اسے ملاحظہ کریں۔

فوزیہ احسان رانا

(لاہور)

منیب کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ گھر جاتے ہوئے وہ روز اتنا ہی پُرجوش ہوتا کیونکہ گھر میں وہ رہتی تھی جو اس کی جان وفا تھی۔ منیب روز ایک تصویر بناتا اور پھر اس میں اپنی پسند کی نقش گری کرتا ثانیہ کے نقوش تراشتا اس میں۔ ثانیہ کو اپنی مرضی سے پیرہن اوڑھاتا۔ وہ ہر رنگ میں پہلے سے بھی زیادہ دلکش لگتی اس کی نقش گری عروج پر ہوتی اور منیب کے لب مسکرا رہے ہوتے۔ سارا دن ایسے کٹ جاتا کہ پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ جیسے ہی شام ڈھلنا شروع ہوتی اسے گھر جانے کی جلدی لگ جاتی۔ ثانیہ کو دیکھنے کا احساس ہی اتنا خوش کن تھا کہ اسے دیکھنے کو دل مچلنے لگتا۔

UUNOVELS.COM

منیب نے کچھ سوچا اور مسکرا دیا۔ صبح اس نے چکن روسٹ کھانے کی فرمائش کی تھی ثانیہ کوئی بات کہے منیب نہ مانے ایسا تو سوچنا ہی فضول ہے۔ منیب تو اس کے لبوں سے نکلی ہر بات کو حرف آخر کی طرح سمجھتا تھا اور صحیفہ دل میں سینت کر رکھ لیتا تھا۔

منیب پیدل گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے بازار سے ثانیہ کے لیے فروٹس لیے تھے۔ چکن روسٹ پیک کرایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا فاصلے سمیٹنے لگا۔ وہ کامنی سی لڑکی اسے زمانے بھر میں سب سے زیادہ اچھی لگتی تھی۔ وہ تھی بھی تو کتنی خوب صورت۔ بڑی بڑی سرمئی آنکھوں میں کتنی کشش تھی۔ کھڑی ناک اور کٹاؤ دار رس بھرے ہونٹ۔ منیب اس پر فریفتہ رہتا جان نچھاور کرتا۔ محویت سے اسے تکا کرتا بعض دفعہ منیب کچھ کہتے کہتے رک کر ثانیہ کو تکنے لگتا۔ منیب کچھ کہنے کی چاہ میں سب بھول جاتا تھا۔ ثانیہ کے باہم پیوست لب منیب کو کسی راز کی طرح لگتے تھے کہ لب کھلیں گے تو نجانے کیا راز اگلیں گے۔ ثانیہ کے چہرے کا تاثر معنی رکھتا تھا مگر منیب صرف محبت کی آنکھ رکھتا تھا۔ ہر بات ہر چیز کو محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اس لیے اسے سب اچھا دکھائی دیتا تھا۔ ثانیہ کا ترچھی نظر سے دیکھنا منیب کی جان نکال لیتا تھا۔ ثانیہ کی ہر ہر ادا اتنی دلربا تھی کہ منیب فدا ہو جاتا۔ وہ حسن و رعنائی کا پیکر تھی، اور منیب اس ساحرہ کا شیدائی تھا۔

منیب ثانیہ کے سراپے کو آنکھوں میں سموئے راستہ کاٹ آیا تھا۔ اس نے دروازے کے سامنے رک کر بیل بجائی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ ''ابھی وہ آئے گی۔''

''اس نے کیسا رنگ پہنا ہوگا۔''

''وہ کیسی لگ رہی ہوگی۔''

وہ اسے جی بھر کر دیکھے گا۔ منیب صبح جاتے ہوئے ثانیہ کو گلابی سوٹ پہننے کا کہہ کر گیا تھا۔ وہ گلابی سوٹ میں اچھی بھی تو بہت لگتی تھی جیسے گلابی پھول۔ تر و تازہ خوشبو سے بھرا۔ جسے دیکھ کر منیب کی روح تازگی سے بھر جاتی تھی۔ منیب کا دل معطر ہو جاتا تھا۔

کافی دیر ہو گئی دروازہ نہیں کھلا۔ منیب نے اب کی بار زیادہ زور سے بیل دی۔ اور انتظار کرنے لگا۔ دروازے کے پار اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کی بے تابی بڑھنے لگی۔ وہ اس کی محبوب بیوی تھی۔

ثانیہ نے دروازہ کھولا اس کا انداز لیا دیا سا تھا۔ منیب نے سلام کیا، ثانیہ نے بے دلی سے محض سر ہلا کے جواب دیا۔ منیب کی گرم جوشی حد سے سوا تھی۔ جبکہ ثانیہ کے نقوش میں بیزاریت صاف پڑھی جا سکتی تھی مگر وہ منیب تھا جو بس محبت دیتا تھا اور دیتا چلا جاتا تھا۔ اسے ثانیہ کی کج ادائی بھی ادا لگتی تھی۔ اس کا اکھڑا لہجہ بھی شیریں سنائی دیتا تھا۔ اس کا دیوانہ پن ہر منظر خود تخلیق کرتا تھا وہ محبت کے قلم سے محبت کو سنہرا لکھتا تھا۔ اپنی آنکھوں میں ایسے خواب سجاتا تھا جن کی تعبیر روشن ہی ہوتی تھی چمکتی دمکتی۔ راستہ دکھاتی نہ جگنو تھماتی تعبیر...... منیب کچھ برا سوچتا ہی نہیں تھا۔ سوچنا چاہتا ہی نہیں تھا۔ محبت کرنے والا دل ہمیشہ بہت خالص ہوتا ہے سونے چاندی سے زیادہ قیمتی دل۔ جو ہر کسی کو اللہ ودیعت نہیں کرتا۔ جس کو کرتا ہے وہ خاص ہوتا ہے۔

ثانیہ کب کی جا چکی تھی۔ وہ وہیں کھڑا کیا کیا سوچ رہا تھا۔

☆......☆

''ثانیہ تم نے گلابی سوٹ نہیں پہنا۔'' منیب نے لو دیتے لہجے میں کہا اس کے محبت سے معمور لہجے میں کتنی مٹھاس تھی مگر اسے چنداں پروا نہیں تھی۔ ثانیہ نے اکتاہٹ سے رخ پھیر لیا۔ ثانیہ کی گردن غرور سے تنی ہوئی تھی۔

''طبیعت ٹھیک نہیں میری، اس لیے دل نہیں چاہا چینج کرنے کا۔'' ثانیہ نے اپنا دوپٹا سر پر باندھتے ہوئے کہا۔ منیب تڑپ کر رہ گیا۔ وہ کب اسے تکلیف میں دیکھ سکتا تھا اس کی جان پر بن آئی۔

''کیا ہوا میری جان؟'' منیب نے اس کا رخ اپنی طرف کیا تو ثانیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

''سر درد سے پھٹ رہا ہے۔'' ثانیہ نے سسکاری لی۔

''چلو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ ابھی اٹھو۔'' منیب نے ثانیہ کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا ثانیہ کے چپل اس کو دیئے۔ وہ بادل نخواستہ اٹھی۔ وہ ایسے کراہ رہی تھی جیسے درد سے بے حال ہو۔

''کمرے میں بہت گرمی ہوتی ہے اس لیے سر درد ہونے لگ جاتا ہے۔'' ثانیہ نے روتے ہوئے کہا۔

''میں پیسے جمع کر رہا ہوں ثانی۔ جلد اپنی جان کو اے۔ سی لگوا دوں گا پھر ٹھنڈے کمرے میں خوب سویا کرنا۔'' منیب اسے بہت پیار سے تھام کر گلی میں لے کر آیا۔ بڑے بھائی کی بائیک لی اور ثانیہ کو لے کر ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ ثانیہ نے دیکھا منیب کی امی بڑے بھائی کے دروازے پر کھڑی ہیں۔ ثانیہ نے کاٹ دار مسکراہٹ سے ان کو

UUNOVELS.COM

دیکھا۔ رضیہ کلس کر رہ گئی۔ اسے منیب کے بدھو پن پر جی بھر کر تاؤ آیا۔ ثانیہ نے رضیہ خالہ کو ہاتھ ہلایا۔ دوسرے معنی میں ہاتھ دکھایا۔ گویا ان کے سینے میں کوئی چھرا گھونپا تھا۔ بائیک چلاتے منیب کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیسا اندھا ہوا ہے۔ مٹی اور سونے میں فرق بھول بیٹھا ہے۔

منیب اس شاطر لڑکی کو لے کر کب کا جا چکا تھا اور رضیہ بت سی بنی کھڑی نجانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ ماں کا دل دکھ سے بھر گیا۔ منیب کی معصومیت نجانے کیا دن دکھانے والی تھی۔ رضیہ کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی۔ وہ زمانہ شناس عورت جانتی تھی کہ منیب کی بیوی قدر دان نہیں ہے۔ اس نے اپنے حسن کے بل بوتے پر منیب کو اپنی مٹھی میں قید کیا ہوا ہے۔ ورنہ اس میں بیویوں والے کوئی گن نہ تھے۔ رضیہ کو تو ثانیہ میں عورت پن بھی نظر نہیں آتا تھا مگر برا ہو اس محبت کا جس نے منیب کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ ایسی پٹی جسے نہ وہ خود کھولنے پر آمادہ تھا اور نہ ہی کسی دوسرے کو اجازت دیتا تھا۔

☆☆☆

منیب نے ثانیہ کو پہلی بار ایک پارک میں دیکھا تھا۔ وہ پھولوں کے جھنڈ کے پاس بیٹھی پھولوں کا ایک حصہ نظر آ رہی تھی۔ منیب کی پہلی نگاہ نے اسے چونکا دیا وہ جیسے مسمرائز سا وہیں اٹک گیا وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکا۔ وہیں رک گیا تھم گیا۔

ثانیہ فراز سے ملنے آئی ہوئی تھی وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور اسی نام نہاد محبت نے ثانیہ کے اندر اپنی جڑ پکڑ لی تھی وہ بہت پریشان تھی۔ فراز سے رابطے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کے سب کونٹیکس نمبر آف جا رہے تھے۔ ثانیہ اور فراز اکثر اسی پارک میں ملا کرتے تھے۔ اب وہ ایک موہوم سی آس دل میں جگائے روز اسی جگہ آ کے بیٹھ جاتی تھی مگر وہ نہیں آیا۔ اسے دیکھنے کے لیے منیب آنے لگا۔ وہ روز آ جاتا تھا اور ٹکٹکی باندھ کر اس ساحرہ کو دیکھا کرتا۔ وہ حسن کا مجسمہ تھی اور حسن سوگواری میں مزید دلکش ہو جاتا ہے۔ ثانیہ کے پُرکشش چہرے پر چھائی اداسی منیب کو کسی معمول کی طرح کھینچ لاتی تھی۔ منیب دیدار کی چاہ میں بھاگا چلا آتا۔ وہ اس کو روتا پا کے بے چین ہو جاتا۔ مگر اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ جا کے اس سے پوچھ لیتا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ وہ ایک انجان لڑکی تھی پھر بھی وہ اسے اداس دیکھ کر بے قرار ہو جاتا۔ بے چین رہتا تھا۔ اس کے دل کی دنیا تہہ و بالا ہو رہی تھی۔ اس لڑکی نے منیب کے اندر بھونچال اٹھا دیا تھا۔ وہ خود پر قابو کھو رہا تھا۔ وہ جو ہمیشہ نک سک سے تیار رہتا تھا اپنے کپڑوں کو مٹی کا ذرہ بھی چپکنے نہیں دیتا تھا۔ اس لڑکی کو دیکھنے کے لیے وہ مٹی پر ہی بیٹھ جاتا تھا اس کی بے خودی ہر روز بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا خود پر بس نہیں چلتا تھا۔

☆☆☆

ثانیہ ربیعہ سے ملنے اس کے گھر پہنچی۔ ربیعہ فراز اور ثانیہ کی محبت کی رازدار تھی۔ وہ ربیعہ کے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تو ربیعہ پریشان ہو گئی۔

”کیا ہوا ہے۔ ایسے کیوں رو رہی ہو۔“ ربیعہ ثانیہ کی کالج فیلو تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی رازدار تھیں۔

”وہ۔ فراز......“ لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے۔

”کیا ہوا فراز کو۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ جلدی بتا۔“

”اس کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ میں اتنی اپ سیٹ ہوں کہ......“

”کیا مطلب؟“ وہ بھونچکی رہ گئی۔

”میں...... میں؟“ ثانیہ بہت روہانسی ہو رہی تھی، اسے اپنی بات کہنے میں دقت کا سامنا ہو رہا تھا۔ بات تھی بھی ایسی۔ ہچکچاہٹ فطری بات تھی مگر کہے بنا چارہ بھی نہیں تھا۔

”میں کنفیوز ہو رہی ہوں ثانیہ۔ پلیز کھل کر کہو جو بھی کہنا چاہتی ہو۔“

”میں فراز کے بچے کی ماں......“ ثانیہ کا جملہ ابھی لبوں میں ہی اٹکا ہوا تھا کہ ربیعہ کا ہاتھ بے ساختہ لبوں پر آن رکا اور اس کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

دروازے میں کھڑی شگفتہ بیگم جو ثانیہ کے لیے چائے لے کر آ رہی تھیں۔ ثانیہ کے الفاظ سن چکی تھیں۔ ان کا دماغ جیسے سن سا ہو گیا۔ وہ ثانیہ کی آزاد فطرت سے تو واقف تھیں اور اکثر ثانیہ کی بے ہودگیوں پر شاکی بھی رہتی تھیں... مگر اس حد تک بے راہ روی کا کبھی انھوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ شگفتہ بیگم جیسے یک دم ہوش میں آئیں۔ وہ دھڑام سے دروازہ کھول کر کمرے میں آئیں ان کے چہرے کے تاثرات جارحانہ تھے۔ شدید قسم کا اشتعال ان کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ ثانیہ اور ربیعہ نے سہم کر ایک دوسرے کو

UUNOVELS.COM

دیکھا۔ شگفتہ نے آگے بڑھ کر ثانیہ کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا۔

"نکلو یہاں سے۔ ابھی اور اسی وقت......"

"آنٹی۔ میری بات تو سنیں۔" ثانیہ سسکی۔

"کیا بات سنوں تمہاری۔ تم کنواری ماں بننے والی ہو... اور اس کے گناہ کو ڈھونڈ رہی ہو جو تمہارے ساتھ برابر کا قصوروار ہے مگر اب سارے ملبے تلے تمہیں دفنا کے خود منظر سے ہٹ گیا ہے۔" شگفتہ تڑخ کر بولی اور ثانیہ کا بازو جھٹکا۔ وہ لڑکھڑائی۔ اس کا سر چکرایا۔

"آنٹی میری بات......" ثانیہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔

"کیا بات سنوں میں تمہاری۔ دفع ہو جا یہاں سے اور دوبارہ میرے گھر کا رخ مت کرنا، اور میری بیٹی سے ملنے یا رابطہ کرنے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ سیدھی تیری ماں کے پاس پہنچ جاؤں گی۔" شگفتہ کو تو اس لڑکی کی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی نے آگ بگولا کر ڈالا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا برد کر دے۔

ربیعہ ثانیہ کی حمایت میں کچھ بھی بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ وہ چپ تماشائی کی طرح کھڑی اضطرابی انداز میں اپنی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ ساری صورتِ حال اتنی غیر متوقع تھی کہ ربیعہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ثانیہ کی بات سن کر وہ خود شاکڈ تھی۔

شگفتہ نے ثانیہ کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔ گلی کا دروازہ انہوں نے ایسے بند کیا جیسے وہ بدنامی کا ایک باب بند کر رہی ہوں۔ ان کو رہ رہ کر ثانیہ پر طیش آ رہا تھا۔ وہ اب بھی ثانیہ کو اس گھر میں گھسنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھیں۔

"آج کے بعد تم ثانیہ سے کبھی نہیں ملو گی اور نہ ہی کوئی رابطہ رکھو گی۔" شگفتہ کمرے میں واپس آ کر اب ربیعہ پر برس رہی تھیں اور ربیعہ شرم سے پانی پانی ہوتی جا رہی تھی۔

"ویسے کب سے چل رہا تھا یہ سلسلہ، اور یہ فراز کون ہے۔" شگفتہ نے کڑے تیوروں سے ربیعہ کو گھورا۔ ربیعہ نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔ وہ چور سی بنی کھڑی تھی، اپنی دوست کی غلطی پر خود کو مجرم سمجھ رہی تھی۔

"فراز ہمارے ساتھ تھا کالج میں، اور ثانیہ کو پسند کرتا تھا۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"ماؤں سے خوب ناز نخرے اٹھوانے والی لڑکی نے بالا ہی بالا لڑکا پسند بھی کر لیا اور ماں کو پتا بھی نہیں۔ تف ہے ایسی لڑکیوں پر۔ جن کو نہ شرم ہے نہ حیا۔ مائیں پتا نہیں اپنے پیٹ کو کتنی گانٹھیں دیتی ہیں اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلانے کے لیے۔ ان کو دوستوں میں اعلیٰ معیار سیٹ رکھنے کے لیے اپنی حیثیت سے بڑھ کر ڈریسز دلاتی ہیں۔ مائیں اپنے کتنے خواب آنکھوں کے اندر ہی دفن کر دیتی ہیں اپنی بیٹیوں کے خواب پورے کرنے کے لیے، اور بیٹی ایسی ہوتی ہے کیا۔ جو ماں کی آنکھ میں دھول جھونکتی ہے دھوکا دیتی ہے بغیر نکاح کے بیوی بن جاتی ہے۔ لعنت ہے ایسی بے حیائی پہ۔ خدا غارت کرے ایسی بچیوں کو جن سے اپنی جوانی نہیں سنبھالی جاتی۔" شگفتہ کا لہجہ رندھ سا گیا ان کی آواز میں نمی گھلتی چلی گئی وہ تھک سی گئیں اور وہیں فرش پر بیٹھ کر رونے لگیں۔

مائیں تو ساری ایک جیسی ہوتی ہیں ساری ماؤں کے دکھ سانجھے ہوتے ہیں۔ بیٹا نافرمان ہو، اونچی آواز میں بازو اکڑا کر آنکھیں نکال کر ماں سے بات کرے تو ماں کتنا دکھی ہوتی ہے۔ ساری ماؤں کی تکلیف ایک جیسی ہوتی ہے۔ بیٹی اپنی من مانی کرے اپنی اندھی خواہشات کی تکمیل کے لیے خود کو غلاظت بھری کھائی میں گرا دے تب بھی بیٹی کا دکھ اس کا درد ہر ماں کے لیے ایک، جیسا ہوتا ہے۔

شگفتہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور ربیعہ ماں کے ساتھ لگی ہوئی خود بھی رو رہی تھی۔

"ربیعہ ایسی حرکت کبھی مت کرنا۔ کسی کو پسند کرنا بری بات نہیں بیٹے۔ مگر خود کو گرا لینا اتنا گرا لینا کہ دوبارہ کبھی اٹھ نہیں سکو نہ ہی دوسروں کی نظروں میں اور نہ ہی اپنی نظروں میں۔ کبھی کچھ غلط مت کرنا جس کی تلافی ممکن نہ ہو۔ ایسا گناہ جو معاف نہ کیا جا سکے ایسا گناہ جو دیمک کی طرح ماں کو چاٹ ڈالے۔ کبھی نہ کرنا۔" شگفتہ کھوئی کھوئی سی کیفیت میں کہے جا رہی تھی۔

"امی مجھے معاف کر دیں۔ میں کبھی ایسا کچھ نہیں کروں گی۔"

"ثانیہ کی ماں لوگوں کے کپڑے سلائی کرتی ہے بیٹا۔ محنت کرتی ہے دس انگلیوں کی کمائی کرتی ہے۔ اپنی بیوگی کو عزت سے ڈھانپ کر بیٹھی ہے۔ سارا محلہ اس کی نیکی اور شرافت کی مثال دیتا ہے۔" شگفتہ زینب کا دکھ رو رہی تھی۔

"جی امی مجھے پتا ہے آنٹی بہت اچھی ہیں۔"

"ثانیہ بہت چھوٹی سی تھی جب زینب اس محلے میں آئی تھی۔ ثانیہ کی فراکیں اتنی خوبصورت سلی ہوئی ہوتی تھیں

UIJNOVELS.COM
UIJNOVELS.COM

کہ ہر عورت دیکھتی رہ جاتی تھی اور پھر سب نے زینب سے اپنی بچیوں کی فراکیں سلوانی شروع کر دی تھیں۔'' شگفتہ زور زور سے رونے لگیں۔

''زینب بہت سلیقہ شعار عورت ہے اس نے ثانیہ کو کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی مگر وہ اتنی خودسر اور سرکش کیسے ہو گئی کہ غلط راہوں پر چل پڑی، کیا وہ فراز نامی لڑکا زینب سے زیادہ ثانیہ کا مخلص ہو سکتا ہے؟ رات کے اندھیروں میں چھپ چھپ کر گناہ کرنے والے کبھی روشن مستقبل نہیں دیا کرتے... ورنہ وہ فراز بھی غائب نہیں ہوتا۔ پیار کرتا ہوتا تو ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کرتا یوں راستے میں ثانیہ کو اکیلا چھوڑ کر خود جان بچا کر فرار نہ ہو جاتا۔'' شگفتہ نے ثانیہ کو گھر سے نکال تو دیا تھا مگر ان کا دھیان اسی کی طرف لگا ہوا تھا۔

''پتا نہیں بن باپ کی بچی کہاں بھٹک رہی ہو گی۔'' ربیعہ نے چونک کر ماں کو دیکھا اور ان کے گلے لگ کر رو دی۔

☆......☆

ثانیہ کا سر بری طرح چکرا رہا تھا اتنی ہتک ایسی بے عزتی اس نے آج سے پہلے کہاں سہی تھی وہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی تھی، آنسو سلگ سلگ کر آنکھوں سے بہہ رہے تھے دل پر گہرے زخم لگے تھے اس نے پیار میں چوٹ کھائی تھی مگر نہ ہی اس کا فراز پر سے اعتبار ٹوٹا تھا نہ ہی اسے اس پر کوئی شک تھا۔ اس کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس نے کیا کھویا ہے۔ کیسا خسارے کا سودا کر بیٹھی ہے۔ جس میں دنیا تو تھو تھو کرتی ہی ہے، ناعاقبت اندیش نے اپنی آخرت بھی خراب کر ڈالی تھی۔

زینب کی مشین کی کھڑ کھڑ کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی... مگر ثانیہ اتنی ٹوٹی بکھری گھر میں داخل ہوئی تھی کہ زینب چونکی اس نے مشین بند کی اور ثانیہ کے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔ کولر سے ٹھنڈے پانی کا گلاس بھرا۔

''یہ لو پانی پیو بیٹا۔''

ثانیہ نے ایک ہی سانس میں پورا پانی پی لیا جیسے برسوں کی پیاسی ہو۔ وہ زور زور سے سانس اندر باہر کر رہی تھی۔ آنٹی کے الفاظ اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی مانند برس رہے تھے انھوں نے کتنا ذلیل کر کے اسے اپنے گھر سے نکالا تھا۔

''کھانا لاؤں بیٹا۔''

''نہیں اماں۔ دل نہیں چاہ رہا۔'' ثانیہ بے دلی سے بولی۔

''کالج میں بہت تھک گئی ہو گی....'' زینب نرمی سے بولی۔

''میں کالج میں کون سی مشقت کرتی ہوں جو تھک جاتی۔'' ثانیہ بدتمیزی سے تڑخ کر بولی اس بات سے ناواقف لڑکی کہ لہجے کی تلخی دل پر کیسا اثر کرتی ہے۔ ماں کے چہرے پر جب ایک تاریک سایہ سا آ کے گزرتا جاتا ہے، وہ کیا کیا جلا کے آیا ہوتا ہے۔ کاش بیٹی جان سکے۔

''پڑھائی بہت مشکل کام ہے نا بیٹا۔ دماغ خرچ ہوتا ہے اس لیے کہا۔''

''آپ جائیں یہاں سے۔ مجھے سونا ہے ذرا۔'' اس نے بے مروتی سے کہا۔ زینب چند ثانیے اسے دیکھتی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اور ہاں بار بار تنگ مت کرنا اماں۔ کالج میں، میں نے سموسے اور کوک لیے تھے اس لیے میری فکر میں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ ایسی ہی خود غرض تھی۔ وہ اچھی بیٹی تو کبھی بھی نہیں تھی۔ مفاد پرست تھی۔ اپنا کام ہوتا تو اس کا لہجہ شیریں ہو جاتا تھا پھر بھی محبت ڈھونڈنے چلی تھی۔ بھلا خود غرض دلوں میں محبت کب پنپ سکتی ہے محبت ایسے دلوں میں بسیرا نہیں کرتی جو اپنی ذات سے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ محبت کا عمل تو اپنے گھر سے شروع ہوتا ہے۔ جب آپ اپنے حقیقی رشتوں سے محبت نہیں کر سکتے تو آپ کسی باہر کے بندے سے محبت کا دعوا کیسے کر سکتے ہیں؟''

''ٹھیک ہے بیٹا آرام کرو۔'' زینب نے ایک طویل ٹھنڈی آہ بھری کمرے کی لائٹ بند کی، پنکھے کی اسپیڈ تیز کی اور ہلکے سے دروازہ بند کیا پھر باہر برآمدے میں آ کے بیٹھ گئی۔ برآمدے میں بلا کی گرمی تھی۔ سورج کی تیز دھوپ سارا دن زینب کو جھلساتی رہتی تھی۔ وہ دھوپ اور گرم ہوا پھانکتی رہتی مگر پنکھا نہیں چلاتی تھی کیونکہ دو پنکھے چلانے سے بجلی کا بل بہت آ جاتا تھا۔ گھر کا راشن۔ ثانیہ کے کالج کی فیس، بجلی کا بل، اور ثانیہ کو روز کالج کے لیے جیب خرچ بھی لازمی چاہیے تھا اس لیے کہ وہ ایک اچھے کالج میں پڑھتی تھی وہاں اپنا اسٹینڈرڈ اپ رکھنے کے لیے ثانیہ کو اپنی ڈریسنگ کا بھی بہت خیال رکھنا پڑتا تھا۔ زینب کی کمر محنت کر کر کے دن بدن جھکتی جا رہی تھی۔ کندھوں میں کھنچاؤ رہنے لگا تھا، بیٹھے بیٹھے گردن اکڑ جاتی تھی بی پی ہائی کا مسئلہ بھی تھا اور گرمیوں میں تو یہ بیماری اور بھی زور پکڑ لیتی تھی مگر ثانیہ کو ماں کی تھکن کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اسے جو چاہیے تھا وہ حاصل کر لیتی

UNOVELS.COM

تھی۔ ماں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی اور ثانیہ اپنی بے جا خواہشات کے پیچھے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ فراز نے اسے بہت سہانے خواب دکھائے تھے۔ ثانیہ کا دماغ پہلے ہی خراب تھا فراز کے جھوٹے سپنوں نے اس کا دماغ اور ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ وہ صرف وہی کرتی تھی جو اس کا دل کرتا تھا۔

ثانیہ بہت خوبصورت تھی مگر فراز اس کے حسن کی اتنی مدح سرائی کرتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ملکہ حسن سمجھنے لگی تھی اس کے انداز و اطوار میں نخریلا پن اور بڑھ گیا تھا۔ اس کی اداؤں میں اور دلکشی سمٹ آئی تھی۔ اس کا یقین راسخ ہو گیا کہ اس کے پاس حسن کے جلوے ہیں اس لیے وہ کچھ بھی حاصل کر سکتی ہے۔ وہ بھول بیٹھی تھی کہ وہ ایک رس سے بھری تر و تازہ کلی ضرور ہے مگر جو بھنورا اس کے گرد منڈلا رہا ہے وہ صرف رس چوسنے کے لیے مدح سرائی کرتا ہے۔ وہ محافظ نہیں ہے جو اس کا خیال رکھ سکے۔ اس کو زمانے کے سرد و گرم سے بچا سکے تاکہ اس منہ بند کلی کی عمر اور لمبی ہو۔ وہ تا دیر جی سکے اور پھول بن کر خوشبو بکھیر سکے۔ اس بھنورے کے پاس اتنا ٹائم کہاں۔ وہ تو گھات لگائے بیٹھا تھا اور جیسے ہی اسے موقع ملا اس نے اس پری وش کو نوچ ڈالا اس کلی کی پتی پتی بکھیر کر رکھ دی۔ اب وہ پتی پتی بکھری زمین پر رل رہی تھی مگر اس خوش فہم کا یقین تھا کہ وہ بھنورا لوٹ کر آئے گا۔ وہ رستے پر نگاہیں ٹکائے انتظار کاٹ رہی تھی۔

☆......☆

غیب اپنی ماں رضیہ اور بڑے بھیا حسیب کے ساتھ رہتا تھا حسیب نے اسے ایک باپ کی طرح پالا تھا۔ غیب اونچا لمبا ہینڈسم لڑکا تھا۔ حسیب نے اسے کبھی کسی چیز کی کمی نہیں رہنے دی وہ مالی طور پر ایک خوشحال فیملی تھی مگر حسیب نے اپنی حیثیت سے بڑھ کے غیب کے لاڈ کیے تھے تاکہ اسے باپ کی شفقت کی کمی محسوس نہ ہو۔

غیب کے پاس ہیوی بائیک تھی۔ وہ شہزادوں کی سی آن بان کے ساتھ جی رہا تھا۔ اس کے پاس کھلا پیسا ہوتا تھا وہ خوب ہلا گلا کرتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ وہ اکثر شمالی علاقہ جات نکل جاتا، اسے گھومنے پھرنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ وہ خوبصورتی کو بہت پسند کرتا تھا۔

ایسے میں جب راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا غیب ثانیہ سے ٹکرا گیا۔ ثانیہ ان دنوں کالج نہیں جا رہی تھی۔ وہ صبح گھر سے تیار ہو کر بظاہر کالج کے لیے نکلتی تھی مگر وہاں جاتی نہیں تھی۔ فراز وہاں نہیں تھا، وہ بے چین ہو کر اسے ڈھونڈنے نکل پڑتی تھی مگر اس کی ہر کوشش بے سود ٹھہری۔ نہ اس کا کچھ پتا چل رہا تھا نہ ہی کچھ امکان نظر آ رہا تھا۔

اسے پورا یقین تھا کہ فراز کسی حادثے کا شکار ہو گیا تھا ورنہ وہ اسے اس مشکل وقت میں اکیلا چھوڑ کر کہیں روپوش کیسے ہو سکتا تھا۔ کڑی دھوپ میں اسے تنہا کیسے جھلنے کے لیے سڑک پر کھڑا کر سکتا تھا۔ نجانے وہ کب تک ان خوش فہمیوں کے سہارے جینا چاہتی تھی۔

☆......☆

غیب کی آنکھوں میں ہر وقت اس انجان لڑکی کا چہرہ سمایا رہتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے کھو جاتا آپوں آپ مسکرانے لگتا۔ خیالوں ہی خیالوں میں اسے اپنی دلہن کے روپ میں دیکھا کرتا۔ وہ ہر روپ میں خوبصورت لگتی تھی۔ اس کا چاند چہرہ اور چہرے کے گرد بکھری زلفیں غیب کو تڑپا کے رکھ دیتی تھیں، وہ گھر سے نکل کر بے ساختہ اس پارک کی طرف چلا جاتا جہاں اس نے اسے اکثر مراقبے کی حالت میں دیکھا تھا۔ وہ دنیا مافیا سے بے خبر اپنی ہی ذات میں گم ایسے بیٹھی ہوتی جیسے کسی ریاست کی شہزادی ہو۔ غیب کے دل کی شہزادی تو وہ بن ہی چکی تھی اب وہ اسے اپنے گھر میں بسانا چاہتا تھا۔ ہر وقت اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔

حسیب نے ایک ساتھ دو گھر بنائے تھے۔ ایک اپنے لیے اور ایک غیب کے لیے۔ غیب کچھ خاص پڑھ لکھ نہیں سکا تھا حسیب نے بہت کوشش کی مگر بے سود۔ حسیب اور رضیہ کا وہ بہت لاڈلا تھا مگر بگڑا ہوا بالکل نہیں تھا اچھا لڑکا تھا۔

غیب اپنی ہیوی بائیک پر گزر رہا تھا، اسے اپنے کسی دوست سے ملنے جانا تھا۔ ایک جگہ سے گزرتے ہوئے غیب کو ایسا لگا کہ اس نے اس لڑکی کو دیکھا ہے، گلابی سوٹ میں یقیناً وہی تھی۔ اس کی بائیک کافی آگے بڑھ چکی تھی اس نے یوٹرن لیا اور بائیک واپس موڑی۔ ہاں وہ بلاشبہ وہی تھی۔ حسین صورت کچھ کملا سی گئی تھی۔

وہ پاس پہنچا تبھی وہ تیورا کھا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی گاڑی اسے نقصان پہنچاتی۔ غیب نے اسے اٹھایا اور اسپتال لے گیا۔

غیب کوریڈور میں ٹہل رہا تھا تبھی وارڈ بوائے غیب کو ثانیہ کا بیگ دے گیا۔ غیب نے بیگ پکڑ لیا۔ وہ پریشانی کے عالم میں چکر کاٹ رہا تھا۔ تبھی ایک نرس باہر آئی غیب کے بولنے سے پہلے ہی خوشی سے بتانے لگی۔

''مبارک ہو آپ کی مسز ماں بننے والی ہیں'' غیب کا

دماغ بھک سے اڑا۔ وہ تو اس کا نام تک نہیں جانتا تھا۔ نرس سے کیا پوچھتا اس لیے چپ سا ہو گیا۔ نرس چلی گئی تو وہ اندر روم میں چلا گیا۔ وہ آنکھیں موندھے لیٹی تھی۔ نقاہت وہ چہرہ کافی کمزور لگ رہا تھا۔ منیب لیڈی ڈاکٹر سے بات کرنے لگا۔

''شکر ہے آپ کی مسز کو ہوش آ گیا۔ ان کی خوراک کا خیال رکھیں اور کچھ میڈیسن لکھ کر دے رہی ہوں وہ ان کو دیتے رہیں۔'' وہ اپنی کارروائی پوری کر کے جا چکی تھیں اور منیب حیران پریشان کبھی اپنے ہاتھ میں پکڑے ڈائیٹ چارٹ کو دیکھ رہا تھا اور کبھی اس گلابی پھول کو۔

تبھی ثانیہ کے بیگ میں رکھا فون بج اٹھا، منیب چونکا۔ اس نے فون نکالا۔ امی جان کالنگ۔ اسکرین پر چمک رہا تھا۔

''ہیلو ثانیہ بیٹا کہاں ہو تم۔'' وہ رو دینے والی ہو رہی تھیں۔

''السلام علیکم آنٹی۔ آپ کی بیٹی بے ہوش ہو گئی تھی۔'' منیب کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بات کیسے کرے۔

''کیا ہوا میری بچی کو۔ کیا ہوا ثانیہ کو۔ اب کیسی ہے۔'' وہ بے تابی سے رو رہی تھیں۔

''جی ٹھیک ہیں، ان کو ہوش آ گیا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہی ہیں کہ اب ان کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنا ہو گا کمزوری بہت ہے۔''

''میری تو ایک ہی بچی ہے میں تو اس کا بہت خیال رکھتی ہوں پھر ایسا کیوں۔''

''آنٹی اس کا شوہر کہاں ہے۔'' منیب نے اٹک اٹک کر وہ بات پوچھی جس نے اس کی جان نکال لی تھی۔

''کون سا شوہر۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔'' انھوں نے غصے سے کہا۔

''وہ دراصل آنٹی لیڈی ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ وہ ماں بننے والی ہے۔'' منیب نے جھجک کر کہا۔

''پاگل ہو گیا۔ کون سے اسپتال میں ہو مجھے بتاؤ۔ میں آ رہی ہوں۔''

منیب نے ایڈریس بتایا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

منیب ثانیہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ تبھی اس نے آنکھیں کھولیں تھیں۔

''پانی......''

منیب نے گلاس میں پانی ڈال کر اسے دیا۔ وہ پانی پی کر منیب کو غور سے دیکھنے لگی۔ ثانیہ نے اس لڑکے کو اکثر دیکھا تھا۔ وہ بہت انہماک سے اسے دیکھا کرتا تھا۔

''میں کہاں ہوں۔ اور آپ کون ہیں۔''

''آپ بے ہوش ہو گئی تھیں میں وہاں سے گزر رہا تھا اس لیے آپ کو اسپتال لے آیا۔'' منیب ثانیہ کو ہی دیکھ رہا تھا۔

''کیوں بچایا مجھے۔ مر جانے دیا ہوتا۔'' وہ چلانے لگی، منیب کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

''زندگی خدا کی نعمت ہے۔ ایسے ناشکرا پن نہ کریں۔'' منیب کے لیے آج حیرتوں کا دن تھا۔

''نہیں جینا چاہتی میں۔ اور آپ مجھے سڑک سے اٹھا کر کیوں لائے۔ وہاں پڑے رہنے دیا ہوتا، کسی گاڑی کے نیچے آ کر کچل جاتی یا کسی چیل کوؤں کی خوراک بن جاتی۔'' وہ دھاڑیں مار مار کر رو دی۔

''آپ کیوں مرنا چاہتی ہیں؟'' اسے کچھ اور نہیں سوجھا تو یہ پوچھ لیا۔

''میرے پیٹ میں جو بچہ ہے یہ کسی وحشی درندے کی ہوس کا نتیجہ ہے، میں اس سنپولیے کے ساتھ خود کو بھی مار دینا چاہتی ہوں۔'' وہ پھر سے چیخنے لگی۔ منیب کو اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''کیا آپ اس بچے کو مار دینا چاہتی ہیں؟'' منیب کچھ سوچ کر بولا۔

''ہاں۔ کیونکہ یہ گندگی کی پوٹ ہے، ایک حادثے کا ثمر ہے۔ میں کالج میں پڑھتی ہوں۔ کسی آوارہ کتے نے مجھے اپنی درندگی کا نشانہ بنا کے نشانِ عبرت بنا ڈالا ہے میں جینا نہیں چاہتی۔'' ثانیہ اپنا سر پٹخنے لگی۔ منیب نے آگے بڑھ کر ثانیہ کا ہاتھ تھام لیا، ثانیہ نے برا نہیں مانا۔

''کون تھا وہ مجھے بتاؤ۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' منیب دانت کچکچا کے بولا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ میں اس وقت کو یاد نہیں کرنا چاہتی اور اس شخص کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہتی۔'' ثانیہ کے رونے میں بے بسی تھی۔

''میں اس گھٹیا کو پاتال سے بھی ڈھونڈ لاؤں گا، جان سے مار دوں گا۔''

''آپ میری مدد کریں پلیز اور اس بچے سے میری جان چھڑا دیں۔'' ثانیہ نے منیب کے آگے ہاتھ جوڑ دیے منیب کا دل تڑپ اٹھا۔

پھر منیب نے ثانیہ کا شوہر بن کر ثانیہ کا مس کیرج کروا دیا۔ اس کام کے لیے بہت سارے پیسوں کی

UUNOVELS.COM

ضرورت تھی، منیب نے اپنی بیوی بائیک بیچ دی۔ ثانیہ کو فراکس اور میڈیسن وقت پر پہنچانا اب وہ اپنی ذمے داری سمجھنے لگا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ بات پھیل گئی تھی۔ ثانیہ بدنام ہو چکی تھی۔ رضیہ اور حبیب کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے منیب کو ثانیہ کے گھر جانے سے بہت روکا۔ مگر وہ اس کے عشق میں دیوانہ ہو چکا تھا۔ وہ کسی کی بات سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ جو بھی ثانیہ کے خلاف ایک لفظ بھی بولتا تھا منیب اسے اپنا دشمن سمجھنے لگتا تھا، چاہے وہ حبیب ہی کیوں نہ ہو۔ منیب کو ایک دو بار رضیہ اور حبیب نے پیار سے سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی۔ ٹوکا بھی اور غصے سے روکا بھی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا الٹا سمجھے سے اکھڑی کلہاڑی کی طرح ہو گیا۔ وہ اپنی من مانی کر رہا تھا۔ اس پر عشق کا بھوت ایسا سوار ہوا تھا جس نے اسے اچھے برے کی پہچان ہی بھلا دی تھی۔ رضیہ کو لگتا کہ وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا ہے۔

زینب کے لبوں پر گہری چپ لگ چکی تھی۔ وہ بس عجیب سی نگاہوں سے ثانیہ کو دیکھتی رہتی۔ اس کی پتھرائی آنکھوں میں زندگی کی رمق ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ساری امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ ثانیہ نے ان کو جیتے جی مار ڈالا تھا ان کی برسوں کی نیک نامی دنوں میں رسوائی میں لپیٹ دی تھی اس دکھ نے ان کو بے دم کر ڈالا پھر وہ زیادہ دیر جی نہیں سکی۔ منیب ثانیہ سے نکاح کر کے اسے اپنے گھر لے آیا۔

اور اب وہ اس کے لاڈ اٹھاتے نہیں تھکتا تھا مگر ثانیہ چپ چپ رہتی تھی۔ اس کے انداز میں کوئی گرم جوشی نہیں ہوتی مگر منیب اس کی رکھائی کی پروا ہی نہیں کرتا تھا۔ اسے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

حبیب اور رضیہ منیب سے خفا تھے۔ منیب کی سونے کی چین بھی بک چکی تھی۔ وہ کام ڈھونڈ رہا تھا اور اسے کوئی کام نہیں مل رہا تھا پھر منیب نے ٹرکوں کے اڈے پر کام شروع کر دیا وہ ثانیہ کو ہر خوشی دینا چاہتا تھا۔ اس نے ٹرک کی ڈرائیوری سیکھنا شروع کر دیا۔ ثانیہ کو اس نے اے سی لگوا دیا۔ گھر کے کام کے لیے کل وقتی ملازمہ رکھوا دی تھی۔ وہ اسے رانی بنا کے رکھنا چاہتا تھا۔

☆......☆

ثانیہ کا فراز سے رابطہ پھر سے بحال ہو چکا تھا وہ جھوٹی سچی کہانی سنا کر ثانیہ کو پھر سے اپنی لائن پر لا چکا تھا۔ اب ثانیہ سارا دن ٹھنڈے کمرے میں بیڈ پر لیٹی فراز سے محبت محبت کھیلتی رہتی تھی۔ وہ دونوں منیب کا مذاق اڑاتے اور ہنستے تھے۔

''دکھتا کیسا ہے تمہارا منیب۔'' فراز ہنسا۔

''سچ بولوں۔ بہت خوبصورت ہے مگر میں نے اسے کبھی خود سے قریب آنے کا حق دیا ہی نہیں۔'' وہ اترائی۔

''وہ تمہارا شوہر ہے۔ ایسا کیسے ممکن ہے؟''

''میں نے صرف تمہیں چاہا ہے، تمہیں ہی پانے کے خواب دیکھے ہیں، یہ حق میں کسی اور کو کیسے دے سکتی ہوں۔ رہا منیب تو وہ تو میری موہنی صورت کا اتنا اسیر ہے کہ گھنٹوں بیٹھا مجھے تکتا رہتا ہے، پاگل ہے پورا۔ جو بھی کہتی ہوں مان جاتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتا ہے۔'' ثانیہ تمسخرانہ ہنسی۔ وہ خوش گمانیوں کے راستے کی مسافر بھی بھول بیٹھی تھی کہ مرد محبت عورت کے اندر اگر لبالب بھر کر اسے مغرور کر سکتا ہے تو وہی مرد بدل بھی سکتا ہے۔ اگر بدلتا ہے تو اسی عورت کو خالی بھی کر دیتا ہے، اور جب اسے اپنی اوقات یاد آتی ہے۔ خوش فہمیوں کا تاج محل پورے قد سے اس عورت کو اس کے گھمنڈ سمیت اپنے بوجھ تلے دفن کر دیتا ہے۔

''تم نے خوب اسے استعمال کیا نا۔'' فراز دوسری طرف ہنسا تھا۔

''ضرورت کے وقت تو گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔ عین اسی وقت بے ہوش ہو کر گرنا جب منیب میرے پاس پہنچ چکا تھا، میرے پلان کا حصہ تھا۔ پھر رو رو کر دہائی دینا کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ پھر سب کچھ ویسا ہوتا چلا گیا جیسا میں نے چاہا۔'' وہ فخریہ اپنا پلان بتاتے ہوئے اترا رہی تھی۔

''شادی کے لیے میں نے شرط رکھی کہ اپنا گھر میرے نام کرا دو، قسم سے اس نے ایک منٹ نہیں لگایا فوراً میرے نام کر دیا۔''

''واہ جی واہ میری ثانی تو بہت بڑی پلانر نکلی مگر تمہارا یہ گھر ہے کہاں، محلے کا نام تو بتاؤ۔'' فراز دل ہی دل میں کچھ حساب لگا رہا تھا۔

''اور کیا۔'' وہ کھلکھلائی۔

''مجھ سے کتنا پیار کرتی ہو۔'' فراز پھر سے جال پھینک رہا تھا۔

''بہت زیادہ......'' ثانیہ گلوگیر آواز میں بولی۔

''کیا کر سکتی ہو میرے لیے۔'' وہ محبت کو جانچ رہا تھا۔

''سب کچھ جو تم کہو۔''

''اپنا گھر میرے نام کر سکتی ہو۔'' فراز کی چالبازیاں

UUNOVELS.COM

عروج پر تھیں۔

"ہاں کر سکتی ہوں۔" وہ ایک عزم سے بولی۔

"واہ مان گئے تمہیں جان من۔" فراز زیرلب مسکرایا اب کی بار ثانیہ اسے پہلے سے بھی کہیں زیادہ فائدہ دینے والی تھی۔

"آئی لو یو جان۔"

"لو یو ٹو فراز جانو۔" ثانیہ ایک جذبے سے بولی۔

فراز زیرلب مسکراتے ہوئے بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

☆......☆

وہ فراز سے ملنے کے لیے تیار ہو رہی تھی اور اس کی پسند کے مطابق تیار ہو رہی تھی۔ ثانیہ نے جین کی پینٹ کے ساتھ پنک ٹی شرٹ پہنی تھی۔

وہ فراز کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھی۔ فراز اسے دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ ثانیہ بالوں میں برش پھیرتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ فراز کے دید کی چاہ میں لپٹے میسجز آ رہے تھے۔ ثانیہ کی گردن احساس تفاخر سے تن گئی۔ فراز نے اس سے سیلفی مانگی۔ ثانیہ نے مختلف پوز بنا بنا کر سیلفیاں لیں اور فراز کو واٹس اپ کر دیں۔

"ڈارلنگ کتنی پیاری لگ رہی ہو۔ بس اب اور انتظار نہیں ہو رہا۔" اس کا میسج آیا تو ثانیہ اک ادائے دلبری سے اٹھلائی اور جوابی میسج ٹائپ کرنے لگ گئی۔ خوشی ثانیہ کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

وہ اپنی ایک ایک ادا کو پسندیدگی سے دیکھ رہی تھی۔ اسے خود پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا۔ وہ فراز کے لوٹ کے چلے آنے سے شاداں و فرحاں تھی پھر سے اس کی آنکھیں فراز کے ساتھ جینے مرنے کے خواب بننے لگی تھیں۔ اس تلخ بات کو بھول کر کہ یہ وہی انسان تھا جو اتنا بے مہر تھا کہ مشکل میں اسے ڈال کے در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ گیا تھا بے سائبان کر گیا تھا۔ آنکھوں کے خواب نوچ لے گیا تھا۔ اس نے برا کیا تھا مگر ثانیہ اتنی کم عقل تھی کہ آنکھیں بند کر کے پھر سے اس کی کچی جھوٹی کہانی پر بھروسا کر کے اس شخص کو دھوکا دینے چلی تھی۔ جو مہربان تھا ایک مسیحا تھا سیاہ دنوں کا ساتھی تھا بے لوث بے غرض محبت کرنے والا۔ جس نے ثانیہ کو تب اپنایا جب سارا زمانہ اس پر تھو تھو کر رہا تھا۔ اسے بدچلن اور بدکردار کہہ رہا تھا۔ سب اس کو چھوڑ چکے تھے۔ کوئی اسے اپنے گھر میں گھسنے بھی نہیں دیتا تھی۔

مگر ثانیہ کو کوئی پروا تھی نہ احساس کہ منیب نے اس کے لیے کیا کچھ کھویا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنا ہی سوچا کرتی تھی۔ اسے صرف خود سے ہی غرض تھی۔ اسے بس فراز چاہیے تھا منیب تو ایک ٹارگٹ تھا۔ اور اب فراز آ گیا تھا تو وہ جلد منیب کو چھوڑ دینے کا پلان بنائے بیٹھی تھی۔

فراز کچھ اور پلان کر رہا تھا.. اور کاتب تقدیر اس کی قسمت میں کیا لکھ رہا تھا کوئی نہیں جانتا تھا۔

وہ عاشق نامراد شدید گرمی میں ٹرک کے نیچے لیٹا انجن ٹھیک کر رہا تھا اس کا ہاتھ، چہرہ کپڑے کالے ہو گئے تھے۔ مگر اس کا دل کالا نہیں تھا۔ نرمی وحلاوت سے لبریز دل بس ثانیہ کو خوشیاں دینے کے لیے پلان کر رہا تھا کہ کیسے محنت کرنی ہے، کیسے ثانیہ کے لیے اچھا معیار زندگی سیٹ کرنا ہے۔ اسے شہزادی بنا کے رکھنا ہے اور وہ بدبخت کتنے گھاٹے کا سودا کرنے چلی تھی جس میں خسارہ ہی خسارہ تھا۔ وہ منیب کے ارمانوں کا خون کرنے جا رہی تھی۔ اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے جا رہی تھی۔

ثانیہ نے آئینے پر نظر ڈالی اپنا سراپا جانچا وہ ہر لحاظ سے بہترین لگ رہی تھی۔

ثانیہ نے مکان کے کاغذات بھی پرس میں رکھ لیے تھے۔

منیب کسی کام سے دوسرے شہر گیا ہوا تھا ثانیہ کو آج تک یہ پتا نہیں تھا کہ منیب کیا کام کرتا ہے۔

ملگجا سا اندھیرا چھا رہا تھا وہ گھر سے نکلی..... اس نے نقاب کیا ہوا تھا فراز نے ٹرکوں کے اڈے کے پیچھے بنے ایک ہوٹل میں اسے بلوایا تھا۔

وہ کافی دیر سے ایک بینچ پر بیٹھی فراز کے میسج یا کال کا انتظار کر رہی تھی۔ تبھی اس کی نظر سامنے ٹرک کے نیچے لیٹے ایک لڑکے پر ٹھہر گئی اسے لگا وہ منیب ہے۔ مگر منیب تو شہر سے باہر گیا ہوا ہے پھر وہ ایسے کام کب کرتا ہے۔ اس نے فراز کو جلد آنے کا میسج کیا۔ اور ارد گرد دیکھنے لگی۔

"اور کیسا ہے تو سونی۔" یہ تو فراز کی آواز تھی آواز کہیں قریب سے ہی ابھری تھی مگر ثانیہ کو دکھائی کچھ نہیں دیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں تو سنا کیا چل رہا ہے زندگی میں۔" ثانیہ کی طرف دونوں کی پیٹھ تھی۔ دونوں آوازوں سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔

"شادی کر لی ہے میں نے۔ بہت اچھی ہے تیری بھابی۔ اسی کے لیے تو اتنی محنت کر رہا ہوں۔ ٹرک کے نیچے گھس کر آگ برساتا انجن ٹھیک کرتا ہوں اپنی بیوی کو شہزادی بنا کے رکھنا چاہتا ہوں۔" منیب کے انداز سے محبت جھلک

UUNOVELS.COM

رہی تھی۔ ثانیہ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔ اس لیے کہ اسے یاد آ گیا تھا کہ منیب سونی کے نام سے دوستوں میں مشہور ہے۔

''کیا شان تھی تیری سونی، اور یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تو نے اپنی۔ کالے تیل سے اٹے ہاتھ پیر۔ خود کو اتنی مصیبت میں ڈالا ہوا ہے۔''

''محبت خوشی ہوتی ہے، سکون ہوتی ہے، مصیبت تو نہیں ہوتی۔ جب میں گھر جا کر اپنی بیوی کو دیکھتا ہوں تب میری ساری تھکن اتر جاتی ہے۔'' منیب کی بات نے ثانیہ کو جھنجوڑ ڈالا تھا وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہ رہی تھی مگر اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔

''اوہ شٹ یار۔ بھاڑ میں گئی ایسی محبت۔ میں انجوائے کرنے کا قائل ہوں اور اچھی وقت گزاری کرتا ہوں اور بس۔ یہ محبت وحبت دماغ کی خماری ہے۔ اور کچھ نہیں''۔ فراز کا تفاخر سے بھرپور لب ولہجہ ثانیہ کو چبھتا ہوا سا محسوس ہوا اس کے اندر بے چینی پھیلنے لگی۔

''فراز تو سنا، کوئی لڑکی اچھی لگی۔'' منیب کی آواز ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی ثانیہ کے کانوں سے ٹکرائی۔ ثانیہ فراز کا جواب سننے کے لیے بے قرار ہو گئی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ منیب اور فراز ایک دوسرے کو کیسے جانتے ہیں... اور ان کی بے تکلفی سے پرانی دوستی یا واقفیت ظاہر ہو رہی تھی۔ حیرت در حیرت ثانیہ کے حواس معطل کر رہی تھی۔ افسوس کرے یا کیا کرے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''ارے سونی کوئی ایک لڑکی۔ اسکول سے کالج تک نجانے کتنی لڑکیاں آئیں اور چلی گئیں۔'' فراز کا تمسخرانہ قہقہہ ثانیہ کی ساری ہستی کو ہلا گیا۔ یہ فراز کیا کہہ رہا تھا وہ تو ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ ثانیہ ہی اس کی پہلی اور آخری محبت ہے۔

''کالج میں ایک لڑکی سے میرا افیئر تھا بہت خوب صورت تھی۔ ثانیہ نام تھا اس کا۔ اسے اپنی شکل وصورت پر بہت غرور تھا میں نے اس سے دوستی کی اسے کسی ٹشو پیپر کی طرح استعمال کیا اور پھینک دیا۔'' وہ پھر ہنسا تھا مگر وہ ہنسی۔ شیطان صفت انسان کا پول ثانیہ پر کھل گیا۔ وہ شاکڈ سی جہاں کی تہاں کھڑی کانپ رہی تھی۔

''جب وہ ماں بننے والی ہوئی تو میں نے اپنا ٹرانسفر کروا لیا۔ پیچھے کسی بدھو نے اس سے شادی کر لی۔ اب میرا اس سے رابطہ ہوا تو اس نے مجھے بتایا کہ اس کے شوہر نے مکان اس کے نام کر دیا ہے۔ میں نے آج اسے ملنے کے لیے بلوایا ہے ماضی کو دہراؤں گا اور مکان اپنے نام کرا کے پھر سے غائب ہو جاؤں گا۔'' فراز کا مذاق اڑاتا قہقہہ ثانیہ کو کسی گٹر میں پھینک گیا تھا یہ تھی اس کی اوقات۔ بڑی پلانر بنتی تھی کیسے ایک ہی لڑکے کے ہاتھوں دوسری بار دھوکا کھانے جا رہی تھی۔ ثانیہ کو خود سے گھن آ رہی تھی۔

''فراز ایسے مت کرو۔ لڑکی کا گھر اس کی پناہ گاہ ہوتا ہے اس کی پناہ مت چھینو۔ وہ اپنے شوہر کی قدر نہیں کرتی نہ کرے مگر ایک گھر میں عزت سے تو بیٹھی ہوئی ہے نا اور کسی بھی عورت کے لیے عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔'' منیب کی باتیں ثانیہ کو اندر سے ریزہ ریزہ کر رہی تھیں۔ اس کے قدم زمین نے جیسے جکڑ لیے تھے۔ وہ خود کو ایک انچ بھی ہلا نہیں پا رہی تھی۔

''ہاہا۔ پناہ گاہ۔ ہاہا اس کو پناہ نہیں چاہیے۔ فراز چاہیے۔ وہ انتہائی بے حس لڑکی ہے۔ اس نے تو کبھی اپنی اس ماں کی قدر نہیں کی جس نے اس کو محنت کر کے پالا پوسا۔ تو وہ اس شوہر کی کیا قدر کرے گی۔ ہاہاہا۔ رکیں سونی بھائی میں آپ کو ثانیہ کی پکس دکھاتا ہوں۔'' وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا ثانیہ کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ زمین آسمان اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ثانیہ نے اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کیں اور گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ واپسی کے سفر میں اسے اپنی تمام زیادتیاں یاد آ رہی تھیں اپنے سارے گناہ یاد آ رہے تھے۔ وہ پچھتاوؤں میں گھری گھر لوٹ آئی تھی۔ وہ گھر کے ایک کونے میں پڑی سسکتی رہی۔ ساری رات روتی رہی۔ رات کا آخری پہر تھا، جب دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ثانیہ دیوانہ وار باہر بھاگی تھی۔

دروازہ کھولا تو باہر ایک گاڑی سے منیب کی ڈیڈ باڈی پولیس والے اتار رہے تھے۔

''آپ کے شوہر نے فراز نامی اپنے دوست کا قتل کر کے خود کو بھی گولی مار لی ہے۔'' پولیس والا کہہ رہا تھا اور ثانیہ کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا وہ ہوش وخرد سے بے گانہ ہو کر زمین پر گری تھی اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ اب کی بار وہ سچ مچ بے ہوش ہوئی تھی۔

UUNOVELS.COM

پھسلتے قدم

محترم مدیر
السلام علیکم!
ایک واقعہ کو کہانی کی شکل دے کر محفل میں حاضر ہوا ہوں۔ یہ واقعہ نازو کا ہے، شعیب کا ہے لیکن ایک اہم کردار اور ہے جس نے یہ واقعہ سنایا اگر اس کے بہکاوے میں نازو کے قدم پھسل جاتے تو کتنا غلط ہوتا؟

ناظم بخاری
(ڈانوراں۔ لودھراں)

میں نے اسے دوسری بار دیکھا تھا، اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اور وہ بھی اسی کے گھر میں۔

اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے یوں لگا، جیسے چند سیکنڈ میں ہی میرا دل سینے سے نکل کر اس کے پاس چلا گیا ہے۔

میں سر سے پاؤں تک اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔

حالانکہ میری عمر اتنی نہیں تھی کہ میں اس سے عشق کرتا۔ میں چونتیس برس کا تھا۔ دو بچوں کا باپ تھا اور وہ مجھ سے کم سے کم دس بارہ برس چھوٹی تھی۔

میں نے پہلی بار اسے بچپن میں دیکھا تھا، وہ میرے خالہ زاد بھائی سلیم کی بیٹی تھی۔

UUNOVELS.COM

وہ بہت ہی خوبصورت تھی، بہت ہی معصوم۔ اس کی معصومیت پر فرشتوں کا گماں ہوتا تھا مگر اس وقت مجھے خوب صورتی اور معصومیت کا اتنا ادراک نہیں تھا، جتنا اب ہے۔

میری عمر اس وقت انیس، بیس کے لگ بھگ تھی جبکہ وہ چھوٹی سی بچی، سات، آٹھ سال کی تھی۔

اسے پہلی بار دیکھ کر میرا دل شدت سے دھڑکا تھا۔ وہ تھی ہی اتنی خوب صورت مگر میرے دل میں اس وقت یہ خیال نہیں آیا کہ میں اسے اپنی زندگی بناؤں، اس سے شادی کروں۔

وہ بچی تھی، شادی کے قابل نہیں تھی اور پھر...... وہ مجھ سے دس بارہ برس کم عمر تھی۔

اسے ہم سفر بنانے کا خیال لانا ہی بے وقوفی کے مترادف تھا، سو میں نے اس کی خوبصورتی اور اس کے خیال کو جھٹک کر گھر کی راہ لی تھی۔

بڑی خالہ کے گھر ہمارا جانا بہت کم ہوتا تھا۔ یعنی کسی شادی، خوشی یا غمی کے موقع پر۔

ان دنوں بھی کوئی غمی کا موقع تھا، اس لیے میرا خالہ کے ہاں جانا ہوا تھا اور وہیں میری نظروں سے نازو گزری تھی۔ اسی دن میں نے نازو کو دیکھا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور اسی دوران امی اور خالہ کے درمیان کسی خاص موضوع پر کچھ ایسی لڑائی ہوئی کہ امی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔

سو ہمارا تعلق بھی ان سے منقطع ہو کر رہ گیا۔

تقریباً چھ سال بعد گھر والوں نے میری شادی کر دی اور میری شادی کے چند ماہ بعد اس کے گھر والوں نے بھی اس کی شادی کر دی۔

غالباً اس وقت اس کی عمر تیرہ، چودہ برس رہی ہوگی۔

خالہ سے لڑائی کی وجہ سے نہ تو کوئی ان میں سے میری شادی پر آیا اور نہ ہی ہم میں سے کوئی ان کی شادی پر گیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ میں دو بچوں کا باپ بن کر گھر کا بوجھ اٹھاتا رہا۔

ہر بیوی کی طرح میں نے بھی ایک اچھی بیوی کے خواب دیکھے تھے۔ ایسی بیوی، جو ہر لحاظ سے میرے معیار پر پوری اترتی ہو۔ یعنی وہ خوب صورت ہو، کسی قدر پڑھی لکھی ہو بھی ہوئی طبیعت کی مالک ہو۔ ان تمام خوبیوں میں صرف ایک خوبی ثوبی (ثوبیہ) میں تھی۔

یعنی وہ خوب صورت تھی۔

وہ خوب صورت تھی، مگر پڑھی لکھی بالکل نہیں تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ اسے شوہر کی عزت و احترام کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ بات بات پر مجھ سے زبان درازی کرتی، لڑتی، چھوٹی چھوٹی باتوں پر گلے شکوے کرتی اور......

میں نے اپنی سی پوری کوشش کی تھی کہ اسے پیار دوں، عزت دوں اور وہ بھی میرے ساتھ پیار سے پیش آئے، مگر......

شادی کے ابتدائی چند ماہ تک ہمارا یہ سلسلہ برقرار رہا اور پھر اس کے بعد......

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!

پہلے بچے کی پیدائش کے ساتھ بیوی کا لہجہ اور رویہ تھوڑا خراب ہوا۔ دوسرے بچے کی پیدائش کے بعد تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔

اصل میں، اس کی ایک وجہ بھی تھی اور وہ تھی روزگار۔ میں دیہاڑی دار مزدور تھا۔ جس دن دیہاڑی لگتی، وہ دن سکون سے گزر جاتا اور جس دن دیہاڑی نہ لگتی، اس دن گھر میں میدانِ جنگ کا سماں ہوتا۔

حالانکہ میری ہمیشہ کوشش رہی کہ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود رہے، مگر...... کبھی کبھار حالات، ہاتھ سے نکل بھی جاتے تھے۔ اس لڑائی جھگڑے میں اکثر اس کی زبان چلتی اور میرا ہاتھ، مگر وہ بھی کبھی کبھار۔

بات بڑوں تک پہنچتی اور بیگم صاحبہ ناراض ہو کر میکے جا بیٹھتی، جسے کچھ عرصے بعد بچوں کی مجبوری کی وجہ سے واپس لانا پڑتا۔ اس دوران میں سسرال سے جو طعنے اور باتیں سننے کو ملتیں، وہ ایک الگ داستان ہے۔

اس کے ماں باپ کبھی میری سائیڈ لیتے اور کبھی اس کی۔

گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ ہم دونوں نے کسی حد تک ایک دوسرے سے کمپرومائز کر لیا تھا۔

گھر میں اب بھی لڑائی جھگڑا ہوتا، مگر اب بات بڑوں کی بجائے خود تک رہتی جاتی۔ ہم میاں بیوی ایک دوسرے سے کئی دنوں تک خفا رہتے اور پھر دھیرے دھیرے یہ ناراضی دور ہو جاتی۔

یہی وجہ تھی کہ میری بیوی سے بہت کم بنتی تھی۔

میرا کئی بار جی چاہا کہ میں اسے طلاق دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے نکال دوں، مگر بچوں کی مجبوری ہمیشہ میرے پاؤں کی زنجیر بنی رہی۔

البتہ میرے دل میں ایک بات ہمیشہ چبھتی رہتی کہ کبھی

نہ کبھی مجھے دوسری شادی ضرور کرنی ہے۔ میری بھی ایک زندگی ہے، جسے میں سکون سے گزارنے کا حق دار ہوں۔ اسلام بھی چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے، بشرطیکہ آپ تمام بیویوں کے حقوق بخوبی ادا کر سکیں۔ سو مجھے بھی ایک اچھی اور سلجھی ہوئی بیوی کی تلاش تھی جسے میں سچے دل سے چاہتا، پیار کرتا۔ میں اسے عزت دیتا اور وہ مجھے۔ بس اس ایک حسرت کے سہارے میں زندگی کے باقی ایام کاٹ رہا تھا۔

گو دوسری شادی کوئی بڑی بات نہیں تھی مگر میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ عمر اور کسی قدر پیسوں کا تھا۔

میں زندگی کی چوبیس بہاریں دیکھ چکا تھا اور اس عمر میں، کون سے ایسے ماں باپ تھے جو اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیتے؟

میں ٹھہرا دیہاڑی دار۔ روز کنواں کھودتا اور روز پانی نکالتا تھا۔ یہ الگ بات کہ اب میرا روزگار پہلے سے بہتر ہو گیا تھا۔

پہلے میری کبھی کبھار دیہاڑی لگتی تھی، مگر اب —— اب میری کوئی دیہاڑی خالی نہیں جاتی کیونکہ کچھ عرصے پہلے، میں ایک مستری (جو مکانات وغیرہ بناتے ہیں) کے ساتھ مستقل طور پر رہنے لگا تھا۔

ان کی مہربانی سے ایک تو دیہاڑی ہر روز لگ جاتی، دوسرا انہوں نے مجھے مستریوں کا کام سکھانا بھی شروع کر دیا تھا، جس میں، میں بہت جلد ہی کاریگر بن گیا اور مزدوری چھوڑ کر مستریوں کا کام شروع کر دیا۔

دھیرے دھیرے میرے ہاتھ اور کام پختہ ہوتے گئے۔

اب میری مزدوری دو سو کی بجائے چار سو تھی (یہ کافی پہلے کی بات ہے، اب تو مزدور کی دیہاڑی بھی پانچ، چھ سو سے کم نہیں ہے) مگر میں گھر میں صرف دو سو ہی دیتا رہا۔

دو سو میں نے الگ سے جمع کرنا شروع کر دیے۔

جلد ہی میرے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی جسے میں نے بینک میں اکاؤنٹ کھلوا کر جمع کرا دیا۔

اب میں اصل کہانی کی طرف لوٹتا ہوں۔

ان دنوں اچانک امی کی خالہ کا انتقال ہو گیا جس سے امی کی ناراضی چل رہی تھی۔ اس خبر کے باوجود کہ خالہ انتقال کر گئی ہیں، امی پھر بھی خالہ کے جنازے میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوئیں۔ انہوں نے ان سے جینا مرنا ہی ختم کر دیا تھا۔ امی اتنی ہی پتھر دل کی مالک تھیں۔

امی تو خالہ کے جنازے پر نہیں گئی، البتہ میں ایسا نہیں کر سکا۔ میں نے بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور خالہ کے جنازے میں جا پہنچا۔

خالہ کا گھر ہمارے شہر سے سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

خالہ کے گھر میں وہی صورتِ حال تھی جو کسی بھی میت والے گھر میں ہوتی ہے۔ میں اور بیگم رشتہ داروں کے گلے لگ کر روتے اور انہیں دلاسہ دیتے رہے۔

شام کو ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور ہم انہیں ان کی آخری آرام گاہ تک چھوڑ آئے۔

ن م راشد جدید نظم کے معروف ترین شاعر ہیں اور اپنے پہلے مجموعہ ''ماورا'' سے لے کر تازہ ترین ''لا=انسان'' تک ان کی شاعری نے ناقدین اور قارئین دونوں کو مسحور کیے رکھا۔ چنانچہ جدید شاعری کا تذکرہ ان کے نام اور کام کے بغیر نامکمل رہ جاتا ہے لیکن کبھی کسی نے بحیثیت نقاد ان کی تحریروں کی طرف توجہ نہ دی۔ اس لیے یہاں راشد کا نام بحیثیت نقاد اور وہ بھی نفسیاتی نقاد یقیناً باعثِ تعجب ہو سکتا ہے۔ یہ تعجب خیز سہی لیکن یہ حقیقت ہے کہ راشد کو بھی بلاشبہ نفسیاتی ناقدین میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ راشد نے تنقید کم لکھی۔ صرف چند مقالات لکھے ہیں۔ ان کے نام یہ تھا۔

1۔ ''[illegible]'' مطبوعہ ماہنامہ ساقی، دہلی جون 1927ء

2۔ ''اختر شیرانی'' ''اخترستان'' کا دیباچہ۔

3۔ ''شاعری کی تین آوازیں'' مطبوعہ نئی تحریریں۔ لاہور، اگست 1956ء (اسی تحریر میں ابن انشاء کی نظم ''خزاں کی ایک شام'' کا ''اس نظم میں'' کے تحت تجزیاتی مطالعہ بھی کیا)

4۔ ''جدید فارسی شاعری'' سہ ماہی ''نیا دور'' کراچی۔ جون 1969ء (یہ مقالہ بعد ازاں کتابی صورت میں بھی مطبوع ہوا)۔

5۔ ''آگ کا دریا'' پر ایک مختصر مضمون۔ ہفت روزہ ''نصرت'' لاہور۔ 14 فروری 1960ء)

ن م راشد کی تنقید کا نفسیاتی مزاج۔ ڈاکٹر سلیم اختر
شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور
شائع شدہ ماہنامہ شاعر بمبئی مئی 1979 سے انتخاب
مرسلہ: نور الزماں خان۔ پشاور

میرا اسی وقت گھر واپس آنے کا ارادہ تھا، مگر رات ہونے والی تھی، سو مجبوراً مجھے وہ رات وہیں بسر کرنا پڑی۔

"اگلے دن واپسی کا ارادہ ہوا تو بیگم نے کہا کہ اب ہم قل خوانی کر کے ہی جائیں گے۔"

میری جہاں شادی ہوئی تھی، وہ اپنے تھے، غیر لوگ تھے۔ سو میری بیگم میرے رشتہ داروں کے لیے اجنبی تھی اور وہ میری بیگم کے لیے۔

بیگم کا اصرار تھا کہ اس دوران میں (جب تک قل خوانی نہیں ہو جاتی) میں ادھر تمام عزیزوں سے جا کر ملواؤں۔ سو میں اسے اپنی ہر خالہ زاد بہن اور بھائی کے گھر لے گیا۔

سب لوگوں نے ہمیں بہت محبت اور عزت دی۔ انہی میں سے ایک نسیم بھائی کا گھرانا بھی تھا۔ ان کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔

ان سب بچوں میں، سب سے بڑی بیٹی نازو تھی اور شادی شدہ تھی۔

وہی نازو جسے میں نے قریباً پندرہ برس پہلے دیکھا تھا۔ یہی سوچ تھا کہ جب میں نازو کو دوسری بار دیکھ رہا تھا۔ میں ان کے گھر قریباً پندرہ برس بعد آیا تھا۔

وہ......وہ بہت خوب صورت تھی، اس کے نقش، نین بہت خوب صورت تھے مگر غربت نے اس کی حالت تباہ کر کے رکھ دی تھی۔

لباس بالکل عام سا، صورت مرجھائی ہوئی اور آنکھوں کے گرد حلقے۔ ان سب کے باوجود اس نے میرا دل اپنی مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔

وہ رات ہم نے نسیم بھائی کے گھر گزاری۔

ایک دوسرے سے گزرے ہوئے پندرہ برس کی باتیں کرتے رہے۔ بہت سے گلے شکوے اور باتیں ہوئیں۔ انہی باتوں میں معلوم ہوا کہ نازو کی شادی شعیب سے ہوئی تھی، آٹھ سال پہلے۔ شعیب، میرے دوسرے خالہ زاد بھائی، نعیم کا بیٹا تھا۔

نسیم بھائی سے معلوم ہوا کہ نازو پچھلے پانچ سال سے میکے میں ہے۔ اس کا ایک سات سال کا بیٹا بھی ہے۔ شادی کے ابتدائی چند ماہ میں ہی اس کی شوہر سے ان بن ہو گئی تھی۔ کئی بار لڑائی جھگڑے ہوئے۔

وہ میکے سے سسرال اور سسرال سے میکے آتی جاتی رہی مگر پانچ سال پہلے اس کے شوہر نے اس پر کچھ ایسے ظلم کے پہاڑ توڑے کہ وہ مستقل طور پر ماں باپ کے گھر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

شعیب ایک آوارہ قسم کا لڑکا تھا اور اسے جوے کی لت لگی ہوئی تھی۔ جب اس کا داؤ لگ جاتا تو گھر میں اچھا کھانے پینے کو مل جاتا، ورنہ کئی کئی دن تک فاقے گھر میں ڈیرا جمائے رہتے۔ وہ ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا اور اسی وجہ سے اکثر لڑائی جھگڑا بھی رہتا تھا۔

نازو کے ماں باپ نے تنگ آ کر نازو کو مستقل اپنے گھر میں بٹھا لیا تھا، وہاں کم سے کم اسے دو وقت کا کھانا تو ملتا تھا۔ ایک تو نازو کی کشش ایسی تھی کہ اس نے میرا دل مٹھی میں بھر لیا تھا اور دوسرا اس کی دکھ بھری کہانی نے میرے دل میں اس کے لیے اور بھی ہمدردی پیدا کر دی تھی۔

بس اسی وقت میرے دل نے کہا تھا کہ یہ پریوں ایسی لڑکی شعیب کے قابل نہیں ہے۔ یہ میرے قابل ہے، اسے میرے ساتھ رہنا چاہیے، میری شریکِ حیات بن کر۔ اس کی زندگی میرے ساتھ بہت سکون سے بسر ہوتی اور میری اس کے ساتھ، مگر یہ سب اتنا آسان نہیں تھا، یہ ایک دیوانے کا خواب تھا، جو شاید ہی کبھی پورا ہوتا۔

اس کی ایک تو بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں پہلے سے ہی شادی شدہ تھا اور میرے دو بچے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ مجھ سے دس بارہ برس چھوٹی تھی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ ابھی تک شادی شدہ تھی، اس نے طلاق نہیں لی تھی اور چوتھی بات یہ کہ اگر یہ سارے مسائل حل ہو بھی جاتے تو بھی کیا پتا تھا کہ اس کے ماں باپ مجھ سے، اس کی شادی کرتے بھی یا نہیں؟ سو ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھ کر میں صرف ایک ٹھنڈا سانس لے کر رہ گیا۔

نازو میرے لیے چاند کی حیثیت اختیار کر گئی تھی، جو خوب صورت تو تھی مگر دسترس سے دور تھی۔ میں اسے دیکھ تو سکتا تھا مگر پا نہیں سکتا تھا۔

اور جہاں تک دیکھنے کی بات ہے تو وہ بھی میں اسے جی بھر کر کہاں دیکھ سکتا تھا۔ آس پاس بیوی تھی، نازو کے ماں باپ تھے......ان سب کے سامنے نازو کو بے جھجک دیکھنا، ناممکن تھا، مگر وہ ایسی لڑکی نہیں تھی کہ اس سے آسانی سے نظریں چرائی جا سکتیں۔ سو جیسے ہی مجھے موقع ملتا، میں سب سے نظریں بچا کر اسے دیکھ لیتا اور اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا لیتا۔

اس دن بڑی شدت سے مجھے پچھتاوا ہوا کہ کاش میں

UUNOVELS.COM

نازو کے بڑے ہونے کا انتظار کر لیتا تو شاید میری شادی نازو سے ہو جاتی۔ ہو سکتا تھا کہ نازو کے ماں باپ، میری عمر کو نظر انداز کر کے نازو کو میرا ہم سفر بنا دیتے اور اگر نازو میری شریک حیات بن جاتی تو نہ ہی مجھے موجودہ بیوی کے ساتھ رہنا پڑتا اور نہ ہی میری زندگی اتنی اذیت ناک ہوتی، مگر اب..... گزرے ہوئے وقت کو واپس لانا اور نازو کو پانا ناممکن تھا، سو میں نے اپنے دل پر پتھر کی سل رکھ لی تھی۔

خالہ کی قل خوانی کے بعد ہم واپس گھر لوٹ آئے مگر نازو..... میرے دل سے نکلے نہیں نکل رہی تھی۔

مجھے اس عمر میں اس سے ایسا عشق ہوا تھا کہ جس کے بدلے میں اپنی بیوی بچوں کو بھی چھوڑنے کو آمادہ تھا۔ بس ایک بار، مجھے کہیں سے ہلکا سا بھی اشارہ مل جاتا کہ نازو میری ہو سکتی ہے تو میں اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

گھر آ کر میری عجیب حالت تھی، یہ دل تھا کہ اسے کسی صورت قرار نہیں آ رہا تھا۔ میرے تصور میں بار بار نازو کا چہرہ آ رہا تھا، جو خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ معصوم بھی تھا۔ کئی دنوں تک میرے دل کی بری حالت رہی۔ کئی بار جی چاہا کہ میں ایک آدھ دن کے لیے کسی بہانے سلیم بھائی کے گھر جاؤں اور اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا لوں مگر یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔

میرے پاس کیمرے والا موبائل تھا مگر مجھ سے اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ میں اس کی ایک تصویر ہی بنا لیتا جسے دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی رہتیں۔

اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ بس ایک ہی راستہ تھا وہ یہ کہ مجھے اپنے دل کو سمجھانا تھا، بہلانا تھا سو میں نے اپنے دل کو بہلا لیا۔

میری راتیں نازو کے تصور میں گزرتیں اور دن اس کے انتظار میں۔

وہاں سے واپسی پر میں سلیم بھائی کا نمبر بھی لیتا آیا تھا۔ ان کے پاس ایک ہی موبائل تھا جو گھر ہی پڑا رہتا۔

میں ہفتے، دس دن کے بعد ان کے گھر فون کرتا اور ان کا حال احوال پوچھتا۔ کال کرنے کے پیچھے ایک مقصد تھا کہ شاید کسی دن نازو میرا فون اٹھائے اور میں اس کی سریلی آواز سنوں، مگر میری زندگی میں ایسا کوئی لمحہ نہیں آیا۔ کال کبھی سلیم بھائی اٹھاتے اور کبھی ان کی بیگم۔ خالہ کو فوت ہوئے دو سے تین ماہ گزر گئے اور اس دوران میں مجھے ایک ایسی خبر ملی، جس نے میرے دل پر بجلیاں گرا دیں۔ نازو اور شعیب کی منگنی ہو گئی تھی۔

پانچ سال بعد، شعیب نازو کو بیاہ کر اپنے گھر لے گیا تھا۔

اصل میں شعیب کا اپنا ذاتی مکان نہیں تھا، وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ نازو کے ماں باپ کی خواہش تھی کہ جب تک شعیب اپنا ذاتی مکان نہیں بنواتا وہ اپنی بیٹی کو اس کے ساتھ رخصت نہیں کریں گے۔

اس بار شعیب نے ایک پلاٹ لے لیا تھا جس پر تعمیر کا کام جاری ہونا تھا اور جلد ہی اس پلاٹ پر ایک گھر تعمیر ہو جاتا..... سو وہ نازو کو بیاہ کر اپنے گھر لے گیا۔

میری اُمید پر جیسے پانی پھر گیا۔ نہ جانے میں نے نازو کو پانے کے لیے کیسے کیسے خواب دیکھنا شروع کر دیے تھے۔

میرا ارادہ تھا کہ میں ایک دو ماہ بعد جا کر نازو کے ماں باپ کو اس بات پر آمادہ کرتا کہ وہ نازو کو زیادہ عرصہ تک گھر نہ بٹھائیں۔ اگر شعیب اسے بسانا نہیں چاہتا تو وہ شعیب سے طلاق لے کر اس کی کہیں اور شادی کر دیں۔

سب سے پہلا مرحلہ نازو کو طلاق دلانا تھا اور پھر اس کے بعد، میں کسی نہ کسی طرح ان سے اپنے لیے بات کر لیتا مگر افسوس..... حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

میری اُمید اور خوابوں کے مینار اچانک ہی مسمار ہو گئے مگر اس کے باوجود میرے دل سے نازو کی محبت کم نہیں ہوئی۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ بڑھتی ہی رہی۔

میں اپنا موبائل کبھی کبھار چارجنگ پر لگا کر باہر نکل جاتا تھا جب واپس لوٹتا، موبائل چارج ہو چکا ہوتا۔

اس دن بھی میں موبائل چارج پر لگا کر باہر نکل گیا مگر جب میں واپس لوٹا، میری آدھی دنیا برباد ہو چکی تھی۔ موبائل میرے بیٹے کے ہاتھ میں تھا اور سلیم بھائی کا نمبر ڈیلیٹ ہو چکا تھا۔

میں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت تھی۔ نازو کی خیر خیریت جاننے کا میرے پاس واحد ذریعہ تھا، وہ بھی اب مجھ سے چھن چکا تھا۔

مجھے بیگم پر ٹوٹ کر غصہ آیا۔ اس کی موجودگی میں بیٹے نے موبائل اٹھا کر نمبر ڈیلیٹ کر دیا تھا اور بیگم صاحبہ تھیں کہ انہیں پتا ہی نہیں تھا۔ ایک بار جی چاہا کہ میں بیگم کی اچھی طرح خبر لوں مگر میں ایسا نہ کر سکا بہ مشکل اس بات پر عمل کرنے سے باز رہا۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا اور اب گھر میں خوامخواہ بات بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

وقت گزرتا رہا اور میں ہر رات نازو کو اپنے خوابوں

میں دیکھتا رہا۔ کبھی کبھار دل میں یہ کمینی سی خواہش جنم لیتی کہ کاش شعیب اور نازو کے درمیان ایک بار پھر جھگڑا ہو اور نازو دوبارہ اپنے ماں، باپ کے گھر آبیٹھے۔

پھر ایک دن یہ خواہش حقیقت کا روپ دھار گئی۔

خالہ کو فوت ہوئے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ اس دن میرے نمبر پر سلیم بھائی کی کال آئی۔ وہ اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے مجھے اور میری بیگم کو شادی پر بلایا تھا۔ میری تو جیسے دل کی مراد پوری ہو گئی تھی۔

میرا اسی وقت جی چاہا کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نازو کے گھر جا پہنچوں اور اپنی آنکھوں کی پیاس بجھالوں۔

شادی کو ابھی پندرہ دن باقی تھے اور ہم پندرہ دن پہلے نازو کے گھر جا پہنچتے، یہ مناسب نہیں تھا۔ البتہ میں اور بیگم شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ یعنی اپنے اور بچوں کے جوتے کپڑوں کی تیاری میں۔

بالآخر وہ دن بھی آپہنچا، جس دن ہم نے نازو کے گھر جانا تھا۔

شادی میں صرف ایک دن باقی تھا اور ہمارا اس دن نازو کے گھر جانا لازمی تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ ہم نازو کے بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے گھر سے نکلتے، اچانک بیگم کی بڑی بھابی دل کے دورہ سے وفات پا گئی اور میرے دل کے ارمان دل میں ہی رہ گئے۔

شادی میں جانے کا پروگرام کینسل ہو گیا اور مجبوراً مجھے سسرال جانا پڑا۔

حالات کو معمول پر آتے آتے دو ہفتے لگ گئے۔ میرا ایک بار پھر ارادہ بن گیا کہ میں نازو کے گھر سے ہو آؤں۔ میں نے بیگم سے بات کی تو وہ بھی تیار ہو گئی۔

اسی دن ہم سلیم بھائی کے گھر میں موجود تھے۔ انہیں پہلے سے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ہم کس لیے شادی میں شامل نہیں ہو سکے تھے۔

پچھلی بار بھی میں چاہ کر اپنے موبائل سے نازو کی تصویر نہیں لے سکا تھا مگر اس بار میں یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں جاتے ہی میں نے اپنا موبائل بیگم کو تھمایا اور اس سے کہا کہ وہ سلیم بھائی کے بیٹے اور اس کی دلہن کی کچھ تصویریں بنالے، جو ہم گھر والوں کو دکھائیں گے۔ دولہا اور دلہن کی تصاویر لینے کے دوران میں، بیگم نے ایک دو تصاویر نازو کی بھی بنائی تھیں جو کہ میرے لیے بہت خوشی کی بات تھی۔

اس بار بھی ہماری اچھی خاصی خاطر مدارات کی گئی مگر اس سے بڑھ کر جو بات میرے لیے خوشی کا باعث بنی وہ یہ تھی کہ نازو ایک بار پھر اپنے شوہر سے جھگڑا کر کے اپنے ماں باپ کے گھر آبیٹھی تھی۔

اس کے ماں باپ اس کے لیے بہت پریشان تھے۔

یہ بھی میرے لیے خوشی کی بات تھی، میں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے بظاہر نازو کا ہمدرد بن کر وہیں اکیلے میں بیگم سے اس سلسلے میں بات کی اور بیگم نے نازو کی امی سے۔

اس نے نازو کی امی سے کہا۔ ”آپ کب تک نازو کو اس طرح گھر میں بٹھائے رکھیں گی؟“

”جب ہم پچھلی بار آپ کے گھر آئے تھے، اس وقت بھی نازو آپ کے گھر تھی اور ہم اس بار آپ کے گھر آئے ہیں تو نازو آپ کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ آخر ایسا کب تک چلے گا۔ اگر اس کا شوہر اسے بسانا نہیں چاہتا تو طلاق لے کر اسے کہیں اور بیاہ دیں۔“

نازو کی امی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”آپ ہی اسے سمجھائیں، ہماری تو ایک بات نہیں مانتی یہ لڑکی۔ کئی بار اسے کہا ہے کہ جب تمہارا شوہر تمہیں بسانا ہی نہیں چاہتا تو سیدھی طرح اس سے طلاق لو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گھر بیٹھ جاؤ۔ نہ اپنی زندگی عذاب بناؤ اور نہ ہماری، مگر یہ لڑکی ہے کہ کوئی بات مانتی ہی نہیں۔“

بیگم نے نازو سے کہا۔ ”نازو! ذرا اپنی شکل دیکھو، کتنی خوبصورت ہو اور کس شخص کے لیے اپنی زندگی برباد کر رہی ہو، اس شخص کے لیے جسے تمہاری ذرا بھر پروا نہیں ہے۔ اگر اسی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے تو یہ بار بار ماں باپ کے گھر آنا جانا چھوڑ دو یا پھر اگر اس کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی تو اس شخص سے طلاق لو اور......“

مجھے یوں لگا، جیسے نازو کچھ کہنا چاہتی ہو مگر ماں، باپ کی موجودگی میں کچھ کہنے سے قاصر ہو۔

بیگم نے مزید اس سے کئی باتیں کیں جنہیں نازو غور سے سنتی رہی۔

اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نظر آرہے تھے جس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب رہا کہ وہ اب بہت جلد شعیب سے طلاق لینے کے لیے آمادہ ہو جائے گی یا پھر......

ہم وہاں ایک دن گزار کر گھر واپس آگئے اور میں

UUNOVELS.COM

ایک بار پھر نازو کو پانے کے خواب دیکھنے لگا۔

وہاں سے واپسی پر نہ جانے کس بات پر میری اور بیگم کی لڑائی ہوئی اور وہ بچوں کو لے کر ہمیشہ کی طرح ماں باپ کے گھر جا بیٹھی۔

اس بار میں نے بھی دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ میری بلا سے وہ اب ناراض ہو کر میکے بیٹھی رہتی یا طلاق لے کر، مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ بلکہ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے نکل جائے اور میں نازو کو آسانی سے پا سکوں۔

اس بار میں نے سلیم بھائی کا نمبر محفوظ کر لیا تھا۔ میری وقتاً فوقتاً ان سے بات چیت ہوتی رہتی۔

گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ میں نے انہیں اس بات کے لیے آمادہ کر لیا کہ وہ اپنی بیٹی کی طلاق لے کر کسی اور جگہ اس کا نکاح کر دیں۔ اس سے ایک تو انہیں یہ فائدہ ہوگا کہ روز روز کی چخ چخ سے ان کی جان چھوٹ جائے اور دوسرا کسی اور گھر میں ان کی بیٹی کا گھر بھی بس جائے گا۔

ایک بار سلیم بھائی نے میری بات سن کر کہا۔ ''چلیں مان لیں، اگر ہم اس کی طلاق لے بھی لیتے ہیں تو بھی اس سے کون شادی کرے گا؟ ایک طلاق یافتہ عورت سے اور وہ بھی اس سے، جس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ بیٹے کو جان و دل سے چاہتی ہے اس کے بغیر وہ ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتی۔ اس کے شوہر کو نہ اس کی پروا ہے، نہ اپنے بیٹے کی۔ اگر ہم سسرال کو طلاق لینے کے لیے آمادہ کر ہی لیں گے مگر پھر وہی بات کہ طلاق کے بعد اس سے شادی کون کرے گا؟''

میرے دل میں جیسے پھول سے کھل اٹھے۔ ''آپ اس کی فکر مت کریں، میری نظر میں ایک رشتہ ہے۔ وہ کھاتے پیتے گھر کے لوگ ہیں۔ انہیں نازو جیسی ہی کسی لڑکی کی تلاش ہے۔ آپ بس نازو کی طلاق لیں، باقی کام سنبھالنا میرا کام ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے، ہم اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔''

میری دم توڑتی امیدیں ایک بار پھر زندہ ہو گئیں۔

اب میرے پاس علیحدہ سے اتنی رقم جمع ہو چکی تھی جس سے میں کہیں بھی پانچ، سات مرلے کا پلاٹ لے کر اس پر خود ہی اچھا سا مکان بنا سکتا تھا۔ جس میں نازو اور میں بہت سکون سے رہتے۔

سلیم بھائی سے جو فون پر باتیں ہوتیں اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب ہو جاتا کہ کامیابی بس اب قریب ہی ہے۔

پہلے نازو سے طلاق کے سلسلے میں بات ہوتی تو وہ پوری شدت سے انکار کر دیتی مگر اب...... اب ایسا نہیں تھا۔ اب انکار کرنے کی بجائے وہ خاموشی اختیار کر لیتی۔

اس دوران میں، جب مجھے نازو کی یاد حد سے زیادہ بے چین کرتی تو میں چپکے سے نازو کے گھر چلا جاتا۔ اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا لیتا۔

سلیم بھائی اور اس کی بیگم میرے اکیلے جانے پر کبھی معترض نہیں ہوئے۔ انہیں پتا تھا کہ ان کی طرح میں بھی نازو کے لیے فکر مند ہوں اور اس کی طلاق کے بعد کہیں شادی کرانا چاہتا ہوں۔

سب سے بڑا مسئلہ نازو کی طلاق کا تھا۔ نازو کو طلاق ہونے کے بعد اپنے لیے نازو کا رشتہ مانگنا مشکل نہیں تھا۔ میں شادی شدہ تھا تو کیا تھا۔ نازو کون سا کنواری تھی۔ اس کا بھی ایک بیٹا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ نازو کے ماں باپ میرے رشتے کے لیے انکار نہیں کریں گے۔ اگر وہ پہلی بیگم کو طلاق دینے کا کہتے تو بھی میں اس بات سے انکار نہیں کرتا۔

اب میں ہفتے میں ایک بار نازو کے گھر کا چکر لگا لیتا تھا۔

میں جب بھی ان کے گھر جاتا ان کے لیے بہت سے پھل فروٹ اور مٹھائی لے کر جاتا۔

اس دوران میں عید بھی قریب آ گئی تھی کہ میرا اور بیگم کا رابطہ منقطع ہی تھا۔ بیگم کا خیال تھا عید کے موقع پر میں اسے منا کر گھر لے جاؤں گا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔

جب سے ہماری شادی ہوئی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ بیگم اور بچوں سے دور ہوئے تین ماہ گزر چکا تھا مگر مجھے فکر نہ تھی۔ میں سب گھر والوں کے لیے عید کا ایک ایک نیا سوٹ لے کر گیا تھا جنہیں وہ سلوا کر عید پر پہنتے۔ ان میں سب سے پیارا سوٹ نازو کا تھا۔

سوٹ دیکھ کر سب خوش ہوئے تھے، میرا خیال تھا کہ نیا سوٹ دیکھ کر نازو بھی خوش ہوگی مگر نازو کو کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ میرا دل ٹوٹ سا گیا۔ میں بجھے ہوئے دل کے ساتھ واپس لوٹ آیا لیکن عید کے دوسرے دن خود کو روک نہ سکا اور نازو کے گھر جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر مجھے شدید حیرت ہوئی۔ گھر میں نازو کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اس کا بھائی اس کی بھابی کو لے کر سسرال گیا ہوا تھا اور اس کے امی ابو اس کی

UUNOVELS.COM

پھوپی کے گھر۔

نازو کو اکیلے دیکھ کر میرا دل پوری شدت سے دھڑکنے لگا۔

نازو نے مجھ سے پانی کا پوچھا، میں نے انکار کر دیا۔

اسے سامنے والی چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ چپ چاپ میرے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

عید کے دوسرے دن بھی وہ بالکل سادہ سے روپ میں تھی۔ وہ اکیلی تھی اور میں اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے اپنے دل کی بات بتانا چاہتا تھا۔ اسے کہنا چاہتا تھا کہ میں اسے پیار کرتا ہوں، اسے چاہتا ہوں، پوری شدت سے، ٹوٹ کر۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بس وہ جلد از جلد اپنے شوہر سے طلاق لے اور.....

وہ بھی شاید مجھ سے کچھ کہنے کی کشمکش میں تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا، اس نے خود ہی بات کا آغاز کیا۔

یہ پہلا موقع تھا، جب وہ مجھ سے کچھ کہنے کو تھی... ورنہ اس سے پہلے میں جب بھی اس کے گھر جاتا، وہ سلام کر کے چپ ہو جاتی تھی۔

''ماموں! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

اس کے ماموں کہنے پر ایک پل کو دل میں کچھ ٹیس سی اٹھتی محسوس ہوئی تھی، مگر میں نے اس بات کو نظرانداز کر دیا۔

میں اس کا ماموں یا چاچو ہی لگتا تھا، وہ مجھے ان ناموں سے نہ پکارتی تو اور کس نام سے پکارتی؟ اور ویسے بھی شادی سے پہلے ہر عورت اپنے ہونے والے شوہر کو کسی اور ہی رشتے سے مخاطب کرتی ہے۔

اہم بات یہ نہیں تھی کہ وہ مجھے کس نام سے مخاطب کر رہی تھی، اہم بات یہ تھی کہ وہ کہنا کیا چاہتی تھی۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ''ہاں نازو! کہو، کیا بات ہے؟''

پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اچانک اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ مجھے پوری شدت سے احساس ہوا کہ اس کا دل کسی انجانے دکھ سے بھرا ہوا ہے۔ وہ اپنا دکھ مجھ سے بانٹنا چاہتی تھی، اپنے دل کا بوجھ مجھ سے ہلکا کرنا چاہتی ہے۔

میرا دل پوری شدت سے چاہا کہ میں اچانک اٹھوں اور اسے اپنی بانہوں میں بھر کر اس کے سارے آنسو پونچھ ڈالوں مگر میں چاہنے کے باوجود بھی خود میں اتنی ہمت نہیں جتا سکا۔

''ماموں! اگر میں آپ سے کچھ مانگوں، کیا آپ مجھے دیں گے؟''

ہائے، یہ اس نے کیا کہہ دیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ مانگ رہی تھی، کچھ لینے کا تقاضہ کر رہی تھی، میں کیسے انکار کرتا؟

''کہو نازو! کیا چاہیے تمہیں؟'' ''ایک منٹ میں آتی ہوں۔''

وہ مجھے وہیں بٹھا کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد لوٹی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا نیلے رنگ کا شاپر تھا۔

وہ سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ''امی اور ابو پچھلے کئی ہفتوں سے مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ میں شعیب سے طلاق لے کر کہیں اور شادی کر لوں، مگر......'' اچانک اس کی آواز بھرا گئی۔ ''میں شعیب سے بہت پیار کرتی ہوں، وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ مانا کہ وہ پہلے بہت خراب تھا مگر اب وہ ایسا نہیں ہے۔ اس نے اپنی ہر بری عادت ترک کر دی ہے مگر امی، ابو کو ان پر بالکل اعتبار نہیں ہے۔ امی، ابو کی خواہش ہے کہ وہ مجھے الگ مکان بنا کر وہاں رکھیں۔ اس کے لیے شعیب نے اپنی سی پوری کوشش کی ہے۔ انہوں نے میرے نام سے یہاں سے کچھ دور ایک چھوٹا سا پلاٹ خریدا ہے، مگر اب ان کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ وہ اس پلاٹ پر ایک آدھ کمرا ہی بنوا سکیں۔ وہ ایک کپاس کی فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔ ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم جمع کر رہے ہیں، مگر اس پلاٹ پر مکان بنانے کے لیے جتنی رقم درکار ہے، انہیں اکٹھی کرتے کرتے دو سال لگ جائیں گے۔'' اس نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا شاپر میری طرف بڑھایا۔ ''یہ میں نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے کچھ رقم جمع کی ہے، (وہ کڑھائی وغیرہ کا کام کرتی تھی) یہ آپ رکھ لیں۔ کچھ رقم شعیب کے پاس ہے، ان سے بھی لے لیں، اگر پھر بھی کچھ رقم کم پڑ جائے تو اپنی طرف سے رقم ملا کر ہمارے پلاٹ پر صرف ایک کمرا ہی بنوا دیں، جہاں ہم میاں بیوی خوشی سے رہ سکیں۔'' وہ ایک پل کو رکی۔ ''جب سے ہماری شادی ہوئی ہے، صرف اسی ایک بات پر امی ابو مجھے گھر میں بٹھائے ہوئے ہیں کہ جس شخص کے پاس اپنا ذاتی گھر نہیں ہے، وہ ساری عمر تمہارا بوجھ کیسے اٹھائے گا؟ میں اور شعیب امی ابو سے چھپ کر ایک دوسرے سے بات کر لیتے ہیں، ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے مگر...... ہمارے آس پاس جتنے بھی رشتے دار ہیں وہ سب منافق ہیں، وہ ہمارا گھر اجاڑنا چاہتے ہیں، بسانا نہیں چاہتے۔

UUNOVELS.COM

آپ ہمارے گھر آئے تو مجھے اور شعیب کو اُمید کی ایک کرن نظر آئی کہ آپ ہی ہمارا گھر برباد ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

میرا کئی بار جی چاہا کہ میں آپ سے اس سلسلے میں بات کروں، مگر میں خود میں اتنی ہمت نہیں جتا سکی کہ......"

اس کی خوب صورت آنکھوں سے دو آنسو بہہ کر اس کے رخساروں کو بھگو گئے۔

میرے خوابوں اور خواہشوں کے جتنے بھی مینار تھے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زمیں بوس ہو گئے۔ دل میں پوری شدت سے ٹیس سی اٹھی مگر میں بہ مشکل اس پر قابو پانے میں کامیاب رہا۔

"سنا ہے، آپ مستریوں کا کام کرتے ہیں۔ اگر آپ ایک کمرا اور چار دیواری کا سامان منگوا کر ہمارے لیے ایک چھوٹا سا مکان بنا دیں تو ہم ساری زندگی آپ کے احسان مند رہیں گے۔ مکان بننے کے بعد جو حساب کتاب ہوگا وہ ہم آپ کو تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کرتے رہیں گے۔ اگر ہمارا مکان بن گیا تو پھر امی ابو کو کوئی شکوہ نہیں رہے گا۔ کیا آپ ہم پر اتنا احسان کریں گے؟"

"نہ جانے کیوں، اس بار مجھے پوری شدت سے ندامت محسوس ہوئی۔ وہ چھوٹی سی گڑیا، نہ جانے مجھے کیا سمجھتی تھی، مجھ سے کیا توقعات وابستہ کیے ہوئے تھی اور ایک میں تھا کہ......"

اچانک میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "بے فکر ہو جاؤ۔ ان شاء اللہ بہت جلد تم لوگوں کا اپنا مکان ہوگا، میں ابھی شعیب سے مل کر، اس سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔"

جب میں وہاں سے نکلا بہت افسردہ تھا مگر ایک بات کی خوشی بھی تھی۔ وہ یہ کہ میں نازو کے کسی کام آ سکتا تھا، اس کا گھر بنا سکتا تھا اور اس کا گھر آباد ہونے میں اس کی مدد کر سکتا تھا۔

نعیم بھائی کا گھر سلیم بھائی کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا۔ میں ان کے گھر گیا تو وہاں میری شعیب سے ملاقات ہو گئی۔ میں اسے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔

مجھے محسوس ہوا، جیسے شعیب مجھ سے کچھ کہنے کے لیے بے چین ہو۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ "کچھ کہنا چاہتے ہو۔"

"جی ماموں۔"

حالانکہ دیکھا جائے تو میں نازو اور اس کا چاچو لگتا تھا مگر وہاں کے علاقے میں ماموں کے لفظ میں زیادہ اپنائیت تھی اسی لیے بچے بڑوں کو ماموں کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔

"نازو کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "جی ماموں، مگر......"

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نازو نے مجھے سب بتا دیا ہے۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جو رقم تمہارے پاس ہے وہ مجھے دو باقی میں کہیں سے بندوبست کرتا ہوں۔"

وہ گھر گیا اور جتنی رقم اس کے پاس تھی وہ لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔

میں نے کہا۔ "میں فی الحال کسی کوٹھی پر کام کر رہا ہوں۔ وہ کام مکمل ہوتے ہی تمہارے گھر کا کام شروع ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ، بہت جلد تم دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے مکان میں رہنے لگو گے۔"

میں نے اسے گلے لگایا اور وہاں سے نکل آیا۔

ایک دو دن کی کوشش سے ہی میں نے نازو کی محبت دل سے کھرچ کر پھینک دی جو چیز مجھے ناممکن لگ رہی تھی وہ اوپر والے نے میرے لیے بالکل آسان کر دی تھی۔

اب جب بھی سلیم بھائی سے بات ہوتی تو میں ان سے نازو کی طلاق لینے کی بات نہیں کرتا تھا بلکہ میں انہیں یہ کہتا تھا کہ وہ نازو کا شعیب کے ساتھ ہی گھر بسائیں۔

میری ان باتوں سے سلیم بھائی کو شروع شروع میں کچھ تعجب ہوا کہ جو شخص نازو کی طلاق لینے کی بات کیا کرتا تھا اب وہی نازو کا گھر بسانے کی بات کر رہا ہے۔ میرے سمجھانے پر وہ کسی قدر میری باتوں میں آ گئے۔ "بھلا کوئی ماں باپ چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی کا گھر آباد نہ ہو؟"

"شعیب اگر تھوڑا سدھرا ہوا ہوتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ اور دوسرا اس کا اپنا ذاتی مکان بھی نہیں ہے۔ میری بیٹی جب اس کے ماں باپ کے ساتھ رہتی۔ بہو اور وہ جو اس کا حشر کرتے ہیں، وہ صرف مجھے پتا ہے۔ وہ اگر اپنا ذاتی مکان بنوا لیتا تو شاید پھر بھی کچھ گنجائش نکالی جا سکتی تھی، مگر......"

"آپ اس کی فکر مت کریں، ان شاء اللہ بہت جلد اس کا اپنا مکان ہوگا۔ اس حوالے سے شعیب نے کافی رقم جمع کرا لی ہے۔

ان شاء اللہ، ایک ماہ کے اندر اندر ان کا مکان بننا شروع ہو جائے گا۔"

چند دنوں میں ہی میں نے کوٹھی کا کام مکمل کر لیا۔

UUNOVELS.COM

اگلے دن میں نے اپنا سامان لیا اور شعیب کے اس پلاٹ پر جا پہنچا، جہاں مکان تعمیر کرنا تھا۔

کال کر کے میں نے شعیب کو وہیں بلا لیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ دو مزدور بھی لیتا آیا تھا۔ مجھ سے پہلے ہی وہاں شعیب نے میرے کہنے پر موٹر پمپ لگوا لیا تھا۔ بجلی کی سہولت بھی موجود تھی۔ اینٹیں بھی آئی ہوئی تھیں۔ میں نے مکان کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ ساتھ میں باقی جو سامان رہتا تھا وہ شعیب سے کہہ کر شہر سے منگوا لیا۔

نازو نے مجھے صرف چار دیواری اور ایک کمرا بنانے کی بات کی تھی مگر میں نے ساتھ میں ایک چھوٹا سا کچن اور کچھ دور باتھ روم وغیرہ کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ دیواریں اندر باہر سے پلاستر کر دی تھیں۔

اگلے پندرہ دنوں کے اندر اندر شعیب اور نازو کا مکان تیار تھا۔ ہم یہ کام چھپ کر کر رہے تھے۔

ہمارا پروگرام نازو، نازو کے ماں باپ اور شعیب کے گھر والوں کو حیران کرنے کا تھا جس میں ہم کامیاب رہے تھے۔

مجھے شعیب نے بتا دیا تھا کہ ان کے پاس گھر میں ضرورت کا کون کون سا سامان موجود تھا۔

ان کے پاس جو سامان نہیں تھا وہ بھی میں نے شہر سے منگوا کر اس مکان میں رکھوا دیا تھا جس میں بجلی کے پنکھے بھی تھے۔

آگے کی کہانی بہت مختصر ہے۔ میں نے نعیم اور سلیم بھائی، دونوں کو ساتھ لے جا کر انہیں وہ مکان دکھایا۔ اس پلاٹ پر بنا بنایا مکان دیکھ کر انہیں بہت حیرت ہوئی۔

شعیب نے اب ان کی ذاتی مکان والی شرط پوری کر دی تھی۔

میرے کہنے پر سلیم بھائی نے نازو کو شعیب کے ساتھ رخصت کر دیا۔

ایک دن وہاں سے سامان اٹھا کر نئے گھر میں رکھنے میں بیت گیا۔ نازو بھی اس سرپرائز سے بہت خوش تھی اور ایسی ہی کچھ کیفیت شعیب کی بھی تھی۔ ان دونوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ میرا کس طرح شکریہ ادا کریں۔ ان دونوں کے اصرار پر میں نے وہ رات ان کے گھر گزاری۔

اگلی صبح جب میں اپنا سامان سمیٹ کر وہاں سے رخصت ہو رہا تھا، نازو نے کہا۔ ''ماموں! ہم آپ کے اس احسان کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں، کم ہے۔ آپ نے اپنی طرف سے جتنی رقم اس مکان پر لگائی ہے، ہم اس کی ایک ایک پائی آپ کو ادا کریں گے۔ شعیب فیکٹری میں اوور ٹائم کام کریں گے اور میں دل لگا کر کڑھائی کا کام کروں گی۔''

وہاں شعیب بھی موجود تھا۔ میں نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے، میں نے اپنی طرف سے جو کچھ اس مکان پر لگایا ہے وہ میری طرف سے تم دونوں کے لیے تحفہ ہے مگر مجھ سے ایک وعدہ کرنا پڑے گا کہ یہ ننھی گڑیا، کبھی بھی لڑ جھگڑ کر میکے نہیں جائے گی۔''

''کبھی نہیں جاؤں گی۔''

''اور تم......'' میں نے شعیب سے کہا۔ ''اگر تم نے کبھی گڑیا سے لڑائی جھگڑا کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''ماموں! آپ بے فکر ہو جائیں، آپ کو کبھی ہماری طرف سے شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

میں نے شعیب کو گلے لگایا، نازو کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس گھر سے نکل آیا۔

اس دن جب میں وہاں سے رخصت ہو رہا تھا، میرا دل ایک ایسی خوشی اور اطمینان سے بھرا ہوا تھا کہ جس کی مثال پیش کرنے سے میں قاصر ہوں۔ جب میں گھر پہنچا تو ایک اور حیرت میری منتظر تھی۔ وہاں میری بیوی اور بچے پہلے سے موجود تھے۔ شاید وہ گھر کا تالا توڑ کر اندر داخل ہوئے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی بیگم میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ میرے پاؤں پکڑ لیے۔ کچھ کہنے کی بجائے وہ صرف روتی رہی۔

میں نے نرمی سے اسے اٹھایا اور اپنی بانہوں میں سمو لیا۔

''مجھے معاف کر دیں، میں آئندہ آپ کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی......'' وہ ہچکیاں لے کر روتی رہی۔

''کوئی بات نہیں......بس اب چپ ہو جاؤ۔ میرے دل میں تمہارے لیے کوئی بات نہیں ہے......''

اس دوران میں، بچے میری بانہوں میں سما چکے تھے۔

اس رات مجھے ایک ایسا سکون محسوس ہوا، جو کسی کھوئی ہوئی چیز کو پانے کا ہوتا ہے۔

میں نادانی میں اپنی بیوی بچوں کو کھونے چلا تھا، ان انمول چیزوں کو، جنہیں کھو کر دوبارہ نہیں پایا جا سکتا۔

مجھے بے ساختہ سورہ رحمان کی وہ آیت یاد آ گئی کہ......

''اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''

UUNOVELS.COM

ضرورت تھی، منیب نے اپنی بیوی بائیک بیچ دی۔ ثانیہ کو فراکس اور میڈیسن وقت پر پہنچانا اب وہ اپنی ذمے داری سمجھنے لگا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ بات پھیل گئی تھی۔ ثانیہ بدنام ہو چکی تھی۔ رضیہ اور حسیب کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے منیب کو ثانیہ کے گھر جانے سے بہت روکا۔ مگر وہ اس کے عشق میں دیوانہ ہو چکا تھا۔ وہ کسی کی بات سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ جو بھی ثانیہ کے خلاف ایک لفظ بھی بولتا تھا منیب اسے اپنا دشمن سمجھنے لگتا تھا، چاہے وہ حسیب ہی کیوں نہ ہو۔ منیب کو ایک دوبار رضیہ اور حسیب نے پیار سے سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی۔ ٹوکا بھی اور غصے سے روکا بھی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا الٹا مجھے سے اکھڑی کلہاڑی کی طرح ہو گیا۔ وہ اپنی من مانی کر رہا تھا۔ اس پر عشق کا بھوت ایسا سوار ہوا تھا جس نے اسے اچھے برے کی پہچان ہی بھلا دی تھی۔ رضیہ کو لگتا کہ وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا ہے۔

زینب کے لبوں پر گہری چپ لگ چکی تھی۔ وہ بس عجیب سی نگاہوں سے ثانیہ کو دیکھتی رہتی۔ اس کی پتھرائی آنکھوں میں زندگی کی رمق ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ساری امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ ثانیہ نے ان کو جیتے جی مار ڈالا تھا ان کی برسوں کی نیک نامی دنوں میں رسوائی میں لپیٹ دی تھی اس دکھ نے ان کو بے دم کر ڈالا پھر وہ زیادہ دیر جی نہیں سکی۔ منیب ثانیہ سے نکاح کر کے اسے اپنے گھر لے آیا۔

اور اب وہ اس کے لاڈ اٹھاتے نہیں تھکتا تھا مگر ثانیہ چپ چپ رہتی تھی۔ اس کے انداز میں کوئی گرم جوشی نہیں ہوتی مگر منیب اس کی رکھائی کی پروا ہی نہیں کرتا تھا۔ اسے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

حسیب اور رضیہ منیب سے خفا تھے۔ منیب کی سونے کی چین بھی بک چکی تھی۔ وہ کام ڈھونڈ رہا تھا اور اسے کوئی کام نہیں مل رہا تھا پھر منیب نے ٹرکوں کے اڈے پر کام شروع کر دیا وہ ثانیہ کو ہر خوشی دینا چاہتا تھا۔ اس نے ٹرک کی ڈرائیوری سیکھنا شروع کر دیا۔ ثانیہ کو اس نے اے سی لگوا دیا۔ گھر کے کام کے لیے کل وقتی ملازمہ رکھوا دی تھی۔ وہ اسے رانی بنا کے رکھنا چاہتا تھا۔

☆......☆

ثانیہ کا فراز سے رابطہ پھر سے بحال ہو چکا تھا وہ جھوٹی سچی کہانی سنا کر ثانیہ کو پھر سے اپنی لائن پر لا چکا تھا۔ اب ثانیہ سارا دن ٹھنڈے کمرے میں بیڈ پر لیٹی فراز سے محبت محبت سنتی رہتی تھی۔ وہ دونوں منیب کا مذاق اڑاتے اور ہنستے تھے۔

"دکھتا کیسا ہے تمہارا منیب۔" فراز ہنسا۔

"سچ بولوں۔ بہت خوبصورت ہے مگر میں نے اسے کبھی خود سے قریب آنے کا حق دیا ہی نہیں۔" وہ اترائی۔

"وہ تمہارا شوہر ہے۔ ایسا کیسے ممکن ہے؟"

"میں نے صرف تمہیں چاہا ہے، تمہیں ہی پانے کے خواب دیکھے ہیں، یہ حق میں کسی اور کو کیسے دے سکتی ہوں۔ رہا منیب تو وہ تو میری موہنی صورت کا اتنا اسیر ہے کہ گھنٹوں بیٹھا مجھے تکتا رہتا ہے، پاگل ہے پورا۔ جو بھی کہتی ہوں مان جاتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتا ہے۔" ثانیہ تمسخرانہ ہنسی۔ وہ خوش گمانیوں کے راستے کی مسافر بنی بھول بیٹھی تھی کہ مرد محبت عورت کے اندر اگر لبالب بھر کر اسے مغرور کر سکتا ہے تو وہی مرد بدل بھی سکتا ہے۔ اگر بدلتا ہے تو اسی عورت کو خالی بھی کر دیتا ہے، اور جب اسے اپنی اوقات یاد آتی ہے۔ خوش فہمیوں کا تاج محل پورے قد سے اس عورت کو اس کے گھمنڈ سمیت اپنے بوجھ تلے دفن کر دیتا ہے۔

"تم نے خوب اسے استعمال کیا نا۔" فراز دوسری طرف ہنسا تھا۔

"ضرورت کے وقت تو گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔ میں اسی وقت بے ہوش ہو کر گرتا جب منیب میرے پاس پہنچ چکا تھا، میرے پلان کا حصہ تھا۔ پھر رو رو کر دہائی دینا کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ پھر سب کچھ ویسا ہوتا چلا گیا جیسا میں نے چاہا۔" وہ فخریہ اپنا پلان بتاتے ہوئے اترا رہی تھی۔

"شادی کے لیے میں نے شرط رکھی کہ اپنا گھر میرے نام کرا دو، قسم سے اس نے ایک منٹ نہیں لگایا فوراً میرے نام کر دیا۔"

"واہ جی واہ میری ثانی تو بہت بڑی پلانر نکلی مگر تمہارا یہ گھر ہے کہاں، محلے کا نام تو بتاؤ۔" فراز دل ہی دل میں کچھ حساب لگا رہا تھا۔

"اور کیا۔" وہ کھلکھلائی۔

"مجھ سے کتنا پیار کرتی ہو۔" فراز پھر سے جال پھینک رہا تھا۔

"بہت زیادہ......" ثانیہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"کیا کر سکتی ہو میرے لیے۔" وہ محبت کو جانچ رہا تھا۔

"سب کچھ جو تم کہو۔"

"اپنا گھر میرے نام کر سکتی ہو۔" فراز کی چالبازیاں

UUNOVELS.COM

کرنے کی جرأت ہوتی، تو شاید کبھی اتنی بڑی حماقت نہ کرتے۔

مالی لحاظ سے بھی فریال مجھ سے کہیں زیادہ آسودہ حال تھی۔ خالد صاحب یعنی میرے سسر ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر تھے اور ریٹائرڈ ہونے کے باوجود ان کا نوکر شاہی والا کروفر برقرار تھا۔ سرکار کی طرف سے مختلف مراعات انہیں تاحیات حاصل تھیں جبکہ پنشن میں ملنے والی رقم اتنی بھاری تھی کہ لاکھوں نوجوان کبھی بس آرزو کرتے ہوں گے کہ کاش ہمیں اتنی تنخواہ کی ملازمت مل جائے۔

دوسری طرف میرے والد محمود صاحب نے ساری زندگی ایک نجی ادارے میں گزاری تھی۔ پنشن ان کی کوئی نہیں تھی، بس ریٹائرمنٹ کے وقت چند لاکھ عطا کر دیے گئے تھے، اس رقم سے ابا نے گھر کی مرمت کرائی تھی اور میری شادی کے اخراجات برداشت کیے تھے۔

اپنے بارے میں بتا دوں کہ میں ایک اردو اخبار میں سینئر سب ایڈیٹر تھا اور ترجمے کا کام بھی بطور فری لانسر کرتا تھا۔ آمدنی بس مناسب ہی تھی۔ میں خود کو ایک سنجیدہ، بردبار اور ذمے دار نوجوان سمجھتا ہوں، جب کہ فریال خوب صورت، بے باک اور بڑے بڑے خواب دیکھنے والی عورت ہے۔ ہماری شادی کو دس سال ہو چکے ہیں اور اس عرصے میں خدا نے ہمیں دو معصوم اور خوب صورت تحفے علی اور شانزے کی صورت میں دیے ہیں اگر میں یہ کہوں کہ میری جان میرے بچوں میں ہے تو یہ غلط بھی نہیں ہوگا، میں اپنے بچوں کی کوئی فرمائش نہیں ٹالتا تھا۔ فریال بھی ایک اچھی ماں ہے، اس نے گھر اور بچوں کو بہت اچھی طرح سنبھالا ہوا ہے مگر یہ بتاتے ہوئے مجھے بے حد دکھ ہو رہا ہے کہ وہ ایک اچھی بیوی ثابت نہیں ہوئی، میں ایسا کیوں سمجھتا ہوں، اس کا پتا آپ کو اس کہانی کو اختتام تک پڑھتے ہوئے ہو جائے گا۔

زندگی ایک ڈھب پر گزر رہی تھی کہ اچانک دفتر میں ایک انتہائی منحوس اور مکروہ خبر ملی، پتا چلا کہ اخبار کے حالات خراب ہیں، آمدنی اٹھنی اور خرچا روپیا ہے، اس لیے مینجمنٹ نے ڈاؤن سائزنگ کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس خبر نے مجھے شدید تشویش میں مبتلا کر دیا۔ دفتر کے ساتھی موقع ملتے ہی اسی موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔

''اگر ڈاؤن سائزنگ کی خبر درست ہے تو کتنے لوگ فارغ کیے جائیں گے، کچھ اندازہ ہے۔'' میں نے سوال اٹھایا۔

''میرے پاس جو اطلاع ہے، وہ ڈھائی سو افراد کی ہے۔'' یوسف صاحب نے بڑے وثوق سے کہا۔

''میرا خیال ہے، ہمارا نیوز روم محفوظ رہے گا۔ کیوں کہ ویسے ہی گنتی کے لوگ ہیں، ہمیں تو مزید سب ایڈیٹرز کی ضرورت ہے۔''

''بھائی جان، یہ تو آپ سمجھتے ہیں نا کہ نیوز روم میں مزید لوگ چاہئیں، مینجمنٹ تو سمجھتی ہے کہ ہر ڈپارٹمنٹ میں سرپلس اسٹاف ہے۔ آری سب پر چلے گی، کوئی شعبہ محفوظ نہیں رہے گا۔''

''چلیں۔ رزق دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ ہمیں کسی نہ کسی ادارے میں ملازمت مل ہی جائے گی۔ ہم سب تجربہ کار صحافی ہیں۔'' میں نے اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانا چاہا لیکن ساتھیوں کی طنزیہ مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ انہیں میری بات پر بالکل بھی اعتبار نہیں ہے۔

رات کے دو بجے گھر آیا تو فریال حسب معمول جاگ رہی تھی۔ وہ رات کو دیر تک جاگنے اور صبح انتہائی دیر سے اٹھنے کی عادی ہے۔ بس بچوں کو اسکول بھیجنے کے لیے سات بجے صبح بیدار ہوتی اور آٹھ بجے جب بچوں کو اسکول وین لے کر چلی جاتی تو دوبارہ سو جاتی اور دوپہر دو بجے تک اس کو ہوش ہی نہ آتا کہ آدھے سے زیادہ دن گزر چکا ہے۔ اس بات پر کئی بار میری فریال سے تکرار بھی ہوئی تھی، کیوں کہ میں تو رات کو آفس سے آتے ہی سو جاتا تھا اور صبح بھی نو بجے بیدار ہو کر اپنا ناشتا خود ہی بناتا اور پھر دوپہر تک اپنے کمپیوٹر پر ترجمے کا کام کرتا رہتا۔ کچھ پبلشرز اور اداروں سے میرے تعلقات تھے جو انگریزی سے اردو میں ترجمے کا کام مجھے دیتے رہتے تھے اور اس کام کے معاوضے سے مجھے کافی سہارا ملتا تھا کیوں کہ ایک صحافی کو ملنے والی تنخواہ کا اندازہ تو آپ کو ہو گا ہی۔

''سونے کی بھی حد ہوتی ہے یار آدھے سے زیادہ دن تم سوتی رہتی ہو۔''

''رات کو دیر تک جاگتی ہوں۔''

''ہاں تو کس نے کہا ہے تم صبح چار بجے تک جاگتی رہو۔ تم موبائل پر کیا کرتی رہتی ہو رات بھر۔ دوپہر تک سونا نحوست ہوتا ہے فریال۔ رزق سے برکت ختم ہو جاتی ہے۔''

''آج تو بڑی مولویوں والی بات کر رہے ہو، اسلام کب قبول کیا؟ مسٹر لبرل سیکولر۔'' فریال میرا مذاق اڑاتی۔ وہ مجھے لبرل سیکولر کہہ کر مجھ پر پھبتی کس رہی تھی، حالانکہ اسے ان دونوں الفاظ کے معنی بھی نہیں معلوم تھے۔ میرے مقابلے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

میں فریال زیادہ مذہبی تھی۔ کم از کم ظاہر تو یہی کرتی تھی۔ فجر کے علاوہ باقی چار نمازیں پابندی سے ادا کرتی تھی۔ سوشل میڈیا پر اس کی پوسٹیں بھی مذہبی نوعیت کی ہوتی تھیں۔

اس رات میں دفتر سے گھر واپس آیا تو فریال حسبِ عادت خرچوں کی فہرست لے کر بیٹھ گئی۔ فریال مجھ سے جب بھی بات کرتی تھی، خرچے لے کر بیٹھ جاتی تھی۔ اس عورت نے آج تک مجھ سے کبھی ضروریات کے علاوہ کوئی معقول بات نہیں کی۔

''کل بجلی کے بل کی آخری تاریخ ہے۔'' فریال نے مژدہ سنایا۔

''کتنے پیسوں کا بل ہے؟''

''آٹھ ہزار چھ سو روپے کا۔''

''یار ہمارا دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ ہے۔ ہر مہینے اتنا بل کیوں آتا ہے۔ اے سی چلانا بند کر دو یار۔''

''کیا اے سی بند کر دوں؟ گرمی دیکھ رہے ہو۔ بچوں کو اے سی کے بغیر سونے کی بالکل عادت نہیں ہے۔''

''بچوں کی آڑ مت لو۔ یہ کہو نا تم اے سی کے بغیر نہیں سو سکتیں۔''

''اے سی آج کے دور میں عیاشی نہیں، ضرورت کی بنیادی چیز ہے۔ اب ہم سکون سے سوئیں بھی نہیں اور اسکول نے جون جولائی کی فیس کا واؤچر بھی بھیجا ہوا ہے۔''

''یہ لو۔ بجلی کا بل اور بچوں کی فیس ادا کر دینا۔''

میں نے جیب سے پیسے نکال کر فریال کو دیے۔

''یہ تو صرف پندرہ ہزار ہیں۔ پانچ ہزار اور مل سکتے ہیں؟''

''مزید پانچ ہزار کا کیا کرو گی؟''

''عاطف۔ تم بھول رہے ہو کہ میری کزن کی پندرہ دن بعد شادی ہے۔ ایک سستا سا جوڑا لے کر کام چلا لوں گی۔'' فریال نے انتہائی معصومیت سے ایک اور بم پھوڑا۔

''پانچ ہزار کا سستا سا جوڑا۔ بہت خوب۔ کیا بات ہے میڈم کی۔''

''پانچ ہزار کی آج کل اوقات ہی کیا ہے۔ لان کا معمولی سوٹ بھی کم از کم دو ہزار میں آتا ہے، مجھے تو پارٹی ویئر چاہیے۔ اگر آج پیسے نہیں ہیں تو کل دے دینا۔ میں کون سا گن پوائنٹ پر پیسے مانگ رہی ہوں۔''

''دیکھو فریال، کل تک مجھے کوئی خزانہ نہیں ملنے والا۔ ترجمے کے کام سے جو پیسے ملے تھے، وہ میں تمہیں دے چکا ہوں۔''

''آخر تمہیں تنخواہ کب ملے گی آج پچیس تاریخ تھی۔''

''ادارے میں ڈاؤن سائزنگ ہونے والی ہے، تم تنخواہ مانگ رہی ہو۔'' میں نے بھی فریال پر بم پھوڑ ڈالا تاکہ وہ پہلے سے ذہنی طور پر تیار رہے۔

ادارے نے اپنی کردہ کارروائی شروع کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اگلے دن دفتر گیا تو پتا چلا کہ سپلیمنٹ کا سارا ایڈیٹوریل اسٹاف فارغ کیا جا چکا ہے۔

''گنتی کے چار سب ایڈیٹرز تھے، سپلیمنٹ ڈپارٹمنٹ میں۔ وہ بھی نکال دیے۔ سپلیمنٹ میں تو سارا کام ہی ترجمے کا ہوتا ہے۔ اب کون کرے گا یہ کام؟'' نوید نے معصومانہ نکتہ اٹھایا۔

''آپ سب لوگ اضافی محنت کے لیے تیار رہیں۔ اب ترجمے کا سارا بار نیوز روم پر ڈالا جائے گا۔'' نیوز ایڈیٹر صاحب نے اپنی گمبھیر آواز میں مژدہ سنایا۔

''اگر ترجمے کے اضافی پیسے ملیں گے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

نوید کی خوش فہمی پر سب کا قہقہہ نیوز روم میں گونجا۔

''کیا میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے۔'' نوید کی آواز بتا رہی تھی، اسے برا لگا ہے۔

''اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔'' نقوی صاحب چہکے۔ ''نوید صاحب۔ اب ماحول یکسر تبدیل ہو چکا ہے۔ اب تو ادارے تنخواہ بھی احسان سمجھ کر دیتے ہیں، چہ جائیکہ اضافی مشاہرہ۔ میاں، اب ورک فورس کو شرنک کرنے کا رجحان چل رہا ہے۔ بارہ لوگوں کا کام چار افراد کر سکتے ہیں تو بارہ کیوں رکھے جائیں اور میں بتا دوں۔ یہ سلسلہ صرف سپلیمنٹ ڈپارٹمنٹ پر نہیں رکے گا۔ نیوز روم، میگزین، سرکولیشن، تلوار سب پر چلے گی۔''

نقوی صاحب ٹھہرے کالی زبان۔ واقعی دو ہفتے میں اخبار کا دفتر ویران ہو گیا۔ ہم شام پانچ بجے دفتر پہنچتے، شام چھ بجے سے پہلے ایچ آر سے تین چار لوگوں کا بلاوا آ جاتا۔ حالانکہ مجھے اپنی ذات پر بڑا زعم تھا کہ میں تو بے حد کام کا بندہ ہوں۔ ادارہ مجھے نکالنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیوں کہ آج تک میری بنائی ہوئی خبروں میں زبان و بیان یا ترجمے کی کوئی غلطی نہیں نکلی تھی۔ سرخیاں نکالنے پر تو مجھے خاص مہارت حاصل تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن مین لیڈ یا سپر لیڈ میری ہی بنائی ہوئی ہوتی تھی۔ اچانک کوئی اشاعتِ خاص

UUNOVELS.COM

آجاتی تو صفحہ بنانے کی ذمے داری میرے ہی کاندھوں پر ڈالی جاتی اور میں تین چار گھنٹوں میں پورے خصوصی صفحے کا مواد تیار کر دیتا۔

لیکن اس دن ایچ آر سے مجھے بھی کال آ گئی۔

''عاطف بھائی۔ گھبرانا نہیں ہے۔'' یوسف صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں میری ہمت بندھائی۔ ''رزق دینے والی اللہ کی ذات ہے، آپ جیسے باصلاحیت نوجوان کو انشاء اللہ جلد ہی اچھی ملازمت مل جائے گی اور ہو سکتا ہے، ایچ آر نے آپ کو کسی اور کام سے بلایا ہو۔''

لیکن جب میں ایچ آر کے دفتر پہنچا تو وہاں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ مجھے اسی وجہ سے بلایا ہے، جس کا مجھے خدشہ تھا۔

''عاطف صاحب، آپ ہمارے بڑے پرانے اور سینئر کارکن ہیں۔ ادارے کو آپ پر فخر ہے لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ادارے کے مالی حالات ایسے دگرگوں ہو گئے ہیں کہ ہمیں مجبوراً ڈاؤن سائزنگ کا کڑوا گھونٹ پینا پڑ رہا ہے۔'' ایچ آر منیجر اپنی منمنی آواز میں رٹا رٹایا اسکرپٹ بول رہا تھا۔

''مجھے دستخط کہاں کرنے ہیں؟'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ میرے پاس کوئی آپشن بھی تو نہیں تھا۔

ایچ آر منیجر نے ایک ٹائپ کیا ہوا لیٹر میرے سامنے رکھ دیا۔

''دیکھیے ہم آپ کو فارغ نہیں کر رہے۔ آپ اس استعفے پر دستخط کر دیجیے۔''

میں نے سرسری استعفے کی عبارت پر نظر ڈالی۔

''دیکھیے سر۔ اصول ہے کہ جب کسی کو ملازمت سے فارغ کیا جاتا ہے تو دیگر ڈیوز کے ساتھ ایک مہینے کی تنخواہ بھی ایڈوانس دی جاتی ہے۔'' میں نے حتی الامکان اپنا لہجہ مہذب ہی رکھا۔

''لیکن آپ تو خود مستعفی ہو رہے ہیں نا۔ دیکھیے، ہم آپ کو فارغ کریں گے تو آپ کی بدنامی ہوگی اور کوئی دوسری ملازمت ملنے میں بھی آپ کو مشکل پیش آئے گی۔'' ایچ آر منیجر نے مجھے پٹانے کی کوشش کی، کیونکہ یہ اس کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ ادارے کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے لیکن میں بھی کب بھولا بادشاہ تھا۔

''سر۔ سب کو پتا ہے، ملازمت خود سے کوئی نہیں چھوڑتا۔ اور کون دیکھتا ہے کہ آپ کو نکالا گیا تھا یا آپ نے استعفیٰ دیا تھا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''آپ مجھے فارغ کر دیں اور ایک مہینے کی تنخواہ کے ساتھ سارے ڈیوز دے دیں۔''

ایچ آر منیجر کے چہرے پر شدید ناگواری کے اثرات ابھرے، اس نے حتی الامکان حیل وحجت کی لیکن بالآخر اسے میرے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ایچ آر منیجر نے اسی وقت مجھ سے میرا آفس کارڈ اور موبائل سم واپس لے لی۔ ایک گھنٹے بعد میں اپنی ڈیسک پر واپس آیا تو فضا بے حد بوجھل تھی۔ نیوز روم سے فارغ ہونے والا میں پندرہواں سب ایڈیٹر تھا۔ سب مجھ سے اظہار ہمدردی کر رہے تھے اور مجھے حوصلہ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

''یار جب میں یہ اخبار جوائن کر رہا تھا، والد صاحب نے شدید مخالفت کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ میڈیا کی جاب ایک سراب ہوتی ہے۔ حکومت بدلتی ہے تو پالیسیاں بدل جاتی ہیں، میں نے تو اپنی زندگی میں اخبار نویسوں کو بے روزگاری کا عذاب جھیلتے ہی دیکھا ہے۔ آج احساس ہو رہا ہے کہ والد صاحب کا حرف بہ حرف کہنا درست تھا۔'' نوید کی آواز شدت جذبات سے بھرا رہی تھی۔ ''میں تو کہتا ہوں میڈیا کی جاب کرنے سے بہتر ہے انسان بریانی کا ٹھیلا لگا لے جو تنخواہ ہمیں ملتی ہے، اس سے زیادہ ہی کما لیں گے۔''

میں سر جھکائے خاموشی سے ساتھیوں کی باتیں سنتا رہا۔ میرے پاس کہنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔

''دوستو، میں بھی اس میکانیکی زندگی سے بیزار ہو گیا تھا۔ روز شام کو پانچ چھ بجے سے رات کے دو تین بجے تک دو کالمی، تین کالمی، چار کالمی سپر لیڈ، لیڈ بنانا آسان کام نہیں ہے۔ نہ دن اپنا، نہ رات۔ ہماری کوئی سوشل لائف بھی نہیں ہے۔'' میں نے خود کو حوصلہ مند ظاہر کرنے کے لیے ہانکی۔

''عاطف صاحب۔ اب کیا ارادہ ہے۔ کہاں اپلائی کریں گے؟'' نقوی صاحب نے پوچھا۔

''نقوی صاحب۔ ابھی کچھ نہیں سوچا۔ فی الحال ارادہ یہی ہے کہ دس پندرہ دن آرام کروں گا اور اپنی نیند پوری کروں گا۔'' کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن زندگی کتنی مشکل ہو جائے گی، اس کا اندازہ مجھے جلد ہی ہو گیا۔

جب میں نے ملازمت ختم ہونے کی خبر فریال کو سنائی تو اس کے چہرے پر مجھے ہزاروں وسوسے نظر آئے۔

''اب کیا ہوگا عاطف، ہمارا گزارا کیسے ہوگا۔''

''اللہ مالک ہے یار۔ فکر کیوں کرتی ہو۔''

''فکر کیسے نہ کروں، گھر تو مجھے چلانا ہے۔''

"گھر تم یا میں نہیں، اللہ چلائے گا۔ سب اللہ پر چھوڑ دو۔ اس نے رزق دینے کا وعدہ کیا ہے۔ انشاء اللہ ہم کبھی بھوکے نہیں سوئیں گے۔"

اللہ کا لاکھ لاکھ بلکہ کروڑ، کروڑ، ارب ارب شکر ہے کہ ہم کبھی بھوکے نہیں سوئے۔ حالانکہ مجھے بیروزگار ہوئے چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ مجھے کسی دوسرے اخبار میں جلد ملازمت مل جائے گی لیکن کچھ ہی دنوں بعد صورت حال یہ بن گئی کہ بڑے روزناموں کو تو چھوڑیں، شام کے اخبارات نے بھی گھاس نہیں ڈالی۔

پریس کلب میں، آرٹس کونسل اور دوسرے مقامات پر صحافی دوستوں سے ملاقات ہوتی۔ میں ملازمت کی بات کرتا تو میرے ساتھی مصلحت آمیز خاموشی اختیار کر لیتے یا پھر ایسی باتیں سننے کو ملتیں کہ دل ڈوبنے لگتا۔

"عاطف، تمہارا اتنا وسیع تجربہ ہے، حیرت ہے تمہیں ملازمت نہیں مل رہی۔"

"بھائی، سب سے بڑے اخبار کی حالت پتلی ہے، دوسرے اخباروں کی تو بات ہی مت کرو۔"

"یار، پانچواں مہینا ہے، پانچ مہینے پہلے جزوی تنخواہ ملی تھی۔"

"اخبارات میں اب کچھ نہیں رکھا۔ اشتہارات نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ انڈسٹری چلتی ہے تو میڈیا بھی چلتا ہے۔ یہاں تو بزنس ہی ڈاؤن ہو گیا ہے۔ اخبار کمائے تو کیسے کمائے۔"

اپنے ساتھیوں کی ایسی باتیں سن کر میں بدمزہ ہو جاتا۔ یہ حقیقت تھی کہ ہر میڈیا ہاؤس ڈاؤن سائزنگ کا شکار ہوا تھا جس ادارے میں پانچ ہزار ملازمین تھے، وہاں ڈھائی ہزار رہ گئے تھے۔ جہاں ڈھائی تین ہزار لوگ کام کرتے تھے، وہاں ہزار، پندرہ سو سے بھی کم رہ گئے تھے۔ کوئی ادارہ وقت پر ہر ماہ پابندی سے تنخواہ نہیں دے رہا تھا۔ نئی بھرتیاں ختم ہی ہو گئی تھیں۔ وہ تو میرے کچھ پبلشر دوست تھے، جن سے ملنے والے ترجمے کے کام سے دال دلیا چل رہا تھا مگر اب..... ترجمے کا کام ملنا بھی کافی کم ہو گیا تھا۔ پبلشر پہلے جیسا معاوضہ بھی نہیں دے رہے تھے۔

ہم ورکنگ جرنلسٹوں کا بینک بیلنس تو ہوتا نہیں۔ جو برائے نام جمع پونجی تھی، وہ تو بس تین مہینے ہی چل سکی۔ اب میں "ہینڈ ٹو ماؤتھ" ہو چکا تھا۔ یعنی مجھے کل کا پتا نہیں ہوتا تھا کہ کل کا دن کیسے گزرے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ گھر میں کھانا روز پک رہا تھا لیکن زندگی کی ناگزیر ضروریات میں صرف کھانا پینا نہیں ہوتا اور بھی ہزاروں ناگزیر خرچے ہوتے ہیں۔ بجلی گیس کا بل تو ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔ بچوں کے اسکول کی فیس دیے بغیر بھی چارہ نہیں ہوتا۔ شکر ہے کہ مکان ذاتی تھا، اگر کرائے کا مکان ہوتا تو ہر مہینے چالیس پینتالیس ہزار روپے کہاں سے دیتا؟ شاید ہم واقعی سڑک پر آ چکے ہوتے۔

☆......☆

میں روز بیس کلومیٹر کا سفر بائیک کے ذریعے طے کر کے آفس پہنچ کر آٹھ دس گھنٹے کام کرنے کی میکانیکی زندگی سے بیزار ہو چکا تھا، جب انسان بیروزگار رہتا ہے تو لگتا ہے، اب سکون سے گھر بیٹھیں گے اور سہولت سے لکھنے پڑھنے کا کام کریں گے لیکن بیروزگار ہونے کے دو ہفتے بعد ہی جب مشکلات کا احساس ہوا تو دن میں تارے نظر آنے لگے۔

میری ساری زندگی ملازمت کرتے گزری تھی۔ میں روز دفتر جانے کا عادی تھا مگر اب میں جاؤں تو کہاں جاؤں؟ نوکری کی تلاش میں دفاتر کے چکر بھی کب تک لگاتا، کیونکہ ہر جگہ ٹکا سا جواب ملتا، یا پھر آپ کو کال کر دیں گے جیسا بے معنی جواب، جس کا صاف مطلب یہی ہوتا تھا کہ آپ قیامت تک ہماری کال کا انتظار کریں۔

آہستہ آہستہ میری سوشل لائف ختم ہونے لگی، کیوں کہ سب دوست اپنے اپنے کام دھندے میں مصروف ہوتے تھے، ایک میں ہی فالتو تھا، جس کے پاس کرنے کو کوئی معقول کام نہیں تھا۔

اب احساس ہوتا ہے کہ مصروفیت بھی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ تنخواہ کتنی ہی کم ہو لیکن آدمی ملازمت پر ہو تو اس کا وقار برقرار رہتا ہے۔ وہ بے توقیر نہیں ہوتا' لیکن اب مجھے اپنی بے توقیری کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ عاطف محمود، تمہیں بڑا زعم تھا کہ تم باکمال لکھاری ہو، سینئر صحافی ہو، لیکن تمہاری اوقات کیا ہے، کوئی معمولی سا اخبار بھی تمہیں رکھنے کو تیار نہیں۔ ہر جگہ تمہیں اوور کوالیفائڈ قرار دے کر ٹال دیا جاتا ہے۔ میں خود کو کوستا رہتا۔ جس بلڈنگ میں، میں رہتا ہوں، وہاں اہل محلہ کو پتا چل چکا تھا کہ میرے پاس کوئی ملازمت نہیں ہے۔ سب کی آنکھوں میں تمسخر محسوس ہوتا، یوں لگتا سب میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ برداشت کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

اب تو فریال اور بچوں کا رویہ بھی میرے ساتھ تبدیل ہو چکا تھا۔ فریال کی بے رخی میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی،

URDUNOVELS.COM

ذہنی تفاوتوں کے سبب وہ کبھی میرے قریب نہیں آئی تھی۔ میاں بیوی کے درمیان جو قربت ہوتی ہے، وہ ہمارے درمیان کبھی نہیں رہی تھی لیکن بچے بھی مجھ سے اکھڑے اکھڑے رہنے لگے تھے، یہ امر میرے لیے انتہائی دکھ دینے والا تھا۔

بچوں کا رویہ کیوں تبدیل ہوگیا ہے؟ میں نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو خود ہی میں نے باور کیا کہ میں بچوں کے لیے کر بھی کیا رہا ہوں۔ پہلے بچے کوئی بھی چیز مانگتے تھے، تو میں فوراً وہ چیز لادیتا تھا۔ شانزے نے بریانی کی فرمائش کی تو میں اسی وقت شانزے کے ساتھ ساتھ علی اور فریال کو بھی بریانی لادیتا۔ علی نے ویڈیو گیم مانگا تو میں نے گھر میں ویڈیو گیمز کے ڈھیر لگادیے مگر اب، اب بچے آئس کریم بھی مانگتے تو میں دل مسوس کر رہ جاتا۔

"یار! تمہارے پاس سو ڈیڑھ سو ہیں تو دے دو، بچے آئس کریم مانگ رہے ہیں؟"

"کہاں سے دوں سو ڈیڑھ سو روپے میں کون سا کماتی ہوں۔ یہ تمہاری ذمے داری ہے مسٹر عاطف۔" فریال ٹکا سا جواب دیتی۔ بظاہر فریال کا پیسے دینے سے صاف انکار بے جواز نہیں ہوتا تھا۔ وہ کوئی جاب نہیں کرتی تھی، نہ ہی اس کا کوئی ذریعہ آمدنی تھا اور بچوں کی ضروریات اور خواہشیں پوری کرنے کی ذمے داری میری ہی بنتی تھی، خواہ میں کچھ کما رہا ہوں یا نہیں۔ فریال کوئی ملازمت اس لیے نہیں کرتی تھی کہ اس کی تعلیم کوئی خاص نہیں تھی۔ اسے تعلیم سے کبھی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ اس نے مر مر کے تھرڈ ڈویژن میں انٹر کیا تھا اور تعلیم چھوڑ کر گھر بیٹھ گئی تھی۔ پھر والدین نے اس کی شادی بھی جلدی کردی تھی۔ شادی کے بعد کی مصروفیات میں عورت کا تعلیم کا سلسلہ بحال کرنا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ اب انٹر پاس کو کون ملازمت دیتا اور اسے کیا ملازمت ملتی؟ اس کی انگریزی بھی بس واجبی تھی۔ البتہ بھرم اس کے بے حد تھے۔ مجھے ماننا پڑے گا کہ اسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ آتا تھا۔ خوب صورت بھی تھی اور اس کی شخصیت میں ایک خاص طرح کی جاذبیت تھی۔ وہ دیکھنے میں کافی پروقار لگتی تھی، کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ عورت صرف انٹر پاس ہے۔

☆......☆

وہ نومبر کی ایک سرد رات تھی اور مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ آج کی رات مجھ پر ایک قیامت گزرنے والی ہے۔ سرد ہوا کے زناٹے چل رہے تھے، خنکی تھی، مگر سردی بھی نہیں تھی۔ ویسے بھی کراچی میں دسمبر کے آخری ہفتے میں ہی سردی آتی ہے اور فروری کے اختتام تک موسم زمستاں رخصت ہو جاتا ہے۔ فلک پر چاند کو سیاہ بادلوں نے اپنی آغوش میں لیا ہوا تھا۔ رات کے تین بجے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ نجانے کیوں اچانک میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ شاید فشار خون کا پارہ بڑھ رہا تھا۔ سوتے ہوئے آدمی کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا بہرحال مجھ سے باہر تھا۔ جب میں بیدار ہوا تو میں نے فریال کو بستر پر نہیں پایا۔ میں سمجھا شاید وہ واش روم میں ہے لیکن میں نے واش روم کے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا اور فریال واش روم میں بھی نہیں تھی۔ اتنی رات کو فریال کہاں جاسکتی ہے۔ میں الجھن میں پڑ گیا، ذہن میں عجیب عجیب وسوسے سر اٹھانے لگے۔ میں سمجھا، فریال شاید بچوں کے ساتھ سو رہی ہے۔ میں نے اٹھ کر بچوں کے کمرے میں جھانکا تو میرے دونوں معصوم فرشتے بے خبر سو رہے تھے، فریال وہاں بھی نہیں تھی۔

مجھے پیاس محسوس ہوئی تو میں نے لاؤنج میں رکھے فریج سے پانی نکالا، تبھی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہے۔ آواز نسوانی تھی اور یہ یقیناً فریال کی آواز تھی۔ رات کے تین چار بجے فریال کس سے محو گفتگو تھی اور یہ کس جگہ ہے؟ گھر میں تھوڑی سی تلاش کے بعد فریال مجھے سیڑھیوں کے پاس کرسی پر بیٹھی فون پر کسی سے باتیں کرتی نظر آئی۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی لیکن میری آہٹ پاکر اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر جلدی سے کال ڈسکنکٹ کردی۔

"کیا ہوا، رات کے اس وقت کس سے بات کر رہی تھیں؟" میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"کک...... کسی سے بھی نہیں۔ ایک سہیلی کی کال تھی۔" فریال کے لہجے کی گھبراہٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔

"کون سی سہیلی کی کال تھی؟"

"وہ...... وہ...... رخشندہ...... تھی۔" فریال کے لہجے کی بوکھلاہٹ ختم نہیں ہو رہی تھی۔

"میں نے پہلے کبھی رخشندہ کا نام نہیں سنا۔"

"تم کیا میری سہیلیوں کو جانتے ہو، اسکول کے زمانے کی سہیلی ہے، دبئی سے آئی ہوئی ہے۔" اب فریال کے لہجے کا اعتماد واپس آچکا تھا۔ "رخشندہ کے نصیب تو دیکھو، اسے اتنا اچھا رشتہ ملا۔ شادی کے بعد شوہر دبئی لے گیا۔ وہاں

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

عیش سے رہتی ہے۔ کروڑوں میں کھیلتی ہے۔" پھر اس نے دھیرے سے مجھے ذلیل کرنے کے لیے کہا۔ "ایک میرا نصیب ہے۔ لعنت ہے۔"

یہ لعنت اس نے یقیناً مجھ پر بھیجی تھی، طبیعت میں اشتعال تو آیا لیکن میں غصے کو پی گیا۔ میں نے مصلحتاً خاموشی اختیار کی اور بستر پر دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن اب نیند کہاں؟ تھوڑی دیر بعد فریال بھی بستر پر آ کر سو گئی۔ میں ایک گھنٹے تک کروٹیں بدلتا رہا اور بالآخر میں بھی نیند کی وادی میں گم ہو گیا لیکن نیند کا یہ عرصہ بہت مختصر رہا۔ فجر کی اذانوں نے پھر میری نیند اڑا دی۔

☆......☆

ذرا سی نیند کے بعد اب نیند پھر میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں نے فریال پر نظر ڈالی۔ اس کے چہرے پر ایسا گہرا اطمینان تھا، جیسے اس کی چوری پکڑی ہی نہ گئی ہو۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ کتھئی بال اس کے گالوں سے کھیل رہے تھے اور میرے دل کو ماننا پڑا کہ وہ سفید ٹی شرٹ اور پاجامے میں دل کش لگ رہی تھی۔ اگر حالات معمول کے مطابق ہوتے تو میں اس کا منہ چوم لیتا لیکن اس وقت میں نے خود کو اپنے ارادوں سے باز رکھا۔ یہ بات مجھ سے ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اپنی کسی سہیلی رخشندہ سے فون پر بات کر رہی تھی۔ فریال کی جتنی چار پانچ سہیلیاں تھیں، ان کے نام میرے کانوں میں پڑ چکے تھے۔ رخشندہ، یہ نام پہلی بار میری سماعت سے ٹکرایا تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی، کہیں کچھ گڑبڑ ہے اور میں نے فریال کا موبائل چیک کرنے کا پکا فیصلہ کر لیا، اگرچہ بیوی کا موبائل چیک کرنا خود میرے اپنے نظریات سے متصادم عمل تھا مگر اپنا گھر بچانے کے لیے میں نے یہ کام کرنے کا پکا فیصلہ کر لیا اور جب صبح نو بجے..... فریال بے حد گہری نیند میں تھی، مجھے یہ موقع مل گیا۔ میں نے فریال کے تکیے کے نیچے سے اس کا موبائل فون نکالا، سب سے پہلے اس کو ساؤنڈ پروف کیا، موبائل نے جب تصدیق کے لیے پیٹرن مانگا تو مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی، کیوں کہ میں کئی بار فریال کو اپنے موبائل کے پیٹرن پر انگلیاں چلاتے دیکھ چکا تھا۔ مجھے اس کا پیٹرن اچھی طرح یاد تھا۔ پیٹرن کھل گیا تو میں نے اس کا واٹس ایپ دیکھنا شروع کیا اور میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ فریال کا موبائل فون چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ مجھ سے بے وفائی کر رہی ہے۔

☆......☆

"یہ دلاور کون ہے؟" دوپہر کو میں نے موقع دیکھ کر فریال سے پوچھا۔ دلاور کا نام سن کر فریال تھوڑا چونکی، پھر اعتماد سے بولی۔ "کون دلاور؟"

"وہی جس سے تم رات رات بھر باتیں کرتی ہو۔" غصے کی شدید لہر میرے اندر اٹھی۔ اور میں نے اس کا موبائل دیوار پر کھینچ کر مارا۔ فریال نے اس طرح لپک کر اپنا موبائل اٹھایا جیسے میں نے خدانخواستہ مقدس کتاب کی بے حرمتی کی ہو۔

"تیرہ ہزار کا لیا تھا۔ اسکرین توڑ دی۔ شاید پینل تبدیل کروانا پڑے گا۔" فریال کے لہجے میں تاسف تھا۔ "کہاں سے اتنا مہنگا پینل بدلوائیں گے۔ تم تو ایک دھیلا نہیں کماتے۔"

فریال کا طنز میرے سینے پر تیر بن کر لگا۔ واقعی اب تو ترجمے کا کام بھی ملنا بند ہو گیا تھا اور گھر میں سو دو سو روپے دینے سے بھی قاصر تھا۔

"کب سے یہ چکر چل رہا ہے۔ کون ہے یہ لونڈا دلاور۔"

"اونہہ۔ تم سے مطلب؟" فریال کی سرکشی نے مجھ میں جنون سا بھر دیا۔

"میں تیرا شوہر ہوں بے غیرت۔ بے شرم بے حیا..... آوارہ۔"

"اونہہ..... شوہر..... شوہر بن کر تو دکھاؤ..... شوہر ہونے کی ذمے داریاں تو پوری کرو..... چوتھا مہینا ہو گیا ہے۔ تم نے بجلی گیس کا بل بھرا؟ بچوں کی فیس جمع کرائی؟ تمہیں پتا ہے، روز ہنڈیا کیسے پک رہی ہے؟ دال سبزی پکانے پر بھی کم از کم پانچ سو روپے تو خرچ ہو ہی جاتے ہیں۔ شانزے کب سے چکن کڑائی مانگ رہی ہے۔ علی کو میکرونی چاہیے اور سچی بات ہے، میرے حلق سے بھی دال یا سبزی نہیں اترتی۔"

"اگر میں اپنی ذمے داریاں نہیں اٹھا پا رہا تو اس کا مطلب ہے تمہیں بے غیرتی کی اجازت دے دوں۔" میں دہاڑا تو علی اور شانزے سہم کر دبک گئے۔

"زیادہ غیرت خان بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ دلاور میرا دوست ہے۔ وہ قطر میں رہتا ہے۔ میں قطر چلی جاؤں تو مجھے شہزادیوں کی طرح رکھے گا۔" فریال بے حد ڈھٹائی سے میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"صاف صاف بول نا وہ تیرا لور ہے۔"

"مجھ سے بدتمیزی کی ضرورت نہیں ہے۔ یس، ہی از مائی لور۔ اینڈ آئی لو ہر۔ اپنی پرابلم۔ اگر برداشت نہیں ہے تو

UUNOVELS.COM

فیصلہ کرلو۔ مجھ سے بھی اب فقیروں جیسی زندگی نہیں جی جاتی۔'' میں نے شدید طیش میں آکر شیشے کا گلاس دیوار پر دے مارا۔ شیشہ چھناکے سے ٹوٹا اور میرا دل بھی۔ فریال کتنی آسانی سے اپنے کارنامے کا اقرار کررہی تھی۔

''آج سے تیرا میرا میاں بیوی کا رشتہ ختم۔''

''مجھے طلاق دو مسٹر عاطف۔'' فریال کے مطالبے نے مجھے شدید دھچکا پہنچایا اور میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اس سچوئیشن سے دور چلے جاؤں میں پاؤں پٹختا ہوا گھر سے نکلا اور محلے کے پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

☆......☆

میری پرانی عادت ہے کہ جب حالات بہت خراب ہوجاتے ہیں اور پانی سر سے اونچا ہوجاتا ہے تو میں ٹھنڈے دماغ سے تمام حالات پر غور کرتا ہوں اور کسی فیصلے پر پہنچتا ہوں یا پھر اپنے مخلص دوست سے مشورہ کرتا ہوں۔

ڈاکٹر شہزاد میرے مخلص دوست ہیں۔ پانچ سال سے جنوبی افریقا میں اہل خانہ کے ساتھ مقیم ہیں۔ ان سے واٹس ایپ پر مفت میں بات ہوسکتی تھی۔

''جانی! آج ہماری یاد کیسے آگئی۔'' دو تین بیلز جانے کے بعد ڈاکٹر شہزاد کی گمبھیر آواز سنائی دی۔

میں نے گلا کھنکھار کر بات شروع کی۔ کہا۔ ''آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''ہاں...... ہاں...... بولو عاطف۔ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔''

''آپ ایک درست مشورہ تو دے سکتے ہیں۔''

''جانی۔ بات تو بتاؤ۔ معاملہ کیا ہے۔''

پھر میں نے جھجک جھجک کر فریال کے کرتوت ڈاکٹر شہزاد کو بتائے اور ان سے پوچھا کہ میں طلاق نہیں دوں تو ایسی عورت کیسے برداشت کروں۔

''دیکھو عاطف۔ جذبات میں کوئی غلط فیصلہ نہیں کرنا۔ کوئی ایسا فیصلہ ہرگز مت کرنا جس کے بعد تمہیں پچھتانا پڑے۔'' ڈاکٹر شہزاد کا مطلب تھا کہ میں فریال کو طلاق ہرگز نہ دوں، کیوں کہ طلاق کی صورت میں گھر بکھر جائے گا، بچوں پر بہت برے اثرات مرتب ہوں گے، کیونکہ بچوں کو ماں اور باپ دونوں ... ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔

''ڈاکٹر صاحب آپ ویسٹ میں رہتے ہیں۔ وہاں تو طلاق عام سی بات ہے۔''

میرے اعتراض پر انہوں نے کہا۔''یہ مت بھولو کہ مغرب میں خاندان کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ یار! سچ تو یہ ہے کہ فریال بھابی کو تم بھی نہیں بھول پاؤ گے۔ ابھی تم غصے کے ابال میں ہو۔''

''تو کیا میرا غصہ غلط ہے؟''

''ہرگز نہیں۔ تمہاری جگہ کوئی اور پاکستانی ہوتا تو پتا نہیں کیا کر بیٹھتا۔''

''ڈاکٹر صاحب۔ یقین کریں، مجھے اس ...... پر جھوٹا بہتان لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں......نہیں...... بخدا مجھے تمہاری بات پر مکمل یقین ہے یار اس اسمارٹ فون نے ہماری عورتوں اور بچوں کو بہت بگاڑ دیا ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب! وہ عورت مجھے شوہر کا درجہ نہیں دیتی۔ ہر وقت بچوں کو میرے خلاف کرتی رہتی ہے۔ میرا کوئی کام نہیں کرتی۔ میں اپنا ناشتا خود بناتا ہوں۔ اپنا کھانا خود نکالتا ہوں۔ پورا دن نکل جاتا ہے، مجھ سے نہیں پوچھتی کہ کھانا نکال دوں۔ ان فیکٹ وہ مجھ سے کوئی بات ہی نہیں کرتی۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوتا کہ میں بھی شادی شدہ ہوں۔ میری بھی کوئی ہم نفس ہے۔ جو مجھ سے اپنے دل کی بات کہے، جس سے میں اپنے دل کی بات کہوں۔ میرے ذہن میں تو بیوی کا تصور ایک دوست کا تھا مگر وہ تو مجھ سے دشمنی پر اتر آئی ہے۔'' میں نے جی بھر کر اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

''میں سمجھتا ہوں ڈیئر! میں سمجھتا ہوں۔'' ڈاکٹر شہزاد مجھے تسلی دیتے رہے۔ میں نے ان سے کہا۔''مجھے بھی امریکا بلالیں۔'' جس کی انہوں نے معذرت کرلی۔ کیونکہ اب حالات بالکل فیور میں نہیں تھے۔ پاکستانیوں کے لیے تو کسی دوسرے ملک شفٹ ہونا ناممکن ہی ہوگیا تھا۔

بہرحال ڈاکٹر صاحب نے مشورہ دیا کہ میں فریال کو طلاق ہرگز نہ دوں۔ اس کا سامنا کرنے سے گریز کروں اور جتنا ہوسکے اپنا وقت باہر گزاروں۔

میں نے اس مشورے پر عمل شروع کردیا۔ میں دن کا زیادہ تر وقت لائبریریوں یا پارکوں میں گزارتا اور ظاہر کرتا جیسے نوکری تلاش کررہا ہوں، پھر بھی فریال مجھے نیچا دکھانے کے لیے کوئی نہ کوئی حرکت کر بیٹھتی۔ اس دن اس نے شانزے سے بہ آواز بلند کہا۔''پاپا سے کہو کہ پکانے کے لیے آدھا کلو قیمہ، ایک کلو آلو، ایک پاؤ مٹر، ایک پاؤ ٹماٹر اور دھنیا مرچیں لے آئیں۔''

UUNOVELS.COM

میں نے حساب لگایا، اس سودے کے لیے چار پانچ سو روپے کی ضرورت تھی۔ میں نے شانزے سے کہا۔ ''ماما سے پانچ سو روپے لے آؤ۔''

فریال نے ہزار کا نوٹ کچن سے باہر پھینکا جو میں نے لپک کر اٹھالیا۔ اس نے ساتھ ہی دو کلو آٹے کی فرمائش کی ورنہ چپاتیوں کے لیے مزید ساٹھ روپے کی ضرورت ہوتی۔

پتا چلا۔ فریال کے ریٹائرڈ سرکاری افسر ابا نے پانچ ہزار روپے بھیجے ہیں جس کا مطلب تھا، چار پانچ دن تو سکون کے گزرنے تھے لیکن ساتھ ہی فریال نے شانزے کے بہانے مجھے سناتے ہوئے کہا۔ ''اونہہ۔۔۔ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔ ملازمت کی طرف سے تو ہاتھ ہی کھینچ لیا ہے۔ پتا نہیں کیا سوچ بیٹھے ہیں۔ ملازمت خود چل کر تو آئے گی نہیں۔ خالی فون کرنے سے جاب نہیں ملتی۔ انسان لوگوں سے ملے جلے۔ جا کر دفاتر میں بیٹھے۔ بات کرے۔ تب جا کر بات بنتی ہے۔''

''تو میں سارا سارا دن کہاں غائب رہتا ہوں؟'' میں نے احتجاج کیا۔

''سب پتا ہے مجھے۔ لائبریری یا پارک میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔'' فریال کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ اس ... کو میرے معمولات کا کیسے علم۔ غور کیا تو اندازہ ہوا کہ محلے کا ایک لڑکا مجھے دو تین بار لائبریری میں ملا تھا۔ اسی نے چغلی لگائی ہوگی کہ میں ملازمت تلاش کرنے کے بہانے لائبریری میں وقت گزارتا ہوں۔

دن گزرتے گئے۔۔ اور وقت مشکل سے مشکل ہوتا گیا۔ مستقل فیس نہ دینے کے باعث مجھے بچوں کو اسکول سے اٹھوانا پڑا۔ اب بچے دن بھر گھر میں ہی دھما چوکڑی مچاتے رہتے۔ فریال کی چڑچڑاہٹ میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔ میرے اپنے والد بھی ریٹائر تھے۔ وہ ہماری کیا مدد کرسکتے تھے۔ فریال کے والد نے بھی کوئی خاص ساتھ نہیں دیا۔ وہ تو گھر ہمارا اپنا تھا۔ اگر کرائے کا گھر ہوتا تو ہم کب کے سڑک پر آچکے ہوتے۔

وقت گزرتا گیا۔ مجھے ملازمت نہیں ملی۔ میں تو بھول بھی چکا تھا کہ میں کبھی ایک اخبار میں سینئر سب ایڈیٹر تھا۔ شانزے جیسے تیسے انٹر آرٹس پرائیویٹ کررہی تھی۔ علی کا پڑھائی میں شروع ہی سے دھیان نہیں تھا۔ آٹھویں سے اٹھ کر اس نے بھی ہمت ہار دی تھی۔ میں نے اور فریال نے علی کو ٹیوشن پڑھانے کی بہت کوشش کی مگر ہم دونوں ہی ناکام رہے۔ والدین سے بچے کب سنجیدگی سے پڑھتے ہیں۔ کوئی اچھا ٹیوٹر رکھنے کی ہماری اوقات نہیں تھی۔

کئی مہینے تک گھر میں سناٹا چھایا رہا۔ بچے بھی سہمے سہمے رہتے۔ اس عرصے میں مجھے ایک کتاب ترجمہ کرنے کو مل گئی۔ ترجمے کے مجھے بیس ہزار روپے ملے۔ وہ پیسے میں نے اپنی بیٹی شانزے کے ذریعے فریال کو عید کی تیاریوں کے لیے دے دیے۔ مگر فریال صرف بچوں کی خریداری کر پائی کیوں کہ اپنے کپڑوں کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں بچے۔ مجھے یہ بات پتا چلی تو ایک دوست سے پانچ ہزار روپے ادھار پکڑے اور فریال کے لیے اپنی پسند سے ایک جوڑا لاکر دے دیا۔ مجھے پتا تھا، میری پسند فریال کو پسند نہیں آنے والی، لیکن مجھے اپنا فرض تو ادا کرنا تھا۔ عید کا سوٹ پانے کے بعد میں نے پہلی بار فریال کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ دیکھی اور پھر میں نے دیکھا کہ فریال رو رہی ہے۔

''کیا ہوا؟ رونے کی کوئی خاص وجہ؟'' فریال کے آنسوؤں کی جھڑی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''مجھے معاف کردو۔'' اس نے مہینوں بعد میرا ہاتھ تھاما تو میرا دل بھی پگھلنے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''مجھ سے بہت بڑی بھول ہوگئی، مجھے معاف کردو۔ مستقل دو اور دو چار کا حساب کرتے کرتے میرے اعصاب شل ہوگئے تھے، میں اپنی زندگی سے تنگ آگئی تھی، اس لیے موبائل فون میں، میں نے زندگی سے فرار کا ایک راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ میں بھٹک گئی تھی، مجھے معاف کردو۔ ایک غلطی تو خدا بھی معاف کردیتا ہے۔ اسے... اس کے تو ذہن میں بھی نہیں ہوگا کہ میں نے عید کی تیاری کی یا نہیں، تم کتنے اچھے ہو، تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔''

فریال کا اشارہ دلاور کی طرف ہی تھا۔ ویسے ان دنوں میں نے محسوس کیا تھا کہ فریال موبائل فون سے دور رہتی ہے۔ شاید اب اس کا دلاور سے بھی رابطہ ختم ہوچکا تھا۔۔۔ ہم میاں بیوی کے تعلقات دوبارہ بحال ہونے لگے تھے۔ اس عید پر مہینوں بعد ہماری فیملی نے فلم دیکھی۔ ''میں پنجاب نہیں جاؤں گی۔'' فلم کے دوران ہیرو جب جنگل میں ہیر کے عشق میں پاگل ہورہا تھا تو میں اور فریال کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ سالی نفرت پر پھر محبت غالب آگئی تھی۔ اس دوران مجھے ایک بہت اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ ایک بڑی ایڈ ایجنسی میں کاپی رائٹر کی جاب۔ اس کام میں مجھے زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن میں نے یہ جاب کرلی۔ اس ملازمت کے ذریعے گھر میں کھوئی ہوئی توقیر بحال ہورہی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

تھی۔ اچھی تنخواہ کے ساتھ دیگر مراعات بھی تھیں مگر خوشیوں کے یہ پل صرف چھ مہینے ہی برقرار رہ سکے۔ کیوں کہ ایک دن میں دفتر پہنچا تو وہاں میری برطرفی کا پروانہ میرا منتظر تھا۔ میں چھ مہینے میں کوئی کمپین نہیں بنا پایا تھا۔ مالکان کو اندازہ ہو گیا کہ مجھ میں اتنی صلاحیتیں ہی نہیں ہیں کہ میں بسکٹ، نئی کار یا لان کا کپڑا بیچ سکوں۔ پھر وہی بے یقینی کے دن آ گئے۔ فریال اب کوئی افیئر تو نہیں چلاتی مگر ہم میاں بیوی کا دل مر چکا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان پھر تلخیاں اور فاصلے پیدا ہو گئے تھے۔

کوئی معقول جاب نہ ملنے کے باعث میں محلے کے ایک سپر اسٹور پر سیلز مینی کا کام کرنے لگا۔ ہوا یہ کہ ایک دن میں سپر اسٹور سے سودا لے رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ اسٹور کے مالک اقبال بھائی بڑے طیش میں بیٹھے ہیں۔ پتا چلا کہ ان کا سیلز مین انہیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

''بھائی۔ سامنے شیلف میں سے اپنا سودا خود اٹھالیں۔ وہ نمک حرام ذرا سی تو اچھی ملازمت ملنے پر چپ چاپ چلا گیا ہے۔'' اقبال بھائی تاسف سے بولے۔

''اقبال بھائی دوسرا سیلز مین رکھ لیں نا۔'' میں نے کہا تو بولے۔

''بھیا! اچھا سیلز مین ملتا کہاں ہے؟''

میں نے ایسے ہی کہا۔ ''مجھے رکھ لیں، آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

اقبال بھائی تذبذب میں پڑ گئے۔ بولے ''میں آپ کو جانتا تو ہوں۔''

''آپ شریف اور ایماندار آدمی ہیں مگر یہ سیلز مینی کا کام......''

میں نے انہیں یقین دلایا کہ سیلز مینی کوئی راکٹ سائنس نہیں ہے اور مجھے دس ہزار روپے ماہانہ کی سیلز مینی مل گئی۔

میں صبح گیارہ بجے سے رات کے دو بجے تک سپر اسٹور پر بھوکا پیاسا کام کرتا رہتا تاکہ گھر سے زیادہ سے زیادہ دور رہ سکوں اور فریال سے سامنا نہ ہو۔ اس دوران بچے کب بڑے ہو گئے۔ اندازہ ہی نہ ہوا۔ شانزے گریجویشن کر چکی تھی، جب کہ علی کی آواز اچھی تھی۔ وہ گلی محلوں کے فنکشنوں میں گا کر تھوڑا بہت پیسا حاصل کر رہا تھا۔

''تم نے بچوں کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ میرا مطلب ہے ان کے مستقبل کے بارے میں۔'' کئی ماہ بعد فریال نے مجھ سے کوئی بات خود سے کی تھی۔

''بھئی میں نے تو سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اللہ پر ایمان رکھنے اور اللہ پر سب کچھ چھوڑ دینے میں فرق ہے کہ جو کرے گا اللہ کرے گا۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو۔'' میں نے پوچھا تو فریال بولی۔ ''بچے اب شادی کے قابل ہو گئے ہیں۔ مجھے تو شانزے کی فکر کھائے جا رہی ہے۔''

''تو رشتہ دیکھو اچھا سا۔ یہ کام تم ہی بہتر کرو گی۔''

''رشتہ طے ہو گیا تو کیا کریں گے۔ کہاں سے لائیں گے شادی کے لیے لاکھوں روپے۔ تمہاری دس ہزار تنخواہ میں کیا ہوتا ہے۔''

فریال نے ایک بار پھر مجھے نیچا دکھایا لیکن میں نے ضبط کیا اور واپس اپنی ملازمت پر چلا گیا لیکن دو گھنٹے بعد فریال کا فون آیا کہ مہمان آئے ہیں، مجھ سے ملوانا ہے۔''

میں تھوڑی دیر کی چھٹی لے کر گھر پہنچا تو ایک صاحب ریش بزرگوار، ان کی باپردہ بیگم صاحبہ، ایک صاحبزادے، لمبی داڑھی، ٹخنوں سے اونچا پاجامہ اور سر پر ٹوپی پہنے بیٹھے تھے۔ صاحبزادے کا نام عبدالغنی تھا۔ انہوں نے حال ہی میں انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ روایتی سا مذہبی گھرانا تھا۔ یہ لوگ شانزے کے لیے آئے تھے۔ میری سمجھ میں یہ لوگ نہیں آئے۔ میرا خیال تھا کہ شانزے اس گھرانے میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر سکے گی۔

''آپ کو عبدالغنی کیسا لگا۔'' فریال کے پوچھنے پر میں نے کہا۔

''بھئی سچ پوچھو تو مجھے یہ لوگ سمجھ میں نہیں آئے۔ وہ عبدالغنی تو کہیں سے انجینئر نہیں لگتا۔ مجھے تو وہ مسجد کا موذن یا پیش امام لگا۔''

''اب ہماری بیٹی کے لیے پرنس ولیم کا رشتہ تو آنے سے رہا۔ عبدالغنی انجینئر ہے۔ سول انجینئر۔ برسر روزگار بھی ہے۔ ابھی تنخواہ کم ہے لیکن ابھی تو اس کا کیریئر شروع ہوا ہے۔ مستقبل میں ترقی کے امکانات بھی ہیں۔ مجھے تو لڑکے میں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔''

میں بھول گیا تھا فریال کا گھر پر کنٹرول ہے، میری رائے کی کوئی اہمیت نہیں اور میری رائے کی واقعی اس وقت کوئی اہمیت نہیں رہی، جب میں نے شانزے کو بائیک پر ایک لڑکے کے ساتھ جاتے دیکھا۔

''شانزے۔ وہ لڑکا کون تھا، جس کے ساتھ تم بائیک پر دوپہر کو جے بلاک کی طرف جا رہی تھیں۔'' میں گرجا تاکہ

UUNOVELS.COM

اس کی ماں بھی سن لے۔

"پاپا! اس کا نام کامران ہے۔ آپ اس سے ایک بار مل تو لیں۔ وہ ایک اچھا لڑکا ہے۔" شانزے نے دھیرے سے کہا تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب میں کیسے ردِعمل کا مظاہرہ کروں۔ کامران دیکھنے میں آج کے نوجوانوں کی طرح ایک نارمل نوجوان لگ رہا تھا۔ نہ داڑھی۔ نہ ٹخنوں سے اونچا پائجامہ۔

لیکن فریال نے میری رائے اور شانزے کی پسند کو نظر انداز کر کے رشتہ قبول کر لیا۔ شانزے نے بھی ماں کی خاطر ہاں کر دی۔ انتہائی سادگی سے شادی ہو گئی ہے۔ شادی کی تقریب کے دوران بھی عبدالغنی کی ماں بات بات پر طعنے مارتی رہی۔

"غریب سے غریب لوگ بھی بیٹی کو کچھ نہ کچھ دیتے ہیں۔ آپ لوگ تو کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ آپ لوگوں نے لگتا ہے، بیٹی کا بوجھ سر سے اتارا ہے۔ کچھ نہیں تو داماد کو ایک موٹر سائیکل ہی دے دیتے۔ آپ ہی کی بیٹی موٹر سائیکل پر عیش کرتی۔"

عبدالغنی کی ماں نے شادی کے ایک ہفتے بعد شانزے پر گھر کے سارے کام کاج کی ذمے داری ڈال دی تھی۔ شانزے کو فجر میں عبدالغنی کے والدین کے لیے شدید نیند میں اٹھ کر چائے بنانا پڑتی، اس کے بعد سات بجے تک ناشتا، ٹھیک ایک بجے دوپہر تک لنچ تیار کرنا شانزے کی ذمے داری تھی۔ جب کہ جھاڑو، برتن، کپڑے اور صفائی کا کام الگ۔ ایک طرح سے وہ لوگ بہو نہیں ملازمہ لائے تھے۔ شانزے بے چاری بنا کچھ کہے سب کچھ کسی طرح برداشت کر رہی تھی مگر ایک دن وہ ساس سسر کو نیند کے عالم میں فجر میں چائے دینے کے بعد کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹی تو سوتی رہ گئی۔ جب عبدالغنی کو سات بجے ناشتا نہیں ملا تو اس نے شانزے کو بہت زدوکوب کیا، اس پر چیخا چلایا، اس کے والدین نے بھی بیٹے کا ساتھ دیا۔

"ارے کیا فائدہ ایسی بہو کا جو شوہر کو وقت پر ناشتا نہ دے سکے۔ کیا عبدالغنی بھوکے پیٹ دفتر جائے گا۔" عبدالغنی کی والدہ چیخیں۔ تو عبدالغنی نے شہہ پا کر شانزے کو گھر سے نکال دیا۔

شانزے روتی پیٹتی گھر آئی تو میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اپنی بیٹی کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر میں بھڑک اٹھا۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ مجھے یہ لوگ سمجھ میں نہیں آئے مگر تمہیں تو خود فیصلے کرنے کا شوق ہے نا۔ اب بتاؤ میں کیسے برداشت کروں۔ ارے شانزے کی شکل تو دیکھو۔ شادی کو چند ہفتے ہی ہوئے ہیں۔ پیلی پڑ گئی ہے۔ میں شانزے کے ساتھ یہ سلوک برداشت نہیں کر سکتا۔ عبدالغنی نے کیا سوچ کر میری بیٹی کو گھر سے نکالا ہے۔ اب میری بیٹی بھی اس کے گھر واپس نہیں جائے گی۔" میں پتا نہیں کیا کیا بول رہا تھا مگر فریال نے پُرسکون ہو کر کہا۔

"اوور ری ایکٹ مت کرو عاطف، شادی کے بعد شانزے کے ساتھ کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی۔ میں عبدالغنی کو سمجھاؤں گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم بیٹی کے والدین ہیں، ہمیں تحمل سے کام لینا چاہیے۔"

مگر میں خاموش نہیں بیٹھا، میں نے شانزے سے صاف صاف پوچھا۔ "کیا تم اس گھر میں زندگی گزار سکتی ہو؟"

"پاپا میں اس گھر میں واپس گئی تو زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکوں گی۔" شانزے نے سسکاری بھری تو میرا دل کٹ کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے، اب تم اس گھر میں واپس نہیں جاؤ گی۔ خواہ تمہارا شوہر تمہیں لینے آئے یا اس کے والدین۔" میں نے فریال کو نظر انداز کر کے کہا۔

فریال نے بھی اس وقت خاموش رہنے ہی میں عافیت سمجھی۔ ویسے بھی اب میں نرا بیروزگار نہیں تھا۔ سپر اسٹور پر سیلز مین سے دال دلیا چلا رہا تھا۔ شام کو عبدالغنی اور اس کے والدین گھر آئے تو میں نے کہا۔ "جوڑے بے شک آسمانوں پر بنتے ہوں گے لیکن بے جوڑ شادیاں ہم خود اپنی مرضی سے کرتے ہیں، جس کا خمیازہ ہمارے بچے بھگتتے ہیں۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ میری بیٹی کی عمر نہیں نکلی۔ وہ سسرال واپس نہیں جائے گی۔ میری بیٹی کو طلاق چاہیے۔"

میری بات سن کو فریال نے سر پکڑ لیا۔ البتہ میں نے شانزے کے چہرے پر اپنے لیے فخر کا احساس دیکھا، جس سے مجھے بھی طمانیت ہوئی مگر عبدالغنی نے کہا۔ "لگتا ہے آپ کی نظر پانچ لاکھ روپے کے مہر پر ہے۔ ہمارا بھی شادی پر خرچا ہوا ہے، وہ کون ادا کرے گا۔ ابو ہم نے شادی پر کتنے خرچ کیے ہیں۔"

عبدالغنی کے سوال پر اس کا باپ بولا۔ "بیٹا! بری ہی چار لاکھ کی آئی تھی۔ باقی کھانے وغیرہ پر دو لاکھ روپے رکھ لو۔ چھ لاکھ تو ہمارے سیدھے سیدھے خرچ ہوئے ہیں۔"

"آپ اپنی بری ابھی اور اسی وقت واپس لے جا سکتے

UUNOVELS.COM

ہیں۔ رہا کھانے وغیرہ پر دو لاکھ کا خرچا۔ تو یہ خرچا آپ نے اپنی خوشی سے کیا تھا اگر شربت کے گلاس پر بھی شادی کرتے تو ہمیں اعتراض نہ ہوتا۔“ میں گرجا تو بحث و تکرار میں جھگڑا بڑھ گیا۔ فریال نے مفاہمت کی کوشش کی مگر میرا اسٹینڈ تھا کہ میرے ہوتے ہوئے میرے بچوں کی شادی بے جوڑ نہیں ہوگی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے شانزے کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ ”بیٹا! تم نے سسرال جانے سے صاف انکار کیا اور مجھے لگتا ہے، تمہارا فیصلہ درست ہے۔ وہ لوگ واقعی اس قابل نہیں نکلے کہ ان سے رشتہ نبھایا جائے۔ اب مجھے خوب سوچ سمجھ کر واضح جواب دے دو، کیا تم عبدالغنی کے نکاح میں رہنا چاہتی ہو۔

میرا سوال سن کر فریال بھڑک اٹھی۔ ”بچی کو کیا سکھا رہے ہو، ہمارے ماحول میں رشتہ پوری زندگی کے لیے استوار ہوتا ہے، جیسے میں تمہارے ساتھ جیسے تیسے نبھا رہی ہوں نا!“

”بہت اچھی نبھا رہی ہو۔ میری حیثیت اپنی نظر میں دو کوڑی کی کرکے۔ تمہارے پاس آپشن ہی کیا ہے، اس گھر میں پڑے رہنے کے سوا۔ تمہارے ابا سرکاری افسر ضرور تھے مگر اب وہ ریٹائر ہو چکے ہیں۔“ میں بولے جا رہا تھا۔

پھر فریال بولی۔ ”میرے ابو کی ایک پینشن میں تمہاری ایک درجن تنخواہیں آجاتی ہیں۔“

”اونہہ..... دور کے ڈھول سہانے۔ بڑے میاں کے اپنے تلے ختم ہوں گے تو تمہیں پالیں گے۔ جب دیکھو نیا تھری پیس سوٹ پہنے ہوتے ہیں۔“

”دیکھو، عاطف۔ تم مجھ سے جیسی چاہے بدتمیزی کر سکتے ہو لیکن میں اپنے ابو کے خلاف ایک لفظ نہیں سنوں گی۔“

میں دھیرے دھیرے بڑبڑاتا رہا اور فریال خون کے گھونٹ پیتی رہی۔ بہت خبیث عورت ہے، کب خاموش رہنا ہے، اسے خوب اچھی طرح معلوم ہے۔

دوسرے دن میں نے ڈی سی آفس سے خلع کے پیپر بنوائے اور شانزے کے سامنے رکھ دیے۔ شانزے نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ان کاغذات پر دستخط کر دیے۔

”پاپا! میری شادی ختم ہو جائے گی نا؟“ شانزے نے پوچھا تو میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”بالکل ہو جائے گی۔ خلع ہوتا ہی اس لیے ہے کہ عورت ساتھ نہ رہنا چاہے تو جان چھڑا لے۔ شادی زبردستی کا بندھن نہیں ہوتا۔ تمہاری بے جوڑ شادی ویسے بھی تم پر ظلم ہے۔“

پھر شانزے نے خواہش کا اظہار کیا کہ وہ کوئی ملازمت کرنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے بخوشی اجازت دے دی۔ میرے اپنے برعکس شانزے کو دس پندرہ دن میں ہی ایک فیکٹری کے پیکنگ ڈپارٹمنٹ میں ملازمت مل گئی۔ تنخواہ بھی میری تنخواہ سے تو زیادہ ہی تھی۔ فیکٹری بھی گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ ایک سکس سیٹر رکشے میں جانے اور آنے لگی۔ اس دوران شانزے کا خلع کا کیس بھی عدالت میں چلنے لگا اور چند پیشیوں کے بعد فیصلہ ہو گیا۔ شانزے اپنے بے جوڑ رشتے سے آزاد ہو گئی۔ کچھ دن بعد شانزے نے مقامی نجی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ وہ بزنس ایجوکیشن حاصل کر رہی تھی۔ اسے یونی ورسٹی کا پک اینڈ ڈراپ میں ہی دیتا تھا۔ یونی ورسٹی میں سمسٹر کی فیس اچھی خاصی تھی لیکن شانزے نے مجھ پر بار نہیں ڈالا۔ وہ اپنی تعلیم کے اخراجات خود اٹھا رہی تھی۔ اپنی ساری تنخواہ وہ یونی ورسٹی کی فیس ادا کرنے میں صرف کر دیتی۔

ایک دن دوپہر کو میں یونی ورسٹی سے باہر شانزے کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک نوجوان قریب سے گزرا اور اس نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا۔ اب میں اسے پہچان چکا تھا۔ وہ کامران تھا۔ مجھے پتا چلا کہ وہ اسی یونیورسٹی میں بطور وزیٹنگ پروفیسر پڑھا رہا ہے۔ میں نے شانزے سے اس بابت پوچھا تو شانزے نے کہا۔ ”جی پاپا! کامران ایم فل کر رہے ہیں اور یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی ہیں۔ ان فیکٹ وہ بہت اچھے ٹیچر ہیں۔“ میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ کچھ دن بعد شانزے نے اٹک اٹک کر پوچھا۔ ”پاپا۔ کامران اپنے پیرنٹس کے ساتھ گھر آنا چاہتے ہیں اگر آپ کی اجازت ہو تو وہ آجائیں؟“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔“

وہ لوگ شانزے کے لیے رشتہ ہی لے کر آئے تھے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا کہ شانزے خلع یافتہ ہے۔ فریال نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ رشتہ طے ہو گیا۔ شانزے کا کامران سے نکاح بھی ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ شانزے غیر معمولی طور پر خوش ہے۔ میں بھی خوش تھا کہ جو ذہنی آسودگی اپنی بے جوڑ شادی کے سبب مجھے حاصل نہ ہو سکی، آسودگی میری بیٹی کو مل گئی تھی۔ کیوں کہ شانزے اور کامران ایک پرفیکٹ میچ تھے اور کامران کے والدین بھی ہمارے جیسے ہی تھے، مذہبی انتہا پسندی سے دور، نارمل لوگ۔

نیا ابراہہ

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
ایک سبق آموز سچ بیانی بھیج رہا ہوں۔ لوگ دنیاوی لالچ میں آکر عقیدے کا سہارا لیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا بدل اس دنیا میں بھی ملتا ہے۔ مسجد تو خانہ خدا ہے، اللہ کیسے معاف کرے گا؟

اسد عباس
(سرگودھا)

یہ سنہ 95 کے وسط اپریل کی بات ہے۔ سورج کی حدت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ٹریفک کے بڑھتے ہوئے مسائل کی وجہ سے حکومت نے بڑی گاڑیوں کا شہر میں داخلہ بند کر دیا تھا متبادل بائی پاس بنا دیا۔ جو گاؤں کے درمیان سے گزر رہا ہے۔

سرگودھا کا یہ نواحی گاؤں ڈھٹہ کوٹ کے نام سے ہے۔ نام کے حوالے سے مختلف روایات سننے میں آتی ہیں۔ کسی قدر نشیب میں واقع ہونے کی وجہ سے بھی لوگ اسے ڈھٹہ (گرا ہوا) کوٹ کہتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی بائی پاس کی۔ بائی پاس بننے سے جہاں گاؤں میں پکی سڑک کی سہولت میسر ہوئی وہیں کچھ لوگوں کو روزگار کے مواقع بھی ملنا شروع ہو گئے۔ بائی پاس سے جہاں

سے ذیلی سڑک گاؤں کی جانب مڑتی ہے وہیں مین روڈ پر دونوں جانب چند دکانیں بھی وجود میں آچکی تھیں۔ دکانوں کے پاس ہی ایک مسجد کی تعمیر بھی سست روی سے جاری تھی۔ مسجد کے ساتھ ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی بچوں کے لیے قائم کر دیا گیا تھا۔ مسجد اور مدرسے کی دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں مگر ابھی چھتیں بنانے کا کام باقی تھا۔ یوں تو یہاں باقاعدہ پانچ وقت کی جماعت کا اہتمام تھا مگر بارش اور سردی کے موسم میں نمازیوں اور مدرسے کے طالب علموں کو بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسجد کے سامنے ٹیبل کرسی ڈالے امام مسجد مائیک پر آنے جانے والوں سے چندے کی اپیل کرتے تھے۔ تین بجے کے بعد یہ ڈیوٹی مدرسہ کے طالب علموں کے ذمے لگائی جاتی تھی جو مغرب کی نماز کے وقت تک جاری رہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے روزانہ دو مختلف طالب علموں کی ڈیوٹی لگتی۔ ان دنوں مسجد کی تعمیر رقم کی عدم دستیابی کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔

اس دن عصر کی نماز کے وقت نئے ماڈل کی کرولا کار آکر مسجد کے سامنے رکی۔ کار سے ایک شخص اترا اور باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے صف میں کھڑا ہو گیا۔ نماز کے بعد امام صاحب نے حسب سابق نمازیوں کے سامنے مسجد کی تعمیر کے لیے چندے کا سوال اٹھایا۔

دعا کے بعد اس شخص نے امام صاحب سے مسجد کی بابت دریافت کیا۔

امام صاحب نے اسے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا۔

آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مسجد اور مدرسہ کی چھتیں میں آپ کو بنوا کر دیتا ہوں۔ اس نے امام صاحب کو پیشکش کی۔

''اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔'' امام مسجد حافظ غلام محمد نے تشکرانہ لہجے میں کہا

اس نے اپنا نام اظہر قریشی بتایا پھر حافظ غلام محمد سے مسجد کی ضروریات کی بابت دریافت کیا۔

حافظ صاحب نے ایک کاغذ جیب سے نکال اظہر قریشی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جس پر تمام سامان کی تفصیل موجود تھی۔

چندے کی مد میں ہمارے پاس بمشکل 6 سو روپے جمع ہوئے ہیں۔ جبکہ چھتوں کے سامان کے لیے لیے کم از کم کم پچاس ہزار روپے درکار ہیں۔

اظہر قریشی نے آہستگی سے ہاتھ حافظ صاحب کے کاندھے پر رکھا اور کہا۔'' آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کل انشاءاللہ مطلوبہ سامان بھی پہنچ جائے گا۔''

حافظ صاحب نے ایک بار پھر اظہر قریشی کا شکریہ ادا کیا۔

اظہر قریشی گاڑی میں بیٹھا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

عشاء کی جماعت کے وقت جب مسجد کی کمیٹی کے ممبران بھی مسجد میں موجود تھے تو حافظ صاحب نے سارا ماجرا ان کے سامنے بیان کر دیا۔ کمیٹی کے ممبران نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور اظہر قریشی کے لیے خصوصی دعا کی۔

دوسرے دن ظہر کی نماز کے بعد چار گدھا گاڑیاں گاڈر، ٹی آر، ٹائلیں اور سیمنٹ کی بوریاں لادے ہوئے مسجد کے سامنے آکر رکیں۔

ایک گدھا گاڑی والے نے حافظ صاحب کو بتایا کہ انہیں اظہر قریشی نے یہ سامان دے کر بھیجا ہے۔ حافظ صاحب نے سامان مسجد کے احاطے میں ایک طرف اتارنے کو کہا۔

سامان اتار کر گدھا گاڑی والے واپس چلے گئے۔

عشاء کے وقت اظہر قریشی ایک بار پھر مسجد میں آیا۔

اس بار اس کی ملاقات مسجد کی کمیٹی کے ممبران سے بھی ہوئی۔ اظہر نے انہیں صبح کے پروگرام کے بارے میں آگاہ کیا۔ کمیٹی کے ممبران نے صرف اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اگلے دن صبح سویرے اظہر قریشی مزدوروں کے ساتھ ساتھ مسجد میں موجود تھا۔ اس نے مزدوروں اور کاریگروں کو ہدایات دینے شروع کر دیں۔ دوپہر تک بغیر کسی وقفے کے کام جاری رہا۔ کھانے کے وقت حافظ صاحب مزدوروں کے لیے گھر سے کھانا بنوا کر لائے۔ کھانے کے بعد مزدور ایک بار پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے اس دوران اگر انہیں کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو اظہر انہیں وہ چیز کچھ ہی دیر میں مہیا کر دیتا۔ اس مقصد کے لیے اظہر قریشی کو تین بار شہر کا رخ کرنا پڑا۔ دو دن میں مسجد کی چھت مکمل ہو چکی تھی۔ اگلے مرحلے میں مدرسے کی چھت مکمل کرائی تھی۔ مغرب کی نماز اظہر نے وہیں ادا کی نماز کے بعد اس نے حافظ صاحب کو اپنا اگلا پروگرام بتایا۔

اگلے دو دن مدرسے کی چھت بنانے میں صرف ہو گئے.... ان دنوں میں اظہر قریشی ایک منٹ کے لیے بھی کہیں نہیں گیا۔ گاؤں والے اس کے مرید ہو چکے تھے۔ ان دنوں میں مسجد اور مدرسے کی چھتیں تیار ہو چکی تھیں۔ اگلے دن اظہر کہیں سے ایک رنگ ساز کو پکڑ لایا۔ اس نے گاڑی سے سفید چونا نکالا اور رنگساز کے حوالے کر دیا۔ ایک بڑے سے ڈرم میں رنگ ساز نے چونے میں پانی ملایا اور مسجد کی دیواروں پر پھیرنے لگا۔

UURDUNOVELS.COM

اس دوران حافظ غلام محمد اور اظہر قریشی آپس میں باتیں کرنے لگے۔

"ماشاء اللہ! آپ جیسا نیک اور خدا ترس انسان میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ آپ کام کیا کرتے ہیں؟" حافظ صاحب نے ممنون لہجے میں پوچھا۔

"حافظ صاحب میری دبئی میں ایک چھوٹی سی فیکٹری ہے۔ جہاں الیکٹرونکس کے پرزے تیار کیے جاتے ہیں۔" اظہر قریشی نے مختصر اپنا تعارف بیان کیا۔

"ماشاء اللہ! ابھی آپ پاکستان میں چھٹیاں گزارنے آئے ہیں؟"

"نہیں حافظ صاحب۔" اظہر قریشی ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ "چھٹیاں تو میں گزار چکا ہوں ابھی تو میں ایک پریشانی میں مبتلا ہوں... جس کے لیے مجھے پھر سے پاکستان کا رخ کرنا پڑا۔"

"اللہ خیر کرے۔ کیا پریشانی ہے آپ کو۔" حافظ غلام محمد نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

"میری فیکٹری کے پیکنگ کے شعبے میں اکثریت انڈین لڑکوں کی ہے۔ پچھلے مہینے جب میں واپس دبئی گیا تو انڈین لڑکوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ان کی تنخواہیں بڑھائی جائیں۔ حالانکہ جنوری کے مہینے میں تمام ملازمین کی تنخواہیں بغیر کسی حیل و حجت کے بڑھائی گئی تھیں۔ اب دو مہینے کے بعد میں پھر سے سات سو ملازمین کی تنخواہیں کیسے بڑھا سکتا ہوں۔ پیکنگ کے شعبے میں سو کے قریب ملازمین کام کرتے ہیں جن میں سے 80 سے زائد انڈین ہیں۔ ابھی میں نے ان سے ایک ماہ کا ٹائم لیا ہے۔ انہیں یہی معلوم ہے کہ میں اس وقت امریکا کے کاروباری دورے پر ہوں۔ درحقیقت پاکستان میں، میں اپنی فیکٹری کے لیے ملازمین تلاش کرنے آیا ہوں مگر... پندرہ دن گزرنے کے باوجود میں بمشکل دس ملازمین کا... انتظام کر سکا ہوں۔" اظہر قریشی نے حافظ صاحب کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں انشاءاللہ، اللہ تعالیٰ آپ کی غیب سے مدد فرمائے گا۔"

رنگساز اپنے کام میں مصروف تھا۔ اظہر قریشی نے حافظ صاحب سے چند گھنٹوں کی اجازت لی۔ اسے اپنے کام کے سلسلے میں کسی سے ملاقات کرنی تھی۔ پانچ بجے دوبارہ آنے کا کہہ کر اظہر وہاں سے چلا آیا۔

ظہر کی جماعت کے بعد نمازیوں نے اظہر کے بارے میں دریافت کیا۔ حافظ صاحب نے نمازیوں کو اظہر کی پریشانی سے آگاہ۔ شام تک یہ.... بات پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی کہ اظہر قریشی دبئی کا بہت بڑا بزنس مین ہے اور وہ پاکستان میں اپنی فیکٹری کے لیے ورکر تلاش کرنے آیا ہے۔

مغرب کی جماعت کے وقت خلاف معمول نمازیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ رنگساز اپنا کام ختم کر کے جا چکا تھا مگر اظہر قریشی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

اظہر کی واپسی عشاء کے وقت ہوئی۔

نمازیوں کی تعداد پہلے کی نسبت بڑھ چکی تھی۔ جماعت کے بعد اظہر قریشی نے نمازیوں کو مسجد مکمل ہونے کی مبارک باد دی۔ اس نے اپنے پاس موجود مٹھائی سے سب نمازیوں کا منہ بھی میٹھا کروایا۔

منہ میٹھا کرنے کے بعد اس نے لوگوں سے اجازت چاہی۔

حافظ صاحب نے اس سے اس کے کام کے بارے میں پوچھا۔

"فی الحال دس بندوں کا انتظام ہوا ہے۔ شاید مجھے انڈیا یا بنگلہ دیش کا چکر لگانا پڑے۔" اظہر نے اداسی سے کہا

"ہمارے پاس آپ کی پریشانی کا ایک حل ہے۔"

"کیا حل ہے۔" اظہر نے اشتیاق سے پوچھا۔

حافظ صاحب نے پگڑی باندھے ایک بارعب شخصیت کو اشارہ کیا۔ وہ ان کے قریب آ گیا۔

"میرا نام چودھری حشمت ہے اور میں اس گاؤں کا نمبردار ہوں۔" بارعب شخصیت نے اپنا تعارف کرایا۔

اظہر قریشی نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"آپ کو اپنی فیکٹری کے لیے کتنے ملازمین کی ضرورت ہے؟"

"80 ملازمین کی۔" اظہر نے جواب دیا۔

"اگر آپ چاہیں تو آپ کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" اظہر نے پوچھا۔

"اتنے ورکر تو آپ کو ہمارے گاؤں سے ہی مل جائیں گے۔" نمبردار نے اظہر کے سوال کے جواب میں بتایا۔

"مسئلہ ورکرز کا نہیں ہے۔" "مسئلہ یہ ہے کہ ایک ورکر پر کم از کم چالیس سے پچاس ہزار روپے خرچا آتا ہے۔ جو کہ ورکرز کو خود ادا کرنا ہوگا۔ مجھے نہیں لگتا کہ آپ کے گاؤں میں کوئی اتنے پیسے ادا کر سکتا ہے۔"

"آپ اپنے ورکرز کو تنخواہ کتنی دیتے ہیں۔" نمبردار

UUNOVELS.COM

نے سوال کیا۔

''تقریباً پچیس ہزار روپے ماہانہ۔ اس کے علاوہ رہائش اور کھانا پینا کمپنی کے ذمے ہوتا ہے۔ دو سال بعد تین ماہ کی چھٹی تنخواہ اور ریٹرن ٹکٹ کے ساتھ۔'' اظہر نے تنخواہ کے بارے میں بتایا۔

''پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ 50000 تو لڑکے دو ماہ میں کما لیں گے۔'' نمبردار نے فٹ سے جواب دیا۔

''مگر آنے جانے کا خرچ 50 ہزار دے گا کون؟'' اظہر نے پھر کہا۔

''ظاہری بات ہے جو لڑکے آپ کے ساتھ جائیں گے ان کے والدین دیں گے۔''

''بہت افسوس کی بات ہے نمبردار صاحب۔ مسجد اور مدرسے کی چھتیں پچھلے چھ مہینوں سے نامکمل پڑی تھی اگر یہی لوگ 600 روپیہ فی کس بھی ادا کرتے تو مسجد اور مدرسے کی چھتیں کب کی مکمل ہو چکی ہوتیں۔ بات جب اللہ کے گھر کی تھی تو سب کو 600 روپے بھی بوجھ محسوس ہوتے تھے اور جب بات اپنے مفاد کی آئی تو پچاس ہزار بھی۔۔۔ کم لگتے ہیں۔'' اظہر نے سنجیدگی سے کہا

اظہر قریشی کی بات سن کر چودھری حشمت سمیت سب لوگوں کو سانپ سونگھ گیا۔

''ایسی بات نہیں ہے اظہر صاحب یہ مسجد تمام گاؤں والوں کے تعاون سے ہی یہاں تک پہنچی ہے۔ مسجد کے لیے جگہ کا بندوبست اور دوسری تمام ضروریات گاؤں والوں نے ہی پوری کی ہیں۔'' حافظ صاحب نے اظہر قریشی کے طنز کے جواب میں کہا۔

''حافظ صاحب مجھے کوئی پریشانی نہیں۔'' میں نے کسی دنیاوی فائدے کے لیے یہ سب کچھ نہیں کیا۔ یہ ہم سب کا اور اللہ کا معاملہ ہے۔ اور اللہ مجھے اس کا اجر دے گا۔ باقی جس نے جانا ہو وہ اپنا پاسپورٹ 12 عدد تصاویر اور پچاس ہزار روپے کا بندوبست کر رکھے۔ ان پیسوں میں ٹکٹ اور ویزا دونوں شامل ہوں گے۔ میں تنخواہ پاکستانی روپوں میں ادا کرتا ہوں۔ پچیس ہزار روپے فکس تنخواہ ملے گی۔ ڈیوٹی ٹائم آٹھ گھنٹے ہوگا۔ اگر کوئی اوور ٹائم لگانا چاہے تو اسے اوور ٹائم کے الگ سے پیسے ملیں گے۔ ہر سال جنوری میں کم از کم دس فیصد تنخواہ میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ دو سال بعد دو مہینے کی چھٹی تنخواہ سمیت ملے گی اس کے علاوہ کمپنی کی طرف سے ریٹرن ٹکٹ بھی دیا جائے گا۔'' اظہر قریشی نے ایک ہی سانس میں ساری تفصیل بتا دی۔

''آپ کی واپسی کب تک ہے۔'' چودھری حشمت نے اظہر سے سوال کیا۔

''یوں تو میری چھٹی ختم ہونے میں دس پندرہ دن باقی ہیں لیکن مجھے ایک بار واپس جانا ہوگا۔ فیکٹری کے معاملات ایسے ہیں کہ مجھے ہر مہینے واپس جانا ہوتا ہے اگر آپ لوگ سنجیدہ ہیں تو میں اگلے مہینے پھر آجاؤں گا تب تک آپ اپنے کاغذات تیار رکھیں۔ واپسی پر میں کمپنی کی طرف سے ایگریمنٹ بھی لیتا آؤں گا تاکہ معاملات یہیں پر طے ہو جائیں۔'' اظہر نے وضاحت کی۔

''ہم سنجیدہ ہیں اور جب تک آپ واپس آئیں گے آپ کو پاسپورٹس اور رقم مل جائے گی۔ میں کل ہی گاؤں کی مرکزی جامع مسجد میں اعلان کروا دیتا ہوں۔'' چودھری حشمت نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

مزید چند منٹ معاملات طے کرنے کے بعد اظہر قریشی نے ان سے اجازت چاہی۔ اس نے بتایا کہ وہ اگلے دو تین دنوں میں ہی واپس چلا جائے گا۔

اگلے دن صبح گاؤں کی مرکزی مسجد میں اعلان ہو گیا۔

نمبردار کے دارے (دارا، جہاں نمبردار گاؤں کے مسائل نمٹاتا ہے) پر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہونا شروع ہو گیا۔ نمبردار نے لوگوں کو تمام تر تفصیلات سے آگاہ کیا۔ لوگوں نے پاسپورٹ کے حصول کے لیے درخواستیں دینا شروع کر دیں۔

گاؤں کے ہر فرد کی زبان پر اظہر قریشی کا نام تھا۔

گاؤں کے اکثر نوجوان جو پہلے آوارہ پھرتے تھے، باہر جانے کے خیال سے ہی پُرجوش نظر آ رہے تھے۔

بعض نے تو ارجنٹ پاسپورٹ بھی بنوا لیے تھے۔ شاید اظہر قریشی جلد ہی واپس آجائے۔ مگر ایک مہینا ہونے کو آ گیا اور اظہر کا کچھ پتا نہیں تھا۔

لوگوں میں مایوسی پھیلنا شروع ہو گئی۔ بعض کے نزدیک اظہر انہیں بے وقوف بنا گیا ہے۔

اس دن شام کو نمبردار کے پاس ایک بار پھر لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔

لوگ بار بار۔۔۔ ایک ہی سوال پوچھ رہے تھے۔ مگر چودھری حشمت کے پاس کسی کا جواب نہیں تھا۔ لوگوں میں بحث و مباحثہ جاری تھا کہ اظہر قریشی کی گاڑی نمبردار کے دارے پر آ کر رکی۔ چودھری حشمت نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اظہر کا استقبال کیا۔ اظہر بھی نمبردار سے تپاک سے ملا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذوں کا پلندہ تھا۔ چودھری حشمت نے دیر

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

سے آنے کا شکوہ کیا۔

''چودھری صاحب یہ ٹیکنیکل باتیں ہوتی ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں ویزے نکلوانا کون سا آسان کام ہے۔ پھر دبئی کی لیبر قوانین اتنے سخت ہیں کہ کچھ نہ پوچھیں۔ بڑی مشکل سے ویزے نکلوائے ہیں۔'' اظہر قریشی نے دیر سے آنے کی وجہ بیان کی۔

چودھری حشمت نے ملازم کو چائے پانی کا بندوبست کرنے کو کہا۔

''آپ لوگوں نے پاسپورٹس بنوا لیے ہیں؟''

''جی پاسپورٹس تو بن گئے مگر اُمیدوار ابھی بڑھ گئے ہیں۔ 96 لڑکوں کے پاس پاسپورٹس موجود ہیں۔''

''کوئی بات نہیں میرے پاس سو ویزے ہیں۔ جن میں 90 ویزے لیبر کے اور دس ویزے فورمین کے ہیں۔ جن کی تعلیم میٹرک سے زیادہ ہوگی، انہیں فورمین کی جاب ملے گی فورمین کی تنخواہ بھی لیبر کی نسبت زیادہ ہے۔'' اظہر نے ہنستے ہوئے کہا۔

چائے پانی کے بعد اظہر قریشی نے کاغذات کا بنڈل کھولا اور پاسپورٹ کے مطابق لوگوں کے کوائف لکھنے لگا۔ کوائف لکھنے اور پاسپورٹس جمع کرنے کے بعد چودھری حشمت نے اظہر سے پیسوں کی بابت دریافت کیا۔

''پیسوں کی فی الحال ضرورت نہیں۔ ابھی تو ان کا میڈیکل ہونا باقی ہے، جب میڈیکل کلیئر ہو جائے گا تب پیسے لوں گا۔'' اظہر قریشی نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد اظہر قریشی نے چودھری حشمت سے اجازت چاہی۔

تین دن بعد وہ پھر گاؤں میں موجود تھا۔ جگہ اس بار بھی چودھری حشمت کا ڈیرا تھی۔

اظہر نے تمام اُمیدواروں کو لاہور کی ایک پرائیویٹ لیبارٹری کا ایڈریس دیا اور کہا۔ ''یہاں سے آپ سب نے میڈیکل کروانا ہے۔ جس کا میڈیکل کلیئر ہوگا صرف وہی باہر جانے کا حقدار ہوگا۔ آپ لوگوں کے پاس ایک ہفتے کا وقت ہے۔ اگلی کارروائی میڈیکل آنے کے بعد ہوگی۔''

☆......☆

اُمیدواروں کے میڈیکل اظہر قریشی کے پاس پہنچ چکے تھے۔

حیران کن طور پر صرف دو اُمیدوار میڈیکل پاس نہیں کر سکے تھے۔

اظہر قریشی ایک بار پھر چودھری حشمت کے پاس موجود تھا۔

''دو دن بعد میں لاہور سے کراچی کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ سب لوگوں کے ویزے کراچی سے لگیں گے۔ اسلام آباد اور لاہور سے ویزوں پر خرچا زیادہ آرہا ہے۔ کل آپ نے بیس بیس ہزار روپے جمع کروانے ہیں۔ بیس ہزار روپے تقریباً ایک ویزے کا خرچا ہے۔ بقایا رقم آپ ویزا لگنے کے بعد ادا کریں گے۔ یہاں یہ وضاحت کر دوں کہ جس کا ویزا لگ گیا اور اس کا ارادہ بدل گیا تو اس کو پیسے واپس نہیں ملیں گے۔''

اگلے دن باہر جانے کے تمام خواہشمندوں نے رقم اظہر قریشی کے حوالے کر دی اور وہ رقم لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اظہر قریشی کی واپسی 5 دن بعد ہوئی۔ واپس آکر اس نے سب کو ویزے لگنے کی خوشخبری سنائی۔ اگلا مرحلہ ٹکٹ کا تھا۔ ایک بار پھر لوگوں نے باقی ماندہ رقم اظہر کے حوالے کی۔

مزید چند دن اسی کام میں گزر گئے۔ اس دوران اظہر کا گاؤں میں آنا جانا باقاعدگی سے رہا۔ اس کی بیٹھک مستقل چودھری حشمت کے پاس ہوتی تھی۔ چودھری حشمت ہی لوگوں کو اظہر کی جانب سے ... تفصیلات فراہم کرتا۔ چودھری حشمت کے دبدبے اور چودھراہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

گاؤں کے لوگوں میں بھی اظہر قریشی کی قدر و منزلت پہلے سے کافی بڑھ گئی تھی۔

وہ جب بھی گاؤں سے واپس جاتا تو اس کے ساتھ دیسی گھی، چاول یا گڑ کا تحفہ بھی ہوتا۔

لوگوں کی نظروں میں وہ مسیحا بن چکا تھا۔

☆......☆

''اگلے ہفتے روانگی ہے۔ سرگودھا سے آپ سب بذریعہ ٹرین کراچی روانہ ہوں گے۔ کراچی سے آپ کی فلائٹ ہے۔ زیادہ سامان لے جانے کی ضرورت نہیں، صرف چند جوڑے کپڑے اور باقی ضرورت کا سامان اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ کراچی تک آپ کا اور میرا ساتھ ہوگا۔ وہاں سے میں واپس سرگودھا آجاؤں گا، مجھے چند ضروری کام نمٹانے ہیں۔ دبئی ایئرپورٹ پر آپ کو میرا ایجنٹ کمپنی میں لے جائے گا۔ ایک ہفتے بعد میری آپ سے ملاقات دبئی میں ہوگی۔ میرے آنے تک آپ دبئی میں گھوم پھر لیں گے۔'' اظہر لوگوں کو روانگی کی تفصیلات بتا رہا تھا۔

''کراچی کے بجائے اگر لاہور یا اسلام آباد کی فلائٹ ہوتی تو اچھا ہوتا۔'' لوگوں کے جانے کے بعد چودھری حشمت

URDUNOVELS.COM

نے اظہر سے کہا۔

''لاہور یا اسلام آباد کی ٹکٹس بہت مہنگی تھی۔ کم از کم 5 ہزار روپے کا فرق آ رہا تھا۔ لوگوں پر مزید بوجھ ڈالنے کی بجائے میں نے کراچی سے روانگی کو ترجیح دی۔'' اظہر نے وضاحت کی۔

☆......☆

اسٹیشن پر خلاف معمول آج بہت رش تھا۔

پورا گاؤں جیسے اسٹیشن پر آ گیا ہو۔ دبئی جانے کے خواہش مند حضرات کے لیے ٹرین کی دو بوگیاں مختص تھیں۔ لوگ اپنے پیاروں کو الوداع کرنے آئے ہوئے تھے۔ اسٹیشن پر جذبات آمیز مناظر دیکھنے کو مل رہے تھے۔ لوگ سہانے مستقبل کے خواب سجائے اپنے پیاروں کو الوداع کر رہے تھے۔ اظہر بار بار لوگوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ انجن نے روانگی کی سیٹی بجائی تو لوگوں نے جلدی سے ٹرین کا رخ کیا۔

ہاتھ ہلاتے لوگ پیچھے رہ گئے۔

لوگوں کی اکثریت خوش گپیوں میں مصروف ہوگئی۔ چند ایک ایسے بھی تھے جن کے چہرے مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ دبئی جانے والوں میں چند ایک ایسے بھی تھے جنہوں نے کراچی بھی پہلی بار دیکھنا تھا۔

رات دو بجے گاڑی ملتان اسٹیشن پر پہنچی تو اسٹیشن کی چہل پہل میں اضافہ ہوگیا۔ لوگ گاڑی سے اتر کر چائے پانی اور کھانے پینے میں مشغول ہوگئے۔ اظہر نے گاڑی سے اتر کر ایک پی سی او کا رخ کیا۔ نمبر ملانے کے بعد وہ فون پر مصروف ہوگیا۔ اس کے ساتھ دبئی جانے والے پی سی او کے باہر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ پانچ منٹ بعد وہ باہر نکلا تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ لوگوں کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اس کا سسر وفات پا گیا ہے اور اسے واپس سرگودھا جانا پڑے گا۔ تاہم اس نے بتایا کہ انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نے ٹرین کے ٹکٹس ایک پڑھے لکھے نوجوان کے حوالے کیں اور کہا۔ ''تم سب اپنے شیڈول کے مطابق کراچی چلے جاؤ۔ میں ٹریول ایجنٹ کو فون کر دوں گا وہ تم سب کو اسٹیشن سے لے لے گا اور ائرپورٹ پہنچا دے گا۔ وہیں پاسپورٹس اور ٹکٹس بھی تمہارے حوالے کر دے گا۔'' اظہر نے راستے کے حوالے سے چند ایک مزید ہدایات دیں۔ ٹرین کی روانگی میں ابھی دس منٹ تھے۔ وہ دس منٹ اظہر نے ان کے ساتھ ہی گزارے۔

جیسے ہی ٹرین وہاں سے روانہ ہوئی اظہر اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ اسٹیشن کی پارکنگ میں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے چابی سے دروازہ کھولا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

☆......☆

''اس بار کتنا مال کمایا؟'' خاتون نے پوچھا۔

''دو مہینوں میں تقریباً پینتالیس لاکھ'' اظہر نے جواب دیا۔

''لوگ کیسے تم پر اعتبار کر لیتے ہیں۔'' خاتون جو کہ اظہر کی بیوی تھی، نے پھر پوچھا۔

''جب تک بے وقوف زندہ ہیں عقل مند کبھی بھوکا نہیں مر سکتا۔'' اظہر نے مسکرا کر کہا۔

''اب کیا ارادہ ہے۔''

''فی الحال تو آرام کروں گا چند دن۔ اس کے بعد دیکھیں گے۔''

☆......☆

دو سال بعد کا ذکر ہے میانوالی کی ایک پسماندہ تحصیل کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے باہر سڑک کنارے ایک ادھوری مسجد کی تعمیر جاری تھی۔ مسجد کے باہر ایک باریش شخص آنے جانے والوں سے چندے کی اپیل کر رہا تھا کہ مسجد کے سامنے ایک گاڑی آکر رکی جس میں سے ایک شخص باہر نکلا اور اس نے باریش شخص سے مسجد کی بابت دریافت کیا۔

''پتر، یہاں زیادہ تر غریب لوگ وسدے نیں۔ لوگ حسب توفیق امداد بھی کرتے ہیں مگر مسجد کے لیے ڈھیر سارا پیسا چاہیے۔''

''آپ پریشان نہ ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آج سے یہ کام میرے ذمے۔ کل سے انشاء اللہ مسجد کا کام شروع ہو جائے گا۔''

ابھی اس نے بات ختم ہی کی تھی کہ مسجد کی بلند ہوتی دیوار سے ایک اینٹ خود بخود پھسلی، پتا نہیں کیسے۔ وہ سیدھی اس کے سر پر لگی۔ اینٹ کا کونا سر میں دھنس گیا۔ باریش شخص نے گرتے ہوئے شخص کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ تھوڑی ہی دیر میں پورا گاؤں جمع ہو چکا تھا۔ پولیس بھی آ چکی تھی۔ شک کی بنا پر باریش شخص کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ ایک اخبار کے رپورٹر نے مرنے والے کی تصویر لے کر اپنے اخبار میں بھیج دی۔ تیسرے دن چودھری حشمت اپنے سمدھی سے ملنے میانوالی آیا تو اس گاؤں کا چکر بھی لگایا، ساتھ ہی ساتھ ایک جملہ بولا۔ ''گاؤں والو! خوش ہو جاؤ کہ ابراہا کو ابابیل نے مار دیا۔ ورنہ میری طرح مسجد کے امام کو بھی زمینیں بیچ کر لوگوں کا منہ بند کرنا پڑتا۔''

UUNOVELS.COM

آخری کال

محترم مدیر

السلام علیکم!

ایک اور سچ بیانی ارسال کررہی ہوں۔ یہ سچ بیانی انوشہ کی ہے۔ انسانی سمجھ کی ہے۔ مغالطے اور پچھتاوے کی ہے۔ اُمید ہے قارئین کو پسند آئے گی۔

نفیسہ سعید
(کراچی)

جانے وہ کون تھا لیکن جو بھی تھا۔ کم از کم انوشہ کو تو پاگل ہی لگتا تھا۔ وہ کئی دنوں سے مسلسل اس کا پیچھا کررہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے ایک بار بھی انوشہ کو مخاطب نہیں کیا، نہ اس سے کوئی بدتمیزی کی اور نہ کسی طرح کی چھیڑ خانی مگر وہ پھر بھی تنگ تھی۔ اسے بہت عجیب لگتا جب صبح صبح دس بجے اپنے آفس کے اسٹاپ پر کھڑا وہ عجیب و غریب حلیے والا دکھائی دیتا۔ وہ سفید ملگجی شلوار قمیص پر کالی واسکٹ پہنے ہوتا۔ بڑھی شیو کے ساتھ اس کا منتظر ہوتا۔ جیسے ہی وہ بس سے باہر نکلتی وہ اجنبی شخص ایک فرمانبردار سیکیورٹی گارڈ کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا۔ اسٹاپ سے آفس

UUNOVELS.COM

تک جاتی لمبی سڑک پر وہ کچھ فاصلہ رکھے انوشہ کے ساتھ ہی ہوتا۔ ایسے میں کئی بار اس کا دل چاہا کہ چلتے چلتے رک کر اس کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے لے مگر وہ اپنی اس کوشش میں کبھی کامیاب نہ ہو سکی، جس کی واحد وجہ پیچھا کرنے والے اجنبی کی ظاہری بے نیازی تھی کہ وہ جب رک کر پلٹ کر اسے دیکھتی، کبھی اپنی طرف متوجہ نہ پاتی بلکہ جب وہ رکتی وہ شخص دھیرے دھیرے چلتا بڑی بے نیازی سے اس کے پاس سے کچھ آگے بڑھ جاتا۔ لامحالہ انوشہ کو بھی اسے نظرانداز کر کے آگے بڑھنا پڑتا۔ یہ سلسلہ کب تک جاری رہ سکتا تھا وہ نہ جانتی تھی مگر یہ طے تھا کہ وہ یہ سب کچھ زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتی اور کسی دن اس شخص کی شامت آنے والی ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ اس کی برداشت ختم ہوتی ایک دن وہ شخص اپنی خاموشی توڑتا ہوا اس کے سامنے آ گیا۔

☆......☆

انوشہ کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ وہ کراچی کی ایک ایسی چھوٹی سی کالونی کی رہائشی تھی جہاں آس پڑوس کے رہنے والے اپنے سے زیادہ دوسروں کے گھر کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں یا یوں کہہ لیں حق ہمسائیگی پورا کرنے کے لیے پڑوسیوں سے باخبر رہنا اس محلے کا پہلا اصول تھا جس کی بنا پر باوجود آپسی پیار و محبت کے ایک دوسرے سے بہت محتاط رہنا پڑتا خاص طور پر ہر گھر کے مرد کی کوشش ہوتی کہ وہ خود تو دوسروں کی ماں بہن کے بارے میں مکمل طور پر باخبر رہے لیکن ان کے گھر کی عورتوں کا ذکر یہاں وہاں نہ ہو۔ انوشہ کا بڑا بھائی فیضان اسی قسم کا مرد تھا جو چاہتا تھا کہ انوشہ اور اس کی چھوٹی بہن وریشہ کو گھر کے کسی کمرے میں بند کر کے رکھے تاکہ محلے کے مردوں کی نظر سے بچا سکے جب کہ ایسا ناممکن تھا کیونکہ جہاں وریشہ مقامی کالج کی طالبہ تھی وہاں انوشہ ایک آفس میں ملازمت کرتی تھی اور یہ ملازمت اس کی مجبوری تھی۔ بدقسمتی سے وہ شادی کے محض تین سال بعد ہی طلاق یافتہ ہو چکی تھی اور اپنے دو سالہ بیٹے کے ہمراہ واپس میکے آ گئی تھی، جہاں وہ ملازمت کر کے اپنا اور اپنے بیٹے کا خرچا پورا کر رہی تھی۔ ورنہ تو شاید فیضان اسے گھر سے باہر نہ نکلنے دیتا مگر بھلا ہو فیضان کی بیوی نازیہ کا جو اپنے میاں کی کمائی کا ایک دھیلا بھی اس کے خاندان پر خرچ کرنے کے حق میں نہ تھی۔ ایسے میں انوشہ کے باپ کی معمولی سی آمدنی میں وریشہ اور ان کے چھوٹے بھائی کے اخراجات علاوہ گھر کا خرچا بھی بمشکل پورا ہوتا تھا تو وہ بھلا کیسے توقع رکھتی کہ اسے اور اس کے بیٹے کی تمام ضروریات گھر بیٹھ کر پوری ہو سکیں لہٰذا ضروری تھا کہ گھر سے باہر نکل کر کمایا جائے اور چونکہ اس نے اپنی تعلیم کمپیوٹر میں مکمل کی تھی تھوڑی سی کوشش کے بعد اسی فیلڈ میں اسے ایک اچھی جاب مل گئی جو پچھلے دو سالوں سے وہ بخیر و خوبی انجام دے رہی تھی کہ اچانک اس اجنبی شخص نے اسے پریشان کرنا شروع کر دیا اور ایسے میں جو پہلا خدشہ انوشہ کے دل میں ابھرا وہ اپنے بھائی اور بھابی کے متعلق تھا۔ جانتی تھی کہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی اگر یہ بھنک مل گئی کہ انوشہ کا پیچھا کوئی مرد کرتا ہے تو بات کا بتنگڑ بن جائے گا اور ایسے میں شاید اس کا گھر سے نکلنا اور آفس جاب جاری رکھنا مشکل ہو جائے گا اس نوکری کی مخالفت شروع دن سے اس کا بھائی کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ کسی قریبی اسکول میں ملازمت کر لے جب کہ انوشہ کو جو تنخواہ اس آفس سے مل رہی تھی محلے کا کوئی اسکول اس کا تیسرا حصہ بھی نہ ادا کر سکتا تھا۔ بس اس ایک پوائنٹ کو دیکھتے ہوئے فیضان بھی خاموش تھا جس کا فائدہ انوشہ کو حاصل ہوا مگر اب اسے اپنی یہ ملازمت خطرے میں دکھائی دے رہی تھی اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس سلسلے میں وہ کس سے بات کرے۔

☆......☆

انوشہ آفس میں بیٹھی اپنے معمول کے کام نمٹا رہی تھی جب پیون نے اسے کسی شخص کی آمد کی اطلاع دی جو اس سے ملنے آیا تھا اور یہ خاصا غیر متوقع تھا کیونکہ دو سالوں میں آج تک کوئی بھی شخص خاص طور پر آفس میں، اس سے ملنے نہ آیا تھا کیونکہ اس کا پبلک ڈیلنگ کا کوئی کام نہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ حیران ہوئی۔

''مجھ سے کون ملنے آ گیا؟'' بڑبڑاتے ہوئے اس نے پیون سے سوال کیا۔

''پتا نہیں جی، انہوں نے یہ کارڈ دیا ہے۔'' پیون کو شاید ابھی یاد آیا کہ ہاتھ میں پکڑا کارڈ اسے انوشہ کو دینا ہے اس لیے اس نے جلدی سے ایک وزیٹنگ کارڈ انوشہ کی سمت بڑھایا۔ جسے اس نے خاموشی سے تھام کر ایک نظر اس پر ڈالی۔

''عاصم علی جان'' آگے اس کا عہدہ تھا جس کے مطابق وہ ایک مقامی ادارے میں سرکاری ملازم تھا۔ انوشہ کو حیرت ہوئی کہ یہ شخص اس سے کیوں ملنے آیا ہے۔ بھلا اسے انوشہ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ یہی سوچتی وہ کمپیوٹر بند

URDUNOVELS.COM

کر کے انتظار گاہ کی جانب آ گئی جہاں بیان کے مطابق عاصم علی جان اس کا منتظر تھا۔ انوشہ نے جیسے ہی انتظار گاہ میں قدم رکھا سامنے موجود شخص کو دیکھ کر جیسے اسے چار سو چالیس والٹ کا کرنٹ لگا۔ وہ بے اختیار چونکی لیکن اگلے ہی پل اس کی گھبراہٹ غصے میں تبدیل ہوگئی اور وہ تیزی سے اس شخص کی جانب بڑھی اور آہستہ آواز میں چلائی۔ ''کیوں آئے ہو تم یہاں؟ کیوں میرا پیچھا کر رہے ہو؟ تمہیں شرم نہیں آتی۔''

غصے کی حالت میں اسے خبر نہ تھی کہ اس کے منہ سے کیا کیا الفاظ نکل رہے ہیں پھر بھی وہ بلا تکان بولے جا رہی تھی جب کہ سامنے کھڑا شخص خاموشی سے ایک ٹک اسے دیکھے رہا تھا جس کا احساس کچھ دیر میں ہی انوشہ کو ہوگیا اور وہ یک دم خاموش ہوگئی۔

''آپ کو جو کہنا ہے آپ کہہ سکتی ہیں۔ میں سن رہا ہوں اور یقین جانیں مجھے بالکل برا نہیں لگ رہا۔'' حلیے کے مقابلے میں اس کا انداز گفتگو خاصا سلجھا ہوا تھا اسی لیے وہ مسکراتا ہوا انوشہ سے مخاطب تھا۔

''تم مجھ سے کیوں ملنے آئے ہو؟'' اب انوشہ اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی۔

''کیوں تم سے ملنے آنا کوئی گناہ ہے؟'' اس کی مسکراہٹ اور جواب جیسے انوشہ کو تپا گیا اور وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔

''میں تمہیں پولیس کے حوالے کردوں گی۔'' یہ کہتے ہی وہ حالت غصے میں باہر کی جانب لپکی تب وہ شخص ایک دم اس کے سامنے آگیا۔

''پلیز ناراض مت ہو، پہلے میری پوری بات سن لو۔''

انوشہ نے دیکھا بات کرتے وقت اس کا لہجہ روہانسا ہو گیا تھا اور چہرے پر پرانی مسکینیت لپک آئی تھی جس سے انوشہ کو سخت چڑ تھی۔

''جلدی بولو ورنہ میں ابھی سیکیورٹی کو بلا رہی ہوں۔'' وہ غصے سے بولی۔

''مجھے غلط مت سمجھو، بات صرف اتنی ہے کہ تمہاری شکل میری مرحومہ بیوی سے بے حد ملتی ہے۔'' بھرائی ہوئی آواز میں وضاحت کرتا وہ شخص انوشہ کو سچ بولتا محسوس ہوا اس لیے وہ خاموش کھڑی اسے سنتی رہی۔

میری بیوی اروما جو چار سال قبل اپنی پہلی اولاد کو جنم دیتے ہوئے مرگئی۔ ہاں میری عزیز از جان روی مرگئی، مجھے تنہا چھوڑ گئی۔'' اب وہ باقاعدہ رو رہا تھا۔ ''جانتی ہو وہ بیوی سے پہلے میری محبوبہ بھی تھی ہم دونوں کی پسند کی شادی تھی۔''

اب انوشہ کے دل میں موجود اس شخص کے خلاف نفرت پگھل رہی تھی اور اس کی جگہ ہمدردی اپنا مقام بنانے لگی۔ ساتھ ہی اسے افسوس ہوا کہ اتنے ماہ وہ بلاوجہ اس شخص کو کوس رہی تھی جس کا نام بھی آج ہی اسے معلوم ہوا تھا لیکن پھر بھی وہ اپنے دل میں موجود بدگمانی کو پل بھر میں ختم نہ کر سکی تھی، اسی لیے ماتھے پر تیوری ڈالتے ہوئے بولی۔ ''میں کیسے یقین کرلوں تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''یہ دیکھو میرے پاس اس کی تصویر ہے۔'' عاصم اسے قائل کرنے کے لیے گھر سے پوری تیاری کر کے آیا تھا اسی لیے جلدی جلدی اپنی واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک مڑی تڑی تصویر برآمد کی اور اسے انوشہ کی جانب بڑھاتا ہوا بولا۔ ''تم خود دیکھ لو۔''

انوشہ نے ایک سرسری سی نظر اس تصویر پر ڈالی جو ہو بہو انوشہ جیسی ہی کسی عورت کی تھی اسے حیرت ہوئی مگر اپنی حیرت کا اظہار کیے بنا وہ ذرا تلخی سے بولی۔ ''چلو مان لیا میں تمہاری بیوی جیسی ہوں مگر تمہاری بیوی نہیں ہوں لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ تم میرا پیچھا کرو اور مجھے ساری دنیا میں بلاوجہ بدنام کرتے پھرو اس لیے بہتر ہوگا کہ جو بھی ہے آیندہ کبھی میرے پیچھے مت آنا۔''

''میں اسی لیے آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔'' اب وہ ایک دم ہی تم سے آپ پر آ گیا۔ ''بے شک میری حرکت نہایت گھٹیا تھی جس نے آپ کو پریشان کیا مگر آیندہ ایسا نہیں ہوگا لیکن یقین جانیں جو پہلے ہوا وہ بھی ایک قطعی غیر اختیاری عمل تھا جس میں میرا کوئی عمل دخل نہ تھا بس آپ کو پہلی بار دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میں روی کو دیکھ رہا ہوں اور اس کے بعد میں خود پر اختیار نہ رکھ سکا اور آپ کا پیچھا کرنے لگا۔ بہرحال آیندہ ایسا نہ ہوگا۔'' وہ انوشہ کو یقین دہانی کروا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔'' اپنی بات مکمل کر کے انوشہ انتظار گاہ سے باہر نکل آئی اور یہاں وہاں دیکھا کہیں کسی نے اسے دیکھا تو نہیں ورنہ بلاوجہ وہ آفس میں بدنام ہو جاتی۔ یہ ہی سوچتی وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ بنا دیکھے کہ عاصم گیا یا وہیں انتظار گاہ میں ہی بیٹھا ہے کیونکہ اب ساری بات مکمل کر اس کے علم میں آ چکی تھی۔ لہٰذا اسے اطمینان ہوگیا تھا کہ بنا کسی پریشانی کے اس کا مسئلہ حل ہوگیا مگر جانتی نہ تھی کہ یہ اطمینان چند روزہ ہے اور عاصم کے

UUNOVELS.COM

حوالے سے مزید کئی نئے مسائل اس کے منتظر ہیں۔

☆......☆

آج ایک ہفتے سے زیادہ ہوگیا تھا مگر عاصم اس کی راہ میں نہیں آیا، اس نے بھی شکر ادا کیا کہ کوئی بات بگڑے بنا ہی ختم ہوگئی مگر نہ جانتی تھی کہ ایسے مسائل اتنی جلدی حل نہیں ہوتے۔ اسی شام جب وہ آفس سے گھر آئی تو دیکھا اس کے چار سالہ بیٹے موسیٰ کو فلو ہورہا تھا۔ امی نے بتایا کہ اس نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا۔ یہ سنتے ہی انوشہ تڑپ اٹھی۔ جلدی سے بیگ سے والٹ نکال کر گلی کے نکڑ پر موجود بابو جنرل اسٹور گئی تاکہ موسیٰ کے پسندیدہ بسکٹ خرید لائے جنہیں وہ شوق سے کھاتا تھا مگر دکان کے چبوترے پر چڑھتے ہی وہ ٹھٹک گئی کیونکہ اس کی نظر گلی کے نکڑ پر کھڑے عاصم جان پر پڑ چکی تھی جو اپنے سابقہ حلیے میں موجود سگریٹ کے کش لگاتا اسے ہی دیکھ رہا تھا اور یہ صورتِ حال انوشہ کے لیے خوف زدہ کر دینے والی تھی کہ ایسا شخص جو اسٹاپ تک محدود تھا اچانک ہی اس کی گلی تک آن پہنچا ہو۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس شخص نے گھر کیسے تلاش کرلیا۔ مارے گھبراہٹ جلدی جلدی اپنا مطلوبہ سامان خرید کر چبوترے سے نیچے اترتے ہوئے اس نے ایک نظر اپنے گھر پر ڈالی کہ کہیں اوپر کی بالکونی میں بھابی کھڑی جھانک تو نہیں رہیں مگر صد شکر بالکونی بالکل خالی پڑی تھی۔ انوشہ کا دل چاہا سامنے کھڑے اس مردود شخص کو گولی سے اڑا دے جس نے اس کا سکون برباد کر دیا تھا مگر چونکہ یہ اس کا اپنا محلہ تھا لہٰذا یہاں وہ کسی بھی قسم کا ہنگامہ کر کے خود کو مصیبت میں مبتلا نہ کرسکتی تھی اس لیے خاموشی سے سامان کا تھیلا اٹھائے تیز تیز چلتی اپنے گھر کی جانب بڑھ گئی اور پھر رات تک اس کا دل دھڑکتا رہا کہ کہیں گھر میں کوئی ایسی بات نہ ہوجائے جس سے اس کے کردار پر انگلی اٹھائی جائے مگر ایسا کچھ نہ ہوا، رات آرام و سکون سے گزر گئی اور صبح تک وہ عاصم جان اور اس سے متعلقہ تمام پریشانیاں بھول چکی تھی۔

☆......☆

گلی کی نکڑ پر نظر آنے کے بعد عاصم جان اسے دوبارہ اسٹاپ پر دکھائی نہ دیا تو انوشہ نے اطمینان کا سانس لیا مگر اس کا یہ اطمینان جلد ہی رخصت ہوگیا۔ آج ہفتے کا دن تھا اور موسیٰ کے اسکول میں پیرنٹس ٹیچر میٹنگ تھی جس سے واپسی پر وہ موسیٰ کو میکڈونلڈ لے گئی جہاں ایک اچھا وقت گزار کر جب وہ گھر آئی تو دیکھا نیچے ڈرائنگ روم میں کوئی موجود تھا جس کا اندازہ اس کے بیرونی دروازہ کے باہر رکھے جوتے دیکھ کر ہوا۔ جب وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو امی بھی کچن میں مصروف تھیں۔ اپنا ہینڈ بیگ کمرے میں رکھ کر اس نے کچن میں جھانکا، امی چائے بنا رہی تھیں۔ انوشہ ان کی مدد کو آگے بڑھی اور بولی۔ ''میں چائے بنا دیتی ہوں۔''

''ارے اب تو بن گئی چھوڑو تم آرام کرو۔'' مسکراتے ہوئے جواب دیتی امی سامنے رکھے کپوں میں چائے انڈیل رہی تھیں۔ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''اندر کون ہے؟''

''فیضان کا کوئی دوست آیا ہے۔''

''اوہ......!'' انوشہ جانتی تھی کہ فیضان سے جب کوئی ملنے آتا وہ نیچے کا ڈرائنگ روم ہی کھلواتا تھا کبھی بھی مہمان کو اوپر اپنے فلور پر نہ لے کر گیا۔ کئی دفعہ بچے سب سو رہے ہوتے تو بھی فیضان اسے یا وریشہ کو جگا کر چائے کے اہتمام کا حکم دیتا جب کہ اس کی بیوی اوپر موجود ہوتی مگر چونکہ امی یا وریشہ نے کبھی اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا تو وہ بھی خاموش رہی یہ ہی وجہ تھی کہ اس نے ابھی بھی امی سے کوئی سوال نہ کیا اور خاموشی سے بچی ہوئی چائے اپنے کپ میں انڈیل کر باہر نکل آئی اور ٹی وی لگا لیا جب اچانک ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلتا فیضان ایک دم ہی اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

''تم عاصم جان کو کب سے جانتی ہو۔'' آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں لیے وہ انوشہ کو اس طرح گھور رہا تھا کہ وہ ایک دم گھبرا اٹھی۔

''کون عاصم جان؟'' اس حالت میں اسے عاصم جان کا نام پہچاننے میں خاصی دشواری ہوئی یا شاید وہ یہ نام اپنے بھائی کے منہ سے سننے کی توقع نہ رکھتی تھی۔ بہر حال جو بھی تھا وہ شاید گھبراہٹ میں سب بھول گئی تھی۔

''زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے۔'' الفاظ کے ساتھ ساتھ زہر ان کے لہجے اور چہرے پر بھی برس رہا تھا۔ ''وہ مجھے تمہارے سارے کرتوت بتا گیا ہے۔''

''کیا بکواس ہے یہ۔'' اب انوشہ کی برداشت ختم ہو گئی اور وہ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ قریبی ٹیبل پر پٹختی اٹھ کھڑی ہوئی جب کہ امی ہکا بکا ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ شور کی آواز سن کر ابا بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئے اور شومئی قسمت اسی وقت بھابی جیسی عظیم ہستی نے بھی کمرے

URDUNOVELS.COM
URDUNOVELS.COM

میں قدم رکھ دیا جس نے معاملہ مزید بگاڑ دیا۔

''اچھا اب تمہیں میری باتیں بکواس لگیں گی جب کہ تم نے اپنے شوہر کو بھی اس خبیث انسان کے لیے چھوڑا۔'' ایک کے بعد ایک الزام تراشی۔ یہ وہ وقت تھا جب ابا اس کی مدد کو آگے بڑھے اور انوشہ کے سامنے تن کر کھڑے فیضان کو بازو سے پکڑ کر پیچھے کیا۔

''کیا بات ہے کیوں اتنے گرم ہو رہے ہو۔ تحمل سے بات کرو مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔'' ابا کی بات سن کر انوشہ نے فیضان کے عقب میں کھڑی بھابی کے چہرے پر ایک نظر ڈالی جہاں تجسس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی کمینی خوشی جھلک رہی تھی جو انوشہ کو اس طرح بھائی کے ہاتھوں ذلیل ہوتا دیکھ کر اس کے چہرے پر در آئی تھی۔ غصے کی حالت میں اس کا دل چاہا کہ بھابی کا منہ ہی نوچ لے مگر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ خود پر برداشت کرتی خاموش کھڑی تھی جب بھائی کی آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔

''تحمل کیسا؟ آپ کی بیٹی کے کرتوت سن کر تو میں اوپر سے نیچے تک سلگ رہا ہوں اور آپ مجھے تحمل کا درس دے رہے ہیں۔''

''میرے کرتوت؟'' انوشہ حیرت زدہ تھی۔ اپنے بھائی کے اس ردِعمل نے اسے صحیح معنوں میں دکھی کر دیا تھا جہاں ایک سگا بھائی محض کسی اجنبی شخص کی بے سروپا باتوں پر یقین کر کے بہن کو کٹہرے میں لے آیا تھا وہ بھی کردار کے حوالے سے۔ انوشہ کو یہ سب سوچ کر بے حد دکھ ہو رہا تھا۔

''اس نے ایسا کیا کر دیا؟'' امی کے ساتھ ساتھ ابا بھی حیران تھے۔

''آپ جانتے ہیں کہ آپ کی بیٹی کا پچھلے کئی سال سے عاصم جان نامی ایک شخص سے تعلق ہے جو اس کے آفس میں کام کرتا ہے اور آج اس کا رشتہ لینے آیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کر گیا کہ اگر ہم نے انکار کیا تو اچھا نہ ہوگا۔''

''عاصم جان......!'' اب انوشہ کو جیسے سب یاد آ گیا اور یک دم چلائی۔ ''وہ پاگل آدمی جو مجھے پچھلے کئی دنوں سے پریشان کر رہا ہے۔ آپ اس کی باتوں پر یقین کر کے میرے کردار پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔'' غصے کی زیادتی سے وہ روہانسی ہو گئی۔

''پاگل......!'' نازیہ ہلکا سا ہنسی۔ ''روز تمہارے پیچھے گھر تک آتا ہے تب تمہیں پاگل نہیں لگا۔ آج رشتہ لے کر آ گیا تو تمہیں پاگل لگنے لگا واہ بھئی واہ۔''

جیومیٹری

اس موضوع پر البیرونی نے حسب ذیل کام کیے۔

☆ منتظم کثیر الاضلاع یعنی مخمس، مسدس، مثمن، معشیرہ وغیرہ کو کسی دائرے کی مدد سے بنانا۔

☆ کسی دائرے کا وتر اور مماس کھینچنا اور اس کی لمبائی بذریعہ پیمائش اور بذریعہ حساب نکالنا۔

☆ اقلیدس کے بہت سے مسائل کے متبادل ثبوت بتائے۔ ایک مسئلے سے دوسرا مسئلہ نکالا اور ثبوت بھی دیے۔

کیلکولس

خیال ہے کہ ریاضی کی اس شاخ کا موجد بھی البیرونی تھا۔ البیرونی نے جو فارمولے وضع کیے وہ مشکل تھے اور لوگ انہیں سمجھ نہ سکے۔ سترویں صدی میں یورپ میں البیرونی ہی کے عربی زبان کے لکھے ہوئے ان فارمولوں اور حسابی طریقوں کا مطالعہ کر کے اور ان میں ذرا سی تبدیلیاں کر کے اس طرح پیش کر دیا گیا کہ جیسے یہ ایجاد اہل یورپ کی ہی ہو۔

ارض پیمائش

یہ ایک ایسا علم ہے جس سے زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعات کو ناپنا آسان ہوتا ہے لیکن بہت بڑے علاقے کا رقبہ نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زمین کی سطح ہموار نہیں ہوتی بلکہ گول ہوتی ہے۔ بڑے بڑے نقشے بنانے والوں کو اس گولائی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ البیرونی نے اس پیمائش میں قوسی یا گول مثلث پیمائی سے کام لیا۔ پیمائش کا یہ طریقہ آج تک رائج ہے۔ البیرونی نے زمین کا نصف قطر اور محیط معلوم کیا۔ آج سے ایک ہزار سال پہلے اس نے جو نتائج اخذ کیے وہ آج بھی بہت کم فرق سے ملتے جلتے ہیں۔ جدید طریقوں سے نکالے ہوئے نصف قطر سے صرف بارہ میل کم تھا۔ اس طرح محیط ستر میل کم تھا۔ پاکستان کے ایک گاؤں نندنہ، ضلع جہلم کو البیرونی کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہے البیرونی نے اسی جگہ زمین کا محیط اور قطر ناپا تھا۔

مرسلہ: سلطانہ بھٹو، لاڑکانہ

UUNOVELS.COM

"اچھا تو آپ میری جاسوسی کے کام پر مامور ہیں۔"
نازیہ کی لن ترانیاں انوشہ کو مزید تپا گئیں۔

"تو ہم جاسوسی کیوں کریں بی بی، پورا محلہ جانتا ہے کہ تمہیں آفس سے گھر تک کوئی چھوڑنے آتا ہے اور آج وہ گھر بھی آ گیا۔ اب کس کس کا منہ بند کرو گی اور کہاں کہاں جا کر جھٹلاؤ گی۔ لہٰذا بہتر ہے کہ یہاں ہی چپ ہو جاؤ اور اس پاگل سے شادی کر کے اپنے گھر سدھارو۔" تیز تیز بولتی نازیہ بیرونی دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے رک گئی اور ایک نظر سامنے کھڑے اپنے مجازی خدا پر ڈالی۔

"اوپر آ جائیں، پیشتر اس کے کہ آپ کو یہاں سے دھکے دے کر نکالا جائے۔"

"ارے دھکے کون دے گا۔" امی حالت صدمے میں بھی بیٹے کی طرف داری کرنا نہ بھولیں۔ "بڑا بھائی ہے یہ اونچ نیچ نہیں سمجھائے گا تو کون بتائے گا۔"

"رہنے دو ایسا بڑا بھائی جسے بہنوں کی عزت کا خیال نہ ہو۔" ابا اس کا پریشان چہرہ دیکھتے ہوئے امی سے مخاطب ہوئے۔

"رہنے دیتا ہوں لیکن یاد رکھیے گا یہ بات جو اب شروع ہوئی ہے ہمیں پوری کالونی میں ذلیل کیے بنا ختم نہ ہو گی، پھر میں آپ سے آ کر پوچھوں گا۔" باپ کو دھمکیاں دیتا فیضان بھی بیوی کے پیچھے ہی باہر نکل گیا جب کہ انوشہ روتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھی جہاں دروازے پر کھڑے سوئی کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ ٹھٹک گئی۔ بیٹے کا پریشان چہرہ دیکھ کر اس کا دل دکھ سے بھر گیا اور اسے اس لمحے خاصی شرمندگی محسوس ہوئی کہ اس کا سگا بیٹا ماں کو اپنے گھر والوں کے نرغے میں گھرا دیکھ کر پریشان ہو رہا ہے اور یہی کچھ سوچتی اپنے بیٹے کو گلے لگا کر رونے لگی۔

☆......☆

اگلے دن جب وہ گھر سے نکلی تو خاصے غصے میں تھی مگر اسٹاپ پر پہنچ کر اسے مایوسی ہوئی کہ آج وہاں عاصم جان نہ تھا۔ اسی مایوسی میں گھری وہ اپنے آفس تک پہنچ گئی لیکن اندر داخل ہوتے ہی سامنے نظر آنے والے کمپیوٹر آپریٹر کے کمرے میں موجود شخصیت کو دیکھ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا جہاں پہلے سے موجود عاصم جان کمپیوٹر آپریٹر ذیشان احمد کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ ان دونوں کے درمیان اچھا اور پرانا یارانہ ہے۔ یعنی عاصم جان کے پیچھا کرنے والی کہانی یہاں سے شروع ہوئی ہے یہ ضرور ذیشان کے پاس آتا تھا جہاں اس نے انوشہ کو دیکھا اور اپنی بیوی کی ہم شکل پا کر اس کا پیچھا کرنے لگا مگر کل اس کے گھر آ کر اس کے کردار کے متعلق غلط باتیں کرنا، یہ انوشہ کو عجیب لگا جس کی بنا پر وہ غصے سے شیشے کا دروازہ دھکیلتی ذیشان کے کمرے میں داخل ہوئی اور سیدھا عاصم جان کے سر پر جا پہنچی۔

"تم کل میرے گھر کیوں آئے تھے؟" لال بھبوکا چہرے کے ساتھ وہ عاصم جان کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی جب کہ وہ اس کے غصے کی پرواہ کیے بنا مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور شاید اس کا جواب دینے کا بھی کوئی ارادہ نہ تھا۔

"میں ابھی پولیس کو فون کرتی ہوں۔" عاصم جان کی خاموشی اسے سرتاپا سلگا گئی اور اس نے ہینڈ بیگ کھول کر اپنا فون نکالا ہی تھا کہ ذیشان اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آن کھڑا ہوا۔ "ایک منٹ مس انوشہ پلیز آپ یہاں بیٹھ کر بات کریں۔"

ذیشان اس کا کولیگ اور پرانا ساتھی تھا لامحالہ انوشہ کو اس کی بات ماننا پڑی اور وہ خاموشی سے عاصم جان کے قریب رکھی کرسی ذرا پرے کھینچ کر اس پر جا بیٹھی جب ذیشان نے اپنی جگہ واپس بیٹھنے کے بعد اسے مخاطب کیا۔

"مس انوشہ آپ پہلے اپنا غصہ ٹھنڈا کریں تو میں آپ سے کچھ بات کروں۔"

"جی آپ بات کریں میں سن رہی ہوں۔" خود پر قابو پاتی انوشہ نے بمشکل جواب دیا۔

"عاصم جان سے تو آپ واقف ہی ہوں گی۔ یہ ماشاء اللہ ایک اچھے سرکاری عہدے پر ملازم ہیں اور یہاں اس وقت میرے پاس آپ کے سلسلے میں آئے ہیں۔"

"میرے سلسلے میں......!!" وہ ہلکا سا غصے سے چلائی۔ "اب یہ میرے سلسلے میں آپ کے پاس آ گیا اس لیے ہی میں چاہتی ہوں کہ اس پاگل آدمی کی ایف آئی آر درج کراؤں کہ مجھے اس سے اپنی جان اور عزت کا خطرہ ہے۔" غصے کی زیادتی میں بولتی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی جب ایک دم ہی عاصم جان نے اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"تمہیں اللہ کا واسطہ انوشہ مجھے غلط مت سمجھو میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یقین جانو میں تمہارے بیٹے کو اپنی اولاد سمجھ کر پالوں گا اور اسے زندگی میں کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔"

UUNOVELS.COM

الوشہ حیرت زدہ اس کی باتیں سن رہی تھی یعنی وہ اس کے بیٹے سے بھی واقف تھا۔ سامنے کھڑا بظاہر بے ضرر نظر آنے والا شخص ہر دوسرے دن اس کی پریشانی میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اب اسے خوف زدہ بھی کررہا تھا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' خوف، نفرت، غصہ سب اس کے لہجے میں سمٹ آیا تھا۔

''تم سے شادی۔'' جواباً عاصم جان بالکل مطمئن تھا۔

''لیکن میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی اس لیے تمہیں خدا کا واسطہ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ بلاوجہ مجھے یہاں وہاں بدنام نہ کرو ورنہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے گولی مار دوں گی۔'' عاصم کو دھمکیاں دیتی الوشہ، ذیشان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اب وہ دل ہی دل میں فیصلہ کرچکی تھی کہ اسے آفس یونین کے دفتر جاکر عاصم کے ساتھ ساتھ ذیشان کی بھی شکایت درج کروانی چاہیے جس کی شہ پر عاصم جیسے لفنگے کی جرأت ہوئی کہ آج وہ اس کے آفس تک پہنچا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اب عاصم کو نظرانداز کرنا اسے کسی بڑی مشکل میں گرفتار کرسکتا ہے لہٰذا اس کا سدباب ضروری ہے کیونکہ عاصم جیسے لوگ کبھی کبھی اپنی بے وقوفی میں دوسروں کو نقصان بھی پہنچادیتے ہیں اور ویسے بھی عاصم کی بدولت روز بروز اس پر عرصہ حیات تنگ ہوتا جارہا تھا۔ ان ہی خیالات میں ڈوبی وہ غصے سے پیچ و تاب کھاتی لنچ بریک میں گراؤنڈ فلور پر واقع یونین کے دفتر جا پہنچی جہاں اتفاق سے آج یونین کا صدر شاہ زیب خان بھی موجود تھا جو نہ صرف الوشہ کی دوست کا کزن تھا بلکہ اسی کی بدولت الوشہ کو اس ادارے میں نوکری ملی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ الوشہ سے عاصم جان کا سارا قصہ سن کر اس کی دفتر آمد اور ذیشان کا اس سلسلے میں حمایت کرنا شاہ زیب کو ٹھیک ٹھاک تپا گیا۔

''آپ اپنے روم میں جائیں، میں بات کرتا ہوں۔''

الوشہ کو ہدایات دیتا وہ اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آیا جب کہ الوشہ اپنے کمرے میں واپس جاکر منتظر رہی کہ کب اسے شاہ زیب اس حوالے سے کال کرے گا مگر اس کا انتظار بے سود رہا اور اس دن تو کیا اگلے دن بھی اسے یونین کے دفتر سے کوئی بلاوا نہ آیا اور نہ ہی اس حوالے سے کوئی سنسنی خیز خبر سننے کو ملی اور قبل اس کے کہ وہ شاہ زیب سے مایوس ہوکر عاصم کے خلاف کوئی نیا قدم اٹھاتی اس دن صبح آفس جاتے ہی اسے شاہ زیب کا فون آگیا۔

''آپ میرے پاس آجائیں کچھ بات کرنی ہے۔''

اتنا کہہ کر شاہ زیب نے فون بند کردیا۔ الوشہ نے جلدی جلدی اپنا سامان ٹیبل پر رکھا اور دوپٹا درست کرتی یونین کے دفتر پہنچ گئی جہاں اندر داخل ہوتے ہی اسے اپنی جگہ ٹھٹک جانا پڑا کیونکہ آفس میں شاہ زیب کے ساتھ اور بھی لوگ موجود تھے۔ اس نے دیکھا یونین کے دیگر افراد کے علاوہ سامنے رکھی کرسی پر ذیشان سر جھکائے بیٹھا تھا جب کہ اس کے قدموں میں نیچے کارپٹ پر عاصم بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اس طرح زمین پر بیٹھا دیکھ کر الوشہ کو عجیب سا محسوس ہوا مگر کچھ کہے بنا وہ شاہ زیب کے سامنے رکھی خالی کرسی پر جا بیٹھی۔ اس نے دیکھا شاہ زیب کے چہرے پر سرخی چھائی ہوئی تھی جو یقیناً اس کے غصے کو ظاہر کررہی تھی۔ کمرے میں ان کا کمپیوٹر انچارج مطیع اللہ بھی موجود تھا ابھی وہ سب کا مکمل جائزہ بھی نہ لے پائی تھی کہ شاہ زیب کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ہاں بھئی اب ذرا میڈم کے سامنے بتاؤ کہ تم آئندہ ایسا نہیں کروگے۔''

الوشہ نے چونک کر دیکھا یقیناً وہ عاصم سے مخاطب تھا جو جواباً بھیگی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا آواز کیوں بند ہوگئی ہے۔''

جنرل سیکریٹری بابر نے زمین پر بیٹھے عاصم کو ایک زوردار لات رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''خبیث انسان گھر سے نکلنے والی مجبور عورتوں کو تنگ کرتے ہو، تیری تو میں......'' ساتھ ہی بابر نے ایک بڑی سی گالی دی۔ اب الوشہ کو افسوس ہوا بلاوجہ ہی بات کو اتنا بڑھایا مگر وہ جو کہتے ہیں نا کہ اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ تو بالکل ایسا ہی تھا اب تو وہ کچھ کہہ بھی نہ سکتی تھی اس لیے اپنے حلق میں آیا تھوک نگل کر رہ گئی۔ جب عاصم کی سسناتی آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔ ''سوری باجی!'' وہ بری طرح چونک گئی اسے یقین کرنا مشکل ہوگیا کہ عاصم کے منہ سے اس کے لیے لفظ باجی نکلا ہے۔ وہ ہکابکا اسے دیکھے گئی۔

''مجھے معاف کردیں آئندہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔'' اپنی آنکھیں رگڑتا وہ الوشہ کے سامنے ہاتھ جوڑے معافی کا طلب گار تھا اور الوشہ کے لیے اتنا ہی کافی تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہاں آکر معافی مانگنے کے بعد اگر عاصم کوئی غلط حرکت کرے گا تو پکڑ یقیناً ذیشان کی ہوگی اور ابھی بھی ایسا ہی ہوا۔ بابر نے زبانی معافی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایک اسٹامپ پیپر پر معافی نامہ تیار کرواکر الوشہ اور

UUNOVELS.COM

عاصم کے علاوہ ضمانت کے طور پر ذیشان سے بھی سائن کروا لیے اور اس کاغذائی کارروائی کے بعد سکھ کا سانس لیتی انوشہ اپنے آفس واپس آگئی اور اس طرح اس کی زندگی سے عاصم نامی بلا فی الحال نکل گئی۔ دوبارہ نہ وہ اسے اسٹاپ پر دکھائی دیا اور نہ ہی کبھی گھر کی گلی میں۔ یہاں تک کہ ذیشان نے بھی کوئی بات نہ کی۔ البتہ ایک سے دو بار اس کے فون پر کسی انجان نمبر سے محبت بھرے میسج ضرور آئے جسے اس نے نظر انداز کر دیا کہ اب مزید شور شرابے کا کوئی فائدہ نہ تھا اور اس وقت جب وہ عاصم کو بالکل بھول چکی تھی اس کے فون پر آنے والی ایک اجنبی عورت کی کال نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا جو خود کو عاصم کی بیوی بتا رہی تھی اور جسے انوشہ نہ جانتی تھی وہ تو اپنے آفس کا سارا کام ختم کر کے فائلز وغیرہ لاک کر کے دفتر سے باہر نکلی آج اس کا ارادہ قریبی مارکیٹ جانے کا تھا جو اس کے آفس سے پیدل کے راستے پر ہی تھی۔ ابھی اس طرف اس نے پہلا قدم ہی اٹھایا تھا کہ اچانک اس کا فون بجنے لگا۔ بے دلی سے اپنا پرس کھنگال کر اس نے فون باہر نکالا۔ کوئی اجنبی نمبر تھا جسے دیکھتے ہوئے انوشہ نے یس کا بٹن دبا کر سیل اپنے کان سے لگا لیا کہ دوسری طرف سے آتی سسکیوں کی آواز اسے بے چین کر گئی اور وہ تڑپتے ہوئے بولی۔ ''ہیلو......کون بول رہے......ہیلو...... میں بات کر رہی ہوں روحی......!!''

''روحی......!'' انوشہ کے لیے یہ نام بالکل نیا تھا۔

''ہاں روحی۔ عاصم جان کی بیوی۔''

''عاصم جان کی بیوی!'' اب انوشہ چونکی۔ ''مگر اس کی بیوی تو فوت ہو چکی ہے اور یہ بات اس نے مجھے خود بتائی تھی۔''

''جھوٹ بول رہا تھا۔'' روحی روتے ہوئے بولی۔

''مگر کیوں؟'' انوشہ کی حیرت بڑھتی گئی اور وہ مارکیٹ جانے کا اپنا ارادہ ملتوی کرتی واپس آفس کی جانب آگئی تاکہ عاصم جان کی بیوی سے صحیح طرح بات کر سکے۔ آج وہ عاصم جان کا سارا جھوٹ کا پول کھولنا چاہتی تھی۔

''کیونکہ اسے تم سے محبت ہو گئی تھی۔'' روحی نے گویا انکشاف کیا۔ ''جانتی ہو میرا میاں تم سے محبت کرنے لگا تھا۔ اس کی باتوں میں ہر دم صرف تمہارا ذکر ہوتا لیکن میں نے کبھی تم سے حسد محسوس نہ کی بلکہ میں تو دل سے چاہتی تھی کہ کوئی ایسا ہو جو اسے زندگی کی طرف واپس لے آئے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ تمہاری محبت اسے زندہ رہنے پر مجبور کر رہی ہے اور وہ تمہاری خاطر جینا چاہتا تھا۔'' روحی کی باتیں انوشہ کی سمجھ میں نہ آ رہی تھیں۔ وہ ہر لحظہ لفظ تھا پر الجھ رہی تھی لیکن خاموشی سے روحی کی ساری گفتگو سن رہی تھی کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ روحی اسے وہ سب بتا دے جو اس کے علم میں نہ تھا لیکن دوسری طرف روحی نے اس کی خاموشی کو شاید محسوس کر لیا اس لیے اپنی بات کو درمیان میں روک کر دھیرے سے بولی۔ ''کیا تم لائن پر موجود ہو۔''

''ہاں......! میں تمہاری بات سن رہی ہوں لیکن مجھے ایک بات کا جواب دو۔ عاصم جان کہاں ہے؟'' روحی کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا جس نے انوشہ کو یہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا ورنہ شاید وہ کبھی بھی عاصم جان کے متعلق استفسار نہ کرتی۔

''وہ مر گیا۔'' اتنا خلاف توقع جواب کہ انوشہ ایک پل کو لرز گئی۔ ''عاصم جان مر گیا۔'' روتی ہوئی روحی نے اپنا جملہ ایک بار پھر سے دہرایا۔

''مگر کیسے؟ وہ تو کل ہی یہاں آفس آیا تھا بالکل ٹھیک ٹھاک پھر اچانک کیسے؟'' انوشہ سمجھ نہ پائی کہ اپنی بات کی وجاحت کس طرح کرے۔

''اچانک نہیں۔'' روحی نے ایک گہری سانس لی۔ ''اسے کینسر تھا پچھلے دو سالوں سے وہ اس موذی مرض میں مبتلا تھا جو آہستہ آہستہ اسے موت کی طرف لے جا رہا تھا کہ ایک دم تم اسے مل گئیں اور دم توڑتی زندگی کی خواہش اس کے دل میں انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔ جانتی ہو انوشہ اسے تم سے محبت ہو گئی تھی۔ اگر تم اسے کچھ وقت دے دیتی تو اس کی سانسوں کی تعداد بڑھ جاتی۔''

جانے روحی اور کیا کیا کہہ رہی تھی مگر انوشہ نے فون بند کر دیا کیونکہ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے فون پر روحی نہ ہو بلکہ عاصم جان نے اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کوئی نیا ڈراما رچایا ہو۔ یہ ہی سوچتی اپنی گیلی آنکھوں کو دوپٹے سے رگڑتی وہ بس اسٹاپ کی طرف چل دی۔ اسے امید تھی کہ عاصم جان اپنی مخصوص جگہ پر کھڑا اس کا منتظر ہوگا مگر ایسا نہ ہوا نہ اس دن اور نہ ہی اس کے بعد آنے والے کسی دن۔ انوشہ نے بھی دوبارہ عاصم جان کو نہ دیکھا اور نہ ہی کبھی فیضان یا ذیشان نے اس کا کوئی ذکر کیا۔

مگر آخری کال کی یاد اسے اب بھی تڑپا دیتی ہے کہ اگر عاصم صحیح انداز میں اس سے ملتا تو شاید وہ اس کے لیے ہمدردی کا سوچتی مگر اس نے راستہ غلط چنا۔ خوف زدہ کر کے اپنی بات منوانی چاہی تھی۔

UUNOVELS.COM

نئے راستے

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

شاید آپ بھولے نہ ہوں، عرصہ قبل بہت ساری سچ بیانیاں سرگزشت میں لکھ چکی ہوں۔ ادھر کچھ گھریلو مصروفیات بڑھ گئی تھیں اس لیے نیا کچھ لکھ نہ سکی پھر این جی او وغیرہ سے بھی رابطہ نہ رہا جن کی توسط سے دکھی لوگوں تک رسائی ہو جاتی تھی۔ ارسال کردہ سچ بیانی بھی تقریباً آٹھ سال قبل حاصل کی تھی جسے اب پیش کررہی ہوں کہ لوگ سبق حاصل کریں اور معاشرے میں پیدا ہونے والے بگاڑ سے بچیں۔

اریشہ غزل

(کراچی)

یہ آج سے پانچ سال پہلے کی بات ہے میں جس میڈیکل اسٹور پر کام کرتا تھا وہاں سامنے کے رخ فلیٹس آباد تھے۔ پانچ منزلہ ان فلیٹس میں طرح طرح کے لوگ رہتے تھے۔ وہیں دوسری منزل پر میرا دوست مانی اپنی بھابی کے ہمراہ رہائش پذیر تھا۔ میرا اکثر ان کے گھر جانا ہوا کرتا تھا یا کبھی کبھار مانی میرے اسٹور پر آجایا کرتا تھا۔ مانی کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا ایک بڑی بہن تھی جو شادی شدہ تھیں۔ زبیر بھائی جب کمپنی کی طرف سے دبئی روانہ ہوئے تو

UUNOVELS.COM

وہ مانی کی طرف سے بہت فکر مند تھے کیونکہ وہ بہت بے پروا اور لاابالی انسان تھا اس کے حوالے سے انہوں نے مجھے اس کا خیال رکھنے کی بہت تاکید کی۔ میں بی ایس سی کا اسٹوڈنٹ تھا اور آدھا ٹائم ورک کر کے اپنی پڑھائی کا خرچا نکالا کرتا تھا۔

میرے ماں باپ غریب اور شریف لوگ تھے۔ میرے علاوہ میری تین بہنیں بھی تھیں۔ میں پڑھ لکھ کر اس قابل بننا چاہتا تھا کہ انہیں اپنے گھروں کا کر سکوں، ہزار خواہشیں اور خواب تھے جو روز میں کھلی آنکھوں سے دیکھتا اور بنتا تھا اور مانی کو سمجھاتا تھا کہ اسے اللہ نے اچھی زندگی دی تھی، بے فکری اور آزادی۔ اس پر ذمے داریوں کا بوجھ نہ تھا اسے ہر لمحے اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ میری باتوں پر وہ ہنستا اور ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتا تھا۔

میری زندگی میں وہ سنسنی خیز موڑ اس وقت آیا جب نتاشا نے پہلی بار مجھے اپنا نمبر دیا اور فون کرنے کو کہا۔ نتاشا کوئی کنواری لڑکی ہوتی تو پریشانی کی بات نہ تھی۔ لڑکے ایسی آفرز پر خوش ہوتے ہی ہیں۔ میں اس آفر پر پریشان ہو گیا اور اس کی وجہ نتاشا تھی کیونکہ وہ مانی کی بھابی تھی اور چھ ماہ پہلے ہی زبیر بھائی اپنی کمپنی کی طرف سے کام کے سلسلے میں دبئی روانہ ہوئے تھے۔ بقول مانی کے وہ دو سال بعد آئیں گے اب گھر کے ہر کام کے سلسلے میں مجھے ہی بکرا بننا پڑا کرے گا اور بھائی بھی تاکید کر کے گئے ہیں کہ بھابی کو کوئی شکایت نہ ہو۔

ان کے نمبر دینے پر مجھے مانی کی بات یاد آ گئی۔ وہ اسٹور پر میڈیسن لینے آئی تھیں۔ زیادہ باتوں کا وقت نہ تھا۔ میں نے خاموشی کے ساتھ ان کا دیا ہوا پیپر لے کر جیب میں رکھ لیا اور جب اسٹور کا مالک کھانا کھانے گیا تب میں نے اس پیپر کو نکال کر پڑھا۔ اس پر واضح الفاظ میں نمبر لکھا تھا اور فون کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ انسانی تجسس اس کو کہیں کا نہیں رکھتا۔ دل میں اٹھتے ہزار سوالوں کے ساتھ میں نے نمبر ملایا تو پہلی ہی بیل پر دوسری طرف سے اٹھا لیا گیا۔

مرد، عورت کے بیچ دوستی کا رشتہ ہو یا کوئی سا بھی اگر وہ خونی نہیں ہے تو اس کی نہ تو اہمیت ہوتی ہے اور نہ ہی عزت۔ میرے ذہن میں ان کے نمبر دیئے جانے کے بعد بھی تاثر تھا کہ معاشرہ جس تیزی سے خرابی اور برائی کی طرف دوڑ رہا ہے کہیں شوہر کی جدائی نے انہیں بھی اس رستے پر ڈال دیا ہو، آخر میں ان کا کون تھا؟ ان کے دیور کا دوست اور اجنبی ہی تو تھا مگر جب ان سے بات ہوئی تو اپنی سوچ پر مجھے بڑی شرمساری ہوئی۔ ناحق میں انہیں غلط سمجھ رہا تھا، ہر عورت بری اور غلط نہیں ہوتی۔ ان کی کال کرنے کا مقصد صرف مانی کو سمجھانا تھا۔ اپنے بھائی کے جانے کے بعد سے وہ اپنے کچھ دوستوں کو گھر لے کر آنے لگا تھا۔ انہی دوستوں میں علی نام کا ایک لڑکا شامل تھا جو اپنی ذومعنی گفتگو اور نظروں سے نتاشا کو پریشان اور ہراساں کیے ہوئے تھا۔ اب وہ چاہتی تھیں میں کسی طرح مانی کو سمجھاؤں تاکہ وہ ان کا گھر آنا بند کر دے اور ایسا بھی ممکن تھا جب مانی کو تمام بات بتائی جائے مگر وہ اپنی بھابی سے زیادہ دوستوں پر ڈیپنڈ کرتا تھا۔ میں نے نتاشا کو بھی مشورہ دیا کہ مانی کو سمجھانے کے بجائے اس وقت تک کمرے سے نہ نکلا کریں جب تک اس کے دوست گھر میں رہیں۔

میرے مشورے پر وہ اداسی سے بولی۔ ''یہ بھی کر کے دیکھ چکی ہوں۔ وہ دو کی چار لگا کر اپنے بھائی کو دبئی میں پریشان کرتا ہے، پھر وہ مجھ پر غصہ ہوتے ہیں کہ میں ان کے پیچھے ان کے بھائی کا خیال نہیں رکھتی۔ زبیر مجھ سے زیادہ اپنے بھائی اور بہن کا یقین کرتے ہیں۔''

''دیکھیں بھابی میں اپنے طور پر مانی کو سمجھانے کی کوشش کروں گا مگر آپ دیکھ رہی ہیں جب سے وہ یونیورسٹی جانے لگا ہے اس کے نئے اور مختلف لڑکوں سے دوستی ہو گئی ہے جو فیشن پرست اور آوارہ ٹائپ زیادہ لگتے ہیں۔ بہتر تو یہی ہے آپ اس سلسلے میں یا تو زبیر بھائی کو خود انفارم کریں یا پھر اپنی امی سے کہیں کہ وہی اس مسئلے کو حل کر سکتی ہیں۔'' میں نے اپنی سمجھ کے مطابق انہیں بہترین مشورہ دیا تھا۔

میری بات پر وہ رو دیں اور غمگین لہجے میں بولیں۔ ''میری والدہ سوتیلی ہیں۔ ابو نے میری شادی سے کچھ سال پہلے امی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کر لی تھی اور اب گھر پر انہی کا ہولڈ ہے۔ میرے دو چھوٹے بھائی ہیں، وہ ان پر ہی کافی سختی رکھتی ہیں۔ میرا مسئلہ کہاں حل کر سکتی ہیں۔ تم خدا کے واسطے مانی کو سمجھانے کی کوشش کرو۔ وہ بھلے سے گھر کے باہر ان لڑکوں سے مل لیا کرے مگر انہیں گھر نہیں لایا کرے۔ مجھے لگتا ہے مانی ان کی محبت میں ڈرنک وغیرہ بھی کرنے لگا ہے۔''

بھابی کی گفتگو نے جہاں مجھے پریشان کیا وہیں ذہنی طور پر میں الجھ کر رہ گیا۔ کہنے کو وہ میرے لیے ایک اجنبی و غیر تھیں اس کے باوجود مانی کی غیر ذمے دارانہ حرکتوں پر مجھے تشویش ہو رہی تھی۔ اس کے ڈرنک کرنے اور لڑکوں کو گھر لانے کا کیا مقصد تھا۔ اگر زبیر بھائی اپنی بیوی پر بھروسا کرتے تو شاید وہ

UUNOVELS.COM

انہیں مکمل کر تمام حالات بتا سکتی تھیں مگر یہ ہمارے معاشرے کی بدقسمتی سمجھ لیں یا جاہلیت کہ بیوی کو بہت کم لوگ اہمیت دیتے ہیں اور اس کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے ہیں ورنہ زیادہ تر مرد بیوی سے صرف خدمت لیتے ہیں اور جہاں مزاج میں برہمی اتری وہیں اسے پیٹنے میں دیر نہیں کرتے جس کے باعث اکثر بیویاں اپنے شوہر پر بھی بھروسا و یقین نہیں کر پاتیں اور نہ ہی اصل حالات دکھا پاتی ہیں۔

اس شام میں چھٹی کے بعد مانی سے ملاقات کیفے میں اپنے دوستوں کے ساتھ نیٹ پر بزی تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہوا تھا اور چیٹنگ پر بنی اپنی گرل فرینڈ کی تفصیلات بڑی رنگین مزاجی کے ساتھ بتانے لگا۔ اس کی اوچھی باتوں پر مجھے افسوس ہو رہا تھا اور لڑکیوں پر غصہ آ رہا تھا جو ہر ایک کو فرینڈ بنا کر خود کو تماشا بنا لیتی ہیں۔ بہر حال میرا مسئلہ اس کی گرل فرینڈ نہیں بلکہ اس وقت نتاشا بھابی تھیں وہ مجھے اپنے بھائی کی طرح سمجھتی تھیں اور اب میرا فرض تھا کہ میں اپنی استطاعت کے مطابق ان کا مسئلہ حل کر دیتا۔ ایک گھنٹا کیفے میں خراب کرنے کے بعد وہ گیارہ بجاتی گھڑی کو دیکھ کر گھر جانے کے لیے اٹھا تو اس کا وہی دوست علی اس کے ساتھ تھا۔ وہ چائے پر اصرار کرنے لگا تو مانی نے بے پروائی سے کہا۔ ''تو گھر چل وہیں بھابی کے ہاتھ کی کافی پلواؤں گا۔ بڑی مزیدار کافی بناتی ہیں۔''

مانی اصرار بھی نہیں کرتا تو اس کے موڈ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ گھر جانے کے لیے بے چین تھا۔ مجبوراً مجھے بھی اس کے ساتھ وہاں جانا پڑا۔

دروازہ کھولنے والی نتاشا بھابی ہی تھیں۔ مانی کے ساتھ انہوں نے علی کو دیکھا تو ان کے چہرے پر واضح ناگواری تھی مگر ان کے پیچھے مجھے دیکھ کر لحہ بھر کو وہ حیران ہو گئیں اور پھر ایک اطمینان سا میں نے ان کے چہرے پر اترتے دیکھا۔

''بھابی کافی تو بنا دیں۔'' مانی نے کچن کی طرف جاتے دیکھ کر انہیں آواز لگائی۔

''کیا یار...... ! باہر سے ہی پی لیتے ناحق بھابی کو پریشان کرتے ہو۔'' میں نے دبے دبے لہجے میں مانی کو ٹوکا۔

''پریشانی کی کیا بات ہے یہ ان کا فرض ہے۔ میرا ہر کام کرنے کی وہ ذمے دار ہیں۔ بھائی کے پیچھے اب وہی میرا خیال رکھنے والی ہیں۔ آخر بڑی بھاوج ہیں نا۔'' مانی کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ تبھی علی اٹھا اور ٹہلتا ہوا کچن کی طرف روانہ ہو گیا۔

''یہ کہاں جا رہا ہے؟'' میں نے مانی کی توجہ اس کے دوست کی طرف کروائی۔

''پانی لینے گیا ہو گا۔'' مانی موبائل پر میسج کرتے ہوئے سرسری سا گویا ہوا۔

''اچھا میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اسی طرف روانہ ہوا جہاں علی گیا تھا۔

کچن میں علی بھابی کا ہاتھ پکڑے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر علی کو ایک تھپڑ جڑا اور اسے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لاؤنج میں پہنچا جہاں مانی ہینڈ فری لگا کر میوزک انجوائے کر رہا تھا۔ اس کو ہونے والے ہنگامے اور دوست کی آوارہ حرکتوں کا کچھ علم نہ تھا۔ مجھے اس طرح علی کو لاتے دیکھ کر وہ ہق دق رہ گیا۔ میں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے علی کو کارپٹ پر پٹخا اور ایک زوردار لات رسید کی۔ اس کے بعد ایک طویل

قومی اسمبلی میں شریعت بل پاس ہوا تو اس بل کے بل سے نکلتے ہی خاص طرز زندگی کے خوگر لوگوں پر ہراس سا طاری ہو گیا۔ اس موقع پر ضمیر جعفری نے ''ہراس نامہ'' لکھی جس میں نہ صرف انگریزی الفاظ سے مزاح بلکہ خیالات سے ندرت عیاں ہے۔

حسینوں کے چہرے پہ سرخی نہ غازہ
ہر اک چیز باسی بس ایمان تازہ
نہ مطرب نہ نے، نہ کوئی نے نوازہ
پلازہ ہے اور ملا دو پلازا
وکیل ایک دیکھا اداس و پریشاں
نہ چہرہ فروزاں نہ آنکھیں چراغاں
جو پوچھا کہ مسٹر تم کیوں ہراساں
وہ پتلون پر کوٹ کالر کدھر ہے
وہ ٹائی کدھر ہے وہ جھالر کدھر ہے
وہ بولا کہ تو کس قدر بے خبر ہے
وکالت میں بحران ہو گا ہمیشہ
نہ جھوٹی گواہی نہ پیسا نہ پیشہ

مرسلہ: نظیر ابڑو۔ سکھر

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

لیکچر مانی کو دیا تا کہ وہ گھر پر اپنے دوستوں کو لانا بند کر دے۔ بھابی مجرموں کی طرح ایک طرف کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مانی شرمسار ہوتا اور آئندہ کے لیے علی کی دوستی سے خدا حافظ کہہ بیٹھتا مگر اس نے صرف علی ہی کو باہر کا راستہ نہ دکھایا بلکہ مجھے بھی باہر جانے کو کہا۔ اس کا موڈ واضح طور پر خراب ہو چکا تھا۔ علی کی حرکتوں کے باعث نہیں بلکہ وہ میرے اس طرح گھر کے معاملے پر اس کے دوست سے الجھنے پر ناراض تھا اور اس کا ثبوت آنے والے دنوں میں اس نے دے دیا تھا۔ اسے میرا اس طرح بھابی کی خاطر علی سے لڑنا پسند نہیں آیا تھا۔ میں نے اپنے طور پر اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ بھڑک اٹھا اور کہنے لگا۔ ''تمہیں ہر کوئی چور کیوں نظر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے علی کو بھڑکانے والی بھی بھابی ہوں۔ مرد کی غیر موجودگی عورت کو آوارہ بنا ہی دیتی ہے۔''

اس کے استہزائیہ انداز میں دیئے ہوئے کمنٹس پر مجھے بہت دکھ ہوا۔ وہ ایک غیر کے لیے اپنی سگی بھابی کو غلط لفظوں سے پکار رہا تھا۔ اس کے کردار پر کیچڑ اچھال رہا تھا۔

''مجھے شرم آتی ہے تمہیں اپنا دوست کہتے ہوئے۔ تم چار دن کی دوستی کے لیے اپنی بھابی کو غلط کہہ رہے ہو۔ ان کے کردار پر کیچڑ اچھال رہے ہو اگر زبیر بھائی یہاں ہوتے تو انہیں تمہارے رویے سے کس قدر دکھ پہنچتا۔'' میں نے اس کو احساس دلانا چاہا۔

''ان کو چھوڑو ابھی تو میں تمہیں ان کے غم میں دبلا ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ مجھ سے زیادہ تمہیں بھابی کی فکر ہو رہی ہے۔'' وہ مجھے شکی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اتنے سالوں کی پرانی دوستی یاری کو اس نے ایک طرف رکھ چھوڑا تھا۔ مجھے اس پر انتہائی غصہ آیا مگر میں اس کے شک کو اس کے دل میں گہرا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس طرح بھابی کی زندگی اور عذاب بن جاتی۔

''وہ میرے لیے بڑی بہنوں کی طرح ہیں۔ میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں کاش تم سمجھ سکتے۔'' میں افسوس کرتا مڑا اور گھر کے راستے پر ہولیا۔

میں نے بھابی کو فون پر تمام تفصیلات بتائیں اور یہی مشورہ دیا کہ اگر مانی اب علی کو لے کر گھر آئے تو ڈرنے اور ہراساں ہوئے بغیر تمام باتیں فون پر زبیر بھائی کو بتا دیں تا کہ وہ آنے والے دنوں میں آپ کو غلط تصور نہ کریں ورنہ جو آج اپنے دوست کی خاطر ان پر شک کر رہا ہے کل انہیں غلط ثابت بھی کر سکتا ہے کوئی بھی الٹا سیدھا الزام لگا کر۔''

اس دن کے واقعے کے بعد سے مانی خود بھی بھابی سے کھنچا کھنچا سا رہنے لگا تھا۔ اس کی نظروں کی بے اعتباری و شک نے انہیں پہلے ہی ہراساں کر رکھا تھا کہ کہیں فون پر زبیر کو کیا کچھ کہہ ڈالے۔ اب میرے مشورے نے انہیں اور ڈرا دیا۔

''زبیر مجھے ہی غلط سمجھیں گے۔ وہ کبھی بھی مانی کے حوالے سے کوئی بھی غلط بات برداشت نہیں کرتے۔ وہ کس طرح میرا اعتبار کریں گے۔'' بھابی کے آخری ہتھیار آنسو ہوا کرتے تھے۔ وہ رونے لگیں۔

مجھے دکھ ہوا کہ میں کسی بھی طرح ان کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ اب اللہ ہی مانی کو ہدایت دے دیتا تو نتاشا بھابی کی جیت تھی ورنہ جن عورتوں کے میکے انہیں سپورٹ نہ کرتے ہوں وہ بے چاریاں بڑی ان سیکیور لائف جیتی ہیں۔ میری کھوکھلی تسلیاں بھی ان کے لیے ناکافی تھیں۔

نتاشا بھابی کے معاملے کو لے کر جہاں میں فکرمند تھا کیونکہ وہ میری بہنوں کی طرح تھیں وہیں مانی کے سلسلے میں بھی پریشانی سر پر سوار تھی۔ وہ ناراض ہو گیا تھا اور اسے منانا دردِ سر ہوا کرتا تھا۔ پہلے تو میں اس کی ہر غلطی کو نظر انداز کر دیا کرتا تھا مگر یہ معاملہ نظر انداز کرنے والا نہ تھا۔ وہ ان ڈائریکٹ مجھ پر اور بھابی پر شک کر رہا تھا اور یہ روگ لگانے والا علی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اکثر و بیشتر وہ اس کے ہمراہ پھر نظر آنے لگا تھا۔ میں نے سوچا کچھ روز گزریں گے اس کا غصہ ٹھنڈا ہوگا تو پھر اسے منالوں گا ابھی اس کے ہی حال پر چھوڑ دیتا ہوں۔ اپنے طور پر میں نے ان کے معاملے سے اپنے آپ کو دور کر لینے کا سوچا تھا۔ کہیں بھلائی کے بجائے برائی گلے نہ پڑ جائے، نیکی برباد گناہ لازم ہو جائے۔ ویسے بھی میں اپنے باپ کا واحد سہارا تھا اور میں کوئی الٹی سیدھی کارروائی میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ کچھ ہفتے ہی گزارے تھے کہ ایک دن میں اسٹور پر پہنچا تو پتا چلا رات گئے مانی کے فلیٹ میں کارروائی ہو گئی تھی کچھ انجانے لوگوں نے جہاں گھر صاف کیا وہیں گھر میں موجود عورت بھی ان کے ظلم سے محفوظ نہ رہ سکی۔ ان کے فلیٹ پر پولیس آئی ہوئی تھی اور وہ معمول کی تفتیش میں مصروف ہے۔ اس رات مانی اپنے دوستوں کے ہمراہ کسی ریسٹورنٹ میں پارٹی منا رہا تھا۔ اس وجہ سے وہ گھر پر نہیں تھا۔ اس سے بھی سوال جواب ہو رہے تھے۔ سب سے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

بری حالت نتاشا بھابی کی تھی۔ جو چیخ چیخ کر مانی کو اس سب کا ذمے دار ٹھہرا رہی تھیں۔ ان کے والد خاموش تھے اور سوتیلی والدہ کے تیور بھی ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ وہ مسلسل نتاشا بھابی کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مانی اس سچویشن پر خوفزدہ لگ رہا تھا۔ اس نے فون کر کے زبیر بھائی کو تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا اور وہ فوری طور پر پاکستان آ رہے تھے۔ پولیس والے مانی کو اپنے ساتھ تھانے لے گئے انہیں اس کا بیان قلم بند کرنا تھا۔ دوسرے نتاشا بھابی کے اسے مورد الزام ٹھہرانے کی وجہ سے بھی انہیں اس پر شک تھا۔ زبیر بھائی کے پاکستان آنے کے بعد مانی کی ضمانت منظور ہوئی۔ انہیں نتاشا بھابی پر غصہ تھا جن کے الزام نے ان کے بھائی کو مجرم بنا ڈالا تھا۔ انہوں نے کھڑے کھڑے اپنی سسرال جا کر تین حرف بولے اور ان سے قطع تعلق کر لیا (یہ سب تفصیلات مجھے بعد میں مانی نے از خود بتائی تھیں) قصہ تمام ہوا کسی کی زندگی برباد ہوئی اور اسے برباد کرنے والوں میں مانی اور اس کے دوستوں کا ہاتھ تھا بقول بھابی کے مگر فی الحال زبیر بھائی اور ان کی بہن اسے ماننے کو تیار نہ تھے۔ زبیر بھائی کچھ عرصے پاکستان میں رہے پھر کوشش کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔ ان کے پیچھے مانی فلیٹ میں اکیلا رہ گیا۔ نتاشا بھابی والے قصے کے بعد میں خود بھی اس سے کھنچ سا گیا تھا۔ میرے کانوں میں نتاشا بھابی کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ منہ بھر بھر کر مانی کو کوس رہی تھیں اور اس کے دوستوں کو بھی۔

کئی بار مانی از خود بھی مجھ سے ملنے آیا مگر میرے سرسری رویے کو دیکھتے ہوئے پھر اس کا حوصلہ نہیں پڑا یا پھر آنے کا مقصد اپنی صفائی پیش کرنا تھی کہ وہ نتاشا بھابی کا مجرم نہیں تھا۔ کہتے ہیں انسان انصاف کرے نہ کرے مگر اوپر بیٹھا مالک جو سب کا پروردگار ہے جو سب دیکھتا اور سنتا ہے وہی اصل فیصلہ کرنے والا ہوتا ہے۔ نتاشا بھابی کا انصاف بھی فوری طور پر نہ ہوا مگر کچھ عرصے بعد جن دوستوں کی یاری دوستی میں مانی نے اپنا گھر برباد کروا ڈالا تھا انہی دوستوں نے معمولی اختلاف پر اسے گولیاں مار کر سنسان علاقے میں پھینک دیا۔ اس کی لاش بھی تین روز بعد نہایت خستہ اور بری حالت میں پولیس کو ملی تھی۔ اس کی لاش کے ملنے کے بعد ایک بار پھر پولیس کچھ عرصے سرگرم رہی۔ مانی کے تمام ہی دوستوں کو تھانے میں پوچھ گچھ کے واسطے بلایا گیا تھا۔ چونکہ نتاشا بھابی والے قصے کے بعد سے ہمارے تعلقات پہلے جیسے نہ رہے تھے اور اس سے میرا ملنا، جلنا بھی ختم ہو گیا تھا اس وجہ سے میرے علاوہ جو لوگ اس سے وابستہ تھے ان تمام ہی دوستوں کی پکڑ ہوئی تھی۔ انہی دوستوں نے مجھے بھی تمام باتیں بتائیں۔ علی کے ساتھ اس کے دو دوست نواز اور یوسف اسی کارروائی میں شریک تھے۔ پولیس نے تمام ہی دوستوں کو پکڑ کر کارروائی شروع کی تھی مگر ان کے تشدد نے اصل مجرموں کو پکڑوا دیا تھا۔ نتاشا بھابی والے واقعے میں مانی براہِ راست شریک نہ تھا۔ وہ اس رات اپنے دوستوں کے ساتھ نیو ایئر پارٹی میں مشغول تھا۔ اس کے پیچھے یہ کارروائی کرنے والے علی اور اس کے دو دوست تھے جن کی مدد سے اس رات گھر کی قیمتی چیزوں کے ساتھ انہوں نے ایک پاکباز عورت کی عزت کا بھی صفایا کیا تھا۔ بھابی مانی کو اس لیے مجرم سمجھ رہی تھیں کیونکہ انہیں گھر کا رستہ دکھانے والا وہی تھا۔ مانی کے فلیٹ کی چابی بھی علی نے اس رات ڈرنک کرتے ہوئے بڑی صفائی سے اس کی جیب سے نکال لی تھی اور اس چابی کی مدد سے وہ اور اس کے دوست فلیٹ میں آسانی سے داخل ہو گئے تھے۔ مانی کو ان باتوں کی خبر نہ تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ اسے اصل سچ پتا چل ہی گیا تھا۔ تبھی سے وہ علی اور اس کے دوستوں سے کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا۔ علی نے سوچا کہیں وہ اس کی اور اس کے دوستوں کی کارروائی کی خبر پولیس کو نہ کر دے۔ یہی ریزن اس کی موت کا سبب بنا تھا۔ ان لوگوں نے اسے بھی اپنے رستے سے ہٹا ڈالا تھا مگر کب تک؟ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ جب اٹھتی ہے تو گناہ گاروں کا صفایا کر دیتی ہے۔ اس بار وہ لوگ بھی پکڑ میں آ گئے تھے کیونکہ پیشہ ور قاتل نہ تھے اس لیے پولیس کی تفتیش اور شک سے گھبرا گئے۔ ان کی گھبراہٹ اور الٹے سیدھے بیان ان کے خلاف ایک مضبوط ثبوت تھے۔ بعد میں پولیس کے تھرڈ ڈگری تشدد نے انہیں سچ بولنے پر آمادہ کر ڈالا۔ آج سارے ہی مجرم اپنی جگہ سزا پا چکے ہیں۔ مانی مر چکا ہے اور اس کے دوست جیل میں اپنے جرم کی سزا کاٹ رہے ہیں۔

نتاشا بھابی کی طلاق کے بعد ان کے گھر والوں نے بڑی عمر کے کسی شخص سے ان کی شادی کر دی تھی اور خود کسی دوسری جگہ شفٹ ہو گئے تھے کیونکہ نتاشا بھابی کی طلاق اور ریپ کیس کی وجہ سے ان کی کافی بدنامی ہو چکی تھی۔ آج وہ کہاں ہے کوئی نہیں جانتا مگر جب بھی مجھے مانی یاد آتا ہے تو نتاشا بھابی کا خیال بھی ضرور آتا ہے اور میں یہی دعا کرتا ہوں کہ وہ جہاں رہیں خوش و آباد رہیں۔

++

UUNOVELS.COM

عشق

محترم مدیر
السلام علیکم!
سرگزشت میں یہ میری پہلی تحریر ہے لیکن یہ میری آپ بیتی نہیں ہے۔ یہ نورالٰہی، شاہ میر، مسز آصف اور عارف کی کہانی ہے بلکہ یوں کہوں کہ اتفاقات کا مجموعہ ہے۔ یہ واقعہ مجھے اتنا پسند آیا کہ میں نے اسے کہانی کی شکل دے دی۔ یاد رہے کہ کچھ واقعات سچ ہوتے ہوئے بھی ناقابل یقین لگتے ہیں۔ ایسے ہی واقعات پر فلم بنتی ہے۔ ناول لکھے جاتے ہیں کیونکہ انوکھے ہوتے ہیں۔ یہ سچ بیانی بھی ذرا الگ انداز کی ہے پھر میں نے اسے افسانوی رنگ میں ڈھالنے کے لیے چند کردار بھی شامل کردیے ہیں تاکہ قارئین دلچسپی لیں۔

علی عمران ممتاز
(ملتان)

شاہ میر کے انتقال کی خبر جنگل میں لگی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ گاؤں کے لوگ خبر سنتے ہی اپنے کام کاج چھوڑ کر دیوانہ وار اس کے گھر کی طرف چل پڑے تھے۔ اس کی اچانک وفات پر بھی حیرت زدہ تھے، کسی کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ایسا خوبرو، نیک دل نوجوان جس کا ایک گیارہ ماہ کا ننھا منا پیارا سا بیٹا بھی ہے، وہ سب کو اچانک روتا تڑپتا چھوڑ جائے گا۔

شاہ میر گاؤں کے لوگوں کی آنکھوں کا تارہ تھا۔ ذہانت اور ایمانداری اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، لوگوں کے مسائل حل کرانے میں مدد دیتا، یوں سمجھ لیجیے گاؤں میں شاہ میر جیسا کوئی اور نہ تھا، اس کے والد انتقال کر چکے تھے، وہ اپنے گھر کا اکلوتا سہارا تھا۔ چچا ملتان میں رہتے تھے۔

اس وقت حویلی میں عورتوں اور مردوں کا ہجوم تھا۔ شاہ میر کی بیوی مہرالنساء دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے سکتے کے عالم میں تھی، بالکل گم صم۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے، گود میں گیارہ ماہ کا ننھا شہروز شاہ تھا، آنگن میں بیٹھی عورتوں کا بین جاری تھا۔

شاہ میر کی میت کو کفن پہنانے کے بعد گھر کے صحن میں رکھا گیا تھا۔ مرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر ایسا سکون تھا کہ جو بھی دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا، شاہ میر کے مرنے کی وجہ یہ بتائی جارہی تھی کہ رات کو عشاء کی نماز کے بعد کھانا کھا کر وہ سو گیا تھا، فجر کے وقت اچانک سینے میں درد اٹھا، ایسے میں بھی وضو خانے تک گیا اور وضو کیا، درد کی شدت بڑھی تو بیوی کو آواز دی، آواز سن کر وہ دوڑی چلی آئی، آتے ہی اس نے شاہ میر کو سنبھالا۔ شاہ میر نے بلند آواز میں کلمہ پڑھنے کے بعد بلند آواز میں ذکر شروع کردیا۔ تسبیح اکبر کی آواز فضا میں گونجنے لگی مگر درد کم نہ ہوا۔ بالآخر شدید درد نے اس کی جان لے لی۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے سب ہی غمزدہ تھے اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ شاہ میر کو اس گاؤں کے لیے باعث برکت سمجھا جاتا تھا کیونکہ شاہ میر کی ولادت سے پہلے یہ گاؤں خشک سالی کا شکار تھا۔ کئی سال تک اس گاؤں میں بارش نہیں ہوئی تھی۔ یہ گاؤں جو کہ ضلع چکوال کے پہاڑی پر آباد تھا۔ ہر طرف پتھر اور پہاڑ تھے، پہاڑوں سے بہنے والے چشمے خشک ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ کنویں بھی خشک ہو گئے تھے۔ پانی کے لیے گاؤں والوں کو دور دراز کے علاقوں میں جانا پڑ رہا تھا۔

انہی دنوں ایک رات ایسی بھی آئی جب چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ یہ چودھویں رات کا چاند تھا اور اپنی بھرپور چاندنی بکھیر رہا تھا۔ تبھی اچانک آسمان پر گھٹا نمودار ہوئی اور کچھ ہی دیر بعد زوردار بارش شروع ہوگئی تھی۔ اسی بارش میں بھیگتا ہوا امیر محمد خوشیاں مناتا ہوا اپنے رشتے داروں، محلے داروں کو بتا رہا تھا کہ اللہ نے اسے چاند سا بیٹا عطا کیا ہے۔

UUNOVELS.COM

میر محمد کے گھر یہ خوشی بڑے دن بعد آئی تھی۔ ساتھ بارش لائی تھی۔ بارش کے بعد خشک سالی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ گاؤں ہرا بھرا ہو گیا تھا۔ کئی لوگ میر محمد کے بیٹے کو نصیبوں اور برکتوں والا کہنے لگے تھے۔ میر محمد نے اپنے بیٹے کا نام شاہ میر رکھا۔ دلشاد مائی میر محمد کی ہمسائی تھی وہ شاہ میر کو زیادہ تر اپنے گھر رکھتی تھی۔ دراصل دلشاد مائی کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی وہ بھی اولاد کو ترستی تھی اس لیے شاہ میر کو اپنا بیٹا سمجھتی تھی۔ انہی دنوں ایک اور بات ہوئی۔ دلشاد مائی جو ہر طرف سے مایوس ہو گئی تھی کہ شاہ میر کے قدم کی برکت سے اس کے پیر بھاری ہو گئے اور وہ ایک بیٹی کی ماں بن گئی جس کا نام اس نے مہر النساء رکھا تھا۔

شاہ میر کی ولادت کے بعد دلشاد مائی کیا گاؤں کی بھی قسمت بدل گئی تھی، گاؤں میں ترقیاتی کام شروع ہو چکے تھے۔ سڑکیں بن گئی تھیں یوں سمجھ لیجیے کہ شاہ میر کی پیدائش نے گاؤں کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ شاہ میر اور مہر النساء جوان ہو گئے۔ شاہ میر جوان ہوا تو اس کی شادی مہر النساء سے کر دی گئی۔

☆......☆

ظہر کی نماز کے بعد شاہ میر کی میت جنازہ گاہ لے جائی گئی، جنازہ گاہ لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ وہاں پاؤں رکھنے کی جگہ تک نہ تھی۔ گاؤں کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ تدفین کے بعد گاؤں کے لوگوں نے ایک عجیب بات دیکھی۔ شاہ میر کی قبر سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے ایک لڑکی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ جوان تھی اور حلیہ سے کسی اچھے گھر کی لگتی تھی۔ کئی لوگوں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ زبان پر تالے ڈالے رہی اور نظریں شاہ میر کی قبر پر مرکوز رکھیں۔

☆......☆

مہر النساء اب بالکل اکیلی تھی صرف شہروز ہی اس کے جینے کا سہارا تھا ویسے تو مہر النساء شاہ میر کے مرنے کے ساتھ ہی آدھی مر چکی تھی۔ زندہ تھی تو شہروز شاہ کے لیے۔ مہر النساء کی ماں دلشاد مائی اب اس کے ساتھ اس کے گھر رہنے لگی تھی۔

شاہ میر کی زمینوں کی دیکھ بھال کمال دین نے سنبھال لی تھی جو مہر النساء کا چچازاد تھا۔ ایک دن مہر النساء اپنی ماں کے ساتھ شاہ میر کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے گئی۔ قبر سے کچھ فاصلے پر اسے درخت کے نیچے ایک نوجوان لڑکی بیٹھی نظر آئی۔

مہر النساء کے قدم اس لڑکی کی طرف اٹھ گئے وہ اس کے پاس گئی وہ میلا کچیلا عروسی جوڑا پہنے ہوئے تھی پھر بھی وہ

URDUNOVELS.COM

خوب صورت لگ رہی تھی۔

اس کی آنکھیں موٹی اور چہرہ گول تھا۔ تن تنہا دنیا سے بے نیاز وہ لڑکی درخت سے ٹیک لگائے سر جھکائے کسی خیال میں گم تھی۔

مہرالنساء نے اس لڑکی کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”کون ہو تم؟ کس کی قبر پر آئی ہو؟ کہاں رہتی ہو؟ جہاں تک میرا خیال ہے تم ہمارے گاؤں کی نہیں ہو!“

مگر وہ لڑکی خاموش رہی، نہ کچھ بولی اور نہ ہی مہرالنساء کی طرف دیکھا۔

مہرالنساء نے سوچا شاید اس کا کوئی اپنا فوت ہو گیا ہے اس لیے اس کی موت پر غمزدہ ہے۔ مہرالنساء نے اسے کریدنے کی کوشش نہیں کی اور واپس گھر آ گئی جبکہ وہ لڑکی انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ اس کی موٹی آنکھوں سے آنسو گالوں سے ہوتے ہوئے اس کے کپڑوں میں جذب ہو رہے تھے۔

شاہ میر کے مرنے کے بعد مہرالنساء کا معمول ہو چکا تھا وہ ہر جمعرات اس کی قبر پر فاتحہ خوانی کرنے جاتی اور ہر دفعہ ہی اس کی نظر اسی لڑکی پر پڑتی جو دنیا سے بے نیاز اپنی ہی دنیا میں کھوئی رہتی۔ مہرالنساء اس سے بات کرتی مگر وہ اسے کوئی جواب نہ دیتی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کا اس قبرستان میں ڈیرا مستقل ہو گیا تھا۔ گاؤں والوں نے اس کا نام پگلی رکھ دیا تھا۔ جو بھی قبرستان آتا اسے خورد ونوش کے لیے کچھ نہ کچھ دے جاتا۔

پگلی ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو قبرستان سے غائب ہو جاتی تھی کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ کہاں جاتی ہے۔

شاہ میر کی وفات کو چھ سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ شاہ میر کا بیٹا شہروز شاہ سات سال کا ہونے والا تھا۔ وہ بہت ہی پیارا بچہ تھا بالکل اپنے باپ پر گیا تھا۔ وہ بہت شریر تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی شرارت کرتا رہتا مگر ایسی شرارت اس نے کبھی نہیں کی تھی جس کی وجہ سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو۔ اپنی نانی دلشاد مائی کا تو وہ چہیتا تھا اور زیادہ تر اپنی نانی کے ساتھ ہی وقت گزارتا تھا۔ گاؤں کے ہی ایک اسکول میں پہلی جماعت میں اسے بٹھایا گیا، ساتھ ساتھ دینی تعلیم کے لیے وہ شام کو مسجد میں جاتا تھا۔

”مہرالنساء جب بھی شاہ میر کی قبر پر جاتی، شہروز شاہ بھی اس کے ساتھ اپنے ابو کی قبر پر جاتا تھا۔ درخت کے نیچے بیٹھی پگلی یونہی دونوں ماں بیٹے کو تکتی رہتی۔ مہرالنساء اکثر اسے کچھ نہ کچھ دے جاتی۔ پگلی خاموش رہتی۔ شہروز کبھی کبھار اکیلا اپنے ابو کی قبر پر آتا تو پگلی کے پاس ضرور جاتا۔ پگلی اسے دیکھ کر مسکرا دیتی پر بولتی کچھ بھی نہیں بس اسے دیکھ کر مسکرائی رہتی، شہروز پگلی سے اکثر سوال کرتا کہ آپ کو سردی نہیں لگتی؟ آپ کو بھوک بھی لگتی ہے؟ اگر لگتی ہے تو روٹی کہاں سے لاتی ہیں؟“

پگلی اس کے سوالوں کو سن کر مسکرا دیتی پر منہ سے کچھ نہ بولتی۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ گونگی ہے۔

پگلی ہمہ وقت خاموش بیٹھی لب ہلاتی رہتی جیسے کچھ پڑھ رہی ہو یا کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ شہروز شاہ کے گھر کے ساتھ والے گھر میں گل بانو اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی۔ گل بانو اور شہروز دونوں ہی ہم عمر تھے دوستی بھی بہت تھی۔ وہ اکثر نزدیکی پہاڑیوں پر گھومنے چلے جاتے اور دور کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو آواز دیتے تو آواز پہاڑوں سے پلٹ کر واپس ان کو سنائی دیتی۔ آواز کے یوں پلٹ آنے پر وہ بہت خوش ہوتے تھے۔

شہروز اور گل بانو زیادہ وقت ایک دوسرے کے گھر گزارتے تھے جب شہروز اسکول چلا جاتا تو گل بانو مہرالنساء کو اپنی ننھی منی باتوں اور شرارتوں سے محظوظ کرتی رہتی تھی۔ شہروز اسکول سے گھر آتا تو وہ دونوں اکھٹے کھانا کھاتے اور پھر شام کو مسجد میں قرآن شریف پڑھنے چلے جاتے۔

گل بانو کے ابا فیروز دین کی گھر کے ساتھ چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی وہ صبح سے شام تک دکان پر ہی رہتے تھے۔ انہوں نے گل بانو کو دنیاوی تعلیم دلوانے کے بجائے دینی تعلیم دینے پر توجہ دی ہوئی تھی۔ وہ سمجھتے تھے گل بانو نے پڑھ کر کیا کرنا ہے۔ آخر ایک دن اپنے سسرال چلے جانا ہے وہاں اپنے میاں کی خدمت کرنی ہے، سسرال والوں کے ناز نخرے اٹھانے ہیں کون سا اس نے پڑھ لکھ کر تیر چلانا ہے۔

گل بانو کی اماں بھی ان پڑھ تھی مگر وہ چاہتی تھی کہ گل بانو پڑھنا، لکھنا تو سیکھ جائے اس لیے گل بانو کی اماں نے مہرالنساء کو کہہ دیا تھا کہ وہ اسے گھر میں پڑھا دیا کریں۔ مہرالنساء نے ہامی بھی بھر لی تھی اس لیے مسجد سے واپسی پر جب شہروز شاہ اسکول کا سبق یاد کرتا تب گل بانو بھی آ جاتی اور ساتھ پڑھتی۔

☆......☆

UUNOVELS.COM

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ شہروز شاہ نے آٹھویں جماعت پاس کر لی تھی۔ گل بانو اب کافی بڑی دکھائی دیتی تھی۔ دونوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا تھا۔

گل بانو اب ہر وقت اپنے سر کو دوپٹے سے لپیٹے رکھتی تھی۔ اماں نے اسے گھر داری کے طریقے بتانا شروع کر دیے تھے تاکہ کل سسرال میں جائے تو گھر داری تو آتی ہو۔

شہروز شاہ نے گاؤں کے ہی گورنمنٹ ہائی اسکول سے دسویں جماعت پاس کی اس کے بعد اس نے شہر جا کر مزید تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ شہر جانے سے پہلے وہ اپنے ابو شاہ میر کی قبر پر گیا، فاتحہ خوانی کے بعد وہ جب واپس جانے لگا تو اس کی نظریں پگلی پر گئیں۔ وہ واپس جانے کی بجائے پگلی کے پاس چلا گیا۔ پگلی ورد کر رہی تھی۔ درخت کے اردگرد اب کچی مٹی کے اینٹوں کی چار دیواری سے ایک کمرا بن چکا تھا۔ چھت پر لوہے کی چادر رکھی ہوئی تھی یہ سارا کام گاؤں والوں نے کیا تھا۔ اب تو قبرستان بھی پگلی کے آستانے کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ پگلی شہروز کو تکے جا رہی تھی پر منہ سے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ شہروز شاہ پگلی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اماں مجھے نہیں پتا کہ آپ کون ہیں؟ لیکن آج میں شہر جا رہا ہوں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے، دعا کرنا مجھے کامیابی ملے۔''

''تمہیں ضرور کامیابی ملے گی۔''

شہروز شاہ کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی جو اس کے عقب سے آئی تھی۔ شہروز شاہ نے مڑ کر دیکھا تو پیچھے گل بانو کھڑی تھی۔

''تو ...... تو ...... یہاں کیا کر رہی ہے؟'' شہروز شاہ نے گل بانو کو دیکھتے ہی حیرت سے پوچھا۔

''سارا گاؤں دیکھ لیا تمہیں تلاش کرتے کرتے اور ایک تم ہو کہ یہاں قبرستان آئے ہوئے ہو۔'' گل بانو خفگی سے بولی۔

''میں یہاں ابو کی قبر پر آیا تھا فاتحہ کے لیے تاکہ اس کے بعد شہر جانے کی تیاری کروں۔''

''مجھ سے نہیں ملنا تھا۔'' گل بانو تیز لہجے میں بولی۔

''تمہیں ملے بغیر میں جا سکتا ہوں۔'' شہروز شاہ اسے دیکھتے ہوئے پیار سے بولا۔ اس کی توجہ پگلی سے ہٹ چکی تھی۔

''وہ ...... وہ ...... تاں۔'' گل بانو کچھ کہتے کہتے اٹک گئی۔

''کیا وہ ...... وہ ...... لگا رکھی ہے؟'' شہروز شاہ نے کہا۔

''وہ یہ کہ۔'' وہ پھر رکی۔

''اب بول بھی دو۔'' شہروز شاہ نے تنگ ہو کر کہا۔

''وہ تاں ...... میرا دل نہیں کر رہا کہ تمہیں شہر جانے دوں ......؟''

''وہ کیوں؟'' شہروز شاہ نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے کیا پتا؟'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی، پگلی دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

''تو بھی نا پاگل ہے ...... ویسے بھی جب دو اچھے ساتھی ایک دوسرے سے دور ہوں تو ایسا ہوتا ہے۔'' شہروز شاہ نے اسے سمجھایا۔

دونوں قبرستان میں ہی کھڑے ایک دوسرے سے کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ شہروز شاہ نے اسے سمجھایا ''میری اماں کا خیال رکھنا۔ میں جلد ہی واپس آؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اور گل بانو قبرستان سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

پگلی انہیں ہنستے مسکراتے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

شہروز شاہ گاؤں سے ملتان چلا گیا تھا۔ وہاں وہ اپنے چچا ندیم شاہ اور سلیم شاہ کے ہاں ٹھہرا تھا جبکہ گل بانو روزانہ اس کے لیے بے چین رہتی تھی۔ آخر اس سے اس کا ایک اچھا ساتھی جو بچھڑ گیا تھا۔ گل بانو کی تو رات کی نیندیں اڑ چکی تھیں۔

وہ تو خود بھی حیران تھی کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے کیوں میں شہروز شاہ کے لیے اتنی بے چین اور بے قرار ہوں جب تک وہ میرے ساتھ تھا پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

ایک دن گل بانو کو پتا نہیں کیا سوجھی کہ وہ صبح سویرے گھر کے کام کاج کر کے شہروز کی امی مہر النساء سے مل کر سیدھا قبرستان چلی گئی۔

قبرستان میں پگلی معمول کے مطابق ذکر میں مصروف تھی۔ گل بانو سیدھا اس کے پاس جا بیٹھی۔ پگلی اسے دیکھے جا رہی تھی۔

گل بانو نے پگلی سے کہا۔ ''میں تجھے عرصہ سے دیکھ رہی ہوں، تو یہاں بیٹھی رہتی ہے لوگوں نے تیرا نام پگلی رکھ دیا ہے، تو کہیں آتی ہے نہ جاتی ہے۔ جہاں تک میرا خیال جاتا ہے تو بڑی پہنچی ہوئی ہستی ہے۔''

گل بانو خاموش ہو گئی کہ شاید پگلی کوئی جواب دے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

مگر وہ بدستور خاموش تھی آخر گل بانو دوبارہ پگلی سے مخاطب ہوئی۔ ''مجھے یقین ہے تو کوئی نیک ہستی ہے اسی لیے اپنا مسئلہ لے آئی ہوں۔'' پگلی پھر بھی خاموش رہی گل بانو نے دوبارہ کہا۔ ''مجھے پتا ہے اللہ والے لوگ کسی سے بات نہیں کرتے صرف سنتے ہیں اور دل ہی دل میں دعا کرتے ہیں چلو خیر کوئی بات نہیں پر میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے نہیں پتا کہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ شہروز شاہ کے لیے میں بہت بے چین ہوں، میری تو نیندیں اڑ چکی ہیں۔ پتا نہیں کیوں میرا دل شہروز کے بغیر نہیں لگ رہا، میں کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟'' یہ کہتے کہتے گل بانو کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے آنکھوں کی نمی کو چھپانے کے لیے آنکھیں موند لیں۔

''تمہیں پیار ہو گیا ہے۔'' گل بانو کی سماعت سے ایک خوبصورت نسوانی آواز ٹکرائی اس نے جلدی سے آنکھیں کھولیں، تو سامنے سوائے پگلی کے کوئی نہیں تھا۔

''کیا یہ تمہاری آواز تھی؟'' گل بانو نے پگلی کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا کیونکہ پگلی نے کبھی کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ آج پہلی دفعہ اس کی آواز سنی، گل بانو کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ حیرت سے پگلی کو دیکھے جا رہی تھی جبکہ پگلی اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان تھی تو صرف خاموشی تھی اس خاموشی کو پگلی نے ہی اپنی آواز سے توڑا، گل بانو سے بولی۔ ''ہاں...... تمہیں اس سے محبت ہو گئی ہے۔''

''یہ محبت کیا ہوتی ہے؟'' گل بانو نے سوال کیا۔

''کسی کو اپنا سمجھنا، اس کے لیے بے چین رہنا، اس کے لیے تڑپنا اگر وہ سامنے ہو تو سکون محسوس کرنا محبت ہی تو ہے۔ جس کے بغیر زندگی کے رنگ پھیکے محسوس ہوں تو اسے محبت ہی کہتے ہیں جو تمہیں ہو گئی ہے۔'' پگلی نے بہت پیار سے اور دھیمے لہجے میں گل بانو کو محبت کے بارے میں بتایا پھر بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ پگلی اسے اتنی اچھی باتیں بتا رہی ہے اس لیے اس نے پگلی کو پہنچی ہوئی ہستی مانا اور کہنے لگی پگلی مائی دعا کرنا میرا شہروز واپس جلدی آئے میرے لیے دن گزارنا مشکل ہو گیا ہے۔''

''بیٹا تو جا...... وہ جلد آئے گا بہت جلد۔'' پگلی نے جواب دیا اور وہ شہروز کے خیالوں میں جھومتی واپس گھر آئی جہاں اس کا ابا فیروز دین منتظر تھا۔

ابا نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ''کہاں چلی گئی تھی صبح سویرے؟''

''ابا وہ میں قبرستان گئی تھی پگلی مائی سے ملنے۔'' گل بانو نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' ابا نے سوال کیا۔

''گھر میں دل نہیں لگ رہا تھا سوچا پگلی مائی کے پاس جاؤں، آخر وہ پہنچی ہوئی ہستی ہے دم کر دے گی۔ میں گئی تو مجھے بہت سکون ملا...... بہت اچھی ہے۔ آج پہلی بار اس نے مجھ سے باتیں کی ہیں۔'' گل بانو نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

''مجھے تو پہلے ہی یقین تھا کہ یہ کوئی اللہ والی ہے۔'' ابا نے گل بانو کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

اماں گھر پر نہیں تھی، وہ ساتھ والے گھر گئی ہوئی تھی، شام کے وقت فیروز دین کو مہرالنساء نے پیغام بھجوایا کہ شہروز کی نانی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ کسی ڈاکٹر کو بلا لائے۔ فیروز دین فوراً سرکاری اسپتال چلا گیا جو گاؤں کے قریب موجود لاری اڈے کے قریب تھا۔ پندرہ منٹ بعد فیروز دین ڈاکٹر کو لے کر شہروز شاہ کے گھر آیا مگر گھر میں عجب منظر تھا۔ نانی انتقال کر گئی تھی۔ ڈاکٹر واپس چلا گیا۔ شہروز شاہ کو فون کر کے بلا لیا تھا۔ اگلے دن شہروز کی نانی کی تدفین کر دی گئی۔ گل بانو حیران تھی کہ پگلی نے کہا تھا، شہروز شاہ واپس آئے گا اور وہ آ گیا، وہ سوچ رہی تھی کہ پگلی کو یقیناً اللہ میاں نے بتا دیا ہوگا کہ شہروز شاہ کی نانی کا انتقال ہونے والا ہے اسی لیے تو اس نے یہ بات کی تھی۔ پگلی واقعی پہنچی ہوئی ہستی ہے۔ گل بانو کی اس سوچ نے پگلی کے لیے اس کے دل میں مزید احترام پیدا کر دیا تھا۔

شہروز شاہ کو گاؤں آئے آج چھٹا دن تھا وہ واپسی کی تیاری کر رہا تھا، کل صبح اس نے ملتان روانہ ہو جانا تھا۔ ان چھ دنوں میں شہروز گل بانو سے کئی بار مل چکا تھا۔ وہ جانے سے پہلے پگلی کو ملنا چاہتا تھا کیونکہ اسے بھی پگلی سے خاص انسیت ہو گئی تھی۔ پگلی سے ملنے کے بعد اس کا پروگرام تھا کہ وہ کلر کہار جھیل سے آگے بابا جی کے دربار پر بھی حاضری دے گا۔ اس نے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا اس کے لیے اس نے سب سے پہلے گل بانو کو ملنا تھا۔ دونوں نے پگلی کے پاس جانا تھا۔ شہروز نے اپنی موٹر سائیکل گھر سے نکالی اور چاچا فیروز دین کے پاس گیا جو اس وقت اپنی دکان پر تھا شہروز شاہ نے موٹر سائیکل دکان کے سامنے روکی۔

''السلام علیکم!'' چاچا فیروز دین جو کہ اخبار پڑھ رہا

URDUNOVELS.COM

تھا اس نے چونک کر سلام کرنے والے کی طرف دیکھا اور فوراً اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔

''وعلیکم السلام پتر، کیسے آنا ہوا؟''

''چاچا...... وہ میں قبرستان جا رہا تھا تو سوچا گل بانو کو بھی ساتھ لے جاؤں۔'' اس نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔

''لے جاؤ پتر...... پر۔'' چاچا فیروز دین کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا چاچا......؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''پتر...... زمانہ بہت خراب ہو گیا ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، گاؤں والے باتیں بناتے ہیں کہ جب دیکھو گل بانو اور شہروز اکٹھے ہوتے ہیں، مجھے پتا ہے تم دونوں بچپن سے اکٹھے کھیلتے آئے ہو مجھے اعتراض نہیں ہے، پر زمانے کا بھی تو سوچنا ہے ناں۔'' چاچا فیروز دین نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ دی۔

''اونہہ...... یہ بات ہے۔'' شہروز شاہ نے اپنے آپ سے کہا اور پھر چاچا فیروز سے مخاطب ہوا۔ ''کوئی بات نہیں چاچا دنیا تو باتیں کرتی ہے پر میرا کوئی اور اچھا ساتھی بھی تو نہیں ہے ناں۔''

''جیسے تمہاری مرضی پتر۔'' چاچا فیروز دین بولے۔

''چاچا گل بانو کو بلا دوناں۔'' شہروز شاہ نے اصرار کیا۔

''اچھا تو بیٹھ پتر میں ابھی بلاتا ہوں۔'' فیروز دین بولا اور دکان سے نکل کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ شہروز شاہ دکان میں موجود ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

☆......☆

اماں چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ سر دوپٹے سے باندھا ہوا تھا جبکہ گل بانو کمرے میں بیٹھی اپنے ہیرو کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

''گل بانو...... ری...... گل بانو...... آ کر ذرا میرا سر تو دبا، درد سے پھٹا جا رہا ہے۔''

اماں نے گل بانو کو آواز دی، اماں کی آواز نے گل بانو کے خیالوں کے تسلسل کو توڑ دیا۔ اس نے خیالوں سے نکل کر اماں سے کہا ''اچھا اماں ابھی آئی۔''

وہ چارپائی پر بیٹھی اماں کا سر دبا رہی تھی۔ سر دباتے دباتے اسے کچھ خیال سوجھا اماں سے کہنے لگی۔ ''اماں میں ابھی آئی'' اور چارپائی سے اٹھ کر باہر کے دروازے کی طرف بڑھی۔

''اوہ کہاں جا رہی ہے گل بانو۔'' اماں نے آواز دی۔

''اماں وہ...... پگلی کے پاس جا رہی ہوں، تیرے سر میں درد ہے ناں اس لیے، پگلی بہت کرامتوں والی ہے۔'' گل بانو نے اماں کو جواب دیا اور باہر والا دروازہ کھولا تو سامنے ابا کو پایا۔ ابا کو دیکھتے ہی کہنے لگی۔ ''ابا خیر تو ہے اس وقت۔''

''ہاں خیر ہے پر پتر تو کہاں جا رہی ہے؟'' ابا نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

''ابا قبرستان جا رہی ہوں، اماں کے سر میں شدید درد ہے، سوچا پگلی سے دعا کروا آؤں۔'' اس نے جواب دیا۔

''پتر دکان پر شہروز شاہ آیا ہے، وہ بھی قبرستان جا رہا ہے اس کے ساتھ چلی جا۔'' ابا بولے اور دوبارہ گھر سے باہر چلے گئے۔ گل بانو بھی ابا کے پیچھے ہو لی۔

شہروز شاہ خیالوں میں گم تھا کہ فیروز دین دکان میں داخل ہوا۔ ''پتر گل بانو آ گئی ہے۔''

وہ فیروز دین کی آواز سن کر چونک پڑا اور کہنے لگا۔ ''شکریہ چاچا...... ہم تھوڑی دیر تک آ جائیں گے۔'' یہ کہہ کر شہروز دکان سے نکل کر موٹر سائیکل پر بیٹھا اور اسٹارٹ کی۔ گل بانو موٹر سائیکل پر بیٹھ چکی تھی، چند لمحوں بعد موٹر سائیکل فراٹے بھرتی ہوئی قبرستان کی جانب جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

شہروز شاہ نے موٹر سائیکل قبرستان کے باہر کھڑی کی اور گل بانو کے ساتھ داخل ہوا۔ داخل ہوتے ہی دونوں کو ایک دھچکا لگا۔ درخت کے نیچے پگلی مائی موجود نہیں تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور پھر درخت کی جانب بڑھے، ادھر اُدھر دیکھا مگر پگلی کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ اچانک گل بانو کو خیال آیا کہ ''آج تو چاند کی پانچ تاریخ ہے پگلی کیسے یہاں مل سکتی ہے؟ اس نے شہروز شاہ کو بتایا، شہروز شاہ کو بھی یاد آ گیا۔ شہروز شاہ نے گل بانو سے کہا کوئی بات نہیں ہم پھر آ جائیں گے۔ چلو سخی بابا کے دربار پر چلتے ہیں، اس بہانے کلر کہار جھیل کی سیر بھی کر آئیں گے۔

دوپہر کا 1 بج چکا تھا کلر کہار، جھیل خوبصورت مناظر پیش کر رہی تھی۔ ایک کشتی والا کشتی میں بیٹھے سیاحوں کو جھیل کے خوبصورت مناظر دکھا رہا تھا اور ساتھ ساتھ

UUNOVELS.COM

معلومات بھی فراہم کررہا تھا۔

بہار کے موسم میں جھیل کا منظر بڑا ہی دلفریب معلوم ہورہا تھا، جھیل کے ساتھ کچھ فاصلہ پر بابا جی کا دربار تھا۔ دربار کے دروازے پر بیٹھا ایک ملنگ صوفیانہ کلام خوبصورت انداز میں پیش کررہا تھا۔ لوگ اس کے اردگرد کھڑے اس کا صوفیانہ کلام سن کر مست ہو رہے تھے۔ سریلی آواز لوگوں کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

”میڈا عشق وی توں میڈا یار وی توں، میڈا دین وی توں ایمان وی توں...“

بابا جی کے دربار کے لنگر خانے میں صبح شام لنگر چلتا رہتا تھا۔ ساتھ ہی ایک بڑا سا ڈبا بھی رکھا تھا، یہاں آنے والے زائرین اس ڈبے میں حسب توفیق اپنی طرف سے لنگر کے لیے چندہ بھی ڈالتے تھے۔

شہروز اور گل بانو دربار کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوئے، ان کے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کے ہار بھی تھے جو انہوں نے بابا جی کی قبر پر چڑھائے اور فاتحہ خوانی کے بعد لنگر خانے کی طرف چل پڑے۔ چندہ بکس میں انہوں نے چندہ ڈالا اور کچھ دیر ستانے کے لیے مزار کے احاطے میں موجود مسجد کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ گل بانو کو پیاس محسوس ہوئی، اس نے شہروز سے کہا کہ وہ پانی پی کر آرہی ہے تم یہیں بیٹھے رہنا، یہ کہہ کر وہ پانی والی ٹینکی کی طرف بڑھی۔

ٹینکی کے پاس پہنچ کر اس نے گلاس میں پانی ڈالا اور پینے لگی۔ پانی پینے کے دوران گل بانو کی نظر لنگر خانے کی طرف گئی اس نے وہاں پگلی مائی کو بیٹھے دیکھا تو حیران ہوئی۔ پگلی مائی لنگر کھا رہی تھی۔ گل بانو واپس شہروز شاہ کے پاس گئی اور اسے بتایا۔ شہروز کو بھی حیرت ہوئی اور جلدی سے بولا ”چلو لنگر خانے جاتے ہیں اور پگلی مائی سے ملتے ہیں۔“

یہ کہہ کر شہروز شاہ اٹھا اور گل بانو کے ساتھ لنگر خانے کی طرف چل دیا۔ لنگر خانے میں داخل ہو کر انہوں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر پگلی مائی کہیں بھی نظر نہ آئی۔ گل بانو کو حیرانگی ہوئی، شہروز شاہ سے بولی۔ ”یہ کیا ابھی تو پگلی مائی یہاں تھی۔“

”شاید تمہارا وہم ہو، وہ یہاں کیسے آسکتی ہے؟“ شہروز اس کی بات ٹوکتے ہوئے بولا۔

”ہاں ایسا بھی ہوسکتا ہے......!“ گل بانو نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کچھ دیر وہاں رہے اور پھر گھر واپسی کے لیے دربار سے باہر آگئے۔ دربار پہاڑ کی چوٹی پر تھا اور اس کے اردگرد کچھ جگہوں پر مور اپنے پر پھیلائے بیٹھے رہتے تھے۔ وہ ان موروں کو دیکھتے ہوئے گھر کی طرف چل دیئے۔

☆......☆

شہروز شاہ اگلے دن ملتان چلا گیا۔ ملتان آنے کے بعد بھی اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا کچھ کھو گیا ہے۔ رہ رہ کر گل بانو کا چہرہ نظروں میں آجاتا۔

”میں گل بانو کے لیے پریشان کیوں ہوں؟ میرے دل میں عجیب سی تڑپ کیوں ہے۔“ شہروز شاہ نے یہ بات اپنے دل سے کہی، تو دل نے جواب دیا:

تجھے گل بانو سے محبت ہوگئی ہے۔ محبت لفظ ذہن میں آتے ہی اسے خوشی کا احساس ہوا اور اس کا دل مسرور ہوگیا۔

اپنی تڑپ پر قابو پاتے ہوئے اس نے سوچا یہ وقتی دوری ہے امتحان دے کر واپس گاؤں ہی جانا ہے پھر وہاں جی بھر کر گل بانو سے باتیں کروں گا۔

شہر میں اس کے چچازاد ندیم شاہ نے اسے علیحدہ سے کمرا دیا ہوا تھا، وہ بی ایس سی کی تیاری کررہا تھا اس لیے زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتا، تیاری کرتا رہتا شام میں گھر کے قریب موجود پارک میں کچھ دیر ستانے کے لیے چلا جاتا۔ ندیم شاہ کا بیٹا خاور چوتھی جماعت کا طالب علم تھا وہ شہروز سے شام کو ٹیوشن پڑھتا تھا۔

یونیورسٹی میں شہروز کے بہت سے دوست بن گئے تھے مگر کامران سب سے عزیز تھا۔

وہ ایک متوسط خاندان کا اکلوتا چراغ تھا اس کے والد گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتے تھے۔ کامران اپنے والدین کے ساتھ خوشحالی کی زندگی بسر کررہا تھا۔ کامران خوبصورت شکل وشباہت اور اچھے اخلاق وکردار کا مالک تھا۔ کامران اور شہروز کی دوستی یونیورسٹی میں مثالی سمجھی جانے لگی تھی۔ ایک روز شہروز اور کامران ایک تفریحی پارک میں بیٹھے اپنے دل کی بات شیئر کررہے تھے۔

”تم جانتے ہو اگر کوئی کسی کے لیے تڑپے تو اس کا کیا مطلب ہوا؟“

”اس کا مطلب ہے کسی سے محبت ہوجانا۔“

”کسی کے لیے تڑپنا، اس کے لیے دعائیں مانگنا، اس کے بغیر ہر چیز بے رنگ بدمزہ لگنا، محبت کہلاتا ہے کیا؟“

UUNOVELS.COM

"پر جناب کو کس سے محبت ہوگئی ہے۔" کامران نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"گاؤں میں رہتی ہے، چاچا فیروز دین کی بیٹی ہے۔"

"اس سے شادی کے ارادے بھی ہوں گے۔"

"مجھے تو ابھی احساس ہوا ہے۔محبت کا، تو ظاہری بات ہے شادی بھی اسی سے کروں گا۔"

کافی دیر دونوں دوست محبت پر گفتگو کرتے رہے۔

☆......☆

صبح یونیورسٹی پہنچ کر شہروز اور کامران نے پہلا پریڈ اٹینڈ کیا۔ پہلے ہی پریڈ میں کامران نے محسوس کیا کہ شہروز پڑھائی پر توجہ کم دے رہا ہے۔ پریڈ ختم ہوتے ہی وہ کینٹین چلا گیا۔ کامران بھی اس کے پیچھے پیچھے کینٹین پہنچا۔ شہروز ہال میں دائیں جانب کونے والی میز پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

"دوسرا پریڈ کیوں چھوڑ دیا؟" کامران نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بس یار بتایا تو تھا دل نہیں لگ رہا آج کل۔" شہروز نے بے دلی سے جواب دیا۔

"یار...... اس طرح تو تم اپنی تعلیم کبھی مکمل نہیں کر سکتے، اس کی یادوں میں کھوئے رہے تو بری طرح فیل ہو جاؤ گے۔" کامران نے اسے سمجھایا۔

"ہاں یار...... تم نے صحیح کہا مگر اس دل کا کیا کروں جو بے چین ہے۔" شہروز نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے دل کی مجبوری بتائی۔

"یہ دل بڑا ہی بے صبرا ہے، جس کے بغیر جی نہ سکے، اسی کے لیے تڑپتا ہے۔" کامران نے شہروز کی تائید کی۔

☆......☆

"مما...... میں نے کہہ دیا کہ میں شادی ابھی نہیں کروں گی۔" عالیہ نے غصے سے کہا اور کچن سے اپنے کمرے کی طرف نکل گئی۔

"تم جتنی مرضی ضد کرلو، تمہاری شادی اسی سال ہو گی، رہی بات تعلیم کی تو میں تمہیں یونیورسٹی میں داخلے کی اجازت نہیں دوں گی۔" مما نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا جبکہ وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

عالیہ 20 سالہ خوبصورت نین نقش والی ضدی لڑکی تھی، اپنی ہر بات منوانا اسے آتا تھا، لمبا قد اور پھر لمبے بال اس کی شخصیت میں نکھار پیدا کیے ہوئے تھے۔ وہ یونیورسٹی سے Bsc کرنا چاہ رہی تھی جبکہ اس کی مما مسز آصف اسے مزید تعلیم نہیں دلوانا چاہتی تھیں۔ وہ جلد سے جلد اس کی شادی کر دینا چاہتی تھیں، گھر میں اکثر ماں بیٹی میں شادی کے موضوع پر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ آصف امریکا میں جاب کرتے تھے اور سال میں 15 دن کے لیے پاکستان آتے تھے۔ اس سال انہوں نے 20 فروری کو پاکستان پہنچ جانا تھا۔ مسز آصف چاہتی تھیں کہ آصف جیسے ہی آئیں، عالیہ کی شادی کر دی جائے مگر عالیہ تو اپنی شادی کی بات سنتے ہی بھڑک جاتی، اسے غصہ آجاتا کہ مما کو اتنی جلدی کیوں پڑ گئی ہے۔

عالیہ کمرے میں پہنچ کر بیڈ پر دراز ہوگئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آخر ایسا کیا ہے کہ مما کو میری شادی کی جلدی ہے۔

☆......☆

میدان میں وہ اکیلا کھڑا تھا۔ اس میدان کے چاروں اطراف دور دور تک صرف پہاڑ ہی پہاڑ تھے، وہ آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھیں آسمان پر منڈلاتے بادل کے ایک ٹکڑے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ حیران تھا اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اس جگہ پر کیسے پہنچا؟ اچانک اس کے منہ سے حمد و ثنا کے کلمات جاری ہوگئے۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور جب آنکھیں کھولیں تو خود کو اپنے بستر پر پایا۔

"میں تو اپنے گھر پر ہوں تو کیا میں خواب دیکھ رہا تھا؟" وہ بڑبڑایا، پسینے سے اس کا جسم بھیگ چکا تھا جبکہ موسم گرمی کا تو تھا ہی نہیں، ابھی جنوری کا مہینا چل رہا تھا اور سردی بھی خوب تھی۔

"میں خواب میں کس جگہ تھا؟" وہ ایک بار پھر خود سے ہم کلام ہوا۔

اسے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ وہ اپنے بستر سے اترا اور کمرے کے کونے میں پڑے میز کی طرف بڑھا جہاں جگ میں پانی رکھا تھا، اس نے گلاس اٹھایا اور جگ سے پانی بھر کر منہ سے لگالیا۔

"عارف تجھے کیا ہوگیا ہے، کیا عجیب عجیب خواب دیکھتا ہے تو۔" وہ پانی پی کر خود سے ہم کلام ہوا۔ وہ کافی دیر میز کے پاس کھڑا سوچتا رہا اور بالآخر اپنے بستر پر دوبارہ آکر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اس نے آنکھیں موند لیں۔

عارف ایک کرائے کے مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ وہ

UUNOVELS.COM

صبح سویرے اٹھتا اور ناشتہ کر کے ایک پرائیویٹ اسکول میں بچوں کو پڑھانے چلا جاتا۔ چھٹی کے بعد ظہر کی نماز ادا کر کے گھر آتا تھا۔ قد آور تھا، سادہ لباس پہنتا، کم گو تھا کسی سے فالتو باتیں نہ کرتا، بس کام سے کام رکھتا۔ پانچ وقت کا نمازی تھا۔ وہ کچھ دنوں سے مسلسل ایک ہی خواب دیکھ رہا تھا۔ ہر خواب میں ایسا ہی میدان اسے نظر آتا، اس قسم کا خواب اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ 40 سال کا ہو چکا تھا مگر ابھی شادی نہیں کی تھی اور نہ ہی شادی کا ارادہ رکھتا تھا۔

عارف کو بھی کسی نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اہل علاقہ اسے نیک اور پرہیزگار سمجھتے تھے۔ کالونی میں اسے سب ماسٹر عارف کے نام سے جانتے تھے مگر مسز آصف اس سے بخوبی واقف تھیں پھر ان کی بیٹی عالمہ نے بھی میٹرک تک ان سے ٹیوشن لی تھی۔

☆—☆

پگلی مائی کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے جیسے وہ کچھ پڑھ رہی ہو۔ وہ کیا پڑھ رہی تھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ پگلی مائی کے سامنے گاؤں کی کچھ عورتیں بیٹھی تھیں۔ ہر عورت باری باری اسے اپنے مسائل بتا رہی تھی، پگلی مائی بس سن رہی تھی مگر کسی کو جواب نہیں دیتی تھی، صرف ہونٹ ہلا دیتی۔ جیسے ہی اس کے ہونٹ ہلنا بند ہوتے دوسری عورت اپنا مسئلہ بیان کر دیتی۔

آج بھی اس کے پاس عورتوں کا رش تھا۔ اس کے ہونٹ ہلانے کی دیر ہوتی حاجت مند سمجھ جاتا کہ پگلی مائی نے دعا دے دی ہے۔ ایک عورت نے آگے بڑھ کر پگلی مائی سے کہا۔ ''مائی تو بڑی کراموں والی ہے، تجھ سے دعا کروا کر گئی تھی کہ میری پریشانی ختم ہو گئی۔''

''یہ.....میرا.....نہیں.....اللہ پاک کا کرم ہے۔''

غیر متوقع طور پر پگلی مائی آج بول پڑی تھی، سبھی عورتیں دنگ رہ گئیں کیونکہ وہ کبھی کسی سے ہم کلام ہوئی ہی نہیں تھی بلکہ پگلی مائی کو اپنا ہوش تو تھا ہی نہیں، پہلی بار گاؤں کی عورتوں نے پگلی مائی کی آواز سنی تھی۔

''مائی کرم اللہ پاک کا ہی ہے وسیلہ تو تم بنی ہو۔'' ایک اور عورت نے پگلی مائی کی بات کا جواب دیا۔ اب کی بار پگلی مائی کچھ نہ بولی بس ہونٹ ہلانا شروع کر دیئے۔ عورتیں اپنے مسائل بتا رہی تھیں کہ قبرستان کے گیٹ سے مہرالنساء بیگم داخل ہوئیں، وہ سیدھا شاہ میر کی قبر پر گئی، پھولوں کی پتیاں قبر پر گرا کر فاتحہ پڑھنے لگی۔ پگلی مائی کی نظر اس پر پڑی تو وہ اسے دیکھنے لگی۔ مہرالنساء نے فاتحہ پڑھ کر دعا مانگی اور پگلی مائی کی طرف بڑھی۔ پگلی مائی بھی اسے اپنی طرف آتا دیکھ رہی تھی۔ مہرالنساء بیگم اس کے پاس آئی۔ اپنے پرس سے 500 روپے نکال کر پگلی مائی کے سامنے رکھ کر واپس مڑی۔

''مجھے نہیں چاہئے آپ یہ لے جائیں۔'' مہرالنساء بیگم کے کانوں سے آواز ٹکرائی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ آواز پگلی مائی کی تھی جو ایک بار پھر بول پڑی تھی، مہرالنساء بیگم نے اس کی آواز پہلی بار سنی تھی اس لیے چونک گئی۔

''کیوں نہیں چاہیے؟'' مہرالنساء بیگم نے پوچھا۔

''مجھے جو چاہیے تھا وہ مل گیا۔'' پگلی مائی بولی۔

''کیا چاہیے تھا؟'' مہرالنساء بیگم نے اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''سکون۔'' پگلی مائی کے منہ سے مختصر جواب نکلا۔ چند لمحے وہاں خاموشی چھائی رہی پھر وہ خود ہی بولی۔ ''اس قبرستان میں سکون ہے جو مجھے مل چکا ہے مجھے نہ دولت چاہئے نہ کچھ اور۔''

''اللہ والوں کو ہی سکون ملتا ہے، تم خوش نصیب ہو کہ اللہ نے تمہیں سکون دیا۔'' مہرالنساء بیگم نے جواب دیا۔

☆—☆

عالمہ اپنے کمرے میں بیٹھی صدارتی ایوارڈ یافتہ کتاب ''نورِ عالم'' کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اس کتاب کی شہرت سن کر ہی عالمہ نے یہ کتاب خریدی تھی اور اب اس کا مطالعہ کر رہی تھی۔ کتب بینی اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

''عالمہ جلدی سے ڈرائنگ روم میں آؤ دیکھو کون آیا ہے؟'' مسز آصف کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''آ رہی ہوں پتا نہیں کون آیا ہے؟'' جواب دے کر عالمہ خود سے بولتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف گئی۔

ڈرائنگ روم میں صوفے پر اپنے ابو کو بیٹھا دیکھ کر وہ حیران رہ گئی اور یہ کہتے ہوئے خوشی سے ان سے لپٹ گئی۔

''ابو جان.....آپ کب آئے؟.....یہ تو سرپرائز ہے۔''

''میری لاڈو ابھی تو آیا ہوں۔'' آصف صاحب نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ابو! آپ نے خبر نہ دی ہم خود ائرپورٹ لینے آتے۔'' وہ لاڈ کرتے ہوئے بولی۔

''ہم نے سوچا اس بار ہم اپنی لاڈو کو سرپرائز دیں گے، اس لیے نہیں بتایا۔'' آصف نے مسکراتے ہوئے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

جواب دیا۔

☆......☆

ماسٹر عارف کمرے میں صوفے پر ٹیک لگائے گہری سوچ میں گم تھے، ان کے موبائل پر مسلسل بیل بج رہی تھی مگر انہیں پتا ہی نہ تھا۔ اچانک ماسٹر عارف کا دھیان ٹوٹا اور وہ چونک پڑے۔ انہوں نے جھک کر جیسے ہی موبائل اٹھایا، بیل بند ہوگئی کال کرنے والے کا نام اسکرین پر ابھرا ہوا تھا۔ ”عالیہ آصف۔“

”اس وقت عالیہ آصف کی کال، اللہ خیر کرے۔“ ماسٹر عارف کال بیک کرتے ہوئے خود سے ہمکلام ہوئے۔

”السلام علیکم سر۔“ چند لمحوں بعد دوسری طرف سے کال اٹینڈ ہوتے ہی عالیہ کی آواز آئی۔

”وعلیکم السلام۔۔۔ جی کیسے یاد کیا، آپ کی کال آرہی تھی؟“ ماسٹر عارف نے پوچھا۔

”جی سر وہ آپ کو بتانا تھا کہ ابو جی آئے ہوئے ہیں کل شام کا کھانا آپ نے ہمارے گھر کھانا ہے۔“ دوسری طرف سے عالیہ نے بتایا۔

”ٹھیک ہے کل ملتے ہیں۔“ انہوں نے مختصر جواب دیا۔

”سر بہت شکریہ!“ عالیہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

☆......☆

چاند کی چودہ تاریخ تھی، چاند کی روشنی رات کے اندھیرے کو اپنے ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ قبرستان میں قائم حجرے میں لیکی مائی اکیلی بیٹھی تھی، اس کے لب ہل رہے تھے۔ وہ کچھ پڑھ رہی تھی۔ ماحول میں مکمل سناٹا تھا۔ رہ رہ کر دور کہیں سے کتے کے بھونکنے کی آواز آجاتی۔ حجرے میں لالٹین کی روشنی پھیلی تھی۔ زرد روشنی میں مائی بیٹھی تھی کہ باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی، کوئی حجرے کی طرف بڑھ رہا تھا، چند لمحوں بعد حجرے میں گل بانو داخل ہوئی، وہ قدموں کی آواز اسی کی تھی۔ گل بانو مائی کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

”اس وقت کیا کرنے آئی ہو بانو۔“ لیکی مائی نے اس سے پوچھا۔

”بس ویسے ہی آئی ہوں، دل بے چین تھا سوچا تم سے مل آؤں۔“ گل بانو نے جواب دیا۔

”گھر چلی جاؤ، یہ وقت نہیں ہے تمہارے آنے کا، قبرستان کوئی اچھی جگہ نہیں۔ انسان نما شیطان بھی یہاں آتے ہیں۔“ لیکی مائی بولی۔

”میرا دل بے چین ہے، شہروز کے لیے۔“ وہ بولی۔

”اللہ تعالیٰ بندے سے کہتا ہے تو میرا ہو جا اور صرف مجھ سے محبت کر جبکہ بندہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ فلاں انسان سے مجھے محبت ہے، اسے میرا بنا دے، میں اس کے بغیر جی نہیں سکتا، مجھے اس کی محبت عطا کردے۔ جس نے ہمیں بنایا ہے ہم اس کے نہیں بن سکتے تو وہ کسی کو ہمارا کیسے بنا سکتا ہے، جو رب ستر ماؤں سے بڑھ کر ہم سے محبت کرتا ہے ہم اس رب کے نہیں بنتے۔ جو رب کا ہوگیا، سب اس کا ہوگیا۔ جاؤ۔۔۔ جاکر اپنے رب کو یاد کرو، اس سے محبت کرو، وہ تمہیں سب دے گا۔“ لیکی مائی دھیمے دھیمے بولتی گئی، گل بانو اس کی باتیں غور سے سنتی رہی، جب لیکی مائی خاموش ہوئی تو گل بانو اس کے حجرے سے نکل کر گھر کی طرف چل دی۔ راستے میں ہی اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے موبائل کی اسکرین پر دیکھا، شہروز کی کال تھی، اس کا نام دیکھ کر وہ خوش ہوگئی، فوراً کال ریسیو کی اور اس سے باتیں کرتی ہوئی گھر کی طرف چل دی۔

☆......☆

مسز آصف کے گھر کھانے کی میز پر ماسٹر عارف، عالیہ اور عارف صاحب کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ سب اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ جہاں چند لمحوں بعد چائے آگئی، ساتھ حالات حاضرہ پر گفتگو بھی ہونے لگی۔

”میں تو انہی پندرہ دنوں میں عالیہ کی شادی کردوں گی۔“ مسز آصف نے ماسٹر عارف کو بتایا۔

”کوئی رشتہ دیکھ رکھا ہے؟“ آصف صاحب نے پوچھا۔

”ہاں رشتہ دیکھ رکھا ہے تبھی تو کہہ رہی ہوں۔“ مسز آصف نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔“ عالیہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”مگر کیوں بیٹا۔“ آصف صاحب نے پوچھا۔

”میں اپنی تعلیم مکمل کرلوں پھر شادی کا سوچوں گی۔“ عالیہ نے جواب دیا۔

”نہیں بیٹا اب تعلیم چھوڑو، صرف اپنا گھر آباد کرو۔“

URDUNOVELS.COM

مسز آصف غصیلے لہجے میں بولیں۔

''آپ اسے تعلیم مکمل کرنے دیں۔'' ماسٹر عارف نے سفارش کی۔

''نہیں بھائی جان اتنی تعلیم بہت ہے۔'' مسز آصف نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''بچی ہے پڑھنے دو اسے۔'' آصف صاحب نے عالمہ کی حمایت کی۔

''جی آپا آپ اسے پڑھنے دیں، یہ اپنی تعلیم مکمل کرلے پھر شادی کر دیں گے۔'' ماسٹر عارف عالمہ کی حمایت میں بولے۔

''بھائی جان آپ جانتے ہیں ناں کہ میں ایسا کیوں کہہ رہی ہوں پھر بھی آپ حمایت کر رہے ہیں۔'' مسز آصف ماسٹر عارف کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ماسٹر عارف کو ایک دم جھٹکا لگا جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

''آخر ایسا کیا ہے جو مجھ سے چھپایا جا رہا ہے۔'' عالمہ نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں بیٹا ایسی کوئی بات نہیں۔'' آصف صاحب نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''پاپا کچھ تو ایسا ہے کہ مما میری شادی جلد از جلد کرنا چاہتی ہیں۔'' عالمہ نے اپنی بات مکمل کی۔

''بہن اسے مزید آگے پڑھنے دو، اللہ پاک سب بہتر کرے گا، ہم عالمہ کو اچھی تعلیم دلوائیں گے اور جب تعلیم مکمل ہوگی اس کی شادی کر دیں گے۔'' ماسٹر عارف نے فیصلہ کن بات کی۔

آصف صاحب نے بھی ان کی بات کی تائید کی تو مسز آصف نے ہار مان لی اور بولیں۔ ''ٹھیک ہے کل یونیورسٹی میں اس کا داخلہ بھی آپ ہی کروا دیں۔''

عالمہ ماما کی بات سن کر خوش ہو گئی۔

کچھ دنوں میں ہی عالمہ نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، وہ بہت خوش تھی کہ اس کی خواہش پوری ہو گئی مگر اسے آج تک سمجھ نہ آئی کہ اس کی مما کیوں اس کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتی ہیں۔ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے مما سے بھی کئی بار وجہ جاننے کی کوشش کی مگر مما نے نہ بتائی بلکہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ زیادہ تعلیم حاصل کر کے کیا کرو گی، گھرداری ہی تو کرنی ہے۔

آج عالمہ کا یونیورسٹی میں پہلا دن تھا اس کے ابو واپس امریکا چلے گئے تھے۔ یونیورسٹی میں پہلے دن اسے بہت مشکلات کا سامنا تھا۔ مگر جب وہ یونیورسٹی کے کیفے میں گئی تو اسے شہروز نظر آیا وہ اپنے دوست کامران کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ کامران کی اس پر نگاہ پڑی تو اس نے شہروز سے کہا۔ ''یہ لڑکی کتنی پیاری اور سادا سی ہے۔''

شہروز نے عالمہ کی طرف دیکھا۔ وہ دوسری میز پر بیٹھی تھی۔ دونوں اس کے پاس گئے اور اس سے ہیلو ہائے کی، عالمہ نے انہیں اشارے کنائیے میں باور کروایا کہ وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے۔ شہروز نے بھی اسی انداز میں سمجھایا کہ ہم بھی ایسے ویسے نہیں ہیں پھر بولا۔ ''یونیورسٹی میں نئی آئی ہو تو سوچا ویلکم کر دیں، اگر کسی بھی وقت ہماری ضرورت ہو تو ہمیں ضرور بتانا شاید ہم کام آ سکیں۔''

عالمہ ہچکچائی تھی مگر ان کے ادب احترام اور انداز گفتگو نے سمجھا دیا تھا کہ یہ اچھے گھرانے کے ہیں، انہیں آزمانے کے لیے عالمہ نے شہروز کی بات کے جواب میں کہا۔ ''بہت شکریہ بھیا۔''

''کوئی بات نہیں بہنا۔'' شہروز نے بھی پیار سے جواب دیا۔ عالمہ حیرت زدہ رہ گئی کہ شہروز نے بھی ہچکچائے بغیر جواب دے دیا۔

پہلے ہی دن ان کی اچھی دوستی ہو گئی۔ شہروز کی کوئی بہن نہیں تھی اس لیے اس نے عالمہ کو اپنی بہن بنا لیا جبکہ کامران تو پہلی نظر میں ہی اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ وہ بس شہروز اور عالمہ کی گفتگو سنتا رہا۔

☆......☆

مہرالنساء بیگم فیروز دین کے گھر میں داخل ہوئیں اس وقت فیروز دین کی بیوی چارپائی پر بیٹھی سلور کے برتن میں دال ڈالے صاف کر رہی تھی۔ گل بانو اپنے کمرے میں تھی۔ مہرالنساء بیگم کو اپنے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر گل بانو کی ماں نے برتن ایک طرف رکھا اور چارپائی سے اتر کر مہرالنساء بیگم کا استقبال کیا۔ مہرالنساء بیگم کے ساتھ دو ملازم بھی تھے جن کے ہاتھ میں دو تھال تھے۔ فیروز دین بھی گھر میں آ چکا تھا، گل بانو کی اماں نے مہرالنساء بیگم کو چارپائی پر بٹھایا اور آنے کی وجہ دریافت کی۔

''مالکن خیر سے آنا ہوا، ہمیں پیغام بھیج دیتیں ہم خود آ جاتے۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں، کام ایسا تھا کہ ہمیں خود آنا پڑا۔'' مہرالنساء بیگم نے وضاحت کی۔

''جی حکم کریں آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔'' فیروز دین

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

چار پائی کے پاس آ کر بولا۔

''میں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے کہ میں گل بانو کو اپنی بیٹی بنالوں اور شہروز کو آپ کا بیٹا بنا دوں۔'' مہر النساء بیگم نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

''مالکن آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں، ہم سمجھے نہیں۔'' گل بانو کی ماں نے وضاحت چاہی۔

''یہی کہ گل بانو کو میں شہروز کی دلہن بنانا چاہتی ہوں۔'' مہر النساء بیگم نے کھل کر بات کی۔

''مالکن یہ ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے بلکہ خوش نصیبی ہے کہ میری بچی آپ جیسے نیک اور پاک لوگوں کے گھر کی عزت بنے گی، پتا نہیں ہماری کون سی نیکی اللہ کو پسند آ گئی کہ سیدزادی نے ہماری بیٹی کو اپنے گھر کی عزت بنانے کا فیصلہ کیا۔'' فیروز دین خوشی سے بولتا جا رہا تھا اور کمرے کی کھڑکی سے گل بانو یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی اور اپنی قسمت پر نازاں ہو رہی تھی۔

''یہ آپ کی امانت ہے مالکن جب چاہیں برات لے کر آئیں اور لے جائیں۔'' گل بانو کی ماں نے خوشی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر مہر النساء بیگم کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ مہر النساء بیگم نے مٹھائی کے تھال ملازموں سے لے کر گل بانو کی ماں کے حوالے کیے۔

مہر النساء بیگم نے اپنے بیٹے شہروز کے لیے گل بانو کو اس لیے پسند کیا تھا کہ گل بانو ایک تو ان کے گھر میں ہی پلی بڑھی تھی اور دوسرا یہ کہ نیک سیرت اور خوش شکل تھی، ادب آداب کا سلیقہ تھا اور پھر ایک بار شہروز نے ان سے اپنی پسند کا ذکر بھی کر دیا تھا، بس یہی وجہ تھی کہ انہوں نے گل بانو کی غربت نہیں دیکھی تھی بلکہ اپنے بیٹے کی پسند کو مدنظر رکھا تھا۔ گل بانو کے گھر سے واپس آ کر انہوں نے شہروز کو کال کر کے یہ خوش خبری سنائی۔

شہروز نے یہ خوشخبری کامران اور عالیہ کو بھی بتائی، اس نے اپنے سب دوستوں کو یونیورسٹی میں ایک پارٹی دی۔ عالیہ شہروز کے اچھے اخلاق سے بہت متاثر تھی۔ اسے ایسے لگتا تھا کہ شہروز واقعی اس کا سگا بھائی ہو۔ عالیہ نے شہروز کی ملاقات اپنی مما سے بھی کروائی تھی۔

☆......☆

ایک بہت بڑے میدان میں ماسٹر عارف اکیلے کھڑے تھے اس میدان میں صرف ایک مسجد تھی، اس مسجد کے گنبد سبز اور دیواریں سفید رنگ کی تھیں۔ سوائے ماسٹر عارف کے دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا، وہ کبھی آسمان کی طرف دیکھتے تو کبھی مسجد کی طرف، اچانک کسی نے پیچھے سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

ماسٹر عارف چلا اٹھے۔ ''کون ہے......؟''

''یہ کیا میں پھر خواب دیکھ رہا تھا۔'' اس نے خود کو اپنے بستر پر پایا تو خود سے ہمکلام ہوئے اور جلدی سے بستر سے اٹھے، واش روم میں گئے پھر لائٹ جلا کر بیسن کے آگے کھڑے ہو گئے۔ چند لمحے کچھ سوچتے رہے پھر نل کھولا، نل سے پانی نکلا تو ہاتھ منہ دھوئے اور نل بند کر کے اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئے۔ گہری سوچوں میں گم ہو گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ایسا خواب انہیں کیوں آتا ہے۔ پہلے صرف میدان نظر آتا تھا اب وہاں ایک مسجد بھی ہے۔ یہ جگہ کون سی ہو سکتی ہے، یا میں پہلے کبھی اس جگہ پر گیا ہوں، اگر نہیں گیا تو کیا راز ہے اس جگہ کا؟

ماسٹر عارف اگلے دن اسلامی اسکالر صدیقی صاحب کی بیٹھک میں بیٹھے انہیں رات کا خواب سنا رہے تھے۔ صدیقی صاحب ان کا خواب سن کر بولے۔ ''بس تم تیاری کر لو، بہت جلد تمہاری نئی منزل تمہیں اپنی طرف بلا لے گی۔''

''نئی منزل...... کیا مطلب؟'' ماسٹر عارف چونکے۔

''ہاں...... نئی منزل...... جلد قدرت تم پر سب راز عیاں کر دے گی...... بس تم اللہ کی راہ پر چلتے رہو، شیطان انسان کا دشمن ہے اور اس کے پھندے میں صرف وہی انسان پھنستے ہیں جو خود بھٹکنا چاہتے ہیں اور جو نیک راہ پر چلتا ہے شیطان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' صدیقی صاحب نے اپنی شگفتہ زبان میں انہیں سمجھایا۔

''میں تو ایک آوارہ انسان تھا مگر کسی کی محبت نے مجھے بدل کر رکھ دیا اور میں ایک اچھا انسان بن گیا، میں تو اس سے شادی کر رہا تھا مگر عین وقت پر اس نے مجھے دھوکا دے دیا۔ مجھے اچھائی کا راستہ دکھا کر خود غلط راستے پر چل پڑی۔'' ماسٹر عارف اتنا کہہ کر رونے لگے۔

''صبر کرو، یہ امتحان ہے، اس امتحان میں کامیابی تمہاری ہو گی، کیا یہ کم ہے کہ اس کے پیار میں تم اللہ پاک کے قریب آ گئے، عشق مجازی سے تم نے عشق حقیقی کا سفر طے کیا ہے اور سچا پیار بھی اسے ہی کہتے ہیں۔'' صدیقی صاحب نے ماسٹر عارف کو سمجھایا۔ ''شیطان کا وجود انسان کے لیے بہت بڑا امتحان ہے، انسان شیطان کا مقابلہ کر کے اپنے

UUNOVELS.COM

رب کے حضور سرخرو ہو کر پیش ہو جائے تو اس سے بڑی کامیابی کیا ہے، تمہاری منزل قریب ہے تم نے شیطان کو شکست دی، اللہ پاک کے نزدیک تمہارا رتبہ بلند ہو گیا، بس تھوڑا سا صبر کرو، تمہیں سب ملنے والا ہے جو تم نے کھو دیا تھا۔"

"مجھے تو اس کا دیا ہوا سبق بھی یاد ہے اور میں بھولا نہیں ہوں۔" ماسٹر عارف بولے۔

"کیسا سبق؟" صدیقی صاحب چونکے۔

"سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم" وہ یہ ذکر مسلسل کرتی تھی۔ اس کے پیار میں میں نے بھی یہ ذکر پڑھنا شروع کر دیا؟" اتنا اہم سبق پڑھا کر بھی وہ دھوکا دے گئی۔ ماسٹر عارف نے اپنے ماضی کی ایک یاد صدیقی صاحب کو بتائی۔

"بیٹا اگر وہ ذکر الہیٰ میں مصروف رہنے والی لڑکی تھی تو سمجھ لو وہ غلط نہیں ہو سکتی، ہو سکتا ہے کوئی ایسا راز ہو جو کوئی نہ جانتا ہو۔" صدیقی صاحب لفظ راز پر زور دیتے ہوئے بولے۔

ماسٹر عارف سے مزید بات کرنا ممکن نہیں تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ کوئی راز ہو گا مگر انہیں اپنے ماضی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بس وہ اب اپنے اللہ پاک کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکے تھے، اسی لیے صدیقی صاحب سے اجازت لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆......☆

رات کو کھانے کی میز پر عالمہ اور اس کی مما ڈنر کر رہے تھے ساتھ ساتھ یونیورسٹی پر گفتگو جاری تھی۔

"تم اتنا پڑھ لکھ کر کیا کرو گی؟" ماما نے اس سے سوال کیا۔

"ماما میں ایم اے اسلامیات اس لیے کر رہی ہوں کہ اپنے نام کی طرح واقعی عالمہ بنوں۔" اس نے اپنی خواہش ظاہر کی۔

"بیٹا ہم نے تو تمہاری ضد کے آگے ہار مان لی، مگر خیال رکھنا یونیورسٹی میں کسی انجانے لڑکے سے کوئی دوستی کا چکر نہ چلا لینا ورنہ تمہارا یونیورسٹی جانا بند کر دوں گی۔" مسز آصف نے تاکید کی۔

"مما آپ بے فکر رہیں، بس شہروز سے ہی بات چیت ہوتی ہے، اس نے مجھے بہن بنایا ہے بس اس کے علاوہ کسی سے بھی دوستی نہیں ہے۔" عالمہ نے ماما کو یقین دلایا۔

"اچھا لڑکا ہے اس سے مل کر خوشی ہوئی تھی لیکن تم نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ شہروز کے والدین کون ہیں اور یہ کہاں رہتا ہے۔" مسز آصف نے شہروز کے متعلق بات کی۔

"ماما وہ کسی گاؤں سے آیا ہے، یتیم ہے اس کے بابا شاہ اس کی پیدائش کے چھ ماہ بعد وفات پا گئے تھے۔" عالمہ نے بتایا۔

"شاہ میر!" انہوں نے شاہ میر کا نام لیا ہی تھا کہ روٹی کا نوالہ گلے میں پھنس گیا۔ وہ زور زور سے کھانسنے لگیں۔ عالمہ نے کرسی سے اٹھ کر جگ سے گلاس میں پانی ڈالا اور ماما کو دیا۔ گلاس ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ مسز آصف کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ عالمہ بھی پریشان ہو گئی اور جلدی سے ڈرائیور کو آواز دی، گاڑی نکالنے کا کہا۔ وہ ماما کو قابو کیے صحن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مسز آصف صحن میں پہنچتے ہی بے ہوش ہو کر گر گئیں۔

☆......☆

سٹی اسپتال کے ICU کے باہر عالمہ اور ماسٹر عارف ادھر ادھر ٹہل رہے تھے، پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی، ICU میں مسز آصف کو آکسیجن لگی ہوئی تھی، ڈاکٹرز چیک اپ کر رہے تھے۔ شہروز اسپتال کے کاؤنٹر پر گیا اور معلومات لے کر ICU کی طرف پہنچا جہاں عالمہ اور ماسٹر عارف پریشان کھڑے تھے۔

"کیا ہوا آنٹی کو؟" شہروز نے پاس آکر پوچھا۔

"پتا نہیں کیا ہوا بس اچانک ان کی طبیعت خراب ہوئی اور وہ بے ہوش ہو گئیں۔" عالمہ نے روتے ہوئے بتایا۔

"بیٹا دعا کرو اللہ خیر کرے گا۔" ماسٹر عارف نے اسے دلاسا دیا۔

"عالمہ آپ پریشان نہ ہوں اللہ پاک سب اچھا کرے گا اور آنٹی ٹھیک ہو جائیں گی۔"

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر ICU سے باہر نکلا، ڈاکٹر کو دیکھ کر عالمہ اس کی طرف دوڑی۔ "میری مما، وہ اب ٹھیک ہیں نا؟"

"دعا کریں انہیں جلد ہوش آجائے۔" ڈاکٹر نے جواب۔

"کیا کوئی پرابلم ہے۔" ماسٹر عارف نے پوچھا۔

"ہم نے اچھی طرح چیک اپ کیا ہے مگر بیماری کا پتا

UUNOVELS.COM

نہیں چلا اور مریضہ ہوش میں بھی نہیں آرہی، دعا کریں، مزید یہ کہ ہم نے ماہر ڈاکٹرز کو بلایا ہے۔ وہ پہنچنے ہی والے ہیں۔" ڈاکٹر نے انہیں تسلی دی اور آگے بڑھ گیا۔ کامران بھی اسپتال پہنچ چکا تھا۔ عالیہ ICU کے باہر پڑی کرسی پر بیٹھ گئی اور سر جھکا کر رونے لگی۔

☆---☆

لنگی مائی اپنے حجرے میں بیٹھی تھی، گاؤں کی عورتیں حسب دستور اس کے ارد گرد جمع تھیں اور اپنے مسائل بتا کر ان کے خاتمے کی دعا کا کہہ رہی تھیں۔ گل بانو چلتی پھرتی ادھر قبرستان کی طرف آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ بھی تھا۔ اس نے دیکھا قبرستان کے دوسری طرف چھوٹی سی مسجد بنائی جارہی تھی، وہ مسجد پر کام کرتے مزدوروں کو دیکھتے ہوئے مائی کے حجرے کی طرف بڑھتی گئی۔ حجرے میں پہنچ کر اس نے لنگی مائی کے آگے لفافہ رکھ دیا اور کہا۔ "مائی یہ لو مٹھائی، تمہیں پتا ہے یہ کس چیز کی مٹھائی ہے؟"

مائی اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اپنے ہونٹ ہلا رہی تھی۔

"لگتا ہے تمہیں ابھی خبر نہیں ملی، چلو بتائے دیتی ہوں، میری منگنی ہوگئی ہے شہروز سے۔" گل بانو بولتی جارہی تھی اور مائی اس کی باتیں سن رہی تھی، ساتھ ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ اس کے سر پر رکھے اور پھر واپس ہٹا لیے۔ جیسے اسے دعا دی ہو۔ گل بانو مٹھائی وہیں رکھ کر خوشی خوشی واپس چلی گئی۔

☆---☆

دس دن ہوگئے تھے، مسز آصف ابھی بھی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھیں۔ انہیں ڈرپ لگی ہوئی تھی، مسٹر عارف بھی امریکا سے خبر سن کر آگئے تھے۔ ڈاکٹرز نے مکمل چیک اپ کرلیا تھا، خون ٹیسٹ سے لے کر ایکسرے، الٹرا ساؤنڈ سب ٹیسٹ کرلیے تھے مگر بیماری کی تشخیص نہ ہوسکی۔ مسز آصف کی بے ہوشی کی وجہ وہ نہ جان پائے بس اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی ٹینشن انہوں نے دل پر لے لی ہے اسی دھچکے سے وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں ہیں۔

عالیہ بہت پریشان تھی، کامران اور شہروز اسے تسلی دیتے رہتے تھے۔ ماسٹر عارف بھی ہر دم ہر لمحہ ان کے ساتھ تھے۔ ان کی سمجھ سے باہر تھا کہ آخر مسز آصف نے کون سی ٹینشن دل و دماغ پر لے لی۔

ایک رات ماسٹر عارف اسپتال سے گھر آئے اور زیادہ تھکن کی وجہ سے بستر پر دراز ہوگئے ورنہ ان کا معمول تھا کہ وہ روزانہ ذکر الٰہی کے بعد سوتے تھے۔ رات کے تقریباً دو بج چکے تھے۔ ماسٹر عارف اچانک نیند سے بیدار ہوگئے، عجیب سا خوف ان کے چہرے سے عیاں تھا، انہوں نے پھر خواب دیکھ لیا تھا، شاید خواب نے انہیں بے چین کر دیا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر وضو کیا، جائے نماز بچھا کر تہجد ادا کی اور پھر حسب معمول ذکر الٰہی شروع کردیا۔

وہ جتنا ذکر کرتے جارہے تھے اتنا ان کے اندر بدلاؤ آتا جارہا تھا، وہ وجد کی کیفیت میں آچکے تھے۔ ذکر کے ساتھ ساتھ اچانک ان کے منہ سے نیا اسم نکلنے لگا "نور الٰہی، نور الٰہی، نور الٰہی" کچھ ہی لمحوں بعد ماسٹر عارف کو کچھ ہوش نہ رہا۔

☆---☆

لنگی مائی اپنے حجرے میں سوئی ہوئی تھی کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی، اسے ایسا لگا کہ جیسے کچھ عجیب ہونے والا ہے، بیٹھے بیٹھے اپنے ہونٹ ہلاتی رہی، جیسے وہ کچھ پڑھ رہی ہو۔ رات کے اندھیرے میں قبرستان میں ہر طرف سناٹا تھا، صرف مائی کے حجرے میں دیئے کی روشنی جل رہی تھی اور وہ خود ذکر میں مصروف تھی۔

☆---☆

صبح اتوار تھا، ماسٹر عارف کے اسکول میں چھٹی تھی۔ وہ اٹھتے ہی نماز فجر ادا کرکے صدیقی صاحب کے گھر چلے گئے۔ صدیقی صاحب بھی فجر کی نماز ادا کرکے گھر واپس آرہے تھے کہ ماسٹر عارف کو گھر کے باہر کھڑے دیکھا۔ دعا سلام کے بعد صدیقی صاحب نے بیٹھک کھولی، ماسٹر عارف اندر آئے اور صوفے پر بیٹھ گئے۔ "صبح سویرے کیسے آنا ہوا؟" صدیقی صاحب نے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"بس جی رات پھر وہی خواب دیکھا تو بے چینی ہوگئی، سو نہیں سکا، فجر پڑھ کر سیدھا آپ کی طرف آگیا۔" ماسٹر عارف نے وجہ بتائی۔

"اب کیا خواب دیکھ لیا؟" صدیقی صاحب نے پوچھا۔

"دیکھتا ہوں کہ میں ایک مسجد کے سامنے کھڑا ہوں۔ مسجد کے صحن کے ساتھ دائیں طرف کبوتر فرش پر سے دانا چگ رہے ہیں اور مسجد کے بالکل سامنے کچھ فاصلے پر دو قبریں ہیں۔ پوچھ رہا ہوں کہ یہ قبریں کس کی ہیں تو غیب

UUNOVELS.COM

سے آواز آتی ہے، یہ نیک لوگوں کی قبریں ہیں تم ان کے رکھوالے ہو، تم نے اب ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔'' ماسٹر عارف خواب بیان کرکے خاموش ہوگئے۔

''خواب کی تعبیر تو یہی بتاتی ہے کہ تمہیں تمہاری منزل ملنے والی ہے، تم جلد یہاں سے ہجرت کرکے نئی جگہ جانے والے ہو جہاں تمہیں موت آنے تک رہنا ہے۔'' صدیقی صاحب نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

''آخر ایسی کون سی جگہ ہے جہاں مجھے رہنا ہے خواب میں نظر آتی ہے حقیقت میں نہیں؟'' ماسٹر عارف نے سوال کیا۔

''تمہیں جس سے عشق تھا، وہ تمہیں اپنی طرف بلا رہی ہے۔'' صدیقی صاحب نے ایک نئی پیش گوئی کی۔

''نام نہ لیں اس دھوکے باز کا، میں اس سے محبت ضرور کرتا ہوں مگر اس نے مجھے دھوکا دیا۔'' ماسٹر عارف غصے میں آگئے۔

''محبت کے بعد اگلی منزل عشق کی ہوتی ہے اور عشق بچھڑنے کا نام ہے، عشق کا آغاز بھی تب ہی ہوتا ہے جب محبوب پاس نہ ہو اور دل اسی کے لیے تڑپے، اسے ہی مانگے، محبت میں ملن تو ہو جاتا ہے مگر عشق عطا نہیں ہوتا، عشق کے لیے محبوب کا نظروں سے دور ہونا ضروری ہے، عشق مجازی سے عشق حقیقی کے لیے جدائی اپنا کردار ادا کرتی ہے اور معشوق کو اس راہ پر لگا دیتی ہے جو دائمی ہے اور عشق تو کبھی مرتا بھی نہیں عشق کرنے والے جسم سے نہیں روح سے پیار کرتے ہیں، شاید اس لیے وہ تم سے دور ہوئی کہ تمہارا عشق سچا تھا، عشق رب کا رستہ ہے، جس پر تم نے چل کر اسے امر کیا اور تم اسی لیے اس کے عشق میں مبتلا ہوکر اللہ پاک کے قریب آگئے۔'' صدیقی صاحب نے اس کے عشق کا ایک اور راز افشاں کیا۔

''وہ بہت اچھی تھی، مجھے اس سے بہت پیار تھا، نیک سیرت، صلوٰۃ و تسبیح کی پابند تھی۔ مجھے بھی ذکر کی ترغیب دیتی جسے میں نے اپنا لیا ہے۔ سوتے، جاگتے یہ ذکر خود بخود میری زبان سے جاری رہتا ہے۔ اگر زبان خاموش ہو جائے تو دل اس ذکر کو جاری رکھتا ہے مگر...... مگر......'' یہ کہہ کر ماسٹر عارف بلک بلک کر رونے لگے۔

''یہ رونے کا وقت نہیں ہے، سوچنے سمجھنے کا وقت ہے۔ وہ نیک سیرت لڑکی تمہیں دھوکا نہیں دے سکتی۔ محبت اسے تم سے نہیں بلکہ تمہیں اس سے تھی اور یہ یک طرفہ محبت تھی، دھوکے باز وہ تب ہوتی جب وہ تم سے اقرار محبت کر کے مکر جاتی۔'' صدیقی صاحب نے اسے سمجھایا۔

''میری تو اس سے شادی ہونے جا رہی تھی، شادی کی رات ہی وہ گھر سے بھاگی، بدچلن لڑکی۔'' اب کی بار ماسٹر عارف غصے سے بولے۔

''اسے ایسا نہ کہو، قدرت کا کیا راز ہے وہ ہی جانے، سوچو اگر وہ تمہیں مل جاتی تو کیا تم اللہ پاک کے قریب ہو جاتے؟ کبھی بھی نہ ہوتے، بچھڑنا ضروری تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم آج یہاں نہ ہوتے اور نہ ہی تم خشوع و خضوع اللہ کی عبادت کرتے اور نہ ہی اللہ کے راستے پر چلتے، وہ تو تمہیں سچے عشق کا رستہ دکھا گئی ہے۔'' صدیقی صاحب نے انہیں سمجھایا۔

ماسٹر عارف نے اپنے آنسو پونچھے کیونکہ وہ مسلسل روئے جا رہے تھے۔ صدیقی صاحب کا ملازم آیا اور ناشتا لگ جانے کا بتایا، پھر دونوں اٹھ کر ناشتے کی میز کی طرف بڑھے۔

☆......☆

مسز آصف کو اسپتال سے گھر شفٹ کر لیا گیا تھا، ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس بھی گھر میں رکھ لی گئی تھی، ڈاکٹرز نے ان کی بیماری کا علاج صرف دعا ہی بتایا تھا اور دعا تو وہ سب کر ہی رہے تھے۔ آصف صاحب نے طویل عرصے کے لیے چھٹیاں لے لی تھیں۔ ان کی نظر میں سب سے پہلے ان کا گھر تھا پھر جاب اسی لیے امریکا سے آگئے تھے۔ عالمہ بھی مما کی بیماری کی وجہ سے بہت ڈسٹرب تھی، یونیورسٹی جانا بھی بند کر دیا تھا، اب وہ گھر پر ہی مما کی دیکھ بھال کے لیے رہتی تھی۔ وہ سوچتی تھی شاید مما کو پتا تھا کہ وہ کسی بیماری کا شکار ہونے والی ہیں اسی لیے جلد از جلد میری شادی کر دینا چاہتی تھیں کیونکہ عالمہ کو اپنے پاپا سے یہ پتا چلا تھا کہ بیس سال پہلے بھی مما کو بے ہوشی کا یہ جھٹکا لگا تھا مگر بروقت ہوش میں آگئی تھیں۔

ایک دن شہروز نے عالمہ کو مائی کا بتایا کہ پگلی مائی کی دعا سے بیمار لوگ صحت یاب ہو جاتے ہیں، اگر اس کی مما کو اس کے گاؤں لے جائیں تو شاید پگلی مائی کی دعا سے وہ جلد صحت یاب ہو جائیں۔ عالمہ نے اپنے پاپا کو بھی یہ بات بتائی مگر اس کے پاپا نے ایسی باتوں پر توجہ نہ دی بلکہ الٹا یہ کہا کہ یہ سب ڈھونگ ہے، آج کے سائنسی دور میں ایسے کرشمے نہیں ہوتے کرشمہ صرف سائنس کی مرہون منت ہے۔

عالمہ نے شہروز کو اپنے پاپا کی سوچ بتائی۔ شہروز نے فیصلہ کیا کہ وہ خود انکل سے بات کرے گا۔ ایک دن شہروز ان کے گھر گیا اس کے پاپا کو ملا اور انہیں منایا کہ صرف ایک بار یقین کے ساتھ گاؤں چلیں ان کی بیوی مائی کی دعا سے صحت یاب ہو جائے گی۔ آصف صاحب نے پہلے تو انکار کیا جب دیکھا کہ شہروز ضدی ہے مسلسل اصرار کر رہا ہے تو ہتھیار ڈال دیئے اور کہا "ٹھیک ہے کل صبح چلتے ہیں، دیکھتے ہیں وہ عورت کیا کرامات دکھاتی ہے۔"

"شکریہ انکل...... میرا یقین ہے آنٹی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔" شہروز نے خوشی سے کہا۔ شہروز سے بھی عالمہ کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی، اسی لیے اصرار کر کے آصف صاحب کو منایا تھا۔

☆......☆

رات کے پچھلے پہر ماسٹر عارف کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں اندھیرا تھا، اندھیرے میں انہیں کسی کا وجود نظر آیا، ان کے بیڈ کے پاؤں والی سائیڈ پر کوئی عورت کھڑی تھی لال جوڑا پہنے۔ وہ گھبرا گئے اور پوچھنے لگے۔ "کون ہو تم...... اور کہاں سے آئی ہو، میرے کمرے میں کیسے داخل ہوئیں؟"

"تمہیں بتانے آئی ہوں جلدی سے آجاؤ تمہاری منزل تمہاری منتظر ہے۔" لال جوڑے میں ملبوس لڑکی بولی۔ اندھیرے کی وجہ سے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ماسٹر عارف نے بستر سے اتر کر اس لڑکی کی طرف بڑھنا چاہا ہی تھا کہ لڑکی غائب ہو گئی۔

"ہیں یہ کیا...... میں نے پھر خواب دیکھا...... ابھی تو میں بستر سے اتر کر اس لڑکی کی طرف بڑھا تھا اور اب بستر پر ہی لیٹا ہوا ہوں۔" ماسٹر عارف خود سے ہم کلام ہوئے۔ گویا انہوں نے خواب دیکھا تھا۔

"وہ لڑکی یقیناً نور الہی ہوگی۔" عارف دوبارہ خود سے ہم کلام ہوئے پھر نور الہی کی یادوں میں کھو گئے۔

عارف کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ ایک انا پرست، ضدی اور خود غرض انسان تھے، وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ وہ خود کو سب سے برتر تصور کرتے تھے مگر جب انہوں نے نور الہی کو کالج میں دیکھا تو اس کے حسن کے گھائل ہو گئے، نور الہی جیسے حور ہو، انہیں ایسا پہلی بار احساس ہوا تھا کہ کوئی اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہو سکتا ہے، عارف پہلی ہی نظر میں دل ہار بیٹھے تھے۔ شاید یہ وقت ان کے سدھرنے کا تھا یا مزید بگڑنے کا، وہ محبت اور عشق کو ایک فضول کام سمجھتے تھے انہیں کیا پتا تھا کہ محبت انمول تحفہ ہے جو آنکھوں سے دل میں اترتا ہے اور پورے کا پورا انسان اس کا ہو جاتا ہے۔ اسے چاہنے لگتا ہے، یہی چاہت تو عشق کے رتبے پر فائز کرتی ہے۔ نور الہی تھی ہی سراپا محبت...... اور ایسی محبت تو ملتی ہی مقدر والوں کو ہے۔ ان میں وہ شامل ہے یا نہیں یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ ماسٹر عارف دن بدن اس کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا گیا۔ یک طرفہ محبت تھی۔ وہ کوشش کرتا کہ اپنی محبت کا اظہار کر دے مگر ایسا نہ ہو پاتا۔ کئی مواقع ملے تھے مگر بات زبان تک آتے آتے رک جاتی۔ آخر ایک دن اس نے موقع پاتے ہی نور الہی سے محبت کا اظہار کر دیا مگر نور الہی نے اسے مثبت جواب نہ دیا بلکہ سمجھایا کہ وہ اس سے محبت نہیں کر سکتی کیونکہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ اس دن عارف کا دل ٹوٹا تھا مگر اس نے ہار نہ مانی اور نور الہی کے گھر رشتہ بھیج دیا۔ اس کے گھر والے خوش تھے کہ اچھی فیملی سے رشتہ آیا ہے مگر نور الہی خوش نہ تھی، وہ عارف کو ذرا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ نور الہی نے عارف کو کالج کی کینٹین میں بٹھا کر سمجھایا کہ وہ باز آجائے وہ کیا جانے کہ عشق ہے کیا، عشق تو صرف اللہ پاک سے ہونا چاہیے، عشق تو اس کے محبوب سے ہونا چاہیے۔

عارف پہلی بار نور الہی کی باتیں سن کر شرمسار ہوا مگر وہ دل کا کیا کرتا جو نور الہی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ہی ساتھ نور الہی کے لیے اس کے دل میں محبت بڑھتی جا رہی تھی۔

"اچھا یہ بتاؤ تم یہ کیا ہر وقت پڑھتی رہتی ہو تمہارے ہونٹ جو ہمہ وقت ہلتے رہتے ہیں؟" عارف نے سوال کیا۔

"ذکر الہی کرتی رہتی ہوں کیونکہ جو لمحہ اللہ کی یاد میں گزارا جائے وہ نیکی میں لکھا جاتا ہے اس لیے ذکر کرتی رہتی ہوں۔" نور الہی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ ذکر کیا ہے، مجھے بھی بتاؤ۔" عارف نے اس سے پوچھا۔

نور الہی نے ذکر کے الفاظ بتائے اور گراؤنڈ سے اٹھ کر کینٹین کی طرف چل دی۔

ماسٹر عارف کو فجر کی نماز کے لیے اذان کی آواز سنائی دی تو وہ ماضی سے حال میں واپس آگئے ان کی آنکھیں نم تھیں، بستر سے اٹھے اور واش روم میں چلے گئے۔

☆......☆

مہر النساء بیگم نوکروں سے گھر کی صفائی کروا رہی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

تھیں۔ گل بانو بھی ہاتھ بٹا رہی تھی اور بہت خوش تھی۔ مہرالنساء بیگم نے اسے بتایا تھا کہ شہروز ملتان سے کچھ مہمانوں کے ساتھ آرہا ہے، گھر بھر کی اچھی طرح صفائی کروا دو، اسی لیے بانو نوکروں سے صفائی کروانے میں مصروف تھی، دو ماہ بعد وہ شہروز کو دیکھے گی۔ یہ سوچ اسے خوش کر دیتی۔ مہرالنساء بیگم کے گھر کے سامنے دو گاڑیاں آکر رکیں، کچھ دیر بعد ان گاڑیوں سے شہروز، کامران، عارف، عالیہ اور آصف صاحب نکلے۔ ساتھ ہی اسٹریچر پر مسز آصف نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھیں۔ اسٹریچر دو ملازموں نے پکڑ رکھا تھا۔ سب شہروز کی امی جان سے ملے اور گھر میں داخل ہوئے۔ مسز آصف کو مہمانوں والے کمرے میں بیڈ پر لٹایا گیا۔ کھانے کی میز پر سب اکٹھے ہوئے، کھانا کھایا گیا اور مسز آصف کی بیماری پر بات چیت ہوتی رہی، کئی گھنٹے کے سفر کی تھکان کی وجہ سے کھانا کھانے کے بعد ہر کوئی آرام کرنے لگا۔ مائی کی طرف صبح جانا تھا۔

صبح ہوتے ہی سورج آہستہ آہستہ افق پر نمودار ہوا، گاؤں کے لوگ اپنی اپنی مصروفیات میں مگن تھے کہ دو گاڑیاں قبرستان میں داخل ہوئیں۔

قبرستان میں زیر تعمیر مسجد تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ آج مائی کے حجرے میں رش بالکل نہیں تھا۔ مائی اپنے حجرے میں ذکر الٰہی میں مصروف تھی۔ گاڑیاں حجرے کے پاس آکر رکیں، سب کے سب اترے اور مائی کے حجرے میں داخل ہوئے۔ مسز آصف ویل چیئر پر نیم مدہوشی کی حالت میں تھیں۔ پگلی مائی دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھی تھی، اسے پتا نہیں تھا کہ حجرے میں کون آیا ہے۔

''مائی شہر سے میری بہن عالیہ کی امی آپ کے حجرے میں نیم بے ہوشی کی حالت میں لائی گئی ہیں۔ دعا کریں یہ ٹھیک ہو جائیں۔'' شہروز نے مائی سے التجا کی۔

پگلی مائی نے مڑ کر دیکھا، اس کی نظر ویل چیئر پر پڑی، پگلی مائی کے منہ سے بے اختیار ذکر جاری ہو گیا لیکن آج ذکر کی آواز بلند تھی۔

مائی کے منہ سے الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ کرامت کا ظہور ہوا۔ مسز آصف کو ہوش آنے لگا۔ ان کے ہوش میں آنے تک ایک اور حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا۔ پگلی مائی خود بے ہوش ہو گئی۔ پگلی مائی کو دیکھ کر عارف دنگ رہ گئے تھے۔ مسٹر آصف بھی حیرت زدہ کھڑے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے ان سب کو سانپ سونگھ گیا ہو، حجرے میں مکمل خاموشی تھی، مسز آصف کی آواز نے خاموشی کو توڑا۔ وہ رک رک کر بولیں۔

''مم...... مم...... ی...... میں...... میری...... بب...... بہن...... نن...... نور...... تت...... تم...... یہاں۔'' اب کی بار دنگ رہنے کے لمحات شہروز اور اس کی فیملی کے تھے۔

''یہ آپ کی بہن ہے؟'' مہرالنساء بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''جی...... یہ...... میری بہن...... نور الٰہی ہے، 20 سال پہلے گھر چھوڑ گئی تھی۔'' مسز آصف رک رک کر بولیں۔

''آنٹی ہمیں کھل کر بتائیں، یہ تو 20 سال سے اسی قبرستان میں ہیں، دلہن کے روپ میں یہاں آئی تھیں۔'' شہروز نے بتایا۔

مسز آصف نے پگلی مائی کی طرف دیکھا پھر بولیں۔ وہ مسلسل رو رہی تھیں۔ ''20 سال پہلے اس کی شادی کی رات یہ اچانک گھر سے غائب ہو گئی تھی، گھر میں کہرام مچ گیا۔ ہمارے ابو الٰہی بخش اس بے عزتی کو سہہ نہ سکے ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ انتقال کر گئے، نور کو شادی کے لیے ہم نے راضی کیا تھا، اس کی شادی عارف سے ہونا طے پائی تھی۔ اسی عارف سے۔ اس نے بھی نور الٰہی کے فرار کو دل پر لے لیا اور آج تک اس کی وجہ سے شادی نہیں کی، ہم سمجھے نور شاہ میر کے ساتھ بھاگ گئی ہے ہمارے لیے بدنامی کا سبب بنی ہے اس لیے اس پر گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے تھے۔''

''نور شاہ میر کو کیسے جانتی تھی؟'' مہرالنساء بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''شاہ میر جس کالج میں پڑھتے تھے وہیں نور بھی پڑھتی تھی۔ وہیں ان کی دوستی ہوئی، نور شاہ میر کو پسند کرنے لگی تھی، اس نے خود مجھے بتایا تھا مگر شاہ میر صرف اچھا دوست بن کر اس کے ساتھ چل رہا تھا، عارف بھی ان کے کالج میں پڑھتے تھے، انہوں نے نور کو پسند کر لیا اور نور سے محبت کرنے لگے، انہوں نے باقاعدہ طور پر ہمارے گھر نور کے لیے اپنا رشتہ بھیجا، ابو جان نے یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کر لیا تھا مگر نور خوش نہیں تھی پر کیا کرتی ابا جان کے آگے نور کی بالکل نہیں چلتی تھی۔ نور نے ہی بتایا تھا کہ شاہ میر کسی گاؤں کا ہے اور بہت اچھا انسان ہے۔ شاہ میر میں خاصیت یہ بتائی کہ وہ دوسروں کے لیے جیتا ہے۔ ایک دن نور نے بتایا کہ شاہ میر تعلیم ادھوری چھوڑ کر گاؤں واپس چلا گیا ہے، نور نے اس

UUNOVELS.COM

کے آنے کا بہت انتظار کیا۔ پانچ وقت نماز ادا کرتی، دعا میں صرف شاہ میر کو مانگتی۔ ڈیڑھ سال تک شاہ میر کی واپسی نہ ہوئی، اسی دوران ابا جان نے عارف کی نور سے شادی کی تاریخ طے کردی۔

جس دن برات آئی تھی اسی رات نور گھر سے بھاگ گئی۔ میری شادی کو دو سال کا عرصہ ہو چکا تھا جس دن ابا جان کا انتقال ہوا اس کے ٹھیک دوسرے ہفتے میری بیٹی عالمہ پیدا ہوئی، عالمہ کو عشق کے چکر سے دور رکھنے کے لیے میں نے سوچ لیا تھا کہ یہ 20 سال کی ہوگی تو میں اس کی شادی کردوں گی تا کہ یہ اپنی خالہ کے نقش قدم پر نہ چلے۔''

مسز آصف نے اپنی بھڑاس نکالی۔

''بہن شاہ میر کو یا اپنی نور کو غلط نہ کہو، شاہ میر میرا شوہر تھا، جس دن شاہ میر کا انتقال ہوا اسی روز قبرستان میں یہ پگلی مائی اسی جگہ دلہن کے روپ میں بیٹھی تھی اور آج بھی اسی جگہ پر موجود ہے۔ پگلی مائی غلط نہیں ہو سکتی، شاہ میر سے عشق اسے یہاں لے آیا، یہ خود نہیں آئی۔ شاہ میر کے عشق نے نور کو بھی اللہ سے ملا دیا، نور نے عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر طے کیا ہے، یہ تو ان کے سچے عشق کی کہانی تھی جو رب نے لکھی۔ اسے غلط نہ کہو۔'' مہر النساء بیگم بھی رونے لگیں۔

وہ مسلسل روئے جا رہی تھیں، عارف ابھی بھی دنگ کھڑے تھے، کچھ نہیں بول رہے تھے بس نور الٰہی کی پاک دامنی کا ثبوت دیکھ اور سن رہے تھے، پگلی مائی ابھی تک اپنی جگہ بے ہوش پڑی تھی، عالمہ کو اپنی شادی کی اصل وجہ پتا چل چکی تھی، یہاں آج کئی راز کھل گئے تھے، کئی پردے ہٹ گئے تھے مگر نور الٰہی کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی ابھی تو داستان باقی تھی۔

نور الٰہی ابھی بھی بے ہوش تھی، اسے فوراً مہر النساء بیگم کے گھر لے جایا گیا۔ ڈاکٹر کو بھی بلا لیا گیا تھا۔ نور الٰہی کو بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ مسز آصف، مہر النساء بیگم سمیت سب ہی افراد نور الٰہی کے اردگرد بیڈ کے پاس بیٹھے تھے۔ مہر النساء بیگم یک دم اٹھیں اور کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ انہوں نے کمرے میں موجود الماری کے خفیہ خانے سے ایک ڈائری نکالی اور واپس اسی کمرے میں آ گئی جہاں سب جمع تھے۔ انہوں نے ڈائری شہروز کو تھماتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا یہ تمہارے ابا جی کی ہے میں تو ان پڑھ ہوں مجھے نہیں پتا اس میں کیا لکھا ہے۔ تمہارے ابا جان کے انتقال کے بعد ان کے سامان میں سے مجھے ملی تھی، اس وقت سے میں نے تمہارے ابا کی نشانی کے طور پر سنبھال رکھی تھی، دیکھو اس میں کیا لکھا ہے؟''

شہروز نے ڈائری اٹھائی اور اسے کھول کر سرسری جائزہ لیا اور بولا۔ ''اماں یہ تو ابا جان کی یونیورسٹی لائف کی یادیں ہیں۔''

ماسٹر عارف نے شہروز سے ڈائری لے لی اور اس کو پڑھنے لگا۔ ڈائری میں لکھا تھا۔ یہ ڈائری میرے مرنے کے بعد نور الٰہی کو دی جائے۔

''یہ ڈائری مجھے نور الٰہی نے دی تھی جب شہر کی یونیورسٹی میں میرا پہلا دن تھا، وہ میری اچھی دوست بن گئی تھی، ہنس مکھ لڑکی تھی وہ بھی ایم ایس سی میتھ کر رہی تھی اور میں بھی ایم ایس سی میتھ کا طالب علم تھا، مجھے نہیں پتا تھا کہ نور الٰہی میرے لیے اپنے دل میں کیا جذبات رکھتی ہے، ایک دن اس نے مجھے کہہ دیا کہ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہے، میں نے اسے سمجھایا کہ میں اسے اپنا دوست مانتا ہوں، پیار ویار کے چکر کا بندہ نہیں ہوں مگر نور الٰہی نے کہا کہ آپ کے دل میں بھلے ہی ایسے احساسات نہ ہوں مگر میں تو آپ کے لیے احساسات رکھتی ہوں، نور الٰہی کو میں نے دین اسلام کا راستہ دکھایا، اسے بتایا کہ محبت نکاح سے پہلے ہو تو انسان کی بربادی کا آغاز ہو جاتا ہے، محبت نکاح کے بعد ہو تو انسان کے لیے راحت بن جاتی ہے، ہمارا دین ہمیں شریعت کے خلاف چلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ میں اللہ کا بندہ ہوں صرف اللہ سے محبت کرتا ہوں اور اللہ پاک کے لیے ہی دوسروں سے محبت کا جذبہ رکھتا ہوں، تم بھی اللہ کی راہ پر چلو۔ نور الٰہی گو کہ ماڈرن لڑکی تھی مگر میری باتیں اس کے دل پر اثر کرتی تھیں۔

ایک دن نور الٰہی کو میں نے کہا کوشش کرو ہر وقت ذکر الٰہی میں مصروف رہو، کوئی لمحہ بے کار نہیں جانا چاہیے۔ اس نے کہا مجھے بتاؤ ایسا ذکر میں بھی کروں گی، میں نے اسے ایک ذکر دیا تھا کہ وہ روزانہ، فارغ لمحے میں ورد کرتی رہا کرے، یہ وہ ذکر ہے جو میں خود بھی کرتا ہوں اور یہ ذکر ہمیں اللہ پاک کی تعریف، اس کے پاک ہونے اور عظمت والا ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ نور الٰہی میرے کہنے پر یہ ذکر کرتی رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس سے پیار نہیں کرتا مگر پھر بھی وہ میرے لیے جذبات رکھتی تھی، یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران ہی میری شادی مہر النساء سے ہو گئی، میں نے اپنی شادی نور الٰہی سے چھپائے رکھی تا کہ اس کا دل نہ ٹوٹے،

UUNOVELS.COM

میں نے شادی کے بعد یونیورسٹی کو بھی خیر آباد کر دیا اور گاؤں میں ہی مستقل طور پر رہنے لگا۔ یونیورسٹی کا ایک طالب علم عارف اس سے محبت کرتا تھا، میں نے اسے کہا تھا کہ وہ اس سے شادی کرلے مگر نور الٰہی کہاں ماننے والی تھی۔

گاؤں آکر میں نور الٰہی کو بھول گیا تھا کیونکہ مجھے ایسا لگنے لگا تھا جیسے میں ابدی زندگی کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ اسی لیے یہ ڈائری لکھی ہے۔ یہ ڈائری میرے مرنے کے بعد نور الٰہی کو دے دی جائے، ڈائری کے آخر میں نور الٰہی کا پتا بھی درج ہے۔ نور الٰہی سے مجھے بھی محبت ہو چکی تھی مگر میں ایسی محبت کا قائل نہیں تھا جو کہ دنیاوی ہو، میں روحانی محبت کا قائل تھا مگر نور الٰہی کو یہ بات نہیں بتائی کہ محبت ملن کا نام ہے اور عشق بچھڑنے کا نام ہے، محبت ملنے کے بعد اختتام پذیر ہو جاتی ہے اور عشق بچھڑ کر امر ہو جاتا ہے، اس دنیا میں نہیں جنت میں ہم ایک ہوں گے۔''

ڈائری میں یہاں تک داستان درج تھی اور ایک خط بھی تھا، عارف نے خط کھولا تو اس میں لکھا تھا۔

نور الٰہی......!

میں اس دنیا میں کم وقت کے لیے آیا تھا، تمہارا عشق مجھے تمہارا بنا گیا، یہ تم سے اقرار وفا ہے، جنت میں ہم ملیں گے۔ تمہارا انتظار کروں گا۔

فقط شاہ میر

سب کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں یہ ڈائری شاہ میر کے مرنے کے بعد نور الٰہی کو پہنچائی جانی تھی مگر کسی کو کیا پتا تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے اور شاہ میر جانتا تھا کہ وہ جلد اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہے، گاؤں والے تو اس کی پیدائش پر ہی کہتے تھے کہ یہ ولی اللہ ہے، اور ان کی بات سچ تھی، کمرے میں خاموشی تھی، ڈاکٹر آچکا تھا اور نور الٰہی کو چیک کر رہا تھا۔ عارف ڈائری پڑھ کر سر جھکائے کھڑے تھے، اتنے میں ڈاکٹر نے مہر النساء بیگم سے کہا۔ ''بی بی جی...... پگلی مائی اب اس دنیا میں نہیں رہی۔''

یہ خبر سب پر بجلی بن کر گری، مسز آصف رو دیں۔ ماسٹر عارف دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے رہ گئے، ان کی آنکھیں نم تھیں۔ نور الٰہی پر لگنے والا بد چلنی کا داغ دھل چکا تھا وہ پاک دامن تھی۔

اگلے دن قبرستان میں شاہ میر کی قبر کے ساتھ دوسری قبر بن چکی تھی جو کہ نور الٰہی (پگلی مائی) کی تھی۔ اس کا راز کھلتے ہی وہ اس دنیا سے چلی گئی جہاں شاہ میر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

مسز آصف، عالیہ، آصف صاحب اور کامران چند روز گاؤں میں رہ کر واپس شہر چلے گئے تھے۔ شہروز نے آصف صاحب سے التجا کی تھی کہ عالیہ کی شادی کامران ہی سے کرائی جائے۔ جلد ہی وہ گل بانو کو اپنی ہمسفر بنائے گا۔

عارف نے پگلی مائی کے حجرے کو ہی اپنا گھر بنا لیا تھا کیونکہ انہیں صدیقی صاحب نے خواب کی جو تعبیر بتائی تھی وہ شاید اسی جگہ کی تھی جو خواب میں عارف کو اشارے ملتے تھے۔ خواب عارف کو شاہ میر اور نور الٰہی کی قبروں کا محافظ بنا گئے تھے۔

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی، ابھی آخری راز باقی ہے۔ ماسٹر عارف کو بھی نور الٰہی کے حجرے سے ایک ڈائری نما کتابچہ ملا، انہوں نے اسے کھولا، چند ورق پلٹنے کے بعد ایک صفحہ پر یہ تحریر درج تھی۔

''عارف میرے مرنے کے بعد یہ ڈائری تمہیں ملے گی، میں بتاتی چلوں کہ میں شادی کی رات اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ مجھے ایسا لگا کہ کوئی میرا اپنا مجھ سے بچھڑنے والا ہے، اسی وقت میں نے ذکر الٰہی شروع کر دیا۔

ذکر پڑھتے ہی مجھے کچھ ہوش نہ رہا، جب ہوش آیا تو میں نے خود کو اس قبرستان میں پایا، میرے سامنے شاہ میر کی قبر تھی، میں نے مستقل اسی جگہ کو اپنا سب کچھ بنا لیا۔ مجھے تم سے عشق نہیں تھا مگر تمہارا احترام کرتی تھی، میں غلط نہیں ہوں، عشق میں اگر فراق کا درد نہ ملے تو عشق عشق نہیں رہتا۔ تم بھی میری طرح خوش نصیب ہو کہ شاہ میر کی بدولت تمہیں بھی اللہ پاک نے اپنا دوست بنا لیا ہے۔ میرے مرنے کے بعد یہ تحریر تمہیں ملے گی۔

میرا نام نور الٰہی ہے۔ یہ اللہ کی مرضی سے رکھا گیا کیونکہ اللہ پاک نور ہے اور اس کا محبوب بھی نور ہے، دنیا کو بس اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کا درس دیتے رہنا، محبت میں جان ہے اگر یہ بے جان ہوتی تو خدا کو بھی اپنے رسول حضرت محمدؐ سے محبت نہ ہوتی اسی لیے اللہ پاک نے کہا ہے کہ مجھ سے محبت سے پہلے اپنی جان و مال سے بڑھ کر میرے محبوبؐ سے محبت کرو۔''

فقط نور الٰہی

ماسٹر عارف نے تحریر پڑھ کر آنکھیں بند کر لیں۔